حیاتِ جاوید

جس میں

عالی جناب جوّاد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سیّد احمد خان (غفرلہٗ)

کی زندگی کے حالات اور اُن کی سرکاری، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات

مفصّل بیان کی گئی ہیں

تالیف لطیف

مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

حیاتِ جاوید

حیاتِ جاوید

جس میں

عالی جناب جوّادُ الدّولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سیّد احمد خان (غُفِرَلہٗ ۱۳۱۵ھ)

کی زندگی کے حالات اور اُن کی سرکاری، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات

مفصّل بیان کی گئی ہیں

تالیف لطیف

مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Hayat-e-Javed
by
Altaf Husain Hali

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن	:	1979
پانچواں اڈیشن	:	2004، تعداد: 1100
قیمت	:	-/181
سلسلۂ مطبوعات	:	656

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 66
طابع: فہمی کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار ورموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات وکائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب وتطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل وتعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فسلفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ وترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے

بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

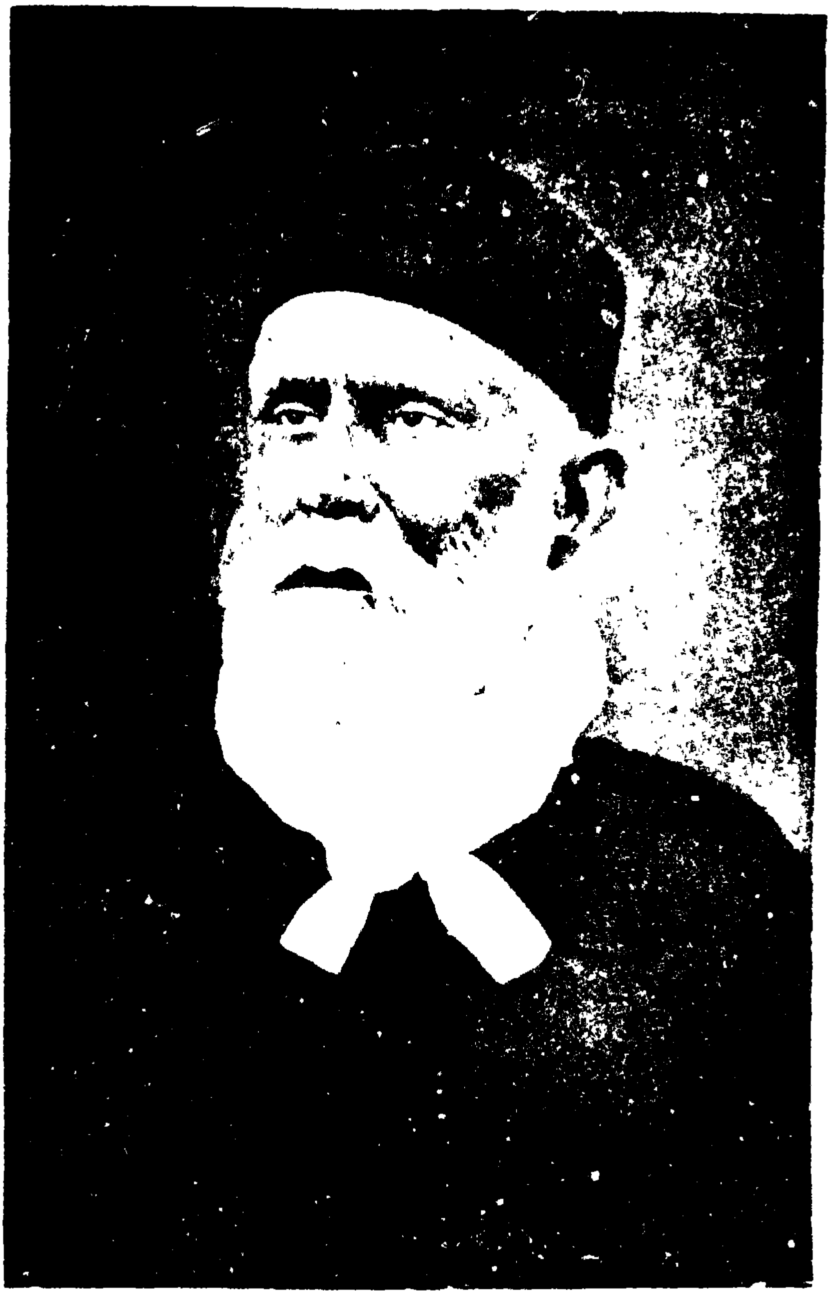
ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین حیاتِ جاوید

پہلا حصہ



الطاف حسین حالی

دیباچہ

سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر اُن کے حالات اُس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو در پیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لیے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لیے درکار ہیں ہمارے لیے بے سود ہوں گی۔ ہمارے اسلاف میں علما و حکما و مصنفین کی بھی کچھ کمی نہیں ہے مگر وہ بھی آج ہمارے لیے قابل تقلید نمونے نہیں بن سکتے، اُن کو خدا نے ایسے وقت میں پیدا کیا تھا جب کہا جاتا تھا کہ "علم[1] اور لوگوں کا کام ہے اور بادشاہی اور لوگوں کا" مگر ہمارے زمانے میں دونوں کام ایک ہی شخص کو کرنے پڑتے ہیں، اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی فکر اور خلجان خلل انداز نہ تھا، وہ معاش کی طرف سے فارغ البال تھے،

[1] یہ ایک عربی مثل کا ترجمہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "للعلم رجال وللثرید رجال"

وہ قوم کی خدمت کرتے تھے اور سلطنت اُن کی خدمت کرتی تھی۔ لیکن ہماری حالت ایسی نہیں ہو
ہم کو دائیں ہاتھ سے پیٹ کا دھندا کرنا ہو اور بائیں سے کسی دوسرے کام کا ارادہ کرنا۔ ہمارے
عرفا و مشائخ کی پاکیزہ زندگی بھی ہم دنیاداروں کی موجودہ حالت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی وہ ہم کو اپنے
اپنے قدح کی خیر منانی سکھاتی ہو مگر ہماری خیر اب اس میں ہو کہ سب مل کر ایک دوسرے کی
خیر منائیں۔ پس اس وقت ہمارے سلف کے کارنامے ہم کو براہ راست اس کے سوا کوئی
سبق نہیں دے سکتے کہ بزرگوں کی بڑائی پر فخر کرو اور اس شعر کے مصداق بنو

اِنْ افتخرت بآبَاءٍ مَضَوْا سَلَفًا قُلْنَا صدقت ولکن بِئْسَ مَا وَلَدُوْا

(یعنی اگر تم کو اپنے بڑوں پر فخر ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی تھے مگر اولاد بُری چھوڑ گئے)

ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لیے بالکل فائدہ مند نہیں ہیں۔
اُن کی بائیوگرافی میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو قومی زندگی کے لیے بمنزلہ ارکان و عناصر کے
ہیں محنت، صبر، استقلال، غیرت، دلیری، اُولو العزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ اُن کے کارناموں
میں موجود ہو، مگر جن مہمات میں انھوں نے ان ہتھیاروں سے کام لیا تھا ہماری مہمات اُن سے
بالکل جداگانہ ہیں جو شاید اُن کو کبھی پیش نہیں آئیں۔ جن آلات سے انھوں نے ملک فتح کیے
تھے ہم کو انھیں آلات سے دل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت اور آبرو انھوں نے اپنی قوم کی سلطنت
میں حاصل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصل کرنی ہو۔ اُن کے زمانے میں سلطنت
کے سوا کسی کو مصالح عامہ میں دخل نہ تھا اس لیے اُن کو ملک اور قوم کی بہبودی کے لیے ہاتھ
پانو ہلانے کی مطلق ضرورت نہ تھی مگر ہمارے زمانے کا حال بالکل اس کے برخلاف ہے۔ ہمارے
زمانے میں قوموں کی موت اور زندگی خود قوموں ہی کے ہاتھ میں ہو۔ وہ چاہیں اپنے تئیں
بنائیں اور چاہیں بگاڑیں، چاہیں جییں اور چاہیں مر جائیں۔ سلطنت کا کام صرف اُن کی حیات و
ممات کا رجسٹر رکھنا اور زندوں کو زندوں کے گھاٹ اور مُردوں کو مُردوں کے گھاٹ اُتار
دینا ہو اور بس۔ ہمارے اسلاف نے اسلام کا دوَر دورہ دیکھا تھا جب کہ غیر مذہب والوں

کو بھی اُس کا اتباع کرنا پڑتا تھا اور اُس کے خلاف کوئی دم نہ مار سکتا تھا اس لیے اُن کو دین کی حمایت کرنے کی صرف اُسی قدر ضرورت تھی جس قدر کہ صلح کے زمانے میں فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہم کو وہ زمانہ ملا ہے کہ بادشاہ اور رعیت دونوں کے مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ آزادی نے گونگوں تک کو گویا کر دیا ہے۔ مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ادھر کرسچینٹی سلطنت کی مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے اُدھر سائنس مذہب کا نقش لوگوں کے دلوں سے مٹانا چاہتا ہے۔ جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اس قدر بدلی ہوئی ہے تو اُن کی بائیوگرافی ہمارے مشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی ہمت سے ہماری ہمت اور اُن کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی ہے مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے کیا کام لیا تھا اور ہم کو اُس سے کیا کام لینا چاہیے۔ جس قدر تیمور[1] کا ایک چیونٹی سے شاہانہ عزم و استقلال سیکھنا عجیب معلوم ہوتا ہے اُس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ تیمور کی لائف سے چیونٹی کا سا عزم و استقلال سیکھا جائے۔ پس اگرچہ زمانۂ سلف کے مشاہیر بلکہ مجاہیل کی بائیوگرافی بھی منفعت سے خالی نہیں لیکن اس میں ہمارے لیے کوئی ایسی صاف اور کھلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کر کے اپنی دشوار گذار منزل طے کرتے چلے جائیں۔

البتہ سر سید کی لائف ہمارے لیے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی کٹھن منزل، جو تنگنائے دنیا میں بظاہر اس کی سب سے آخری منزل ہے آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اُس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دولت

---

[1] تیمور نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ اناج کا دانہ جو اس سے سنبھل نہ سکتا تھا لیکر بار بار دیوار پر چڑھتی تھی اور پھر گر پڑتی تھی اسی طرح ستر یا استی دفعہ چڑھی اور گری آخر ایک دفعہ دیوار کی منڈیر پر جا پہنچی۔ تیمور نے اپنے تزک میں لکھا ہے کہ اس دن سے میں نے کبھی کسی مشکل یا سختی میں ہمت نہیں ہاری ۱۲

عہدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ وہ بتاتی ہے کہ کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزت حاصل کر سکتی ہے اور ایک شائستہ گورنمنٹ میں کیونکر اُس کا رسوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے۔ وہ جس طرح ہم کو آزادیٔ رائے کی تعلیم دیتی ہے اُسی طرح یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہم کیونکر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہم کو خودداری اور سیلف ریسپکٹ کی تاکید کرتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے اور دوسری طرف حکمران قوم کا ادب اور اُس کی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے وہ ہم کو خبردار کرتی ہے کہ قومی تنزل سے قوم کے مذہب کو کیا صدمہ پہنچتا ہے اور اُس کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے اور مذہب کے متہم ہونے سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرون اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کر دیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔ وہ ہم کو سبق دیتی ہے کہ قوم کی حقیقی خیرخواہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ بہت سے کام اُن کی عقل اور عادت اور مرضی کے خلاف نہ کیے جائیں اور اُن کی مخالفت کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے۔ وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص، طمع، خودغرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاؤ۔ وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہیں جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں سے انجام نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے، غیر قوموں کے ساتھ حسن معاشرت سکھاتی ہے، دوستوں کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی، خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔ وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اُس کو کر دکھاؤ۔ وہ بہ آواز بلند کہتی ہے کہ وقت کی قدر کرو، ڈیوٹی کا خیال رکھو، ایک لمحہ بے کار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔

تعجب کی بات ہے کہ ایسی قابل فخر بائیوگرافی جس کا لکھنا مسلمانوں کا نہایت ضروری فرض تھا اُس کے لکھنے کا خیال سب سے پہلے ایک شریف انگلشمین کو آیا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف

ان کی وفات سے تیرہ برس پہلے انگریزی میں لکھ کر شایع کر دی اور اس ضروری کام میں سبقت کرنے کا فخر مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اگرچہ صاحب ممدوح کے ہم دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے باوجود غیر قوم ہونے کے ہمارے واجب التعظیم لیڈر کی ایسی قدر کی اور اُن کی بائیوگرافی کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی لیکن سچ یہ ہے کہ اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لکھنے کا حق ایک آدھ مصنف سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کرنل گریہم کی کتاب پر ایک انگریزی اخبار میں یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "وہ ایک مکمل بائیوگرافی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی"۔ ہم کو پہلے بھی یہی امید تھی اور اب جب کہ سرسید کی وفات نے ایک حیرت انگیز غلغلہ تمام ہندوستان میں ڈال دیا ہے وہ امید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی، متعدد لوگ اُن کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اٹھائیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔

راقم کو سرسید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اُس وقت پیدا ہوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جاتا تھا اور اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سرسید کی دلنشیں تحریریں جیسی کہ اُردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، شایع ہو رہی تھیں۔ اگرچہ سرسید نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک اُن کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے اُن کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔ اگرچہ قوم میں عموماً مخالفت پھیلی ہوئی تھی مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسید کے کاموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میرے دل میں بھی ان کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اُسی وقت سے میں نے کچھ نوٹ اُن کی لائف کے متعلق قلمبند کرنے شروع کیے اور کم و بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بمقام علیگڈھ اس غرض سے بھیجے

کہ اُن کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی، کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علیگڑھ میں جا کر رہوں جہاں اس کام کے لیے قیام کرنا نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہوئی کہ سر سید کی زندگی میں اُن کی لائف لکھنی مناسب نہیں۔ اس کی جو وجوہات اُنھوں نے اُس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں۔ ان اسباب سے آخر کار یہ ارادہ موقوف کر دیا گیا۔

کچھ دنوں بعد سر سید کے نہایت خالص مخلص دوست آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اُردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے۔ چنانچہ اُن کی تحریک سے میرے دوست منشی سراج الدین احمد مالک و مہتمم چودھویں صدی سر سید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ انھوں نے بڑی کوشش سے اُس کے لیے میٹریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اُس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دیدیا۔ کئی برس تک وہ مسودہ رکھا رہا مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

چونکہ کرنل گریہم اور منشی سراج الدین سر سید کی زندگی ہی میں اُن کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھے میرے دل میں پھر ایک ولولہ اٹھا۔ میں نے خیال کیا کہ اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ خدا کے فضل سے ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو سر سید کے کاموں کی دل سے قدر کرتے ہیں، اُن کی خدمات کی داد دیتے ہیں، اُن کی بائیوگرافی کو قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی اُن کی بائیوگرافی لکھے تو اُس پر نکتہ چینی کی اعلیٰ لیاقت رکھتے ہیں مگر اس کا لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں۔ ایسی حالت میں اس ضروری کام کو لیت و لعل میں ڈالنا اور اُس وقت کا انتظار کرنا جو معلوم نہیں کہ اول ہم کو پیش آئے یا سر سید کو، ٹھیک نہیں ہے جس طرح ہو سکے اس کام کو اُن کی زندگی ہی میں پورا کر لینا چاہیے تاکہ جب کبھی موقع آئے اُس کو فوراً شائع کر دیا جائے۔

ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علیگڑھ میں قیام کیا جہاں خود سرسید اور اُن کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا اور اُس کے بعد کئی دفعہ اُسی کام کے لیے وہاں جاکر ٹھیرا۔ میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کا شکر گزار ہوں کہ جس وقت اُن کو میرا ارادہ معلوم ہوا انھوں نے وہ تمام مسودات جو منشی سراج الدین نے مرتب کیے تھے میرے حوالہ کر دیے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں کہ اُن کے مسودات سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

اگرچہ سرسید کی لائف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ستاون سے لیکر اخیر تک جو کچھ اُنھوں نے کیا وہ سب چھاپے کے ذریعے سے مشتہر ہو گیا ہے اور سنہ ستاون سے پہلے کے حالات بھی معتبر ذریعوں سے معلوم ہو گئے ہیں، مگر درحقیقت اُن کی تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دشوار کام ہے۔ اُن کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوست نے بالکل سچ کہا کہ جس قدر سرسید کی زندگی میں اُن کے مخالف یا موافق لکھا گیا ہے اور جس قدر اُن کی وفات پر اطراف ہندوستان میں رنج و ماتم کا اظہار کیا گیا ہے اگر صرف اُسی کو جمع کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص سرسید کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہے اس کو کیسا مشکل کام کرنا ہے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اُس کی شان اور اُس کے درجے کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو۔ مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، جرنلزم، پالٹکس، لٹریچر، پبلک سپیکنگ، انجنیرنگ، آرکیولوجی وغیرہ وغیرہ کس کس بات کو بیان کیا جائے؟ اور کس کس حیثیت پر گفتگو کی جائے؟ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کام کی مشکلات دیکھ کر جی نہیں چھوڑا اور اس عربی مثل کے موافق کہ "مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ" سرسید کی لائف

پوری یا ادھوری جیسی کہ ہم سے بن آئی قوم کے لیے مرتب کر دی ہے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آیندہ مصنفوں کے لیے کم سے کم ایک داغ بیل ضرور ڈالدی ہے جس کی حدود میں وہ ایک وسیع اور عالیشان عمارت آسانی سے تیار کر سکتے ہیں ۔

اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہوتا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے، اس کی خوبیوں کے ساتھ اُس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اُس کے عالی خیالات کے ساتھ اُس کی لغزشیں بھی ظاہر کیجائیں ۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی ۔ لیکن اوّل تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انھیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے ۔ اُن کو سب نے بھلا جانا کیونکہ اُن کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا ۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا ۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما و مفسرین کو ٹوکا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے ۔ ایسے شخص کی لائف چُپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے ۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کیجائے

اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا زعم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لیے ضرور ہے کہ اُن کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اُس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اُسی قدر اُس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ کتاب بہ نظر سہولت دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات اور اُن کے کام ابتدا سے اخیر تک ترتیب وار بقید تاریخ بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں اُن کی تمام لائف اور اُن کے ورکس پر ریویو کیا گیا ہے۔ سرسید کی زندگی کا زیادہ نمایاں حصہ جو غدر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اُس کے متعلق زیادہ تر حالات علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور تصانیف احمدیہ سے لیے گئے ہیں اور بہت سی اطلاعیں سرسید کے دوستوں کی زبانی یا خود سرسید کے خطوط سے جو انھوں نے اپنے دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھے، یا سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں اور بعض مدبران سلطنت کی تحریروں سے جن میں سرسید کا ذکر کیا گیا ہے اور بعض اور معتبر ذریعوں سے جن کی ہر ایک موقع پر تصریح کر دی گئی ہے، حاصل ہوئی ہیں۔

غدر سے پہلے کے حالات کسی قدر اُن کی قدیم تصنیفات سے جو غدر سے پہلے لکھی جا چکی تھیں یا سیرت فریدیہ سے جو حال ہی میں انھوں نے اپنے نانا کے حالات پر لکھی تھی یا اُن کے بعض رشتہ داروں کی زبانی اور زیادہ تر ایک مختصر تذکرہ سے جو مخدومی خان بہادر[1] غلام نبی خاں مرحوم نے ۱۸۴۹ء

[1] خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ غدر سے تین چار برس پہلے رہتک میں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے اور سرسید بھی قائم مقام صدر امین ہو کر گئے تھے۔ وہاں دونوں صاحبوں میں بہت اتحاد ہو گیا تھا اور ایک مدت تک دونوں ایک ہی مکان میں رہے تھے۔ اُس زمانے کے حالات خان بہادر نے قلمبند کر کے راقم کے پاس بھیجے تھے۔ خان بہادر دہلی کے بزرگ ہیں جو غدر کے بعد ایک مدت دراز تک پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور سب آرڈینیٹ جج اور بعد پنشن لینے کے بہاولپور میں مشیر مال رہے۔

میں راقم کی درخواست پر میر نو سے ایک رسالہ کی صورت میں خود لکھوا کر بھیجا تھا اور خاص کر خاندان بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسید مرحوم کی زبانی لکھے گئے۔ اس کے سوا کرنل گریہم کی کتاب اور منشی سراج الدین احمد کے مسودات سے بھی جا بجا مدد لی گئی ہے اور اُن رسالوں اور اخبار پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے جو خاصکر سرسید کی مخالفت کی غرض سے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے اور سرسید کے اخلاق و عادات وغیرہ کے متعلق کچھ اپنی خاص واقفیت سے اور کچھ اُن کے قدیم دوستوں کے بیانات سے اخذ کرکے لکھا گیا ہے۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی لائف اگر اُن کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اس کو حاصل ہونی دشوار تھی۔ مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو اس بات کا افسوس رہ گیا کہ وہ سرسید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اوّل اوّل تو جب کبھی سرسید کے سامنے اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے، اور رکھا ہی کیا ہے؟ مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے، اُن کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخیر بائیوگرافی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لیے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کیے ہوں اور سوائے تکفیر و تضلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اُس سے زیادہ کون شخص اس بات کے دیکھنے کا خواہشمند ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اُس کی مذہبی تصنیفات پر نظر انصاف سے بحث کرے۔ پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آ پہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے اُن کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور اُن کی نظر سے گذران دیتے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ جو دائمی سرور اور روحانی خوشی مرنے کے بعد اُن کو اپنی خالص اور بے ریا خدمات کے صلے میں حاصل ہوئی ہو گی اُس نے دنیا کی ناچیز و حقیر قدر دانیوں سے ان کو ابدالآباد تک مستغنی کر دیا ہو گا۔

اب ہم دیباچہ کو ختم کر کے لائف لکھنی شروع کرتے ہیں اور ناظرین کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ دنیا میں بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی بظاہر اسی طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام آدمیوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اُس میں کوئی کرشمہ ایسا صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے اُن کی آیندہ زندگی کی عظمت کا سراغ لگ سکے لیکن جب اُن کی اعلیٰ قابلیتوں کے جوہر بتدریج اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ جو معمولی باتیں اُن کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی اُن کی آیندہ ترقیات کی بنیاد تھیں۔ پس اس معزز لائف کی وہ عظمت جس کی طرف دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آغاز کتاب میں ڈھونڈھنی نہیں چاہیے بلکہ اُس موقع کا منتظر رہنا چاہیے جہاں سرسید کی ترقی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ جو کچھ اُن سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا وہ اُس کے لیے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

سرسیّد مرحوم کی لائف

پہلا حصّہ

پہلا باب

۱۸۱۷ء / ۱۲۳۲ھ عیسوی سے ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ تک

تاریخ ولادت، خاندان، بچپن، تعلیم اور عنفوانِ شباب

تاریخ ولادت اور خاندان سیّد احمد خاں ۵، ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷، اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے[1]۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سیّد ہیں اُن کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے

---

[1] مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیر نے اپنی وزارت کے زمانے میں تراہہ بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دیوانخانہ، فیلخانہ اور اصطبل وغیرہ متعدد مکانات تھے اس کو سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد نے خرید لیا تھا اور اب تک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے اسی حویلی کے ایک حصہ میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے ۱۲

آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے اور جیسا کہ شجرۂ نسب مندرجہ خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلۂ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہما السلام ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی فاطمہ کو بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوف چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پر آشوب زمانے میں کسی وقت سر سید کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے چلے آئے تھے اور آخر کار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی غالباً اُن کے بزرگ ہندوستان میں پہلے ہی پہل شاہجہاں کے عہد میں آئے ہیں اور اُس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلۂ علیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سر سید سے پانچ پشت اوپر ہیں دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے اُن کو یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان میں واپس نہیں آئے، مگر اُن کے بیٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دلّی میں سکونت اختیار کی۔ سید برہان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی جو کہ سر سید کے دادا تھے اُن کو عزیز الدین عالمگیر ثانی کے سنہ جلوس مطابق ۱۱۶۶ ہجری میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ وسہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور رقباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ رقباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علی خاں بدستور دلّی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سر سید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدۂ احتساب ولشکر و صوبہ شاہجہاں آباد اور ۱۲ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۸۵ھ میں عہدۂ قضائے لشکر عنایت ہوا اور ۱۰ ربیع شعبان سنہ ہجری

کو انھوں نے دنیا سے رحلت کی۔ سر سید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔"

سید ہادی کے بیٹے یعنی سر سید کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ اگرچہ شاہ عالم کے زمانے میں اور اُن کے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں اُن کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اُس کے لوازمات بھی دے سکے اس لیے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اُس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ اُن کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لیے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ ثمن برج سے پیوستہ جو مکان خوابگاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا، میر متقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اُس خاص دربار میں گیا ہوں۔"

میر متقی کے آبائی سلسلہ میں میر قطبی کے سوا، جو مجذوب ہو گئے تھے اور جن کے لوگ بہت معتقد تھے، اور کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اُن کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اُس کے گوشۂ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کہ بعد نادرگردی اور مرہٹہ گردی میں لٹ چکا تھا اور اُس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے اُن میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے شرقی دروازے پر جو مکانات ہیں اُن میں بیٹھتے تھے۔

اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیر اندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے میر متقی کو ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشدزادے اور شریف زادے ان دونوں فنوں میں اُن کے شاگرد تھے۔ خود سر سید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی اُن سے سیکھی تھی۔ سر سید

کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیر اندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے میر متقی ہی کے شاگرد تھے۔

میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سید احمد اُن کی اولاد میں ابتک موجود تھا۔ اُن کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے جن کی خانقاہ دلی میں مشہور ہے، بیعت تھی اور شاہ صاحب اُن پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔ ہر روز بعد حلقہ کے ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا میر متقی کی زنانی ڈیوڑھی پر آتا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیر وعافیت پوچھ کر شاہ صاحب سے جا کر عرض کر دیتا اور جب میر متقی یا اُن کے گھر میں کوئی اور بیمار ہو جاتا تو مرزا غفور بیگ صاحب خورجوی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدانِ خاص میں سے تھے اور خود مرزا مظہر جان جاناں سے اکتساب کر چکے تھے مطلب مرض کے لیے اُن کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار کو صحت نہ ہولی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر متقی کے حال پر تھی اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدتِ مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لیے قبر کھدوانے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی پائنتی میری قبر ہو۔ چنانچہ اُن کے لیے بھی سردابہ تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو ۱۵ رجب ۱۲۴۰ھ ہجری میں واقع ہوا، اُسی سردابہ میں شاہ صاحب کی پائنتی مدفون ہوئے۔

میر متقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فریدالدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم راہ تھی۔ میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی اُن کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو اُنھوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیزالنسا بیگم کی شادی میر متقی سے کر دی۔ اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آ رہے۔

میر متقی نہایت وضعدار اور راست باز آدمی تھے معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی

مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ توہمات متعلق بہ دعویٰ سلطنت تھے۔ اتفاق یہ کہ میر متقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ اُن کے ہاں برابر آتے جاتے تھے مرزا شمس الدین بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا حقہ پینے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے لوگوں کی دراندازی سے ایک بار اُن کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا۔ میر متقی نے ہاتھ باندھ کر کہا کیا حضور کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردد ہوا ہے؟ بادشاہ نے ہنسکر فرمایا نہیں نہیں۔ میر متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر مفت میں کیوں روسیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانے میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں جو بادشاہ کے چاہتے بیٹے تھے، چلے گئے تھے اور اس لیے راجہ سوہن لال جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لیے اُنھوں نے دربار کا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سر سید جایا کرتے تھے جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور تمام سنیا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے سنہری روپہلی چھلّوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات تک بدستور جاری رہیں۔

سر سید کی ننھیال

سر سید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرت فریدیہ میں جو خود سر سید نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد کے حالات میں لکھی ہے مندرج ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سر سید نے سیرت فریدیہ لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی اخذ کر کے لکھتے ہیں۔

سر سید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلّی میں آئے تھے جو کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اُنھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے

ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیروؤں کا پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں۔ وہ خاص کر حقائق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے فصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کیے ایک غرقی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سر سید کہتے تھے کہ "وہ نہایت خوش خلق اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جو اُن کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اُس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو جیلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے۔"

دوسرے سر سید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انھوں نے لکھنؤ جا کر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی۔ خواجہ فرید ریاضی میں مجلی اور رسائل متوسطات جا کر کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے اُن سے ریاضی کی تحصیل کی اور اُس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ ازاں جملہ مولوی

کرامت علی[1]، مولوی رجب علی خاں[2]، خواجہ محمد ناصر جان[3] اور حکیم رستم علی خاں اُن کے مشہور شاگرد ولی ٹن سے تھے۔ خود اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں پوری مہارت رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۵ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرا دلّی جانا ہوا اُس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے اور دلّی میں اُن کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاص کر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔

سرسید کہتے تھے کہ "خواجہ فرید کے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیأت اور آلات رصد کے باب میں تھے جو ایام غدر میں ضائع ہو گئے مگر اُن میں سے تین رسالے خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیراعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے" انھیں میں ایک رسالہ ہے فوائد الافکار فی اعمال الفرجار اُس کے دیباچہ[4] میں انھوں نے ایک

---

[1] یعنی مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلّی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدرآباد چلے گئے تھے ۱۲

[2] یعنی ارسطو جاہ مولوی سید رجب علیخاں جنھوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا ۱۲

[3] یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے ۱۲

[4] سیرت فریدیہ جس میں سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے اس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا ہے چونکہ اس کا مضمون دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اُردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں میری نظر سے گذرا تھا کہ "آلات ریاضی میں سے ایک آلہ تھا جس کو پرکار دوفتا کہتے تھے۔ اُس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ آلہ مفقود ہے اس لیے اُس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا"۔ اس کے سوا میں نے اپنے بعض اساتذہ سے بھی ایسا ہی سنا تھا۔ اُس آلہ کے دیکھنے کا مجھے کمال اشتیاق تھا جس یا جنی وال سے اُس کا ذکر کرتا وہ لاعلمی بیان کرتا تھا اور اکثر یہ کہتے تھے کہ اس معمولی پرکار کے سوا جو دائرہ کھینچنے اور خطوں کے ناپنے میں استعمال ہوتا ہے اور کوئی پرکار نہیں ہے۔ جب ۱۲۲۱ھ میں میرا لکھنؤ جانا ہوا اور وہاں جنرل مارٹین اور مسٹر گورادسلی سے ملاقات ہوئی اُن کے پاس میں نے ایک عجیب آلہ پیتل اور لوہے کا بنا ہوا دیکھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا، انھوں نے کہا یہ پرکار تقسیم ہے، اس سے خطوط و دوائر و سطوح و اجسام مختلفہ کی تقسیم آسانی سے ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا۔ میں نے اُن سے مستعار لے لیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ پرکار دوفتا یہی ہے چونکہ مسٹر گورادسلی نے اُس آلہ سے چاروں عمل مذکورۂ بالا (باقی برصفحہ آئندہ)

واقعہ لکھا ہے جس سے اُن کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو اُن کو فطری مناسبت تھی اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہ کر ریاضی کی تکمیل کے بعد دلی واپس چلے آئے تھے۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اُسی سال آصف الدولہ نے قضا کی اور سعادت علیخاں ان کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مدرسۂ کلکتہ کے لیے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا، ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدیداروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدہ پر بمشاہرہ سات سو روپیہ ماہوار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) میرے سامنے کیے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ دیکھیں اس سے کوئی عمل نجومی بھی استخراج ہوتا ہے یا نہیں آخر جب اُس سے کوئی عمل نہ ہو سکا میں نے سمجھا کہ یہ پرکار متناسبہ نہیں ہے مگر چند روز غور کرنے کے بعد میں نے اصول کے موافق اُس کے بنانے کا طریقہ ذہن نشین کر کے ویسا ہی ایک پرکار چاندی کا تیار کیا۔ مسٹر گور اوسلی نے اُس کو مجھ سے لیکر نواب سعادت علیخاں کی خدمت میں پیش کیا اور نہایت تعجب ظاہر کیا کہ اکثر لوگ اس پرکار کے عمل سے بھی واقف نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ ایسا پرکار خود بنالینا کہ ولایت میں ہر شخص نہیں بنا سکتا۔ سر گور اوسلی نے کہا کہ مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ پرکاروں کے گنج میں ایک آلہ ایسا بھی ہے جس سے یہ پرکار تیار ہوتا ہے۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح تیار ہوتا ہے تم نے بغیر اس آلہ کے یہ پرکار کیونکر بنا لیا۔ چونکہ میں نے کبھی گنج پرکار نہ دیکھا تھا میں نے اُس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سر گور اوسلی نے اپنے بکس میں سے گنج نکال کر وہ آلہ مجھکو دکھایا۔ اُس پر بہت سے خطوط اور ہندسے کندہ تھے۔ میں نے اُن کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے دو تین عمل کر کے دکھلائے اور کہا میں اس سے زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن میں نے بتایا کہ اُس سے بہت سے اعمال ہندسی اور حسابی اور اکثر اعمال نجومی ہو سکتے ہیں۔ مگر میں ملکہ ہندسوں کے سوا کوئی انگریزی نہیں جانتا۔" خواجہ فرید لکھتے ہیں کہ وہ گنج چونکہ نہایت عمدہ اور نفیس تھا گو میرا جی بہت للچایا مگر میں نے اُس کو مستعار مانگنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد میں نے کئی پرکار تقسیم خطوط کے تیار کر کے اور انگریزی ہندسوں کی جگہ فارسی ہندسے کندہ کر کے اپنے دوستوں کو دیے۔ چند روز کے بعد جب میرا کلکتہ جانا ہوا وہاں جا کر میں نے ایک گنج پرکار خریدا جس میں وہ آلہ مطلوب بھی تھا۔ میں نے نہایت کوشش اور فکر و غور سے اُس کے اعمال دریافت کیے اور عمل استخراج ظل اور اکثر اعمال نجومی اور ہندسی نکالے۔ اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ پرکار متناسبہ جو کبھی عرب و عجم میں مروج تھا وہی ہے اور آج یورپ کے سوا کہیں اُس کا رواج نہیں رہا۔ چونکہ اس تحقیقات اور تفتیش میں مسودے بہت سے جمع ہو گئے تھے میں نے ان سب کو مرتب اور صاف کر کے اس رسالہ کی صورت میں جمع کر دیا۔" اس رسالہ کا ترجمہ سر سید نے اُردو میں کر دیا ہے اور اُس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کر دی ہیں۔ یہ ترجمہ بھی اُن کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہے۔ ۱۲

مقرر ہوکر کلکتہ چلے گئے ۔

اس کے بعد مارکوئس اوف ولزلی کو جو اُس زمانہ میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لیے جس کی تفصیل سیرت فریدیہ میں درج ہے ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ ۱۸۰۰ء میں مسٹر لوٹ کا اور اُن کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجنا تجویز ہوا، راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہوکر واپس چلے آئے اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہر ہوتے ہوئے طہران میں پہنچے اور فتح علیشاہ قاچار کے دربار میں حاضر ہوئے اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے، بخوبی انجام دیا۔ اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہوگیا

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقع برما میں ایک پولٹکل معاملے کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے مقرر کرکے بھیجا وہاں سے آنے کے بعد جب کہ ملک بندیلکھنڈ فتح ہوچکا تھا پرگنات اگاسی وغیرہ جو اب ضلع باندہ میں شامل ہیں، مالگزاری وصول کرنے کے لیے عہدۂ تحصیلداری پر مقرر ہوئے ۔ اُس زمانہ میں تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ کل زرمالگزاری میں سے کچھ فیصدی حق التحصیل ملتا تھا جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانۂ حال کے موافق تحصیلدار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدہ سے کنارہ کش ہوکر بارہ تیرہ برس بعد دلّی میں واپس آئے مگر چند روز رہ کر پھر کلکتہ چلے گئے ۔

سنہ ۱۲۳۱ھ ہجری میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو کلکتہ سے بلاکر خلعتِ وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ انھوں نے ایامِ وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرضدار ہوگئے تھے، قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی۔ شاہزادوں اور بیگمات اور عملۂ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فیصدی تنخواہ کم کردی۔ بڑا خاصہ[1]

[1] بڑا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تمام ملازموں، عہدیداروں، خواصوں اور باریداروں کو بادشاہ کی
(باقی برصفحۂ آئندہ)

اور چھوٹا خاصہ جن میں زر کثیر صرف ہوتا تھا اور بعض اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کردیے۔ اس کے سوا دیوان عام کی تلنبے کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری ملمع کے سبب خالص سونے کی سمجھ کر اکھڑوا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اُکھڑی پڑی تھی، اُسکا سونا الگ اور تانبا الگ کرکے جتنا تانبا نکلا اُس کے شاہی ٹکسال میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کردیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا گیا۔ اب آمدنی اور خرچ برابر ہوگیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بماہ ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار اُن کو عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلا کر عہدۂ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام دے کر بہ صلاح جرنیل اختر لُنی کے جو دلّی میں رزیڈنٹ تھے آخر کار استعفا دیدیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلایا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے کہنے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کردیا اور پھر اخیر وقت تک باوجودیکہ قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاوا ہوئی اُنھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۲۴۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ "جا بہ بہشت یافتسم بے کم و کاست" نکلتی ہے۔

دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب با صوفی ملش آدمی تھے۔ ایک زمانے میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہوگئے تھے اور تمکا شاہ جو زُل شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے اُن کے مرید ہوگئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا۔ چھوٹا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو ہر روز تیار ہوکر محل میں بھیجا جاتا تھا اور درباری امیر یا حکیم جو اپنی باری یا کسی اور ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے ان کو محل سے بھیجا جاتا تھا ۱۲

کہ خواہ مخواہ چار ابرو کا صفایا کریں بلکہ دنیادار اور متاہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اس لیے دبیر الدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈاڑھی مونچھ نہیں منڈوائی۔ مگر مرنے سے دو برس پہلے اُن کو یہ خیال ہُوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی کرنی بھی چاہیے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرادیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہُوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی مگر انھوں نے اُس کی کچھ پروا نہیں کی لیکن ایک دفعہ کے سوا پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب انتقال ہُوا تو اُن کی ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہوگئی تھی۔"

دبیر الدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے تھے۔ بڑے وحید الدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خاں جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ یہ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی کُرہ اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا۔ نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل سیرتِ فریدیہ میں مندرج ہے اُن کے ہاتھ کے بنے ہوئے موجود تھے۔ اُن میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ انھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کیے تھے اور اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہوگیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرتِ فریدیہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلّی میں سرسید کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سُنا ہے، چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت اور اُن کے اخلاق و عادات بلکہ اُن کے تمام واقعاتِ زندگی میں بہت بڑا دخل ہے، اس لیے ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سرسید کے والد میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے۔ خصوصاً جب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہوگئے تھے اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ

پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ اُن کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اُن میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدائی کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اُن کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ اُن کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر اُن سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو اُنھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی اُنھوں نے کہا دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی" میں تین دن تک وہاں چھپا رہا تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ اُنھوں نے کہا اگر اُس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

سرسید کی والدہ کی دانشمندی اور دور اندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے سرسید کہتے تھے کہ "جب دبیرالدولہ نے وزارت سے دوسری بار استعفا دیدیا تو کچھ دنوں بعد ماما صاحب

رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے اُن کے پاس بھیجی اور لاہور بُلایا سارا کنبا چاہتا تھا کہ وہ منظور کرلیں مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں اور اُس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اُس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے۔ آپ لاہور کا ارادہ کریں ۔" دبیرالدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سرسید کا بیان ہے کہ "میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا جب اُن کا انتقال ہوگیا سب لوگ گریہ زاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہوگیا۔ انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلّے ہی پر بیٹھی رہیں۔ انہیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا۔ صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو اُن لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سُنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن اُن کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ جب کہ میں خود تمھارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اُس میں سے پانچ فیصدی کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئی جوان لڑکیوں کا اُن کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے

تنگ ہوتیں اُن کی پوشیدہ خبرگیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہوجاتیں اُن کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو بُرا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلے سے اُن کی امداد کرتیں بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرلیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ اُن کے گھر برابر جاتیں اور اُن کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔"

سرسید کہتے تھے کہ "میری تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی شاہ صاحب کے ہاں منت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لیجاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دُعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے۔ یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ انھوں نے خود کوئی منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اُن کو مطلق اعتقاد نہ تھا لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع بھی نہ کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو اُن کو یقین ہوجائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا کیا جاتا تو نہ ہوتا۔" سرسید کا بیان ہے کہ "میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اُس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک مہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس بچے کو دیا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی سید حامد اور سید محمود کو بھی اُن کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل اُن کو کھلا دیتیں۔"

سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہوسکے نہیں پاتا

البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے مگر میں اِن دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی سوا اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کارِ خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جائے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔"

سر سید کا بیان ہے کہ "جب میں دلّی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اُس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔"

سر سید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانشمند تھیں اُس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سر سید کا بیان ہے کہ "مسماۃ زبین ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اُس کی خبرگیری کرتی تھیں۔ جب میں دلّی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زبین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اُس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور اُن سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زبین کو بھی مفید ہوگی لیکن اُس کو کون بنوا کے دے گا، اُنھوں نے خود اُس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زبین کو کھلاتی رہیں۔ زبین کو اُس سے بہت فائدہ ہوا، مگر والدہ بھی بغیر اُس معجون کے استعمال کے اچھی ہوگئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زبین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عنایت کی۔"

سر سید کہتے تھے کہ "میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی

کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔"

سرسید نے ایک شخص کا نام لے کر ذکر کیا کہ "جب میں صدر امین تھا تو اُس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اُس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اُس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُس کو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔" اُن کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انھیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلا لے۔"

سرسید کی بہن صفیۃ النساء بیگم تھی جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں جب کہ سرسید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلّی میں موجود تھے کچھ کم نوّے برس کی عمر میں ہوا، عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور اُن کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور اُن سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ اُن کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اُس کے خلاف تھی۔ اکثر اُن

کے والد کے ملنے والے اُن سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور ڈاڑھی نہ منڈایا کرے ۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہی جو اس کا دل چاہے کر لینے دو کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائیگا آخر ایک مدت کے بعد اُن کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ ڈاڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے یہانتک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بہت کرنے لگے۔

وہ ہنگام ضلع فتحپور میں منصف تھے ۔ ۱۸۴۶ء میں سر سید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے اور سید محمد خاں ہنگام سے دسہرہ کی تعطیل میں دلی آئے ۔ وہاں اُس وقت بخار کی فصل تھی ۔ سید محمد خاں کو بخار آنے لگا تعطیل کے بعد جب سر سید جانے لگے تو رخصت کے وقت اُن کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہی۔ اس کے بعد فی الواقع اُن کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لیے خود جگہ تجویز کی ۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہی تم کیوں اس خیال میں پڑے ہو ۔ مگر اُن کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اُتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا ۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لیے کپڑا منگوایا اور اُس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا ۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا ۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کو جو اُس وقت خانقاہ میں سجادہ نشین تھے بُلایا اور اُن کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا ۔ مفتی صدر الدین خاں نے جو سر سید کو اُن کی تعزیت کا خط بھیجا تھا تو اس میں یہ شعر لکھا تھا۔

"قسمت نگر کہ کُشتۂ شمشیر عشق یافت　　مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند"

سر سید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں ۔ لیکن بائیوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہی، وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات اور خیالات کہاں سے آئے ؟ اور اُن کی بنیاد اُس میں کیونکر پڑی ؟ انسان میں کچھ خصلتیں جبلّی ہوتی ہیں جو آباؤ اجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں اور زیادہ تر

وہ اخلاق وعادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلت سے نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال جس میں اُس نے نشوونما پائی درحقیقت ہیرو کے اخلاق وعادات پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سرسید کا بچپن سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیۃ النسا بیگم اور اُن کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید سے چند مہینے پہلے اُن کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علیخاں تھا۔ سرسید کو اول حاتم علیخاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب اُن کے نانا دوسری بار کلکتہ سے دلّی میں آئے اور اُن کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے"

سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ اُن کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے، نہیں پائی جاتی تھی یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں، سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور وفکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھتے جائیے اُسی قدر اُس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

یہانتک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔اسی لیے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا اُن کا نام احمد رکھا۔سرسید کے دادا اُن کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے اور یہ اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متبنّیٰ کی اولاد کی محبت ایسی دیدی ہے کہ اُس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھکو بے چین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ ماں بی بی نے جو ایک قدیم خیرخواہ خادمہ اُن کے گھرانے کی تھی پالا تھا۔اس لیے اُن کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔اُنکا بیان ہے کہ "مجھے خوب یاد ہے کہ ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھکو پلا رہی تھی جب وہ مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔بہت اچھے مکان میں رہتی ہے،بہت سے نوکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گذرتی ہے۔تم کچھ رنج مت کرو۔مجھکو اُن کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔مدت تک ہر جمعرات کو اُس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔اُس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ایک دن اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔میں نے کہا ہاں بھیجدو۔والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دیدیا۔"

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندش ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ

جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود اُن کے ماموں اُن کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے اُن کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے اُن کو نوکروں اور اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ اُن کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کرسکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور اُن کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اُس کا چوک اور اُس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں۔ ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچولی، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر اُن کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سرسید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہوجاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کردیتا اور جس کی طرف سے چینڈ معلوم ہوتی اُس کو بُرا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چینڈ کرنا بے ایمانی کی بات ہے کبھی چینڈ مت کرو اور جو چینڈ کرے اُس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

اُن کا بیان تھا کہ" باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جُدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی جب کبھی مَیں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔"

سرسید اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ " ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی

کو جو استنجا کر رہا تھا چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلتے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مُکّے سے اُس کے ہاتھ کی انگلی اُتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔"

سر سید لکھتے ہیں کہ "میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دستر خوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز مُنہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوانخانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کا دھبّا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبّا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔"

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے سیر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے، وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ "میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلّی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا

جن میں مرزا افضل اور مرزا فاضل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اُس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا"

تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں وہ کہتے تھے کہ "مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی، یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اُس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علیخاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے"۔ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا"

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے اُن کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اُس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب

اجازت لے لی کہ ابکی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے بھی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس وقت صغیر سن تھا جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھالو۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھالیا۔"

دلی سے سات کوس مظلپور ایک جاٹوں کا گانو ہے وہاں سرسید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر اُن کے والد مظلپور جاتے تو اُن کو بھی اکثر اپنے ساتھ لیجاتے اور ایک ایک ہفتہ گانو میں رہتے۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُس عمر میں گانو میں جاکر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔"

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ اُن کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ "ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اُٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اوّل دربار میں جاکر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہنکر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہنکر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اُٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اُس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ "تمہارا بیٹا ہے؟" انھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد"۔ بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے

تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اُس چبوترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بُلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مُسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا آداب بجالاؤ۔ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔" سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے۔ اُن کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بُلایا تھا تاکہ اضافۂ پنشن بادشاہی کے لیے اُن کو لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے" سرسید نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم سرسید کہتے تھے کہ "مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لاکر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقرأ کی اوّل کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا" سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا۔

"بہ مکتب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی — ز فیضِ نقشبندِ وقت جانِ جانِ جانانی"

سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اُٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے الّا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔"

بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اُن کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی، سرسید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی" قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے گئے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنہوں نے اُن کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما خالق باری آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہو گیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے انھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول ما اَنَا قُلتُ تک پڑھی مگر طالبعلموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں اُن کی ننھیال کے لوگ دلّی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیأت میں شرح چغمینی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقنطر، ہلزون، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار تناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اُسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھے

کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا جب اُنھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دلّی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلّی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

عنفوان شباب | سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گذرا تھا، راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلّی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے خود اُن کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر جو لشکر کھیے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا اُس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلّی میں تھے۔ اُن کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اُس حوض میں زردی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اُس میں ہزاراں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسے میں شریک ہوتا تھا"۔

خود سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بڑے بڑے نامی گوّیے دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلّی میں مشہور بین بجانے والے تھے وہ بھی

تھے۔ گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی بڑے بڑے نامی گوَیے آتے تھے، دھرپت اور خیال گاتے تھے۔ اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرسیّد اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضعدار تھے جمنا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی، اُس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے اُن کی دوستی تھی بلائے جاتے تھے بڑے بڑے گوَیے، بہادر خاں ستارن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا اُن کے ہمراہ گیا ہوں“

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر دیوانی عدالت آگرہ میں موجود تھی اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع اور اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدیداروں کا مجمع تھا۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ ہنسی اور خوشی میں گذارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرسیّد نے بھی اُن جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور اُن میں شریک ہوئے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اُس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی اُن کی طبیعت میں تھی۔ دلّی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اُس کی ماں بھدّی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مُجرے کے لیے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھ کر بولے ”مادرش بسیار تلخ ست“ سرسید نے یہ مصرع پڑھا ”گرچہ تلخ ست

دلیکن برخیرے دارد"

سرسید کا مذکورۂ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا اگرچہ اُس وقت تک دلّی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہوچکا تھا اس لیے اُن کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں بے فکرا میرزادے عیاشی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔ لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، باوجود غایت دلبستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی، سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے حسبِ حال تھا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک زاہد کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اُس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے یہ سنکر فرمایا "کاش کردے وگزشتے"۔ یعنی بہ نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھیرا رہے یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کر کے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی اُس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اُس کی نظیر دی جاتی تھی۔ سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ وہ کیسی ہی عیش و نشاط

کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے"۔ ایسا ہی حال سر سید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اُس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا، ڈاڑھی چھوڑ دی، پائنچے متشرع کر لیے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اُس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے

حور جنت جلوہ بر زاہد کند در راہِ دوست　　　اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سر سید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اُس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہدِ خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے۔ اور اپنی قوم کے غمخوار"۔

مگر سر سید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اُس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملے کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں: "وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اُس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عملدرآمد اس مقولے پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اُسے دیکھ کر نفرت نہ کریں"۔ یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی برائی ہو مگر اُس برائی کا برا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی رستہ برائی سے نکلنے کا ہے"۔

دوسرا باب

۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۵ء تک

ملازمت، تالیف رسائل مذہبی تاریخی وعلمی، خطاب بادشاہی، ترتیب آثار الصنادید، ترتیب تاریخ ضلع بجنور، تصحیح و تکمیل آئین اکبری

ملازمت | ۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا ان کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ قلعہ سے اُن کے والد کو کئی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ اُن کے والد اور راجہ سوہن لال میں ان بن تھی اور اُن کی زندگی ہی میں اُن کی تنخواہ میں کاٹ چھانٹ ہونے لگی تھی اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدر قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں اور چند ملکیں جو معافی کی تھیں وہ بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں۔ اس لیے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ہرچند اُن کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق کرنے پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا ایک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ اُن کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اُس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا۔ چند مہینے اُن کو کام سیکھتے گذرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ نے اُن کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گذرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں جج ہو کر آئے۔ سرسید

کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی انھوں
نے اُن کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے اُس کام کو مشکل جان کر انکار
کیا۔ ہرچند صاحب جج نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہم تم سے بہت سہولت
کام لیں گے اور ہر ایک بات بتاتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت
نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرض کہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے رہے۔ اتفاق
سے انھیں دنوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چٹھی کے ذریعہ
سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے
نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بُلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری
کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اُس وقت کمشنری آگرہ
کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام
کمشنری میں تھا۔ سرسید نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا
مرتب کیا گیا۔

انھیں دنوں میں انھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی تھی
جس کا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقران سے
لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر
سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار
کیا کہ وہ عہدۂ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو صاحب کمشنر نے اس کو
گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اُس پر
یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سید احمد خاں کو اُس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے

دیا یا تھا کہ عہدۂ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہوگئے صاحب کمشنر نے اُن کو امتحان دینے کی ہدایت کی۔ اُنھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علیخاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ سید محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اس لیے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے مگر سرسید اور حاتم علیخاں نے پہلی ہی بار امتحان دیکر ڈپلوما حاصل کرلیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی اُس میں شامل کرکے اُس کا نام انتخاب الاخوین رکھا جس کو اُس زمانے کے بعض ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخوین کہتے تھے۔ خان بہادر منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحوم کہتے تھے کہ "یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہوگیا۔ لوگوں کو اُس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف ہوگئے" ۱۸۸۴ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی اُس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوگئے۔ مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو مین پوری سے تبدیل ہوکر فتحپور سیکری میں آگئے یہ آگرہ کے قریب ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ جلال الدین کے مرشد شاہ سلیم چشتی اسی شہر میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے مدت تک یہ شہر اکبر کا دارالسلطنت رہا ہے اور یہاں کی قدیم شاہی عمارتیں ابتک اُس زمانے کی یادگار ہیں۔ سرسید اس شہر میں چار برس تک منصف رہے فتحپور میں جہاں اکبر کی خوابگاہ تھی حسن اتفاق سے وہی عالیشان مکان سرسید کو رہنے کے لیے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اُسی مکان میں گذرے۔

رسائل مذہبی وغیرہ | اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں (۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۸ھ۔ یہ مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت، وفات ہجرت

اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے اُن میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سر سید نے اس رسالہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں[1] پر اکتفا کیا تھا۔ (۲) تحفۂ حسن مؤلفہ سنہ ۱۲۶۰ھ یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کا۔ باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں مع اُن کے جوابات کے مذکور ہیں اور باب دوازدہم میں تولّا اور تبرّا کا بیان ہے۔ (۳) تسہیل فی جرّ ثقیل مطبوعہ ۱۸۴۴ء۔ یہ اردو ترجمہ ہے بوعلی نام ایک عالم کے ترجمۂ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابوذر مینی کے عربی رسالہ سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جرّ ثقیل کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے سخت چیزوں کے چیرنے اور جن چیزوں کا دبانا یا نچوڑنا دشوار ہو اُن کے دبانے یا نچوڑنے کے لیے پانچ کلیں بتائی ہیں اور اُن کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

خطابِ بادشاہی | اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سر سید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز کے لیے بتقریب رخصت بہ تعطیل دلی آئے تھے۔ اُس زمانہ میں حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے ہاں نیابت کا کام کرتے تھے انھوں نے بادشاہ سے سر سید کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہیے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا۔ اگرچہ سر سید کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا مگر بادشاہ نے اُس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب سر سید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۵ فروری ۱۸۴۶ء کو سر سید فتحپور سیکری سے دلی تبدیل ہو گئے۔ اُنھیں دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا اور اُن کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت

---

[1] اس ترجمہ کے سوا کبھی سر سید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر اعتراض کرنا یا اُن کے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو۔

گذرا تھا۔ اس لیے انھوں نے خود درخواست کرکے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدرامین مقرر نہیں ہوئے دلّی ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدرامین مقرر ہوکر رہتک جانے کا اتفاق ہُوا جس وقت وہ فتحپور سے بدلکر دلی میں آئے تھے اُس وقت اُن کی عمر اُنتیس برس کی تھی۔

یہاں آکر اُن کو یہ خیال ہُوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیا ہوگئی تھیں اُن کو از سرِ نو غور اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلّی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، و شرح وقایہ، اور اصول فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعۂ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مُسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے اُستاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید اُسی زمانے میں جب کہ وہ دلّی میں منصف تھے اُن کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہُوا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دیدیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینا اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دیدیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات اُن کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھالیتا تھا۔" اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو تحمّل سے مکتفی ہوتی تھی۔ اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہوچکا تھا جس سے سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہوگئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئی تھی۔ کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف ستر کی تنخواہ کے سو روپے ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ

اور کشادہ دل تھے، خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا، اُس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عماراتِ دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کرکے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا، مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی شہر کے باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ سیکڑوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہوگئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہوسکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہوگئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے اُن سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اُس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے اُن کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول و ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورتِ حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہٖ اُس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا فی الحقیقۃ نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر

کہتے کا چربا اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا ؛ سر سید کی آیندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور اُن کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

وَيَصْعَدُ حَتّى يَظُنَّ الْوَرىٰ   بِأَنَّ لَهٗ حَاجَةً فِي السَّمَاءِ

(یعنی وہ اپنے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اُس کو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپکر تیار ہو گیا۔ اس اڈیشن میں چار باب تھے پہلا باب عمارات بیرون شہر کے بیان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اُس کی عمارتوں کے بیان میں تیسرا باب خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سر سید سے کچھ پہلے یا اُن کے زمانہ میں موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اُس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور اُس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں تیسرے باب میں تقریباً . ، حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں، اور کنووں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اوّل کسی قدر اُن شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمت ۴۰۰ بکرمی سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اُس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اُردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیر اہلِ دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایک سو بیس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصوّر، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات باردہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اُس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگذاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اول کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل

سرد ہوجاتا ہو۔ اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھگڑا آنکھوں کے رو برو آجاتا ہو اور تعجب ہوتا ہو کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہل علم اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہو۔

الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپکر شایع ہوا۔ اُسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جاکر اُس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اُس کو بہت پسند کیا اور کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہوجائے تو بہت بہتر ہی۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اُس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں اُن کی درستی اور اصلاح کیجائے۔ چنانچہ اُنھوں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اُس کو از سر نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ اُنھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہی اُس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچہ میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے اڈیشن میں یہ ہی کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت سادگی ہی اور اُس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارده سے بالکل پاک ہی۔ اس اڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔ مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور وہ سب نقشے تلف ہوگئے۔ کچھ نقشے جو اب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہی۔ اس ترمیم و اصلاح کے باعث دراصل مسٹر اڈورڈ طامس ہوئے تھے جو اُس وقت دلی میں سشن جج تھے اُن کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا انھیں کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو از سر نو مرتب کیا تھا۔

یہ اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپکر تیار ہوگیا تھا مگر نہ اس اڈیشن سے اور نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا، کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہوگئے۔

اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اُس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا سراسر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلّی سے تبدیلی ہو گئی پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اُس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں لیکن فرانس کے مشہور او رفاضل مسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اُس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں اول مسٹر رین ہولڈ راسٹ سکرٹری سوسائٹی موصوف کی چٹھی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۴ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہنچی کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور باتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں" اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

لندن ۴ جولائی ۱۸۶۴ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہز موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا جس کی سند میں یہ ڈپلوما اُن کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط ایڈورڈ کول بروک پریسیڈنٹ۔

دستخط ایچ۔ ولسن ڈائرکٹر۔

دستخط رین ہولڈ راسٹ سکرٹری

رسائل مذہبی وغیرہ | اسی زمانے میں جبکہ وہ دلّی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ اُنہوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مترجمہ ۱۸۴۶ء یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ نے پرکار متناسبہ

کے اعمال پر (جو اُنھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے) فارسی میں قلمبند کیے تھے۔ یہ مسودات سرسید کے ہاتھ آ گئے تھے۔ انھوں نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اُس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔ (۲) قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین مورخہ ۱۸۴۸ء۔ اس رسالہ میں قدیم خیالات کے موافق سرسید نے زمین کی حرکت کو جس کا آجکل یورپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب مدت سے حرکتِ زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کو یقینی جانتے تھے (۳) کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے (۴) راہِ سنت در ردِ بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء۔ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانہ میں اہلِ بدعت کے برخلاف متبعینِ سنت کی تائید میں لکھا ہے۔ (۵) نمیقہ در بیانِ مسئلہ تصورِ شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصورِ شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبتِ خدا و محبتِ رسول و انجذابِ رحمتِ الٰہی بتایا ہے۔ (۵) سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے۔ اُس میں راجہ یُدھشٹر سے لیکر ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند تک ۲۰۲ فرمانرواؤں کا نام، باپ کا نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور یہ کہ اُس کا عہد کس زمانے میں تھا نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی فہرست ہے جو آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے۔ اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علیحدہ چھاپ کر اُس کا نام سلسلۃ الملوک رکھ دیا ہے (۷) آغازِ کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ء۔ بس اس کے سوا دلی کی منصفی کے زمانہ میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

دلی سے بجنور کو تبدیل ہونا | سرسید دلی میں جب کہ آثار الصنادید کو ترتیب دے رہے تھے، درجۂ اوّل کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلی میں ہر قسم کے اہلِ کمال اور اہلِ علم موجود تھے اور مسلمانوں کی سوسائٹی ہر کسی قدر

جان باقی تھی اور کچھ عمارتوں کی تحقیقات کے ذوق و شوق میں، وہ دلی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدر امین مقرر کرکے کہیں باہر بھیجنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ رہتک میں جو وہ قائم مقام صدر امین ہو کر گئے اُس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لیے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ آثار الصنادید کا دوسرا اڈیشن بھی نکال چکے تھے، اتفاق سے مسٹر اڈورڈ طامس جو دلی میں جج رہ چکے تھے اور جن کے ایماسے آثار الصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی، کہیں سے آگرہ میں وارد ہوئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو بورڈ میں چلے گئے۔ اُس وقت بجنور کی صدر امینی خالی تھی اور صدر امینی کے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے، اس لیے اُن کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عمارات دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے سو وہ کام ختم ہو گیا ہے، اب اُن کو دلی سے باہر جانے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اور ایک چٹھی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز انکار نہ کرنا۔ اس لیے سرسید کو لاچار دلی چھوڑنی پڑی چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس اُن کو گذرے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت سخت محنت کے کیے جو ذکر کے قابل ہیں۔ ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا، دوسرے آئین اکبری کی تصحیح اور تکمیل۔

ضلع بجنور کی تاریخ | جس زمانے میں سرسید بجنور کو تبدیل ہو کر گئے انھیں دنوں میں ایک سرکلر محکمہ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اُس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس پر کچھ عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسید سے اُس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا میں ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر بہت خوش ہوئے اور محکمۂ بندوبست میں حکم بھیج دیا

کہ جس پرگنہ یا گانو کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً اُن کے پاس بھیج دیے جائیں اور اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ جس قانون گو یا پٹواری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں اُن کے حکم کی تعمیل کیجائے۔ سرسید نے یہ تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ اُن کا بیان ہے کہ "گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانونگویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔" اُن سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اُس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اُس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیجدیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شکسپیر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵ر جون ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں اُن باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو اُن کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکار آمد ہوتی۔ مگر غالب ہے کہ آگرہ میں باعث غدر کے تلف ہو گئی ہوگی۔"

اسی تاریخ میں سرسید نے ایک لمبی بحث سنہ فصلی کے متعلق لکھی تھی اور جو غلطی سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اُس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اُس غلطی سے لازم آتی تھیں اُن کو جتایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ نے سرسید کی اُسی تحریر پر لحاظ کر کے اس غلطی کی اصلاح کی کیونکہ وہ تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر ۱۸۵۴ء میں اور دوسرا ۱۸۶۱ء میں بمنظوری گورنمنٹ جاری ہوا جن کی رو سے علاوہ سنہ فصلی اور سنہ حسابی کے ایک اور سنہ سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنہ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جتائی تھیں۔ کچھ تعجب نہیں ہے

کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا ہو اور غدر کے دو تین برس بعد اُسی بنا پر سنہ مالی مقرر کیا گیا ہو۔ سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں دیا تھا جو ۲ر جون ۱۸۶۶ء کے اخبار میں درج ہے۔ اس لکچر میں انھوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے تھے۔

آئینِ اکبری کی تصحیح جب سرسید دلی میں منصف تھے تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دلی کے ایک مشہور تاجر تھے اُن سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئینِ اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اُس کو چھپوا دوں اور اُس کے معاوضہ میں آئینِ اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپئے کے آپ کی نذر کروں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں دہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں اُن کا جی بہت لگتا تھا بجنور پہنچکر اُنھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئینِ اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں، فارسی لٹریچر میں کبھی اُس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے اس لیے اُس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا پھر آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اُس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں اُن کی جا بجا تشریح کی۔ اُس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے

اُن کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے سمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی اُس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے اُن کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اُس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سکے ابوالفضل نے بیان کیے تھے اُن میں سے ہر ایک سکے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جو عبارت یا الفاظ کندہ تھے اُن کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانہ کے آٹھ سکے سونے اور چاندی کے اُن کے علاوہ اور نشان دیے۔ اس کے سوا اور بہت سی باتیں مفید اضافہ کیں۔

پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سرسید نے نہایت محنت و جانفشانی اور حسنِ اہتمام سے بے شمار تصویریں دلّی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقعے کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جُدا جُدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازوئے ہوائی و ترازوئے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہِ بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اُس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامان توزک و احتشام کی تصویریں، فیلخانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کُشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر ایک درخت کے ساتھ اُس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں، اوراق گنجفۂ قدیم اور گنجفۂ مخترعۂ اکبر کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں کی تصویریں اور اُن کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ چنانچہ مسٹر ایچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے جو ۱۸۷۳ء میں

آئین کا از سرِ نو ترجمہ کرکے چھاپا ہے اس میں انھیں تصویروں کی نقل لی ہے جو سرسید نے فارسی آئین اکبری میں نقل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کرکے مطبع میں چھپنے کو بھیجدی گئیں مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابو الفضل نے آئین خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اُس کی تصحیح کا نہ تھا۔ اتفاق سے دلی میں سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب نکل آئی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر درج تھا۔ اُس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کرکے دوسری جلد بھی تکمیل کی گئی اور ایک لمبا دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کرکے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہوگیا اور اُس کے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہوگئے۔ اب اُس آئین اکبری کی جو سرسید نے صحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری دو جلدیں مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ہجری کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انھوں نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیات غالب میں موجود ہے مگر آئین اکبری میں سرسید نے اُس کو قصداً نہیں چھپایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابو الفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اُس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کیجائے چنانچہ کہتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب   یافت از اقبالِ سید فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی   کہنگی پوشید تشریفِ نوی
ویں کہ در تصحیحِ آئیں رائے اوست   ننگ و عارِ ہمتِ والائے اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع ہیں نہ کہ اکبر اور ابو الفضل کے۔ اور تمثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کیے

ہیں جب یہ تقریظ مرزا نے سرسید کو بھیجی انھوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیجدیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار[1] نہیں۔ ایک عربی تقریظ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کی بھی ہے مگر وہ بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب چھپنے نہیں پائی۔ انھوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں بھی آئین اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں ۱۷۸۶ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اُس وقت سے ۱۸۷۳ء تک اس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فرنچ اور انگلش میں ہو چکے ہیں۔ مسٹر ایچ بلاک مین جنہوں نے ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اُس کا ترجمہ کرکے شائع کیا تھا اُس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ یہ فی الواقع اُس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشجات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لیے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں نقشوں اور گزیٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

---

[1] سرسید کہتے تھے کہ جب میں مرادآباد میں تھا اُس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علیخاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مرادآباد میں سرائے میں آکر ٹھیرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا۔ ظاہراً سبب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا اُن سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مرادآباد میں آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب وہ سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اُس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھدیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھاکر اسباب کی کوٹھری میں رکھدیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھدیا ہے مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے انھوں نے کوٹھری میں لیجاکر بوتل دکھا دی آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھاکر دیکھی اور مسکراکر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے سچ بتاؤ کس نے پی ہے شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی حافظ نے سچ کہا ہے۔

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر میکنند　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

سرسید کہتے تھے کہ اس طرح وہ کدورت جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہوگئی مرزا دو ایک دن وہاں ٹھیر کر دلّی چلے آئے۔

پس سرسید کا ایک ایسی نادر الوجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش بلیغ کر کے اُس کو از سرِ نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی الحقیقت پبلک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنّف اور نامور بادشاہ کے کارنامہ کو دنیا کے سامنے ایک دلنشیں صورت میں پیش کرنا تھا۔

غدر سے پہلے صرف سوا دو برس سرسید کا بجنور میں رہنا ہوا اسی قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ وہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مفید کام کرتے رہے۔ چونکہ اُن کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا اس لیے صاحب کلکٹر نے کمیٹی رفاہ عام کا تمام کام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اُس کی رپوٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لیے روپیہ منگواتے تھے اور ہر ایک کام کی خود نگرانی کرتے تھے منجملہ اور کاموں کے ایک مفید کام اُنھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متصل شارع عام کے بیچوں بیچ مدت سے ایک نہایت چوڑا چکلا گڑھا پڑا ہوا تھا، اسی رستے سے تمام گاڑیاں، گھوڑے، پیدل اور سوار گذرتے تھے۔ بعض اوقات گاڑیاں اُلٹ جاتی تھیں، بیلوں کو نقصان پہنچتے تھے، برسات میں پانی بھر جاتا تھا جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو ہوتی تھیں؛ مدت سے یہ گڑھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ سرسید نے خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پُل بندھوایا اور بجنور سے دارانگر تک ایک سڑک بنوا دی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہوگئی۔

تیسرا باب

۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۸ء تک

ایام غدر کی خدمات اور واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ سرکشی بجنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر اور چھپوا کر ولایت بھیجنا، ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ، ایک میگزین موسوم بہ لائل محمڈنز آف انڈیا" اُردو اور انگریزی میں نکالنا، تحقیق لفظ نصاریٰ پر ایک مختصر رسالہ لکھنا، انتظام قحط ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی، تفسیر توریت و انجیل، بی بی کا انتقال، غازیپور کی تبدیلی، غازیپور ہی میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا، غازیپور میں مدرسہ قائم کرنا، علیگڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر کرانا، سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علیگڑھ سے نکلنا، ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک، بنارس کی تبدیلی، اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت، رسالہ طعام اہل کتاب، رسالہ علاج ہیضہ بموجب اصول ہومیوپیتھک۔

ایام غدر کا بیان | جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے نام پر ایک سیاہ دھبا چھوڑا ہے اور جو ہندوستان کی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا، وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا پڑا۔ اُن کو اس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گذرے تھے کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دلّی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی۔ وہاں اُس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے اُن بیس جانوں کے بچانے میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کی جائے۔ جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت دردانگیز ہیں اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل دوبارہ لکھنی گویا اُن مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے ع مَصَائِبُ اُخْرٰی ذِکْرُ تِلْكَ الْمَصَائِبِ۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اُس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یورپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں اُن کے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے خیرخواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے اُن کے دل بڑھائے اور جن کی نیتوں میں تزلزل اور تذبذب پایا اُن کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا اُن کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور جیسا کہ اُس زمانے کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور جیسا کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے صرف سرسید ہی کی حسنِ تدبیر، دانائی، اور نیک دلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رڑکی میں پہنچ گئے۔

مسٹر شکسپیر جو اُس زمانے میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے، گو کہ سرسید کو باعتبار عہدے کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیر اور مسز شکسپیر سے اُن کی بہت راہ و رسم تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شکسپیر بہت گھبرائیں سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر اُن کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہو اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں" مسز شکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکرگذار رہے۔

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔ وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچوں کی ڈھارس بندھواتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی۔ پلٹن نمبر ۲۹ کی تلنگوں کی ایک کمپنی سہارنپور سے بطور بدلی کے مرادآباد کو جاتی تھی جب وہ بجنور میں پہنچی تو صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے۔ سرسید سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبہ دار بہ ارادۂ فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں۔ وہ اسی وقت مسلح ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے۔

اور اپنے صغیر سن بھتیجے[1] کو جو تنہا چچا کے پاس تھا، چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجیو۔ مگر کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی مذکور بھی پر مراد آباد جاتی تھی۔

وہ رات جبکہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر اُن کی حفاظت کے لیے فراہم ہوئی تھی اُن کی نیتیں بگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا اُن کی کمک کے لیے مراد آباد سے عنقریب آنے والا تھا، نہایت سخت تھی۔ اُس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سر سید تنہا اُس خود سر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو اُن کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بہتر یہ ہے کہ اُن کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ۔ ایسے ٹیڑھے وقت میں سر سید کے ہوش و حواس بالکل بجا اور درست رہے اور محمود خاں سے ایسی عمدہ گفتگو کی اور اس معاملہ کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اُس نے فوراً منظور کر لیا اور سب انگریزوں کو اُسی رات اُس خونخوار مجمع سے نکال کر رڑکی روانہ کر دیا۔ اس موقع پر کلکٹر کی طرف سے جو تحریر سر سید نے لکھ کر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اُس کے موافق عملدرآمد کرتا تو اُس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا بلکہ انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد ضرور اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اور خیر خواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اُس پر کچھ لحاظ نہ کیا۔

انگریزوں کے رڑکی روانہ ہو جانے کے بعد سر سید اور اُن کے دوست میر تراب علی جو اُس زمانے میں بجنور میں تحصیلدار تھے اُسی رات کوسی کوٹلہ جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے مگر نواب نے سوار بھیجکر اُن کو وہاں سے بلایا۔ مجبوراً اُن کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا اور ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے آپہنچے۔ نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ جب مجھ سے ملنے آئیں

---

[1] یعنی سید محمد احمد خاں سب جج سیتاپور حال پنشنر ۱۲

تو نذریں پیش کریں۔ مگر انھوں نے نذریں پیش نہیں کیں۔ نواب نے مکدر ہوکر اُن کو رخصت کر دیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرو۔ سرسید نے دیوانی کا کام اسی طرح جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا جو روبکاریاں اور رپورٹیں صاحب جج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں اُن کی نسبت علی الاعلان کچہری میں یہ حکم تحریر کرتے رہے کہ بحضور صاحب جج بہادر بھیجی جائیں مطلب اس سے یہ تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکار انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے مگر محمود خاں کو یہ امر ناگوار گذرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر ایک روز رات کے وقت سرسید کو بلایا۔ اس وقت نواب اور اُس کا بھانجا جو اُس کے مزاج پر بہت حاوی تھا دونوں موجود تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور ہم سے اس بات پر حلف کرلو۔ جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسل ہم سے ٹھیرالو اور ہم سے حلف لے لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے۔ سرسید کو اول تو جواب دینے میں تامل ہوا۔ مگر آخر کار اُن سے صاف کہدیا کہ" میں اس بات پر بلاشبہ حلف کرسکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں" سرسید نے قسم یاد کرکے نواب سے کہا کہ" میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادہ کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عملداری نہ کرسکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہ سرکار بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی نہایت قدر کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب کلکٹر سے اجازت منگا لیجیے اور یہ اقرار کرلیجیے کہ کوئی کام جب تک کہ اُس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگالیں ہرگز نہ کریں گے" مگر نواب نے اُس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ وہ ناراض ہوا اور چیں بہ جبیں ہوکر سرسید کو رخصت کیا اور ہر طرح اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی بُرائی کے درپے ہوگیا جس مکان میں

سرسید پہنے تھے اس کو بہ جبر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ جو اسباب سرسید کا اس میں بند تھا وہ سب فوج کے افسروں نے لے لیا۔ اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ جبر چھین لیا۔

انھیں دنوں میں ایک شخص منیر خاں نامی مع جمعیت چار سو آدمی کے نگینے سے بجنور میں آیا اور سرسید، میر تراب علی، ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہوا اُن کو بہ جبر و تحکم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہوگے تو بہتر نہ ہوگا۔ سرسید اور میر تراب علی اُس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے سرسید سے مسئلۂ جہاد کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے اُس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اُس نے اُن کو تو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس خود جاکر یہی مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بڑی دلیری سے اُس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اُس کو قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے۔ اُس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوتے بچے۔ دوسرے دن منیر خاں وہاں سے دلی چلا گیا اور وہاں جاکر لڑائی میں مارا گیا۔

سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا اسی عرصہ میں ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سرسید نے اُس کی مفصل کیفیت اسپیشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی وہاں سے حکم آگیا کہ تم سرکار کی طرف سے ضلع کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر تراب علی کو اپنے ساتھ شریک کرلو۔ انھوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا انتظام رکھا۔ مگر باوجود سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری نے نگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لیے۔ اب نواب محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیت کثیر جمع ہوگئی۔ نواب نے بجنور پر حملہ کیا اور چودھری شکست کھا کر بھاگے۔ چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے خدشہ تھا وہ بھی ہلدور چلے گئے مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودھریوں کو شکست دے کر ہلدور کے بہت سے مکانات جلا دیے۔ سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادہ سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں موضع پلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسلح اُن کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادے سے دوڑے مگر

بخشی نامی ایک پٹھان نے اُن کو بچایا۔ جب وہاں سے چاندپور پہنچے تو کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے اُن کو گھیر لیا۔ یہانتک کہ میر صادق علیخاں رئیس چاندپور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں کو اُس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے۔ دوسرے روز میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع مجولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے میرٹھ پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو اُن کے دوست تھے مقام کیا اور اپنی مفصّل سرگذشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ میں پہنچے ہیں اُن کے پاس چھ پیسے اور اُس پھٹے ہوئے کُرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں اُن کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سُن کر مسٹر کری کرافٹ ولسن جو کہ وہاں جج اور اسپیشل کمشنر تھے اُن کے دیکھنے کو آئے اور سرسید سے کہا کہ "تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، مگر جب تم کو اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمھاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور سرکار کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے زمیندار تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا بلکہ خود درخواست کی کہ تمھیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیرخواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمھاری ایک تصویر بنا کر پشتہا پشت کی یادگاری اور تمھاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔"

کچھ اُوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ میں ٹھہرنا پڑا۔ میرٹھ میں اُن کو معلوم ہوا کہ دلّی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے اُن کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔ جب دلّی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چل دیے تھے اور سرسید

کا کنبا بھی جب کہ اُن کے ماموں وحید الدین خاں اور اُن کے ماموں زاد بھائی ہاشم علیخاں سپاہیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ سلطان نظام الدین چلا گیا تھا مگر اُن کی والدہ اور خالہ دلّی ہی میں رہیں۔ لیکن جب اُن کا گھر سارا لُٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر جلوخانہ کی ایک کوٹھڑی میں جہاں زیبن نامی ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اُس کوٹھڑی میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی سرسید کہتے تھے کہ جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انھوں نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گذرے گی گذر جائیگی" میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلّی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب اُن کی خاطر جمع ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش کو نکلا۔ کنووں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جا سکے اور چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا میں سیدھا پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صُراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زیبن بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اُٹھا نہ گیا۔ میں نے اُس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صُراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارا کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں اُن کے لیے پانی لیجاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پانی پی کر لیٹ گئی۔ میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لیجاؤں

باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ زمین مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے وہ ان کو ملجائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔ میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن کے رہنے کو ایک مکان خالی کردیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہوگیا تھا کوئی دوا یا غذا پچتی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہکر یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُن کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب اُن کے پاس میرٹھ میں جمع ہوگئے تھے۔ اس لیے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔"

الغرض ۱۲ر فروری ۱۸۵۸ء کو سکرٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شکسپیئر کے نام پہنچی کہ تمام عملہ ضلع بجنور رڑکی کو روانہ ہو جاؤ اور رڑکی میں انتظام روہیلکھنڈ کے لیے فوج کے کام باندھنے کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ مسٹر شکسپیئر اس فوج کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسان ضلع بجنور سب اُن کے ہمراہ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوئی تھیں کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کیے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آگیا تھا، اس لیے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لیے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رڑکی میں پہنچ لی اور روہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ ضلع بجنو، میں جو کہ روہیلکھنڈ کا سب سے پہلا ضلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانے والی ہے کون لوگ باغی تصور کیے جائیں؟ مسلمانوں کی نسبت اُس وقت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسران فوج کا اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیرخواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور اُن میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے وہ چاہتے

تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے اُن حملوں میں شریک تھے جو انھوں نے ہندو رئیسوں پر کیے وہ سب باغی قرار دیے جائیں۔ اگر اُس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔ سر سید نے مسٹر شکسپیئر اور بعض افسرانِ فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ "سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہییں جو آتے سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے اُن کی نسبت جو کچھ ہو سو ہو مگر اُن کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بر وقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔" اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں وہی باغی قرار دیے جائیں لیکن بدنصیبی سے آم سوت، نجیب آباد اور نگینے پر احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیف خفیف مقابلے کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلم کھلا بے وفائی کر چکے تھے سر سید نے اُن کی حمایت ہرگز نہیں کی لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے مجرم ٹھیر گئے تھے، یا جنھوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ کسی گروہ کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے، یا جن لوگوں نے سر سید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی، جہاں تک ممکن ہوا اُن کی بریت میں کوشش کی اور اُن کی صفائی کرائی۔ ایک تحریر[1] میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی

---

[1] آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں نے ۱۸۹۸ء میں سر سید کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک خط نواب محسن الملک کے نام حیدرآباد بھیجا تھا۔ اُس زمانے میں محسن الملک بیمار تھے انھوں نے شمس العلما مولوی نذیر احمد سے اس کا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو علیگڑھ گزٹ میں چھپا تھا۔ اس تحریر میں سر سید کی نسبت دونوں کے خیالات مندرج ہیں ۱۲

اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اُس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

"سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور روہیلں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگار غدر ہیں۔ اس عموم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کر دیا ہو۔ تسلط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر یہ معاملہ فہم منصف مزاج، نرم دل، نیک طینت آدمی اُس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں۔ مخالفت اور حمایت میں، حملہ اور حفاظت میں۔ اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب[1] و تبعات غدر سے محفوظ رہا۔"

سر سید کی رائے جو اُس وقت عام رعایائے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور جس پر حکام ضلع کو پورا بھروسا تھا وہ تاریخ سرکشی بجنور میں انھوں نے صاف صاف لکھدی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ حال تھا کہ اُن لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے۔ سب کے خیال میں چودھریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار بیچ میں سے علیحدہ تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان لڑائیوں میں شریک تھے وہ اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے سرکار انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی"۔ سر سید ہی کی رائے کا نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

---

[1] عواقب و تبعات غدر سے وہ بدنتائج مراد ہیں جو اکثر اضلاع ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد باشندگان اضلاع کو بھگتنے پڑے کیونکہ بجنور میں سوا اُن لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا سرکاری فوج کے مقابلے میں مارے گئے، فتح کے بعد فوراً بہت کم بے جرم تہ تیغ یا سزایاب ہوئے۔ پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا۔"

خدمات غدر کا صلہ

جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا وہ اس بات کو بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں اُن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا مگر گورنمنٹ نے خود اُن کی خدمات کی قدر کی اور اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولٹکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔

میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاندپور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ اُن کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا اور جس طرح کہ دیگر خیرخواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں مسٹر شکسپیر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ، چاندپور کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہیے۔ مگر جب انھوں نے سرسید سے اس بات میں امتزاج لیا تو انھوں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مسٹر شکسپیر نے اس قاعدہ کے موافق کہ کسی کو اُس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی تھی، سرسید سے کہا کہ نقد پنشن بہت قلیل مقرر ہوگی اُنھوں نے کہا جو کچھ سرکار عنایت کرے اُس کا احسان ہے۔ مگر مجھ کو یہ جائداد لینی ہرگز منظور نہیں۔

اس واقعہ کو اُسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی اس طرح بیان کیا ہے کہ "سید احمد خاں کو حسنِ خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اُس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لکچر میں جو ۲۰ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں مدرسۃ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا، اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ غدر

میں جو حال انگریزوں اور اُن کے بچّوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھکو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اُس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دُنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپیگی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اُس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

مرادآباد کی تبدیلی | اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدر الصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مرادآباد گئے اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائداد مضبطہ کے متعلق عذرداریاں ہونے لگیں اور اُن کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بیٹھا، اُس میں دو یورپین

---

[1] غدر کے بعد سرسید کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا کہ پنشن لے کر مصر میں جا کر سکونت اختیار کریں ۱۲

ممبر ایک کمشنر روہیلکھنڈ، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سرسید مقرر ہوئے چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت دانائی کی تھی کہ اکثر اضلاع میں ضبط جائداد کی تحقیقات کے لیے جو اسپیشل کمیشن مقرر کیے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کر دیا تھا کیونکہ جائدادیں اکثر ادنیٰ ادنیٰ شبہ پر ضبط ہو گئی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے خصوصاً ضلع مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور انگریزی افسروں کا یہاں اعتدال پر رہنا دشوار تھا اگرچہ سرسید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا لیکن مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدرداریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائدادیں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگذاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔

ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاصکر مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد، جو روہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور اُنھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر اُن سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثۂ عظیم ان کے مکان میں گذرا تھا اور اُن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار اُن مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا، سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو اُن کی تلاش درپیش تھی۔ اور اُن کی نسبت یہ گماں تھا کہ باغیوں کے ساتھ اُن کی ضرور سازش تھی ورنہ اُن کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے۔ مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور اُنھوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے

کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ اُن کو یا اُن کے رفتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود اُن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحب ضلع سے، باوجودیکہ وہ نہایت افروختہ تھے، بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں، لیکن جب تک کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ اُن سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک میں اُن کے بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے اُن سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے۔ لیکن چونکہ تمہارے نزدیک وہ بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے اُن کو بری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیے گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور | مراد آباد ہی میں آکر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپ کر شائع کی۔ اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ تمام خط کتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رُڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو انھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا نواب اور چودھریوں نے اُن کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اُس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملے سے تعلق رکھتی تھیں لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں۔ اُن میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لیے میٹریل جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب کہ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اُٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔ اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا اُن کو کامل یقین تھا، دوسرے یہ کہ ضلع کی اُس خوفناک حالت میں بدحواسی یا خوف و

ہر اس نے اُن کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔

اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو و رعایت اور بے کم و کاست لکھے گئے ہیں۔ جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمایشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اُن سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے اُن کے حالات جوں کے توں بیان کر دیے ہیں اور باوجودیکہ ہندو چودھریوں یا اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لیے اس الزام سے اُن کی بریت کی ہے مگر جو کچھ انھوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں کی تھیں اُن کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ غرض کہ واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مدرسہ مرادآباد | اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مرادآباد میں قائم کیا جہاں اُس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا مگر جب کہ اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا اسی تحصیلی مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبہ بھی داخل ہو گئے۔

رائے در باب تعلیم | انھیں دنوں میں انھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے ورنیکلر سکولوں پر سخت اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا تھا۔ ہم اس مضمون میں سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

> "گذشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایائے ہندوستان کی تعلیم کا کیا ہے سب سے اوّل اس میں یہ بات قابل لحاظ کے ہے کہ آیا فی نفسہ وہ انتظام ایسا ہے یا نہیں؟ کہ رعایا اُس سے ناراض ہو اور خواہ نخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو۔ ہماری رائے یہ ہے

کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے تو جو اس قوم کی زبان ہے اُسی میں اُس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے گا۔ بظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کیونکہ تمام اہل یورپ اور اہل عرب نے اپنی ہی زبان میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کل زبانوں پر ایسا خیال کرلینا صحیح نہیں ہے بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اُس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اُس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔"

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اُس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں اُن کے سمجھنے کی، بُرائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اُس کو طاقت ہو، اُس کے اخلاق درست ہوں، معاملاتِ معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امورِ معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ "ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ بلکہ ہم اُسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر، نہایت بیجا ہے۔"

"سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہل ہند کا ہے اردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اُس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔ کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اُس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اگر نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہٖ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں؟ کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لاعلاج ہے، تیسرے یہ کہ آیا وہ

ایسی زبان ہی یا نہیں کہ اُس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلامت فکر، ملکۂ عالی، قوتِ ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیبِ دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تمام باتوں میں سے اُردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اُس طریقۂ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے۔ بالکل بدل دے اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔"

"میری صاف رائے ہی کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھالے اور صرف انگریزی مدرسہ اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہی اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اُس میں ہو سکتی ہی۔"

یہاں ان فقروں کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مدعا ہی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دیسی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ سرسید کی رائے اس زمانے میں تھی یہی رائے اب سے ۲۶ برس پہلے تھی۔ مگر ۲۶ برس کے تجربے سے اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہی جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

رسالۂ اسباب بغاوت ہندوستان

مرادآباد ہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی، مُلک کی اور خاص کر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو اُن کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گی۔ وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے۔ جب مرادآباد میں پہنچے تو اُن کی تباہی و بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ اُن کی نظر سے گذرا جس سے ایک اور چوٹ اُن کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاصکر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا

ہندوستانی خیر خواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ اُن کا مسلمان ہونا ہی اُن کے مجرم ٹھیرانے کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بے قاعدہ رعایت یا ہمدردی کرنا سرکاری عہدیداروں کی قدرت سے باہر تھا اس لیے سرسید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک اُن کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ اُن کے مرادآباد میں آنے سے کسی قدر اُن ناگفتہ بہ بے اعتدالیوں کا انسداد ہوا جو خاص مرادآباد میں بعض ناخدا ترس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردے میں کرتے تھے کیونکہ حسنِ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں اسٹریچی صاحب مرادآباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور اُن کو سرسید کی رائے اور مشورہ پر پورا اعتماد تھا۔ مگر سرسید اسی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اُس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل بُرے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت طبیعت اور طرزِ خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور انھیں کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے بُھس بھری ہوئی مردہ کھال دلّی میں موجود تھی۔ مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدر ایک ملکی بغاوت تھی اور اس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لیے کسی سازش پر تھی محض غلط ہے۔ اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ

ملک کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اُن کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی وہ بھی نہ بہ ارادۂ بغاوت کے بلکہ بسبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سر ولیم کے نے بھی جو غدر کے بعد انڈیا آفس میں انڈر سکرٹری تھے، نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو "سپاہیوں کی وار" سے تعبیر کیا ہے نہ ملکی بغاوت سے۔ اور لارڈ لارنس نے بھی آخر کو یہی فیصلہ کیا کہ صرف کارتوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی بغاوت۔

اسی بنا پر انھوں نے مرادآباد میں آکر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں عام ہندوستان کو اور خاصکر مسلمانوں کو جن پر سارا نچوڑ انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اور اُس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے اُن کی تردید کی ہے اور اُن کو غلط بتایا ہے

یہ رسالہ غالباً انھوں نے مرادآباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں اُردو ہی میں اس کو مطبع مفصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیجدیا اور ۱۸۵۹ء میں اُس کی پانسو جلدیں چھپ کر اُن کے پاس پہنچ گئیں۔ جب سرسید نے اُن کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو اُن کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رامچندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اُس وقت مرادآباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے، انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلادو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں، پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔" رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بدرجۂ

غایت دیکھی اور اُن کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔ سر سید نے اوّل دو درکتیں بطور نقل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیجدی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹل فریر نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا۔ مگر مسٹر سسل بیڈن نے جو اُس وقت فارن سکریٹری تھے اُس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ بازپرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے" لیکن چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا اس لیے اُن کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔

مگر سنہ ۱۸۶۰ء میں جب کہ لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سر سید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن فارن سکریٹری گورنمنٹ انڈیا سے مڈبھیڑ ہو گئی جب اُن کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سر سید سے دوسرے روز علیحدہ مل کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ "اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شایع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے" سر سید نے کہا میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے، میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں اس لیے جس طرح میں نے اُس کو ہندوستان میں شایع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک

جلد بھی کہیں ہندوستان میں ملجائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔" مسٹر ہیلڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور اُنھوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اُس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شایع نہیں ہوا ؟ جب اُن کا اطمینان ہو گیا پھر انھوں نے اُس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اُس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ انڈیا میں بھی اُس کا ترجمہ کرایا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔ مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شایع نہیں کیا گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ایک مدبر حاکم نے اشاعت کی نظر سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کرنل گریہم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں، پورا کیا اور ۱۸۷۳ء میں چھپ کر شایع ہوا۔ اس کتاب کی نسبت مدبران سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتائج اُس سے پیدا ہوئے وہ دوسرے حصہ میں لکھے جائیں گے۔ چونکہ یہ رسالہ آج تک عام طور پر شایع نہیں ہوا اور نہ امید ہے کہ آیندہ شایع ہو اس لیے ہم نے رسالہ کو بجنسہ بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے کیونکہ جس قدر اس تحریر سے سرسید کا ایک عمدہ مدبر سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے اُس سے زیادہ گورنمنٹ کی حق پسندی و انصاف اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے جس نے اُس غیظ و غضب اور ناراضی کے زمانے میں نہایت ٹھنڈے دل سے شکایتوں کو سُنا، اُن پر غور کیا اور جو شکایتیں اور اعتراض صحیح معلوم ہوئے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ ادا کرنا

سرسید ابھی اپنی کتاب اسباب بغاوت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن و امان کا مشتہر ہوا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مرادآباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا کہ ملکہ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا اور اس غرض کے لیے سب کا ایک جگہ جمع ہونا قرار پایا۔ شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاقی صاحب کی ہے اس کام کے لیے وہ جگہ تجویز ہوئی۔ شہر کے

مسلمانوں نے آپس میں چندہ کیا اور ۲۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہوئے، غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاقی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک جماعتیں کھڑی ہوئی تھیں۔

نماز کے بعد سرسید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اُردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں، نہ رنگینی ہے، نہ تصنع ہے محض سیدھے سادے الفاظ اور بے ساختہ جملے ہیں۔ مگر اُس کے ہر جملے اور ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اس شخص کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا کر رکھی تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سرسید کو خیر دم تک اس چینک سے خالی نہ رہنے دے گی۔ ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس مناجات کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کر دیں کیونکہ اُس کے الفاظ سے سرسید کے دل کی اصلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

مناجات

"اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک الملک تو ہی ہے جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے اُن کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں۔ تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے عاجز بندے سراسر گنہگار ہیں۔ اے خدا ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سر تک ڈبو دیا ہے۔ اے خدا ہم تیرے ہر وقت تقصیروار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا نہیں، اے خدا

تیرے سوا ہم گناہ کے دریا میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی ترانے والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے تجھ سے چاہتے ہیں۔ اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے اپنی رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر۔ اے خدا جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی ناپاکی سے پاک کر لے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو تمام برائیوں اور تمام ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف کر۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس کی تائید سے قوی کر۔ تیرے سوا ہمارا حقیقی ماویٰ اور اصلی ملجا اور کوئی نہیں۔ آمین!

الٰہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے جس کا تو نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اس دن تیری رحمت اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں کیونکہ تیرے آگے سب گنہگار ہیں، مگر ان پچھلے دو برسوں میں جو تیری نگاہ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الٰہی تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین!

الٰہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گذرا کہ انسان اور حیوان، تمام چرند و پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی تو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی

پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ الٰہی تو ہمارے اس شکرانہ کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے اپنے فضل و کرم سے قبول کر۔ آمین!

الٰہی تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامت اعمال سے آکر پیش آئی اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر آمین!

الٰہی جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تو دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ اہل ہند جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے اُن پر رحم کرنا تو نے ہی ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القا سے کوئن وکٹوریہ دام سلطنتہا نے پُر رحم اشتہار معافی جاری کیا۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر آمین! الٰہی ہماری ملکہ وکٹوریہ ہو اور جہان ہو۔ تمام اہل ہند ناظم کشور ہند وائسرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہٗ کا یہ رحم اور احسان کبھی دل سے نہ بھولیں گے جس نے تمام اصل حالات فساد پر غور کر کے اس پُر رحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں نہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہل ہند اُس کے اس احسان کے بندے

اور دل و جان سے اُس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری دُعا قبول کر۔ آمین! الٰہی دنیا ہو اور ہمارا وائسرائے لارڈ کیننگ ہو۔

الٰہی اہل ہند رحم کے اُس سے بہت زیادہ خواہشمند ہیں جتنا (کہ) پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہے جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اُس کی رحم کی نظر ہے اُس کو دل سے پیار کرتے ہیں اور اُس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہل ہند جانتے ہیں کہ اصل حالات فساد پر غور کرکے نہایت رحم کی نگاہ سے اہل ہند کو مسٹر ریڈ ممبر صدر بورڈ نے دیکھا ہے۔ اس لیے اُن کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے اُن کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین چان اور تمام رعایائے ہند کو اطاعتِ گورنمنٹ سے سرخروئی دے اور ہمارے حکّام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین! صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین و آخر دعوانا اَنِ الحمد للہ رب العٰلمین۔"

رسائل موسومہ لائل محمڈنز آف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاصکر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ رسالہ اسباب بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انھوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور جو نتائج اُس پر مترتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے اس لیے سرسید کے دل کی بےچینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کیجاتی تھیں اُن کی بےچینی اور زیادہ

ہوتی تھی۔ مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ دلی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی۔ اور سب سے بڑا اور عام الزام جو اُن پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رُو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لیے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بے شمار شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیرخواہی میں جانبازی اور جاں نثاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے۔ اور مذکورہ بالا تینوں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے وہ فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کر کے وقتاً فوقتاً اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شایع کی جائے۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطراف ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیرخواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانبازیاں کی ہیں اُن میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا جائے اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ حکام اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکیٹ بہم پہنچا کر اُس کی سرگذشت کی ذیل میں نقل کیجائیں اور جو کچھ اُن کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لیے بے انتہا سامان اور میٹریل درکار تھا جس کا جمع کرنا دقت سے خالی نہ تھا۔ پھر اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجرت بھی اس زمانے میں نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپہ کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپے کے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے سرسید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیرخواہ مسلمان کا حال جتنے صفحوں پر چھپے اُس قدر

صفحوں کے چھاپہ وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کے پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین نمبر بقدر ۳۰ صفحہ کے چھپ کر رہ گئے ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہوگیا۔

پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے "سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبوں و درماندہ کر دیتا ہے، ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر، علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا یا پلٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا۔ کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا۔ جو کام انسان سے بُرا سرزد ہوتا ہے وہ تو بُرا ہی ہے مگر اس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ناہمواری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ جو ایک مثل مشہور ہے کہ "ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے" یہ خاص ایسے ہی بُرے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت وقت کا یہ خاصہ ہے کہ اگر ایک آدمی بھی بُرا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے۔ گو اُسی قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر اُن خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔"

"برخلاف اس کے جن لوگوں پر یہ بدبختی کے دن نہیں ہوتے اُن کا بُرا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ اُن میں سے ہزاروں نے کیسے ہی بُرے کام کیے ہوں مگر اُن کی بُرائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا۔ یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۵۷ء و ۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اُس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، گو وہ اُمّ دُن اور ماتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے کز آسماں آید | گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پُرسد | خانۂ مسلماں کجا باشد

"اس گذشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں اُن پر میں یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفعل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بدذاتی کا چاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مٹ جائے گا اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں مگر روز بروز اور زیادہ کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اُس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔ مگر میں اُس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو، کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں ملا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جان نثاری کو حاضر رہا ہو۔"

"جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی میں اُن کا طرفدار نہیں ہوں میں اُن سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور اُن کو حد سے زیادہ بُرا جانتا ہوں کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں، نبیوں پر ایمان لائے ہیں، خدا کے دیے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔

پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اُس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے بھی برخلاف کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ اُن سے ناراض ہوا جائے مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے اُن کی نسبت چھاپی جاتی ہے اُس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تہدیداور جو بنااور جو نتائج کہ وہ لوگ اُن کی نسبت لگاتے ہیں میں اُن کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت درستی اور انصاف سے کام میں لایا ہوں۔"

"اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیے کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالاتِ فساد پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ رہے تو پھر اس شور و غوغا کا اُن کو کیا غم ہے۔

نمیگویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من — بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

"ہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدردان گورنمنٹ نے خیرخواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی، انعام و اکرام اور جاگیر اور پنشن سے نہال کر دیا ہے، ترقی عہدہ اور افزونیٔ مراتب سے سرفراز کیا ہے۔ پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ کے شکرگزار و ثناخواں رہیں۔"

"مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیرخواہیاں کیں اُن کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں اُن میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیرخواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص

مسلمان ملازمان گورنمنٹ نے جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں اُن کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہو لکھوں اور جو انعام واکرام ہماری منصف و قدردان گورنمنٹ نے بعوض اس کے ان لوگوں کو دیے وہ سب بیان کردوں۔ تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدردانی زیادہ تر مشہور ہو اور تمام رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی مروّت اور سلوک اور رعایت اور قدردانی دیکھ کر اُس کی دل سے شکرگذار رہو اور ہر ایک کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے عزت اور نیک نامی حاصل کی اُسی طرح ہم بھی حاصل کریں اور یہ بھی جان لیں کہ ہماری گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور اُن کی قدر و منزلت کرنے کو تیار ہے۔"

"مگر چونکہ مسلمان خیر خواہ بہت کثرت سے ہیں اور اُن کی رپوٹیں بھی بہت لمبی لمبی ہیں اس لیے اُن سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از دقت نہ تھا اس واسطے یہ تجویز کی ہے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے۔"

"جو لوگ بسبب تعصب یا عدم واقفیت کے حالاتِ ملکی سے، یا جو اصولِ سیاستِ مُدن کے ہیں اُن پر صحیح رائے نہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں وہ لوگ میری اس رائے کو دیکھ کر حُب الوطنی کا الزام مجھ پر لگائیں گے۔ ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکرِ خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں پھر نامنصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے، مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کریں گے کہ ان حالات و واقعات کی تحریر میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا جس مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہٖ حکام متعہد کی رپورٹیں جو اُن کے حق میں ہوئیں اور سارٹیفکٹ جو اُن کو دیے گئے اور گورنمنٹ سے جو انعام واکرام اُن کو ملے، وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں جو میری اس تحریر پر گواہِ عادل ہیں اور تمام متعصبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں۔"

اس کے بعد سرسید نے اوّل اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بمقابلہ بڑے

بڑے خیرخواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور اس لیے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر صرف اس امید پر کہ جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں وہ مؤلف کو گورنمنٹ کا خیرخواہ سمجھ کر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں سب سے پہلے اپنا اور میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رسالوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصل حال درج کیا ہے جن میں سے بعضے خود بھی مارے گئے اور اُن کے ساتھ دس دس بارہ بارہ آدمی اُن کے کنبے کے بھی باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے دوسرے رسالہ میں خیرخواہانِ سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث اُن تینوں الزاموں کے متعلق بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور اُن کے مذہب پر لگائے جاتے تھے اور قرآن حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ اُن کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے تیسرے رسالہ میں لانس لٹ اڈیسن نام ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے جو اُس نے ۱۶۹۷ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی، ایک عہدنامہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اُس میں اُن کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کی برابر حقوق دیے تھے اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اُس پر ہمیشہ کاربند رہیں ورنہ وہ خدا سے منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالے مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم ہمتی سے صرف تین نمبر سے آگے نہ چل سکے۔ اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں ایک نہایت مفید اور کارآمد چیز ہوتی اور اُن دعووں کا ایک علمی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت کرنے کے لیے اصول اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔

تحقیق لفظ نصاریٰ | سرسید مرادآباد ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایامِ غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور اُن کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو اُن کی قسمت میں لکھی تھیں۔ اس وقت جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے

پہلو پر ڈھالی جاتی تھی۔ انگریزوں نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سرسید نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ میں لکھا اور اُس کو اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اُس کے مضمون سے مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھتے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا مگر جو کچھ سرسید نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے، اُس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے کہا "من انصاری الی اللہ" تو حواریوں نے کہا "نحن انصار اللہ" اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو اُسی صفت کے ساتھ جس کی حواریوں نے حامی بھری تھی، موصوف کیا گیا ہے اور اُن پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ کو ناصری کہا گیا ہے۔ اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرت کے زمانے میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى (یعنی اے محمد تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں۔)

جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں

لہ غدر کے چند سال بعد دلی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا۔ دلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں راہب یعنی پادری کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اُس کو حقارت کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اُس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا ۱۲

کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاری کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اُس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی

انتظام قحط ضلع مرادآباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اُس وقت سرسید مرادآباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو مرادآباد کے وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرسید کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظر اور سلیقۂ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرسید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سرسید کے ایک قدیم دوست خود مرادآباد کے رہنے والے جو اُس وقت وہاں ملازم تھے اُن کا خیال ہے کہ سید احمد خاں کو جو اس قدر عزت اور نیکنامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اُن کی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حسن انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کے لیے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں اور شیرخوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے اُن کے لیے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں اُن کے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی آسامی اور ایک ایک پساری روئی کے گالوں کی میر محلوں کی معرفت بھیجدی جاتی تھی۔ جب سوت کتکر آجاتا تھا تو اور روئی اور کاتنے کی اجرت بھیجدیتے تھے۔ سرسید کے مرادآبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے کی عورتیں جو اب تک جیتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جا سکتی تھی، جن کے دست جاری

ہوتے تھے اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، اُن کو سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر لٹا دیتے تھے۔ اُن کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے، دوا پلواتے تھے اور نہایت شفقت سے اُن کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی۔ ایس۔ آئی کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے اُس وقت تک اُن سے ملاقات نہ تھی، اُن کا بیان ہے کہ

"جب سرسید نے رسالہ 'لائل محمڈنز آف انڈیا' نکالنا شروع کیا تو اُس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے اُن کو کچھ ہمدردی نہیں ہے، اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیرخواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ انھیں دنوں میں میرا مراد آباد جانا ہوا، محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سرسید سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے اُن فقروں کا ذکر کیا جن سے اُن کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا، مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اُس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے اُس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہو گئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے؟ وہ دن ہے اور آج کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ میرا اور اُن کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔"

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا۔ مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آنے سے شرماتے تھے اُن کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لیے ہر ایک جنس عمدہ اوّل درجہ کی منگوائی جاتی تھی کھانے کے سوا اُن کے لیے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اُجلے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں

ہوا سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور رسّیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے تھے اور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہو سکتے تھے کرتے تھے اور اس طرح اُن کے کام کی اُجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہوجاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات سے اور نیز اُن کی نیک بی بی جو اُن سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں غریبوں اور محتاجوں کی خبرگیری کرتے تھے۔ اُن کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریچی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اضلاع کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ اور تعریف کی گئی، مگر اسٹریچی صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں سب جج نے کی ہے، اگر شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سرسید کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہدیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے اُن میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد کیے جائیں گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دیے۔ مگر حسب ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اُس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنانے کے۔ ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے رہے اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان اسٹریچی مرادآباد سے بدل گئے اور مسٹر پاور اُن کی جگہ آئے۔ مشنریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر اُن کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیے گئے

ہیں وہ واپس لیے جائیں۔ اُس زمانے میں مسٹر الگزنڈر شکسپیئر جو سرسید کے نہایت دوست تھے مراد آباد میں جج تھے انھوں نے سرسید کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمھارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لیجائیں گی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سرسید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دیے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے، پس اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں کو دیا جائے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ چونکہ اُس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخر کار کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لیکر مشنریوں کو دلوا دیے گئے۔ سرسید کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں اور اُن کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں، سرسید نے پہلے اس سے کہ کوئی اُن سے مانگنے آئے فوراً اُن کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے وہ بچے زار و قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً اُن کو بھیجنا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تعلیم دیجائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی | مراد آباد ہی میں اُنھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی کی تصحیح

کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اُس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اُس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اُس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانۂ شاہ دہلی کا، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر اڈورڈ ٹامس سے اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شایع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے۔ سرسید نے اُس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں اُن تمام تاریخوں کا جو شاہانِ ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برنی کا حال درج ہے یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تبیین الکلام | ۱۸۵۷ء سے پہلے جبکہ دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کے جا بجا مباحثے ہونے لگے، اُس وقت سرسید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انھوں نے کچھ کچھ بطور یادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید محمد احمد خاں کو جو اُس وقت صغیر سن تھے جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

دفعۃً غدر ہو گیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا جس کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لیے اوّل عیسائی مذہب اور بائبل کی حقیقت اور اُس کی تاریخ اور جو کچھ بائبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اُس سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے۔ اُن کو

یہ بھی خیال تھا کہ ابتک جس قدر مباحثے یا مناظرے ہندوستان میں پادریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں۔ اعجاز عیسوی وغیرہ میں جو تحریف لفظی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اس سے سرسید کو اختلاف تھا۔ نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اُس کو وہ محض نزع لفظی سمجھتے تھے۔ بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائبل سے اصول اسلام کے خلاف نکالتے تھے اُن کو سرسید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن اِن تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لیے بہت کچھ سامان درکار تھا۔ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں غدر کے زمانہ کی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا اور جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اُس کے معاوضہ کا، بہت سا روپیہ سرسید کو سرکار سے ملا۔ اوّل انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور یونی ٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں، اور نیز لامذہبوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی خواں کو جو ان کتابوں کے ضروری مقالات ترجمہ کرکے سناتا تھا اور کتب احادیث و تفسیر وغیرہ سے سندیں بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورہ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی اُس کو اول دس مقدموں اور دو قسموں میں بیان کیا۔ اس کے بعد بائبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن و حدیث سے اُس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہانتک ممکن ہو مطابقت ثابت کیجائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کیجائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کیجائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اُس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے۔ اُن کو بائبل اور اُس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ کسی کو پہلے اس زمانے کیسی ضرورتیں پیش آئی تھیں اور نہ اگلے زمانے میں آج کل کا سامان

اور میسر آسکتا تھا بایںہمہ یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپیہ کا پریس رڑکی سے منگوایا اور اُردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ اُن کی بدلی غازی پور کی ہوگئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازی پور لے گئے اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں انھوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اُس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چریاکوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں اُن کی اعانت سے سرسید کے ارادے کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔ الغرض عہدِ عتیق میں سے کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک اور عہدِ جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک تفسیر اُسی التزام کے ساتھ جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا لکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی۔ جو کچھ سرسید لکھتے تھے اُس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یورپین جس کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے، ہر روز دو گھنٹے کرتا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اُردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں اور اُس کا اُردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اُس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اُسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اُس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اُس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔

اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں، بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اُس مذہبی تنافر کے دور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب، لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور بمنزلۂ بنیاد کے ہیں ایک ایسی تفسیر کے لیے جو بائبل پر اصول اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک بھی انبیا کا مبعوث ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اہل کتاب کے نزدیک ضروری ہے اور اہل اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور اُن کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ویسا ہی ضروریات دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہل کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت صلعم کے زمانے میں موجود تھیں۔ اور آج اُن کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پا سکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے۔ نیز محققین واکابر اہل اسلام مثل امام اسمٰعیل بخاری، امام فخرالدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کے قائل نہیں ہیں اسی طرح محققین اہل اسلام بھی اس کے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تحریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے صرف اسی قسم کی تحریف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور بزرگوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی حفاظت، تنقید اور تصحیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں اُن کی تمام ہسٹری اور جو نتائج اُن کوششوں پر مرتب ہوئے وہ مفصل بیان کیے ہیں۔ پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلاف تراجم سے اصل بائبل کا محرف لازم نہیں آتا نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر نسخ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اس کو محض نزاع لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اُس بونِ بعید کو جو علمائے فریقین کے سبب ناواقفیت سے اسلام اور اصلی عیسائیت کے اصول میں پایا جاتا تھا اُس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ عہد عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا کر پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اُس میں تحریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اس لیے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے اُس کے لکھنے پر توجہ نہیں کی، موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت

کو جس کی بنیاد تثلیث، کفارہ اور تکذیب خاتم النبیینؐ پر ہے غلط ٹھیرانی ہے، عیسائیوں کے برخلاف تھی۔ نیز اس کے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بے انتہا محنت اور روپیہ صرف ہوتا تھا اور کتاب کے بکنے کی بالکل امید نہ تھی۔ ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سرسید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادھورا رہ گیا مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعے سے بیان کرنے منظور تھے ان میں سے بعض اہم اور ضروری مقصد خطبات احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں، جیسے انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت، یا مسئلہ تعدد ازدواج یا مسئلہ طلاق وغیرہ۔

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ مناظرے کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے قلم سے لکھی جائے اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافتراق ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے۔ سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جن کے دل میں یہ خیال

پیدا ہُوا مگر چونکہ اُس کا پورا کرنا بغیر قوم کی تائید کے اُن کی طاقت اور بوتے سے باہر تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصوبے کو پورا نہ کرسکے۔ مگر جو نمونہ اُن کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے اُس کے موافق اُس تفسیر کا پورا کرنا اب ویسا مشکل نہیں رہا جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا۔

جان میولسن آرنلڈ نے اپنی کتاب "قرآن اینڈ بائبل" مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں سرسید کی ایک چٹھی چھاپی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق مصنف موصوف کی چٹھی کے جواب میں اُن کے پاس بھیجی تھی۔ چونکہ اس چٹھی سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اُس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خیالات جو اُس وقت تھے اور خود سرسید کا اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا، بخوبی واضح ہوتا ہے اس لیے یہاں اُس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ جان میولسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ "بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آبا و اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور اُن کے اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے۔ ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بُرے ہوں، اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا"

"جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کرسکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا، اُس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو اُس کی حالت اور منزلت اُس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی؟ بلاشبہ اُس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اُس کو بُرا کہیں گے۔ یہی حالت میری ہوئی۔ اس کام کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہُوا۔ مگر میں نے اُن کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں

اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور اُس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا۔ جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اول حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہوگیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اُس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہوگئے۔ اور بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسدہ جو اُن کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہوگئے جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہوگا جن کو میں ایک بڑے مولوی[1] کے خط سے جو میرے نام تھا نقل کرتا ہوں:

"میں نے آپ کی تفسیر کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانے میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ہر سہ شنبہ کو پڑھی جاتی ہے اور اُس کے قابل تعریف فقروں کو پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔"

"بائبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اُس سے بہت بد اعتقاد ہوگئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا، عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی لیکن میں برخلاف اُن کے کہتا ہوں کہ خود بائبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ میری تفسیر کا دوسرا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائبل کے ساتھ بہت کم ہوجائے گا۔"

"با اینہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں[2] کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات

---

[1] غالباً یہ خط مولانا محمد فصیح مرحوم غازی پوری یا مولوی تراب علی صاحب مرحوم کا تھا۔ ۱۲

[2] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے تفسیر لکھنے کے بعد عام مسلمانوں کے خیالات کے برخلاف کیے وہ سب پہلے ہی سے اُن کے مکنون خاطر تھے۔

نسلے گی عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونو انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند سالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائے گا آپ کی خدمت میں ارسال ہوگا۔"

"یقیناً میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرفدار اور موئید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا قصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنزو کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں جب اُن کا موقع آئے، جواب دوں۔"

جان میولسن آرنلڈ سرسید کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کر کے اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں کہ "اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلتے جاتے ہیں تو اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے دُور ہو جائے گی، یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا واجب التعظیم بیان کرتی ہے اور اُس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے، اس قابل ہے کہ اُس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں

جس نگاہ سے کہ وہ قرآن پاک کو دیکھتے ہیں "

اس کے بعد جان میولسن آرنلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس پر بے اختیار ہنسی آتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے " معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ انھوں نے کہاں سے نکالا؟ اگر وہ ذرا غور اور امعان نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا اگر انجیل صحیح ہے تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہے۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹوفر جبارہ ہے اور جو وہاں کے مشہور عیسائی اخبار شہادۃ الحق کا اڈیٹر ہے، مذاہب ثلاثہ یعنی یہودیت عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کرکے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقۃ تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ممکن ہے اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے چنانچہ اُس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام وحدۃ الادیان ووحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن ہے۔ اس کتاب میں اُس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق وتطبیق کی ہے اور اُس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اُس نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جس کی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحاد اسلامی موسیو کلافیل ایک فرنچ بیرسٹر نے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اُسی مضمون کا فرنچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو مذہبی اور پولٹکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنھوں نے اُن کے سوشل اور پولٹکل تعلقات میں تلخیاں پیدا کردی ہیں اُن کو رفع کیا جائے

اور اسی لیے اس نے اخبار مذکور ایسی دو زبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس ہوئی ہے اس کو سرسید نے اب سے ۲۵ برس پہلے بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان سے جس نے ایک قدیم اسلامی دار الخلافہ کی سوسائٹی میں نشو و نما اور پرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو، کچھ کم تعجب انگیز نہیں۔

فرانس کا مشہور اورنٹیلسٹ گارساں دتاسی جس نے اردو لٹریچر کی تحقیقات میں عمر صرف کی تھی، وہ ۱۸۸۰ء کے لکچر میں سرسید کی اس تفسیر کی نسبت لکھتا ہے "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی تصنیف ہے جو زمانۂ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب آثار الصنادید کا میں نے پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (یعنی تبیین الکلام) کے عنقریب چھپنے کے پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور ہماری کتب مقدسہ کا پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرفہ تر یہ کہ بہت سی یوروپین تصانیف سے اُن کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو انھوں نے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک اُن کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی۔ حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اُردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو"

---

۱۵ یہ شخص پیرس کی یونیورسٹی میں اُردو لٹریچر کا پروفیسر تھا اور ہمیشہ اس سبجکٹ پر لکچر دیا کرتا تھا۔

بی بی کا انتقال

۱۲۷۷ھ ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال مراد آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید حامد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی۔ اُس وقت سرسید کی عمر چوالیس برس کی تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ اُن کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کر لو اور نیز تقاضائے سن بھی یہی تھا مگر جو تعلق کہ اُن کو بی بی کے ساتھ اُن کی زندگی میں تھا اُس کے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ وہ بڑے بڑے ارادے جن کی دُھن اُس زمانے میں اُن کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع رہے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تجرّد میں کمال عفت و پارسائی کے ساتھ گزار دی اور اپنے تمام قوےٰ اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔

غازیپور کی بدلی اور اول وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا

۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازیپور کو ہو گئی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد اُن کو ایک بہت بڑا اہتمام خاطر کرنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے مگر بہت جلد یہ سب خیالات اُن کے دل سے محو ہو گئے۔ اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں۔ باوجودیکہ وہ غازیپور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اُس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا صرف کرتے تھے اُسی حالت میں انھوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہموطنوں کی بھلائی کی سوچی۔ انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا، کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروّج تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ جن لوگوں

وعدوں سے کسی لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکہ معظمہ کے اشتہار میں ان کے ملنے کی ہندوستانیوں کو امید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر اُن وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔

سرسید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور وحشت کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض نوکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جمانے کے لیے ضرور ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت اُن کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط واتحاد پیدا ہو جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا اور یہ تمام مقصد بغیر اس کے کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا سکے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۶۴ء میں انھوں نے ایک تحریر اس عنوان سے کہ "التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان در بابِ ترقی تعلیم اہلِ ہند" چھاپ کر شتہر کی جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر مائل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سنہ میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی تمام قواعد منضبط کیے گئے۔ ڈیوک اوف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے انھوں نے سوسائٹی کا پیٹرن ہونا منظور کیا اور ڈرمنڈ صاحب لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب نے ایس پیٹرن ہونا قبول کیا۔ اور دُور دراز صوبوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزت ہندو اور مسلمانوں نے اس کی ممبری قبول کی اور غازی پور میں ترجمہ کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے جو اس سوسائٹی کے آنریری سکرٹری قرار پائے تھے اور درحقیقت وہی اس کا دل اور وہی اُس کی صورت تھے، سوسائٹی کے اغراض اور مقاصد مشتہر کرنے اور اس کے ساتھ

پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرہ علمیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا جو اُن کی اُردو اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں اُن کا گذر ہوا وہاں سوسائٹی کا چرچا کیا۔

غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا اسی سنہ میں اُنھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی۔ اگرچہ ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خود یہ خواہش تھی کہ غازی پور میں ایک مدرسہ قائم ہو، لیکن اول تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسہ کے انتظام اور حفاظت زرِ چندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے دوسرے مسلمان عموماً انگریزی کے نام سے بدکتے تھے سرسید نے ان دونوں مشکلوں کو حل کیا اور تھوڑا تھوڑا چندہ جمع ہونے لگا۔ اس مدرسہ کی عمارت اور اُس کے قیام کے لیے اسّی ہزار کا تخمینہ ہوا تھا جب چندہ کی مقدار سترہ ہزار تک پہنچ گئی تو اوّل مدرسہ کے لیے ایک مکان تجویز ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک عام مجمع میں جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے، اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور تعمیر شروع ہوگئی

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپیچ دی تھی جو اُن کی اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے یہاں ہم صرف وہ جملے جو بنیاد کا پتھر رکھے جانے کے بعد اُن کی زبان سے نکلے تھے نقل کرتے ہیں "اے خدا کے بندو خدا کی مناجات کرو۔ خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے ابد تک مبارک ہووے۔ آفتاب کے مطلع سے لے کر اُس کے مغرب تک خدا کا نام ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریب کو خاک سے اٹھا لیتا ہے، محتاجوں کو کوڑے پر سے اٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہم کو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیے اُس نے ہماری آواز سنی۔ اس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی سو جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دل اور مرنے کے بعد ہماری روح خدا کی ستائش کرے گی۔"

"اے خدا ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی، تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے

کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لیے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں اُن کے لیے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایسے نیک کام کی طرف پھیر تا۔ اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا تھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے تیری غریب مخلوق کے فائدے کے لیے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

یہ مدرسہ بھی مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندہ سے سیلف ہیلپ کے اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اُس کی ابتدائی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ ہردیو نرائن سنگھ اُس کے پیٹرن اور وزیٹر قرار دیے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اُس کے انتظام کے لیے قرار پائی تھیں۔ انگریزی، اُردو فارسی عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سرسید کا چند سال وہاں اور قیام ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ کالج کے درجہ تک پہنچ جاتا۔ مگر اُسی سال یعنی ۱۸۶۴ء ہی میں اُن کی تبدیلی علیگڑھ کی ہوگئی۔ بااینہمہ اُس کی بنیاد ایسے مستحکم اصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اُسی میں برابر ہوتی ہے۔

غازیپور سے علیگڑھ تبدیل ہونا

۱۸۶۴ء میں سرسید غازیپور سے تبدیل ہو کر علیگڑھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے اُن کی ذات سے وابستہ کی تھی، آ گئے۔ چونکہ غازیپور میں سائنٹفک سوسائٹی کا اُن کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علیگڑھ میں لے آئے اور مسٹر ولیم جنکس بریلی جو اُس زمانہ میں علیگڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پائے۔ اُن کی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی۔ ہندوستانی اور یوروپین ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اس وقت تک ایک عالیشان عمارت دلکشا چمن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے اور بظاہر

تیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کا پتھر آنریبل ممبر آف لفٹنٹ گورنر اضلاعِ شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا تھا چنانچہ دو کتبے ہز آنر اور مسٹر بیلی جج علیگڑھ کے نام کے اُس کے سب سے بڑے ہال میں اب تک لگے ہوئے ہیں۔

۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ڈیلس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اُس کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ صاحب ممدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اُس کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: انھوں نے کہا کہ "سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انھیں کا کام ہے اور وہی اس جلسہ کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں، وہی بانی ہیں۔ . . . اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں اے خدا! اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر۔"

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن سے لوگوں کو نئی نئی اطلاعیں حاصل ہوتی تھیں، لکچر دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ مترجم، مولوی، اہلِ سیمن چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو[1] روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔ چند برس کے عرصہ میں بہت سی مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کراکے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالۂ علم فلاحت، بلینیر کا رسالۂ سیاست مدن، سر جان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ ایکسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ

---

[1] عملۂ ترجمہ ۲۴۵ روپیہ ماہوار اور عملۂ مطبع ۲۳۴ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور درستی و انتظام مکان سوسائٹی کے لیے ۱۰ روپیہ ماہوار مقرر تھا (سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۸۶۶ء جلد ۲) ۱۲

وغیرہ۔ اِس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸ اخبار اور میگزین انگریزی اور ۲۶ اخبار اُردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالک غیر سے یہاں آتے تھے۔

سر سید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقہ سوسائٹی کا دار و مدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی اور اُردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے، جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دیدیا۔ چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اُس جلسہ میں چیئرمین تھے سر سید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اُس احسان کو اس عالیشان عطیے نے اور زیادہ کر دیا ہے۔" نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انھوں نے بطور اظہار خوشنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ خاص سر سید کے واسطے بھیجی، سر سید نے جلسۂ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے سوسائٹی کو دیدی۔ اس کے سوا انھوں نے محض سوسائٹی کی مدد کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں کو قانون پر لکچر دینا اختیار کیا اور جو فیس اُن سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی کی نذر کرتے رہے۔

۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء کو انھوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقہ کشتکاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی اُس کے معاوضہ میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کا تالیف کرنا سر سید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی سے پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کرلیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں۔ صرف مضامین کی طولانی فہرست جو

سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۴۲ جلد اول میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا اور اگر سرسید اس کے سرانجام کرنے میں مصروف ہو جاتے تو اُن کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علیگڑھ اور اُس کے نواح کے اور چند یوروپین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپیچ کی جس کا حاصل یہ تھا کہ "ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ اوف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔"

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اُسی وقت نو معزز ہندو اور مسلمان اُس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام "علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا"

اس ایسوسی ایشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علیگڑھ میں رہے انجام دیے۔ مدت تک اُس کی خط کتابت انگلستان کی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ساتھ رہی۔ اُس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصل عرضداشت بھیج کر مسافرانِ ریل کی اُن تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں اُن کو حد سے زیادہ اٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اُس عرضداشت پر بہت سی شکایتیں رفع کی گئیں۔ نیز

اُس نے گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ جس قانون کی رُو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دوچند کیا گیا ہے اُس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو صدمہ پہنچتا ہے اس لیے ایک آنہ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر لیا جاتا ہے بجائے اُس کے آدھ آنہ فی دس تولہ مقرر کیا جائے۔ اسی طرح اور بعض مفید تحریکیں اُس کی طرف سے ہوئیں مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہوگئی اُسی وقت اس ایسوسی ایشن کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہوئی

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علیگڑھ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مالگذاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے اول امتحاناً ضلع علیگڑھ اور اٹاوہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا اور آخر کار تمام اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہوگئیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حاکموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیری سے کہیں ان کے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۷۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ اُن کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم تساڈ کی نمائش گاہ میں تھیں۔"

اگرچہ ۱۸۸۰ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد ترمیم ہوکر از سر نو جاری کیے گئے مگر چونکہ اُن سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت کو کچھ وسعت نہ ہوئی تو سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اُن شکایتوں کا پھر اعادہ کیا اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ حاصل نہ ہوئی اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں پیش کیں جن سے

ورنیکلر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جا سکے۔

سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالنا

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اُن کے آخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ اِس اخبار کا اڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے آخیر تک سوائے اُن ایام کے جبکہ سرسید علیگڑھ میں نہیں رہے انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اُن کو اُس میں کسی بڑے آرٹکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مُہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا، وہ ہمیشہ اُس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اول اول سرسید زیادہ تر اُس میں پولٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے اُس کی ابتدائی جلدوں کو اُن کے پولٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اُردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے، اس لیے اُس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور اُن میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اُس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ اُن لیڈنگ آرٹکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ

ہوکر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجراء سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

جو ماٹو اُس نے اپنے لیے اختیار کیا تھا اُس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور رعایا کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اُس کی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی، بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اُس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اُس کو غور سے سُنا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اُس کا لکھنے والا اور اہتمام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کیے ہوئے تھے کہ علیگڑھ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھدار مسلمانوں کے خیالات کا ارگن ہے۔ کتاب "پلرز اوف دی انڈین امپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا۔ اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم روس اور روس و افغانستان اور روس و ہندوستان، کے بن جائے گا۔" اسی کتاب میں علیگڑھ گزٹ کی وقعت اور اعتبار کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علیگڑھ گزٹ جس کے اڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار

ہے۔ اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھ کر خاص ملکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر اُن کو ایک جگہ فراہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام معصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں رکھی۔ اُس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اُس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اُگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ وہ جس طرح اپنی قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اُس میں دردناک اور افسوسناک مضمون نکلتے رہے۔ باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اُس کے مدبروں پر کثر نکتہ چینی کرتا تھا مگر اعتدال اور ادب اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اُس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اُس نے برخلاف اپنے معصروں کے جن کی زبان درازی سے اول لارڈ لٹن کے زمانے میں اور اب لارڈ ایلگن کے عہد میں اُن کی آزادی چھین لی گئی، اپنے معتدل رویہ سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اُس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اُس کی باقاعدگی، جو اکثر دیسی اخباروں میں مفقود ہے اور اُس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جانا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سر و پا خبروں

سے مبرا دیکھا گیا۔ اُس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر ماخذ سے (الا ماشاء اللہ) اُس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اُس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں۔ جن سے اُس واقعہ کی ایک مختصر ہسٹری یعنی تاریخ مرتب ہوسکتی تھی۔ اُس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چندہ کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لیے پچھلے برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقروض ہوگئی تھی۔ مگر سرسید نے جس طرح ہوسکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

بنارس کی تبدیلی

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جکیشن داس سی۔ ایس۔ آئی کو کہ وہ اُس وقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، سپرد کرگئے۔ انھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانے میں پوری نہیں ہوئی تھیں اُن کو پورا کیا۔

سرسید بنارس میں بھی سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کو برابر تقویت دیتے رہے اور اُن کے مفید آرٹکل اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے اخبار میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے، اس لیے پہلی بار بنارس میں اُن کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ اُن کے اس قلیل زمانے کے بھی چند کام ذکر کے قابل ہیں۔

ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سرسید علیگڑھ ہی میں تھے انھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغرب کی طرف سے وائسرائے وگورنر جنرل کشور ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا" (۱) یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے (۲) یہ کہ دیسی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں

(۳) جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلدوی تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اُن طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں یہ ہے کر یا تو ایک اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کیجائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔" اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ جو چٹھی سکرٹری گورنمنٹ ہند کی مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۷ء سرسید کے نام بمقام بنارس موصول ہوئی اُس میں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اور تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے اُن تمام کوششوں کی قدر کریں گے جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی ہے یا خاص خاص آدمی اُس مقصد (یعنی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے) کو ترقی دینے کے لیے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کا اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے،، اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی،، اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر با اجلاس کونسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔"

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی جنھیں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے ؛ ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاء اللہ اور پنڈت دھرم نرائن۔ اور جب ان لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اُس نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۸ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی۔

جس میں ایسوسی ایشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۶۷ء میں اسی یونیورسٹی کے متعلق دہلی سوسائٹی میں جبکہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مضمون کا ایک میموریل بھیجا گیا کہ "یہ یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لیے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کی جائے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلی ہونا چاہیے۔"

اول اول سرسید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں انھوں نے اطلاع دی کہ "ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہے مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جو روپیہ وہ اشاعت تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہے اُس میں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت اور تقویت کرے،، یہ بھی لکھا کہ "سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرہ کو فراخ کرنا چاہتی ہے اور امیدوار ہے کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء سوسائٹی کے مقصد میں خارج ہو تو اُس قانون کی ترمیم کی جائے اور اگر نہ ہو تو اُس کی تشریح کی جائے۔"

مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اُس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سرسید نے بنارس انسٹیٹیوٹ کے ایک جلسہ میں جو اسی معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ "مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اُس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اُس کے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور

خیالات دیسی زبان کے ذریعہ سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو" اس کے بعد اپریل ۱۸۶۸ء میں جبکہ نواب لفٹنٹ گورنر بھی بنارس انسٹیٹیوٹ میں موجود تھے سر سید نے پھر اپنی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے"

غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سر سید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا، مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا چنانچہ سر سید نے اسی باب میں جب مسٹر ہیرن انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی سے رائے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔ اس تحریر سے بھی ضرور اُن کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہوگا پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سر سید اور اُن کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔ جو موانع اس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر اُن میں سے کوئی امر پیش نہ آتا تو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی تھی۔ ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے دہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلی ہونا چاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹیٹیوٹ کی ضرور یہ خواہش ہوتی کہ اُس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو۔ اس کے سوا اُردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اُردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کیجائے۔ اور باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سردست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی، اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش

کرکے اُس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا تو گورنمنٹ آخرکار یہ فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھا نیوتا اور کیوں دو بلائے۔

سوسائٹی کی امداد کی ایک خاص تدبیر

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علیگڑھ میں آئے اور ضلع علیگڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اُس کی شرائط واجب العرض میں بروقت بندوبست کے درج ہو جائیں، تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع اُن کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۲۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علیگڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیجدی تاکہ وہ اُس کی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں۔ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعے سے روانہ کر دیے۔ اُس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اُس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء بنام سرسید کے موصول ہوئی اُس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔

ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچ کر اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ اور جیسا کہ اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لیے مفید سمجھی اُس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی ۱۸۶۷ء میں انھوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اُس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سرسید قرار پائے

اور کمیٹی کی تجویز سے ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام "ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طریقہ سے جو اُن کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بعضے اپنے دوستوں کو جو کسی مرض مزمن میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لیے دوائیں بھجوائیں۔ اس طرح اُس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہو گیا۔ پایونیر کے پرچہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہوسپٹل میں آئے۔ حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقۂ علاج سے مطلق واقف نہ تھا"۔ ۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کو سرسید نے ایک طول طویل لکچر ہومیو پیتھک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقۂ علاج تمام طریقوں سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا۔ اور ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر بموجب اصول ہومیو پیتھک کے لکھا۔ یہ لکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سرسید ہمیشہ سے جیسا کہ اُن کی مذکورہ بالا ملکی خدمت سے ظاہر ہوتا ہے اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مِل جُل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ اُن کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا اُن کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو ربط و ضبط اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی

نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔ جو عزت اور جاہ و منصب دراموں سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اُس سے محروم تھے، اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے اُن کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اُس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور امنگیں بھری ہوئی تھیں، مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہلنے سے کہ دریا میں خاک کیوں اُڑاتے ہو اُس سے دست و گریباں ہو جائے۔ اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی، فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے اُس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اُس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کیجائے اور بجائے اُس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے اُن کا بیان ہے کہ اُنہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیئر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر اُنھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت

کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اُس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اُس کے لیے کمیٹیاں مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورۂ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔

یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ اُنھیں دنوں میں لفٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو ایڈریس ایسی اُردو میں دیا گیا جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کیے گئے تھے اور اُس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگالہ میں رہا ہو آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگالہ میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے اسی طرح صوبۂ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کیے جائیں۔ چونکہ ہز آنر ایڈریس کے بہت ہی کم الفاظ سمجھے تھے انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہے یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انھوں نے چند روز بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حرف اور جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو۔ ہرچند مسلمانوں نے اور بہت سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور اُن کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخرکار مجلس کے سکرٹری بابو سردا پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط کتابت شروع کی۔ سکرٹری کی متعدد چٹھیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے ہر ایک کا جواب

دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا۔ آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کیے۔ الٰہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجی۔ سنا گیا ہے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور غالباً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہوگئی کہ فارسی خط اور اُردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اُردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اُردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اُردو قائم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجی۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی حضور سر انٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اُردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا

جو ۱۹ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الٰہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اُس کو اس باب میں بذریعۂ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہانتک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندؤوں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہ کرتے تھے جس طرح وہ ہندوستانیوں کے انگریزی لباس اور انگریزی طرزِ معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ اُن کی تنگدلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے، اسی طرح انھوں نے اُردو زبان کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا کیے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آرٹکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندؤوں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اس زمانہ میں جب کہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ اور معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی دناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظرِ عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکرا سمجھتی ہے۔" اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اُردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کیں ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی مگر جو کچھ انھوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا ہے کہ آیندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اُردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعوے نہیں کر سکتی، اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں، خود گورنمنٹ

اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۳۷ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں کی قومی زبان اُردو ہے۔ یہ صوبہ اُن دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اُردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں، یعنی دلّی اور لکھنؤ۔ اس صوبہ کے ہندو عموماً اُردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرتِ تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ "من بجنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد" فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ گارساں تاسی جنھوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہموطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔"

رسالہ احکام طعام اہل کتاب

۱۸۶۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال بطور استفتا کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ سرسید نے اُس کا جواب آیات و احادیث کے حوالے سے لکھ دیا کہ جائز ہے، اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کے سوسائٹی کے اخبار میں چھپا۔ اُس پر ایک سید صاحب نے اڈیٹر کے نام لکھنؤ سے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی اور لکھا کہ "میں اُس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق

ہوں جب یہ سنوں کر سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔" اس کے جواب میں سر سید نے لکھا کہ "میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کرکے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تامل کرے۔ اسی لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سؤر یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں اُن کے ہاں مہمان ہوتا ہوں اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ جس چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اُس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے؟"

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے سر سید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے۔ رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیوگے؟ میں نے کہا یہاں چائے کہاں؟ انھوں نے کہا ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چلکر نگینے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جاکر جماعت میں شریک ہوگیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے، پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے؟ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور اُن کے ساتھ کھانا درست ہے۔ اُن لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھالو اور

خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔"

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے لیکن ابھی تک اُن کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلانے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ رسم و رواج کی قیدیں ایک آدمی کے اٹھا دینے سے نہیں اٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر رہنا اُس وقت تک موقوف نہ ہوگا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول اور ربط ضبط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلا واسطہ معلوم کرنے کا موقع نہ ملے، اس لیے انھوں نے ایک مبسوط اور مفصّل تحریر ۱۸۶۸ء میں بنام بہ رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب" بنارس میں لکھ کر شائع کی جس میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی اور روایاتِ فقہی سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے سے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود اُن کے ساتھ انھیں کے ہاتھ کا پکا ہوا انھیں کے برتنوں میں اور انھیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے، صرف سُور اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالہ میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام مواکلت اہلِ کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا، نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کے لیے کافی ووافی ہو لکھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اول بہت شور و غل ہوا۔ سرسید کو کرسٹان کہا گیا۔ اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا۔ اُن کے رسالہ کے جواب لکھے گئے۔ بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں مگر بقول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا۔"

مطلع صاف ہوگیا۔ اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جاکر اور اُن کو اپنے ہاں بلاکر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقوے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

چوتھا باب

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک

سفر انگلستان، سفرنامہ، لندن کے عمائد سے ملنا، جلسۂ کنوشین سوسائٹی آف سول انجینیرس میں شریک ہونا، سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغا ملنا، ملکۂ معظمہ کی لوی میں شریک ہونا، پرنس آف ویلز کی لوی میں بلایا جانا، ایتھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر غور کرنا، تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ لکھنا، خطبات احمدیہ لکھ کر شائع کرنا، جان ڈیون پورٹ کی کتاب چھپوا کر شائع کرنا۔

سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آیندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا نہایت ضروری تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں برابر سرگرم رہے، مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے اُن کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کے لیے جس کا اُن کو حد سے زیادہ خیال تھا، بہت سی ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔

مگر اُس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اول تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے شرمندہ رہی ہو، اس کو ولایت جانا اور وہاں جاکر اپنے تمام مقاصد پورے کرنے کے لیے ایک مدت تک قیام کرنا سخت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر

تانتا بندھا ہوا ہو اُس زمانے میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دور دراز سفر سے ہچکچاتے تھے اور بمبئی و بنگال کے متعدد آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔

حسن اتفاق سے اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو سکالرشپیں چند صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبہ کی سکالرشپ کے لیے سید محمود کو انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا، مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرسید کے ارادہ کو بہت تقویت ہوئی۔ انھوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی جس نیت اور جس ارادہ سے انھوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر اُن کی درخواستِ رخصت سے جو ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی معلوم ہوتی ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب غریب نتیجوں اور اُس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولتمند، طاقتور اور دانا ہیں اور اُن مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اُس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اُس کے شہروں کی صفائی اور اُس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔"

"پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہموطنوں کے

> لیے ایک نظیر قائم کروں مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے اُن کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو چند باتیں میں نے سیکھی ہوں اُن کو بھی سکھاؤں اور اُن کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔"

مولوی سید مہدی علی خاں اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذات خود اصول وطرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔"

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دونوں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا اُن کا قدیم خدمتگار چھجو، یہ چار آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انھوں نے بطور ایک سفرنامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

سفرنامہ | اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں اُن کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جابجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور مورل حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دھن میں سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اس سفرنامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا دھن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی میں شرابور ہے۔ بمبئی میں پہنچ کر کہیں وہ بمبئی کے مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پرستی، جھوٹی شیخی کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور گھروں پر مدرس نوکر رکھنے پر افسوس کرتا ہے اور پارسیوں کی عمدہ حالت

سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے کہیں پارسیوں کے صاف اُردو بولنے پر حیران ہوتا ہے اور اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں اور پھر سوال کرتا ہے کہ الہ آباد انسٹی ٹیوشن کون کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی؟ مصر کی ریل کی تعریف کرکے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے؛ مصریوں کی کوئی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر ونسن فرمیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے اور پنجاب کی طرز حکومت کے ذکر میں اس کو ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے اور دلی کو قانونی اضلاع میں سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنے کو غدر کی سزاؤں میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجینئر ایم۔ دی لیسپس سے جس نے نہر سویز نکالی ہے، جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اُس کو ایڈریس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر لیسپس رکھنا زیبا ہے تو ایم۔ دی لیسپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہر فرانس رکھا جائے۔ وہاں اُس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفریں کرتا ہے اور اپنی قوم پر نفریں کہ اُن کا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور جھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں اور اسی سبب وہ بدبختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر "حب وطن، گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا اور اُس جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے، زیارت میسر آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت روضۂ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اُس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی موزونیت دیکھ کر قلعۂ دہلی کی نہر بار بیچ اور مہتاب باغ کا حوض جس کے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوٹتے تھے اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہے۔ وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہے، مگر الجزائر کے محاربات کی تصویروں میں ایک مرقع دیکھ کر اُس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے، جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اُس کی بہادری و سولیزیشن کو قابل نفریں سمجھتا ہے۔ اُس نے ایک

تصویر دیکھی ہو کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں، فرانسیسی سپاہیوں نے اُن کے اونٹ بٹھا کر کجاوہ کو گرا دیا ہے اور عورتیں اُس میں سے نکل پڑی ہیں اور اُن کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہی، سپاہی سنگینیں اٹھائے ہوئے اور اُن کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے، ارد گرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لیے اُن عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا، آنکھوں سے خون نکلنے کے لیے کافی ہی اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لیے قابل شرم ہی اور اُس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہی۔ پھر کہتا ہی کہ " اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ویسی ہی عزت دل میں پیدا ہوتی ہی جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تن تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا اور فریب کے لڑتا رہا اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی اُن کو اخیر عمر تک نباہ دیا۔" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر دیکھتا ہی جس میں نپولین امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہی اور اُس کی ماں سے جو باہر پھرنے کا پورا پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہی، مصافحہ کر رہا ہی۔ اس تصویر کو دیکھ کر نپولین کی فیاضی، دانائی اور ہمت کی تعریف کرتا ہی۔

اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہی اور اپنے سفرنامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہی کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں۔ پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لٹکواں پل کے بننے کی تاریخ بیان کرتا ہے جو مدت سے ناتمام پڑا تھا اور جس کو سول انجنیرس انسٹیٹوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے باہم اتفاق کر کے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہی اور کہتا ہی کہ اے میرے ہم وطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے، ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک صدگاہ کا ذکر لکھ کر

کر ایک عورت اُس کا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیان علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھنا شروع ہوا تھا، مگر جب اُس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اُس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صداؤں سے زیادہ آشنا نہ تھے؛ اس لیے انھوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا۔ مگر زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

لندن کے عمائد سے ملنا

الغرض سرسید بمبئی سے جون میں لندن پہنچے اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹھہرے اور اپنے تمام دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر اُن کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ اُنھوں نے ہی سرسید کو لندن کے اکثر امراء و مشاہیر سے ملوایا تھا، لارڈ اسٹینلی اوف ایلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سر جان ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہو گئی تھی۔ ملکۂ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے پیٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس اوف لارن سے بھی جو ملکۂ معظمہ کے داماد ہیں اُن کو ملایا۔

جلسۂ سول انجینئرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ بااینہمہ اُن کو اکثر

خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۴ جولائی کو سمتھونین سوسائٹی اوف سول انجنیرس کے ایک عظیم الشان جلسہ میں اور اُس کے بعد جو اُسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا اُس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کیفیت ڈیلی نیوز مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پن نے جو سوسائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ تھے، سر سید کو اس جلسہ میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقتِ معین پر میرے اسٹیمر میں جو پارلینٹ ہوس کے سامنے موجود ہوگا آئیں۔ مگر خود لارڈ لارنس سر سید کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کر کے لے گئے سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جا کر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجنیر شریک تھے۔ کھانے میں طرفہ بات جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینیو[1] میں مندرج ہے، یہ تھی کہ تیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے، خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجنیروں نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد اسپیچیں دیں اور سال گذشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجنیرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپیچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سر سید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔ اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی (سر سید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا تھا کہ جلسہ کی تمام کارروائی کو اُن کو اُردو میں سمجھاتا جائے) لارڈ لارنس کے بعد سر سید اُٹھے۔ ایک ایسے جلسہ میں جہاں انگلستان کے نامور انجنیر جمع ہوں اور جلسہ کا موضوع انجنیرنگ کے سوا

---

[1] مینیو ایک خوبصورت چھپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر ایک مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینیو سر سید کے کاغذات میں اب تک موجود ہے جس میں تیس کھانوں کے نام لکھے ہیں ۱۲

اور کوئی مضمون نہ ہو، سرسید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا، باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی۔ پریزیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر آف انڈیا کہا تھا، سرسید نے اُن کو فادر اوف انڈیا کہہ کر یاد کیا۔ سرسید کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب وداب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل وانصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انہیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوئی ہے جن کو اُن سے کام پڑا ہے یا جن کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے لیکن وہ چیز جس نے خاص وعام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجنیری کے نتائج ہیں جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خودبخود انگریزی سلطنت کا رعب وداب اور اُس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے۔" اس پر جلسہ میں نہایت زور سے چیرز دی گئیں اور جب لارڈ لارنس نے اُس کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیرز کا غُل ہوا۔ سرسید کہتے ہیں کہ میرا ارادہ اسپیچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے تھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لیے مجھکو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

خطاب اور تمغا ملنا ۶؍ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا اوفس میں ڈیوک اوف ارگائل کے ہاتھ سے اُن کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغا ملا۔ اُس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔ تاریخ معین پر سرسید انڈیا آفس میں گئے۔ وہاں سرجان ڈبلیو کے انڈر سکرٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے ہمراہ اُس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آوف آرگائل اُن کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکوئس اوف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغا اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارکباد کہہ کر سرسید کو رخصت کیا۔ اُسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغا ملنے والا تھا۔ جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سرسید کو کھانے پر بلایا جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سرسید کو اس

موقع پڈوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔

لطیفہ جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اُس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکشن داس صاحب کو یہی خطاب ہندوستان میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں عمل میں آئے تھے جب جلسہ برخاست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست اُن کو مبارکباد دینے لگے سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی۔ ایس۔ آئی کا لفظ سنتا تھا اور نہایت تعجب کرتا تھا۔ باہر آکر اور نوکروں سے کہنے لگا اے یار عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر! لندن گئے تھے وہاں جاکر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کسی نے نہ جانا، ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا کہ یہ ہندوستان ہی میں بھرے جلسہ کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی ایس۔ آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکہ معظمہ کی لوی وغیرہ میں بلایا جانا

۶ نومبر ۱۸۶۹ء کو ملکۂ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائرز برج، ہالبورن اور وایڈکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا جلسہ کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پر وہاں مدعو کیا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ جلسہ نہایت شان وشوکت کا تھا۔

پھر ۱۱ مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکۂ معظمہ کی لوی میں اُن کو بلایا گیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ حسب معمول لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا جب ملکۂ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جاکر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکۂ معظمہ سے ہاتھ ملاکر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا اُس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں۔

پرنس آف ویلز کی لوی میں بلایا جانا

اس کے بعد ۱۸۷۰ء کو پرنس آف ویلز کی لوی میں اُن کو شریک کیا گیا۔ یہ لوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھی، کسی سویلین کو اُس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی، مگر چونکہ سرسید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن تھا کہ اُن کو پھر پرنس آف ویلز کی کسی لوی میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے، اس لیے اُن کو خاص اجازت

بوی میں شریک ہونے کی بل گئی تھی۔

اتھینیم کلب کی ممبری لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سرسید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے۔ جب لندن میں گئے تو اُس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا، لیکن سب سے بڑا امتیاز جو اُن کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے علاوہ اتھینیم کلب کا آنریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب معزز خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ سنہ ۱۸۶۹ء میں جب کہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر گذر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اُس کے دوست اس کو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سرسید خاص قاعدے سے جو نامور اور مشہور باکمال لوگوں کے لیے مقرر ہے دو دفعہ اتھینیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اُس کے ممبر رہے اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر اڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سرسید کی منصفی کے زمانہ میں دلی کے جج تھے اور جنھوں نے اُن کو آثارالصنادید کے دوبارہ لکھنے اور ترمیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں جانا آثارالصنادید کا مترجم گارساں دتاسی جو فرانس کے مشہور مستشرقین[1] میں سے تھا وہ بھی لندن ہی میں سرسید سے خط کتابت اور شوقِ ملاقات رکھتا تھا۔ مگر یہ تمام اعزاز و امتیاز اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا سب یہ

[1] زمانۂ حال کی عربی میں اورینٹلسٹ کو مستشرق کہتے ہیں ۱۲

ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اُس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کرلیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اُس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ اُن کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑی ہوں گی، اور شاید اُن کو پوری واقفیت حاصل نہ ہوسکی ہو، مگر جو نتیجے اس ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ اُن کا عشر عشیر آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر آئے ہیں۔

انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ اُن کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے ملاحظہ کیے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی۔ یوروپ کے طریق معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے امرا کے محل اور مکانات اور طرز ماندوبود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجنیری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بنا، انجنیروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان کے علمی ذوق شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا جس سرگرمی کے ساتھ اہل مذہب مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پردیسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطع نظر

کی اور اُن کی خوبیوں کو چُنا اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے دردِ دل کو بڑھایا اور اُس درد کو دوسروں کے دلوں میں پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں پوچھا کہ "کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

اُن کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُس کو اپنے سفرنامہ میں مفصل بیان کر کے اہلِ وطن کو خبردار کریں، مگر اہلِ وطن نے اُس کو برداشت نہ کیا، وہ اپنی پستی کی دردانگیز داستان نہ سن سکے اور اس لیے جو سلسلہ سرسید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا، وہ منقطع ہو گیا۔ بااینہمہ، وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے جستہ جستہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے اور جب کبھی موقع ملا انھوں نے کوئی نہ کوئی بات اہلِ وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو انھوں نے ایک لمبی تحریر سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کیے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادبار و تنزل کی مثالیں پیش کر کے اہلِ وطن کو غیرت دلائی تھی۔ جب اس تحریر کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برافروختہ ہوں اور بُرا بھلا کہیں کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان "عرضداشت سید احمد بخدمت اہلِ وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں سرسید کو اہلِ وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے قوم کو

کے کان پر جوں نہیں چلی، مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں اُن کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان میں پہنچ کر سرسید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سرسید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرا کر شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاصکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف اوف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانیِ اسلام کے کیرکٹر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق جو ٹھیک اطلاعیں سر ولیم نے اہلِ یورپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانیِ اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو دقتیں سرسید کو اُس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش اور اُمنگ سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور جو رائیں انگریزوں نے اُس پر دیں، یہ سب امور ہم دوسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ولایت میں سرسید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی اردو یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کرا کے چھپوایا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بہت بعد انھوں نے اُس کو اُردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے ازسرِ نو مرتب کر کے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تقطیع پر ٹائپ میں چھپوایا تھا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر چونکہ اس کی جلدیں بہت ہی کم چھپوائی گئی تھیں اس لیے اُس کی زیادہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ خطبات احمدیہ لکھنے کے سوا اُنھوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بعض خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ سرسید نے جس تحریر کے ذریعہ سے ولایت جانے کے لیے گورنمنٹ سے اجازت

چاہی تھی، جو کچھ اس تحریر میں لکھا تھا۔ اُس سے بہت زیادہ اپنے ارادوں کو پورا کر کے دکھایا۔ وہ لندن سے نہایت قیمتی اطلاعیں لیکر ہندوستان میں آئے جن سے اُنھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں اُن سے پہلے غالباً کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے۔ محض انہیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور انھیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے دیسی طالبعلموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا۔ جس زمانہ میں سر سید ولایت گئے ہیں انھیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار علیگڑھ میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانیوں کے واسطے ایک عمدہ مثال قابل تقلید قائم ہو گئی ہے چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان مسلمان سید امیر علی (جو اب آنریبل سید امیر علی سی۔ایس آئی۔ بیرسٹرایٹ لا اور جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں) لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت جانے کو تیار ہو رہے ہیں۔" سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے ہی میں سر سید کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں اور اُس کی خوبیاں یوریئن قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی اُنھوں نے سر سید کا پورا پورا اتباع کیا ہے۔ اُن کی دو بادقعت کتابیں "لائف اوف محمد" اور "اسپرٹ اوف اسلام" جو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں، اور یہ حامی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔"

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ اُن کی روانگی کے بعد ایک لمبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام نے اخبار رہوم ورڈ میل مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ نومبر ۱۸۷۰ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں لکھے جاتے ہیں۔ "جن انگریزوں سے یہاں (یعنی انگلستان میں) اُن کی ملاقات ہوئی اُن پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی اُن سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا، بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ 'اگر ہم ایک ایسے لیئق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی (پور) ہوتی — اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اُس کی اہلِ یورپ کیسی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ . . سید احمد خاں کی بدولت اس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجے کے انگریز اُس سے بڑی محبت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں۔"

پانچواں باب

۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک

ولایت سے واپس آنا۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو۔ ابتدائی مدرسہ علیگڈھ میں قائم کرنا۔ کالج فونڈیشن سٹون۔ چندہ وصول کرنے کی تدبیریں۔ عمارات کالج۔ کالج کلاسس قائم ہونا۔ تفسیر القرآن۔

ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا

۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سر سید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آتے ہی اُنھوں نے اُس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انھوں نے ولایت جانے سے بہت پہلے باندھا تھا اُس کے پورا کرنے میں ظاہرا اُن کو دو سخت مزاحمتیں نظر آتی تھیں۔ اول مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے اُن کی نفرت اور ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد آرٹکل جو انھوں نے لندن سے لکھ کر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی اور جا بجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری مزاحمت اُن کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ اُن کا ارادہ جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائے گا فی الواقع ہندوستان میں پہنچ کر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی لیاقت پیدا ہونے کی اُن کو ہرگز امید نہ تھی۔ اس لیے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے ولایت میں

ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان "ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات" تھا مگر چونکہ اس میں سرسید نے اپنی ذاتی رائے لکھی تھی اس لیے اُس سے بھی کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی امید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں پہنچ کر دو بڑے بڑے کام ایک ساتھ شروع کیے۔

تہذیب الاخلاق | اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھوں نے اس پرچے کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور اُن کے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لینا قرار پایا تھا۔ یکم شوال ۱۲۸۷ہجری مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اُس کا اول نمبر شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اُس کے اڈیٹر اور مینیجر خود سرسید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی اخبار نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اُسی کی ترقی میں صرف کی جاتی تھی۔ اُس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا "حُبّ الْقَوْمِ مِنَ الْاِیْمَانِ فَمَنْ یسعٰی فی اعزاز قومہٖ اِنَّمَا یسعٰی فی اعزاز دینہٖ"

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اڈیسن نے دو میگزین یعنی ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نوبت بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۱ء تک جاری رہے۔ ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن سے انگریزوں کے اخلاق عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اُس وقت انگلستان کی حالت کیا باعتبار علوم و فنون اور کیا باعتبار اخلاق و معاشرت کے آج کل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اُس عام ریفارمیشن کی بدولت جو لوتھر اور کالون نے کی، بہت کچھ اصلاح پا چکے

تھے۔ اس لیے ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا، اُس میں مذہبی بحث کرنی لازم آپڑی تھی، کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں۔ اگرچہ اس پرچہ میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسہ سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوء ظن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا نورالآفاق اور نورالانوار زیادہ مشہور تھا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کیے گئے۔ رسالہ اشاعۃ السنہ جو خاص اہل حدیث کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے اور سرسیّد کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے، یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرشان کہلانے لگے۔ لطیفہ: جب محسن الملک سید مہدی علی خاں کے چند مضمون نہایت دھوم دھام سے اس پرچہ میں شائع ہوئے تو کسی سُنّی صاحب نے اُن کے چچا سے جن کا تمام خاندان محسن الملک کے سوا اثنا عشری ہے، جا کر کہا کہ آپ کے لیے رونے کا مقام ہے کہ مہدی علی خاں کرشان ہو گئے۔ انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ میاں اب تم کو رونا چاہیے، ہم تو اُسی دن رو چکے تھے جب اُس نے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ کر تمھارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

بااینہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتد بہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا جیسے انگلستان والے ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اس کے مضامین پر وجد کرتے تھے اور تاریخ معین پر اُس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے

اور اُس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔ جو نتائج اس پرچہ سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے اُن کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائے گا یہاں صرف اس قدر کہا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہرا اُن کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اُس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اُس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یورپ کی سویلزیشن کے اصول و فروع سے اور اُن اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو نفرت دلائی جائے اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہاں تک اُس میں غلطی ہو اُس کو ظاہر کیا جائے علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے اُن کی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دنیا میں اُن سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں اُن کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن اُن سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے، اُن کی قدیم علمی اور عملی ترقیات اُن کو یاد دلائی جائیں اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید اور اُن کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی

جہاں تک ہوسکا اپنی زبان میں بیان کیے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور اُن کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو اُنھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اس لیے اول اول لوگ اُس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اُس کا اثر پھیل گیا۔ اَن پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اُس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اُس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ اُمرا تک اُس کی رسائی ہونی سخت دشوار تھی کیونکہ اُن کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق کا اثر صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاص کر دلّی اور لکھنؤ اور اُن کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندلے نشان باقی تھے اُس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اس کے چونکہ اُس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی اُس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اُس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے مضامین کا جزو اعظم سرسید کی دلنشیں تحریریں اور سید مہدی علی خاں کے دلکش آرٹیکل تھے۔ سرسید کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اُس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں پر بھی لوگ سر دُھنتے تھے۔ اس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی سے برخلاف اُس قدیم دلآزار طریقہ کے جو مسلمانوں کے مناظرات و مجادلات میں جاری تھا، بیان کی جاتی تھی۔ کسی شخص کی طرف روئے سخن بہت کم ہوتا تھا، بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے نہ بطور طعن و تعریض کے گفتگو کی جاتی تھی۔ اُس میں ظرافت بھی ہوتی تھی، مگر نہ ایسی کہ کسی کو ناگوار گذرے

اُس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اس لیے مناظرہ کے بے مزہ ردّ و بدل اور جواب ردّ جواب و کدّ جواب و حدّ جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا کیونکہ اُس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جو بات سچ معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈالدی جائے نہ یہ کہ اُن سے زبردستی منوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کی روئدادیں اور تمام حالات اُس میں کئی برس تک برابر چھپتی رہیں، اس لیے مدرسۃ العلوم کو اُس سے بہت تقویت پہنچی۔ ادھر تو اُس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور اُدھر چندہ کی روزافزوں ترقی، بانیان کالج کی سرگرمی، اور سرسید کی کوششوں کے کل نتائج اُس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا تھا۔

سنہ ۷۶ء میں جب سرسید پنشن لیکر علیگڑھ میں آگئے تو اُن کو ہمہ تن مدرسہ کی تکمیل اُس کی عمارتیں تیار کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا اس کے سوا اُن کے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر اُبال آنے کی قابلیت تھی اُس قدر اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اُس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان سنہ ۱۲۹۳ھ کے پرچہ پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ چھ برس کے عرصہ میں ۲۲۴ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چسکا لگ گیا تھا اُن کو اس کا بند ہونا شاق گذرا اور اُن کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اُس کو پھر جاری کیا جائے۔ آخر جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دو برس پانچ مہینے جاری رہ کر بند ہو گیا، اس دفعہ چونکہ سرسید کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف مصروف رہی اور اُن کے سرگرم معاونوں کو اُس مدد دینے کی فرصت

یا موقع نہ تھا اس لیے اُس میں پہلے کی نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔ اب کی بار کل ۹۰ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف آٹھ شخص تھے۔ ازاں جملہ ۶۳ مضمون سرسید کے اور باقی اور لوگوں کے تھے۔ شوال ۱۳۱۱ ہجری میں سرسید نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اُس کو پھر جاری کیا مگر اس دفعہ اُس کا دارومدار بالکل سرسید کی ذات پر رہا اور لوگوں نے اُس میں بہت مدد دی آخر تین برس جاری رہ کر بند ہوگیا۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسید نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم پر غور کرنے کے لیے اُنھوں نے بنارس ہی میں ایک دوسری کمیٹی قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان کی نسبت اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اُس زمانے میں مرزا پور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے۔ مگر اُنھوں نے اُس کی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈال دیں اور معمولی اشتہاروں کی طرح اُس کی اشاعت کو محض بے سود خیال کیا۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو اُنھوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے رکھ دیے اور یہ کہا کہ ہر شخص سید احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔ اب سرسید نے خود اُس کام کو شروع کیا۔ وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" جہاں جہاں مناسب سمجھا بھیجا اور اخبار کے ذریعہ سے بھی اُس کو شائع کیا۔ خلاصہ اس التماس کا یہ تھا کہ "انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اُٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُن سے مستفید نہیں ہوتے، اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں اُن پر کافی بھروسا نہیں ہوسکتا اور بالیقین نہیں کہا جاسکتا کہ درحقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب

دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اُس وقت چندہ دہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے"

اس چندہ میں سب سے پہلے سرسید نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی اور باتفاق مولوی مہدی علی خاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ دسمبر ۱۸۷۰ء میں یہ اشتہار جاری ہوا تھا اُسی مہینے میں ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور، کنور وزیر علیخاں مرحوم رئیس انوپ شہر ضلع بلند شہر اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض ۲۶ر دسمبر کو بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہوگئی جس کے سکرٹری سرسید قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علوم قدیمہ اُن میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ اور جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو اُن کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور اُن تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔

نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ "جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو اُن کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا نخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی" پھر آپ ہی کہنے لگے کہ "جو جلسہ کل ہونے والا

ہی مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گذر گئی ہے کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں " نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ "سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گذری اُس کو بیان نہیں کرسکتا اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی جانتا ہوں "

اُسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو، تین سو، ڈیڑھ سو روپئے کے مقرر ہوئے تھے جاری کیا گیا اور میعاد معین تک ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے سکرٹری کے پاس پہنچے۔ مولوی مہدی علی خاں کا مضمون سب سے عمدہ تھا مگر اُن کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا اور پہلا مولوی سید اشرف علی ایم۔ اے کو جو اُس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، دوسرا نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسید نے ان مضامین سے ایک عمدہ رپورٹ اُردو انگریزی میں تیار کی جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کرکے اُن سے مفصلہ ذیل نتائج استخراج کیے تھے (۱) ہندوستان کے سمجھ دار مسلمان ان تعصبات کو جو پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر جانتے ہیں (۲) مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بمقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیے اُس سے بہت کم ہے۔ (۳) جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے اُن میں سے کچھ ناواجب اور اکثر واجبی ہیں اور سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے (۴) اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کرے تو بھی اُن کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں (۵) مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقۂ تعلیم بھی مندرج تھا جو سرسید نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کے موانع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کرکے

گئے تھے اُن کی نسبت شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۲ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کیے ہیں جو سرسید نے ۱۸۷۲ء میں اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔"

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھی بھیجی گئی تھی چنانچہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں درکار ہیں اُن پر رائیں لکھی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکرٹری کے پاس بھیجے ہیے۔ اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیمی کمیٹیوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ قائم ہوگیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے بموجب قواعد گرانٹ ان ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دے گی۔ اس کے بعد سکرٹری گورنمنٹ ہند کی چٹھی مورخہ 9 اگست ۱۸۷۳ء اس مضمون کی پہنچی کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو تجویز مندرجہ رپورٹ کمیٹی خواستگار ترقی کی اطلاع سے جو بابت قائم کرنے اینگلو اورنٹیل کالج کے ہے، نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہونی چاہیے ویسی ہی ہوگی۔ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اُس میں مدد دے اور سید احمد خاں بہادر اور اُن صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں اُن کے شریک ہیں نہایت تحسین و آفریں کے قابل ہیں۔" ان دونوں چٹھیوں کے آنے سے کمیٹی کو مدد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

کمیٹی خزینۃ البضاعۃ | ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسۂ مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام "کمیٹی خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا اور اُس کے لائف سکرٹری سرسید قرار پائے اور یہ ٹھیرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لیے لائق سرمایہ جمع نہ ہوجائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکرٹری کا قیام ہو چنانچہ جب تک مدرسہ علیگڑھ میں قائم نہ ہولیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سرسید جج سمال کاز کورٹ تھے۔

جولائی سنہ ۱۸۷۲ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرستہ العلوم کونسے شہر میں قائم کیا جائے۔ اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعضے لوگ جو پرامیسری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ ہمارے روپیہ سے جائداد خریدی جائے۔ پس تاوقتیکہ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ قرار نہ پالے جائداد نہیں خریدی جاسکتی تھی کیونکہ جائداد کا مقام مدرسہ کے قریب خریدا جانا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف رائیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جنھوں نے علیگڑھ کو ترجیح دی تھی اُن کو معلوم تھا کہ سرسید نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلی کی سکونت ترک کر کے علیگڑھ میں بود و باش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں کی جو حالت ہوگئی تھی وہ اُن سے دیکھی نہیں جاسکتی تھی۔ اُن کو پنجاب کی طرزِ حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کے ایک جلیل القدر حاکم سے صاف کہدیا تھا کہ دلی کو شمال مغربی اضلاع سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنا انھیں سزاؤں میں سے ایک سزا ہے جو فتح دہلی کے بعد اہل دہلی کو دی گئیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ منصوبہ سرسید نے باندھا تھا اُس کا دلی میں پورا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

کمیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لیے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے ایک ہزار روپیہ کا چندہ اور اسی طرح مسٹر اسپنکی جج ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک معقول رقم مدرسہ کے لیے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسید کی کوششوں میں جان ڈال دی اور کمیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی جب اس طرح سے چندہ میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کمیٹی میں تحریک کی کہ کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کی بموجب ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہونی چاہیے۔ ورنہ تمام جائداد اور پرامیسری نوٹ سکرٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائیں گے اور میرے اور

میرے وارثوں کے نام منتقل ہو سکیں گے۔ چنانچہ کمیٹی مذکور کی رجسٹری حسب ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپہ کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرسۃ العلوم کے لیے جمع ہوا ہے یا آئندہ جمع ہوگا اس کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے

فروری ۱۸۷۲ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلۂ تعلیم کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقۂ تعلیم دیکھ کر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی۔ موجودہ ممبروں نے اس کو پسند کیا اور منظوری کے لیے اس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی گئیں اور نیز لوکل گورنمنٹوں اور گورنمنٹ ہند میں بھی اُس کی نقلیں ارسال کی گئیں، تاکہ اگر گورنمنٹ اُس اسکیم کو پسند کرے تو گرانٹ اِن ایڈ سے حسب وعدہ امداد کرے۔ نیز ایک استفتا مع اس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس بھیجا گیا جس میں اُن سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسہ میں اس اسکیم کے موافق تعلیم دی جائے گی اُس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتا شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی نے جو اُس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتا شائع کیا جس میں بنارس کے استفتا کو غلط اور دھوکا دینے والا بتایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ یہ پہلی مخالفت تھی جو علانیہ مدرسۃ العلوم کے ساتھ کی گئی۔ ! س کے بعد ادھر ادھر مخالفتیں ہونی شروع ہوئیں۔ بعضوں نے مشہور کیا کہ مدرسہ میں سید احمد خاں کا بت اور اُن کے معاونوں کی تصویریں قدِ آدم یا نصف قدِ آدم رکھی جائیں گی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی اور اس طرح باطل کی اعانت کی جائے گی۔ بعضے کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اُس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں چندہ دینا یا اُس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں۔ بعض کا یہ اعتراض تھا کہ جو روپیہ چندہ سے جمع ہوگا وہ سود میں لگایا جائے گا اور اس کے پرامیسری نوٹ خریدے جائیں گے اور مدرسہ میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے گا۔ بعضے کہتے تھے کہ یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک ہے اس کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو

سرانجام کرسکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کو سن کر ہمدرد آدمیوں کے دل بھی افسردہ ہوجاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں چند دیسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرستہ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے۔ ایک آدھ مضمون انڈین آبزرور میں بھی مدرسہ کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا، مگر اودھ اخبار، پنجابی اخبار، اردو گائڈ، پٹیالہ اخبار اور انگریزی اخباروں میں پائونیر ہمیشہ مدرسہ کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انھیں ایام میں چندہ کی آمد بھی سست پڑگئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے۔ انھوں نے دوستوں کی ہمت بندھوانے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لیے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اُس کے شائع کرنے کی درخواست کی۔ اُس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں "اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خود شہر بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دورہ کرنے اسپیچیں سنانے اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے، اس کام کے لیے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدوں خرچ کے دورہ نہیں ہوسکتا کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا پھر نہیں نکلتا، پس دورہ کرنے کا وقت، اُس کی محنت اور اُس کا خرچ سب ہم کو اپنی گرہ سے کرنا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے۔ اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور اگر اس میں آنکھ بند ہوگئی اور لحد میں جا سوئے تو یہ امید رکھیں گے کہ" مرغے از غیب بروں آید و کارے بکند "

اب سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی شروع کی۔ جہاں جہاں اُن کے دوست اور مددگار تھے وہاں اس غرض کے لیے سب کمیٹیاں قائم کیں، جیسے مرزاپور، علیگڑھ کانگڑہ، پٹیالہ وغیرہ۔ اور خود سرسید نے مع اپنے اکثر دوستوں کے اسی مطلب کے لیے پٹنہ، لاہور، گورکھپور وغیرہ کا سفر کیا اور ہر ایک مقام پر نہایت زبردست اسپیچیں اور لکچر دیے۔ تمام سب کمیٹیوں نے

توقع سے زیادہ چندہ جمع کیا اور سرسید کے ہر ایک سفر میں معتدبہ کامیابی ہوئی۔ انھیں دنوں میں سرسید نے ایک سرکلر بحیثیت سکرٹری ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یوروپین دوستوں سے درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ اور لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہندوستان، لارڈ اسٹینلی اوف ایلڈرلی، سر بارٹل فریر، سر چارلس ٹریویلین اور اڈورڈ ٹامس وغیرہم کے نام پرائیوٹ چٹھیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود تعلیم کے لیے انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آج کل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ چرچ متعلقہ ٹرینٹی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے اپنے دوست سے بر سبیل تذکرہ یہ کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسۃ العلوم ہی کی امداد کے لیے دیدیں۔ اُن کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سُنکر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ "جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے اُن کی اعانت کرنی گناہ ہے اُن کو تباہ ہونے دو"

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھ کر شائع کی جس کا نام "اور انڈین مسلمانز" تھا اس کتاب میں انھوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف

سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبارت یہ تھی "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟" آگے چل کر انھوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ "اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبیعت سے اپنی شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھیرا کر بغاوت کے بڑے فرض سے بچ جاتے ہیں"۔ پھر اس کے بعد لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں"۔ پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ "اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ میں صرف انھیں سے زیادہ واقف ہوں" لیکن جو فقرے ان کی کتاب کے اوپر نقل کیے گئے ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا، دوسرے بنگالہ کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا، تیسرے انھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اس پر اور طرہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

سرسید اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے، نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار منہ سے نکلا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے"۔ انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصول شرح بیان کیے ہیں، اور

صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا یا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا، انھوں نے جہاد کے مسئلہ کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں اُن کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت نہ اور کسی قسم کا فساد۔ اُن کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرمانبرداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے تھے۔

سرسید کے ریویو نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بُرے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اُنھوں نے تمام ریویو پاؤنیر کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوایا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا۔ سنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ اُس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اُس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو

---

۱ سنا ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسید سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ دونوں آگرہ جاتے تھے اور سرسید کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور ہے۔ اُس افسر نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟ انھوں نے کہا وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اُس نے سرسید کا سارا پتہ دریافت کیا اُنھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا۔ جب ریل آگرہ میں پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے پھر سرسید مسٹر ... صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے گئے اتفاق سے وہ افسر انھیں کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا اور اُن سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھیرا ہوا ہے۔ اب صاحب کمشنر نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ لو یہ تمھارے وہابی حاضر ہیں جب اُس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اُسے نہایت تعجب ہوا اور بہت دیر تک اُن سے بیٹھے

کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں جب یہ ریویو پاینیر کے ذریعہ سے شائع ہوا انھیں دنوں میں پاینیر مورخہ ۱۸ نومبر ۱۸۷۱ء میں ایک بہت مبسوط آرٹکل جو کسی بڑے لائق عربی داں انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گویا سر سید کی تائید میں چھپا اور پاینیر سے سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا۔ اس آرٹکل میں نہایت عالمانہ لیاقت سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا اور سر سید کی تائید کی گئی تھی۔ اس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو، موحد ہو، اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے محض تہمت ہے۔ ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے لیے ملازم ہیں کہ ان سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں، باایں ہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں اور سرکار نے سب سوچ سمجھ کے ان کو معتمد علیہ نہیں گردانا بلکہ غدر کے زمانہ میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی ان کی وفاداری کا سونا اچھی طرح سے تایا گیا اور وہ خیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ ان سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا۔ ہم ڈاکٹر ہنٹر کی آگاہی کے لیے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں۔"

اس کے ایک مدت بعد انڈین آبزرور مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۷۲ء میں خود اس کے یورپین اڈیٹر کا ایک زبردست آرٹکل سر سید کے ریویو پر نکلا جو درحقیقت ہندوستان کے یورپین حکام اور افسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔ ہم اس آرٹکل کے چند مقام یہاں بجنسہٖ نقل کیے دیتے ہیں تاکہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس ریویو نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا تھا اور تاکہ ہندوستانیوں

پر ظاہر ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرنے میں کس قدر غیر متعصب اور منصف مزاج ہوتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اُس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانانِ ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت، بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اُس کے بحر و پوچ ہونے کی بابت، بالاتفاق تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اُس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں، کیونکہ اُن کے سوا ہم نہیں جانتے ہیں کہ کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو جس کسی کو کچھ بھی علم اُن باتوں کا ہوگا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک ہی نظر میں معلوم کرے گا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور خاصکر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے وہ شمال مغرب کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں تک کہ جو قومیں اُس ملک میں بستی ہیں اُن کے نام تک نہیں جانتے اور امورات سلطنت کی پیچیدہ باتوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سید احمد کے زمانہ میں سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا، نہایت دھندلے خیالات کے سوا اُنھوں نے اور کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب سے کہ ملک پنجاب گورنمنٹ انگلشیہ کے قبضہ میں آیا ہے اُس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں اُن کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں بلکہ جب اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُس میں ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس کو اکبر کے زمانہ کے حالات کے تذکرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل غیر ممکن ہیں۔ اگرچہ وہ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث ایک مکہ کے مولوی کیسی فصاحت اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں، تاہم اُن کے مباحثہ کے ہر حصّہ کے مانند اُن باتوں کا علم بھی اُن کو اُن نہل اور بے صرفہ خیالات سے کچھ بڑھ کر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہوتے ہیں جس نے کچھ ہسٹری پڑھی ہو۔"

"اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہے جیسا اہم اوپر کہہ آئے ہیں یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔ ہر شخص جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کرے گا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس میں اس معاملہ کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کو یہ توقع تھی کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دلفریب عبارت کے ذریعہ سے کامیاب ہو جائیں گے، مگر غالباً انھوں نے اپنی ناواقفیت کی گہرائی کی تھاہ دریافت نہیں کی تھی، یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جانتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا، اس لیے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کر سکے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مدارات کریں گے؛ ان کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل کو لبھائے گی، مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھوئی گئی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا اُن کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھے بالائے طاق رکھ دے گا اور یہ سمجھے گا کہ قصہ کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں۔"

"سید احمد خاں کا چھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر ہنٹر کی تردید کے اور بھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے ہمارے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لیے بخوبی لائق ہے۔ سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور اُن کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر کار اور مذہبوں پر یہی مذہب غالب آئے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت گرمجوشی سے انگریزی علداری کے معاون ہیں وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کرنی چاہے تو تبدیلیوں کا ہوتے رہنا نہایت ضرور ہے۔ بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو روحانی سلطنت حاصل کرنی ہے تو وہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ملا جلا رہے۔ کوئی انگریز اس

قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کرسکتا، کیونکہ اُن کا دعویٰ اس قدر مدلل اور مستند ہی کہ کوئی انگریز اُن دلیلوں اور سندوں کا بیسواں حصہ بھی اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کرسکتا۔ پس اگر سید احمد خاں یہ کہتے ہیں کہ وہابی یا پکّے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہی کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ کرے اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہی ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی ہندوؤں کے ساتھ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب والوں کی مانند تمامی بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں، جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجہ کی واقفیت نہ ہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی کا الزام لگا سکیں اُس وقت ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں ہی کہ تعصب اور فساد کے مقابلہ میں ہم زیادہ احتیاط نہ کریں، لیکن اب ایسی باتوں کا خوف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہی، کیونکہ انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہی کہ مسلمان جس قدر زیادہ ایماندار ہوگا اُسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہوگا اور اُسی قدر اس کا یہ ارادہ ہوگا کہ یا تو وہ اُسے توڑے یا خود اُس سے ٹوٹ جائے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہی کہ اگر ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دائمی ملے گا، گورنمنٹ انگلشیہ کے لیے نہایت دقّت کی چیز ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہی کہ ایسی عمدہ سند سے جس کی عمدگی حتی الامکان ثابت ہی یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہی۔ ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو امید نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے ایسے معاملہ میں کچھ معتبر ہوگی۔"

اس کے بعد انڈین آبزرور کے اڈیٹر نے سرسید کے رسالہ سے چند فقرے نقل کرکے ان کی تائید کی ہی اور ایک لمبی بحث کے بعد اپنے آرٹکل کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سرسید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو، اس سے اُن لوگوں کا اطمینان ہونا چاہیے جو بزدل اور وہمی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالہ میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا تذکرہ ہم

کرتے اگر ہمارے اس پرچہ میں گنجائش ہوتی۔ ہم ایسی کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس میں ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے بغور پڑھنا چاہیے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلے گی۔ یہ ٹھیک اسی قسم کی کتاب ہے جس کی ضرورت آج کل اُن تمام عام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لیے ہے جو اپنی ناواقفیت کے سبب سایہ سے بھی بھڑکتے ہیں " سر الیفرڈ لائل اپنے ایک ایسے میں جو سرسید کے بعد تصیولوجکل ریویو میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ آبادتیا"

سرسید کے ریویو پر اور بھی بعض مدبرانِ سلطنت نے رائیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ریویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا تھا، اس کی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی، مگر ہم بطور نمونہ کے اُس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر یہ لکھا تھا کہ "مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں اُن ذات سے بڑی امید یہی کرسکتا ہوں کہ وہ حکومت انگریزی کے قبول کرنے میں سرد مہری کریں گے" سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ "اگر ڈاکٹر صاحبوں کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر مایوسی ہے تو میں اولاً اُن سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف توجہ فرمائیں "ولتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذٰلک بان منھم قسیسین ورھباناً وانھم لا یستکبرون" یعنی اے محمد تم پاؤ گے تمام آدمیوں میں سخت دشمن مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو اور پاؤ گے مومنین کا سب سے زیادہ دوست اُن لوگوں کو جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ میں اکثر عالم اور عابد ہیں اور وہ بہت گھمنڈ نہیں رکھتے،

"دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان بجز سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سرد مہری پر کچھ متحیر نہ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی اُسی طرح اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔"

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجہ ذیل سوال لکھا تھا "سوال اے علما و محققان شرع اسلام تمھاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اُس غنیم کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟" اس سوال کے جواب میں سرسید نے اوّل اصول اسلام کی رو سے ایک بہت لمبی تقریر کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے، اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں، اذان جس قدر بلند آواز سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں، شارع عام میں دعوت اسلام کر سکتے ہیں، پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں اُن کا جواب بلا خوف و خطر دے سکتے ہیں۔ خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں، اُس کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشہ کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں اُس وقت تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے، کیونکہ اُن کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کا توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

"اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اُس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان

کیا کریں گے ؟ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے ، بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہو۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں اُن میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے ، پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا ؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولٹکل حالت اُن سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ بحث سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے پس اس لحاظ سے اُس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے "

سر سید نے جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آنریبل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر کے اُس شریفانہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سر سید اور مسلمانوں کے ساتھ اُن سے ظہور میں آیا۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہوس میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمڈن کالج میں آ کر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سر سید اور اُن کی کوششوں کی انتہا سے زیادہ تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔

ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم ہونا

فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اُس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۱۳ راگست ۱۸۷۳ء کو علیگڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگڑھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے ، وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری

سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۱۲ ؍دسمبر سنہ ۷۳ء کو دوسرا جلسہ علیگڑھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، اس کے رفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک تحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگڑھ میں قائم کیا جائے جس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے، اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اور بعض علمائے اہل اسلام نے جو اُس جلسہ میں شریک تھے طریقۂ تعلیم کو جو سکرٹری نے اُس وقت بیان کیا بلا لحاظ شرعی تسلیم کیا۔ اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ لکھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کرنے قرار پائے تھے اُس کی طرف سے علیگڑھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان کر دیا تھا، اس لیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اُس وقت علیگڑھ میں سب آرڈینیٹ جج تھے نہایت ہی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقاصد کو انجام دیا اور ۲۴ ؍مئی سنہ ۷۵ء جو کہ ملکۂ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ آگئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ تھے رسمِ[1] افتتاح

---

[1] افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر مرحوم اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی اور اردو میں قطعات تاریخ لکھے تھے چونکہ یہ سب تحریریں طولانی ہیں اس لیے صرف قطعۂ تاریخ اردو مرتبہ مولوی صفدر حسین جو مضمون اور مادۂ تاریخ دونوں کے لحاظ سے نہایت لطیف و عمدہ ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ

ہے مدرسہ علیگڑھ میں اک نمونہ کو — جس کو کیا ہے جاری اسلامیوں نے مل کر
ہر علم و ہر زباں کی تعلیم ہوگی اس میں — سب مدرسوں سے اچھی سب کالجوں سے بہتر
انگریزی عام ہوگی تعلیم میں مگر ہاں — مذہب کی خاص ہوگی تعلیم اس کے اندر
تعلیم مذہبی ہی ہے جان مدرسہ کی — ورنہ اثر نہ ہوتا اس کا کبھی دلوں پر
تعلیم دنیوی ہے بہرِ معاشِ دنیا — تعلیم مذہبی ہے بہرِ نجاتِ محشر
گر یہ نہ ہو تو وہ ہیچ اور وہ نہ ہو تو کیا یہ — بے اس کے ہے وہ تیرہ بے اُس کے ہے یہ ابتر
ہے جسم مدرسہ کا انگریزی اور اس میں — تعلیم مذہبی ہے بس جان کے برابر
عیسائی اور مسلماں ہیں مثل جسم و جاں کے — ثابت کریں گے ہم ان [illegible] بہتر
تھا شرع موسوی میں افراط حد سے زائد — تھی شرع عیسوی میں تفریط حد سے بڑھ کر
شرع محمدی نے کی اعتدال ہی سے — افراط کو گھٹا کر تفریط کو بڑھا کر

(باقی)

عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسۃ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گذرا ہے، اس عرصہ کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسۂ مذکور کے انتظام اور ترقی سے متعلق ہیں اُن کے لکھنے کے لیے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علیگڑھ اور اُس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریڈ ہوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اُس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی قریب ۷۴، ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے اُس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگڑھ میں کلکٹر تھے اُنھوں نے اُس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی اور سر ولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفٹننٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے کا وعدہ کر لیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ مانسی گیوٹ صاحب علیگڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ اُن کے بعد جو مسٹر کالون مستقل کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے اُنھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اُس وقت کے تمام یورپین حکام اُن کے ہم رائے اور ہم زبان ہو گئے یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیانِ کالج اس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب

قالب میں، مذہب شرع محمدی لیا — اس کو ذرا انجمن نے اضطور کر کر
اس ریکھ بابی کی وضع بھی ہو پیدا — جس سے ثبوت ہو اس قاعدہ کا اثر
پتلون کوٹ کا لباس ہو یہ — پہ شرع احمدی کا جبہ ہو جائے اندر
توریت کا ہو عالم انجیل کا ہو ماہر — فسخ محمدی کا خاکا ہو بیشتر
سرکار کی بھلائی اسلامیوں کی حالت — کیا کیا نہیں کیا ہے اس نے سب ملاکر
سرکار کی بھلائی اسلامیوں کی لعنت — اسلامیوں کی لعنت سرکار میں جا کر
سرکار سے چھڑائی اسلامیوں کی نفرت — اسلامیوں کی نفرت سرکار کی چھڑا کر
اسلام کی ترقی اسلامیوں کی شوکت — اس شخص کی بدولت ہم سب کو ہو میسر
تھا دشمنوں نے مار ڈالا اسیر بھی اسے لیکن — دکھلا یا محبت تھی یہ مدرسہ بنا کر
تاریخ بھی لکھی ہو وہ جس سے حضرت — ہر بات کو ہماری پڑھا لیے ملا کر
ظاہر ہیں عیسوی ہو باطن ہو دہریا — اے سامعین سنیے للہ دل لگا کر
تھی فکر مجکو اک دن تاریخ مدرسہ کی — بولا یہ ملہم غیب! انھارہ سے چھتر
۱۲۹۲ھ

تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے اُسی زمانے میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹنٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ کے دنوں میں علیگڑھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس کے بننے سے پہلے اُس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جایا کرے اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی اُن سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں اور سر جان اسٹریچی نے اُس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت کی اور حسب ضابطہ قطعہ مذکور پر قبضہ دلا دیا گیا۔ مدرسۃ العلوم کے افتتاح سے پہلے یہ زمین کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلہ میں اب تک محمڈن ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اس بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲ نومبر ۱۸۷۵ء کو سر ولیم میور جو اُس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جس میں کمیٹی کو مبارکباد دینے کے بعد سرسید کی نسبت کہا کہ میں خاص کر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے اور اُن کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہوئے ایک سال گزر چکا تو سرسید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسے کے کام میں حارج ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جبلی احتیاط کے سبب سے سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ پنشن کا نقشہ تو وہ مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے۔ جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آ گئی اور وہ اُسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علیگڑھ چلے آئے اور اپنی قدیم

کوٹھی جو علیگڑھ میں تھی وہ ایت جانے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے لینے اور سرسید کے رہنے کے لیے ایک اور کوٹھی خریدلی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سرسید بنارس سے آئے تو اس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے اُن کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اضلاع قرب وجوار کے رؤسا بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں اُن کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے اُن سے ظہور میں آئے۔ سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اُس قدیم نامی اور پُرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں ابتک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز ابتک رہتے ہیں، جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اُسی میں میری خاک مل جائے گی، صرف مدرسۃ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسانِ ضلع علیگڑھ وبلند شہر کی محبت وعنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش وآرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ

کے زیر سایہ پڑی ہے "

فونڈیشن سٹون کا جلسہ | الغرض سرسید علیگڑھ میں آکر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے کالج کی عمارتوں میں جلد جلد ترقی ہونے لگی۔ ہندوستان کے اطراف میں چندہ کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علیگڑھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی تحامی، قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ تجویز ٹھیری تھی کہ لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی، لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سرجان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقتِ معین پر نہ آسکے۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ سے اس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ادا ہوئی۔ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد دلی سے مدرسۃ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علیگڑھ میں تشریف لائے اور سرسید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقتِ معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فونڈیشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اول سید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرسید نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی درخواست کی چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے، اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یورپین قاعدہ کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات کی سرسید کو بطور یادگار کے عنایت کیں۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں اُن کو ایک کشتی نقرئی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر یہ عبارت کندہ تھی "بیادگار رکھنے بنیاد کالج کے بدست خاص وائسرائے

بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۷۸ء نشان اعزاز بخشی دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی سی۔ بی۔ وجی۔ ام۔ ایس۔ اے وائسرائے وگورنر جنرل ہندبولی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی۔ پریسیڈنٹ اینگلو اورنٹیل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ۔ تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۸ء"

سید محمود نے جو سکیم ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے، پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام "محمدن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے، اور بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگران حال رہے اُس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اُس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ اِن ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قایم کی جائے اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اُن کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک اعلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اُس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلو شپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ اُن کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقۃ مسلمانوں کی حالت اسی بات کی

مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو طرزِ تعلیم سمجھا جائے۔ بالغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہ کر تسلی دے لی۔

نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

چندہ وصول کرنے کی تدبیریں مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لیے تحریک شروع ہوئی اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہوگا سو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے، سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور اُس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ مرزا پور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا، بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے انھوں نے اپنے چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاصکر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے، جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ نہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب امّو جان مرحوم سے جو اُن کے قریب رشتہ دار تھے بر سبیل تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ روپیہ جمع ہوسکتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے نہایت تعجب سے کہا تم کیا دیوانوں کیسی باتیں کرتے ہو؟ مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے

بھی وصول نہیں ہوسکتے۔" اس حکایت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت تیار ہوگئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سالانہ تک اُس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھ کر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے "واللہ معجزہ مینماید کاریکہ از سلطنت برنیاید چگونہ از یک فرد رعیت سرانجام شد"، مگر ہم سرسید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آسکتا ہے۔

سرسید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا، اس کالازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھدار اور روشن خیال مسلمان اُس کی طرف گرویدہ ہوگئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اُس کی جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اُس کے معاون بن گئے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں چلتی گاڑی میں برابر روڑا اٹکاتی رہیں مگر کام کی عظمت، اُس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور اُن کی وجاہت اور خود سرسید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی سقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت اُن پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلِ حالت کے سدِّ راہ تھے شیئاً فشیئاً دُور ہونے لگے، سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اُسی کام میں صرف ہوگا، سب سے زیادہ فراہمی چندہ کا باعث ہوا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقش خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں تا بمقدور اعلیٰ درجہ کے اسکیل پر بنانی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرأت اور

دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لے لیکر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے، حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اُس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۲ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود زرِ کثیر کا محتاج تھا سو اُس کے لیے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کرکے اُس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ ہوتا ہے، جو شخص اتنا روپیہ دے گا اُس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیہ قرار دیے اور اس طرح احاطہ کا ایک بڑا حصہ تیار ہو گیا، یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہو گئی۔ احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ بنوا دے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز ہوا، اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کرکے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپیہ روپئے دیے اُن سب کے نام اُس میں سنگ مرمر پر کندہ کرا دیے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگار میں بنانی تجویز کیں جن میں اُن کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالبعلموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور اُن کے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کرکے اُن کی کل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے اور اخراجات کے لیے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروا نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے

میں ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا لطیفہ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی، سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے، انھوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولتمندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی"۔

لاٹری کے سوا انھوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کرکے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں چھپیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا۔ جب خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپے طلب کیے جس پر انھوں نے ایک معقول رقم ان کی نذر کی۔ ان کے ایک دوست کے قائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے، آپ سیادت کے دعوے سے ان کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے نیشنل والنیٹرن کر گلے میں جھولی ڈالی پنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہوکر غزلیں گائیں۔

پنی ریڈنگ کا جلسہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تجویز ٹھیری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا، لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے، اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کرسکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں" جس

وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے ایک موثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

"کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی شیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اُس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں اُن کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اُس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کُھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔"

"اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب اُن کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سر انجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، والنٹیر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے اُن سے کچھ بن نہ آئی۔ بس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔" اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریر کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی۔

ساقیا برخیز و درده جام را | خاک بر سر کن غمِ ایام را
ساغرِ مے بر کفم نہ تا ز بر | برکشم ایں دلقِ ازرق فام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں | ما نمی خواہیم ننگ و نام را
باده درده چند ازیں بادِ غرور | خاک بر سر نفسِ نافرجام را
دود آہِ سینۂ نالانِ من | سوخت ایں افسردگانِ خام را
محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود | کس نمی بینم ز خاص و عام را
با دلآرامے مرا خاطر خوش ست | کز دلم یکبارہ برد آرام را
ننگرد دیگر بسرو اندر چمن | ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را
کیست آں سروِ سہی کاندر سرش | باختیم دین و دل و آرام را
قوم ما بلے قوم ما! کز بہرِ تو | دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمدؔ بہ سختی روز و شب | عاقبت روزے بیابی کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جب پہلی بار انھوں نے لاہور میں لکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور ادنیٰ اور اعلیٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی نخالفتوں کا ذکر کر کے انھوں نے کہا کہ "فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں، مگر اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے! آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے، چمار، قلی کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اُس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، آپ مجھ کو بھی اس

مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چار کی مانند تصور کیجیے، اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے "

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی وہ ویسی ہی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چندہ جمع کیا، یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسہ کی حقیقت سُن کر خوشی سے چندہ دیا اور اس طرح سوا سو روپیہ جمع ہوگیا۔ انھوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے۔ سرسید نے کچھ پس و پیش نہیں کی اور فوراً روپیہ منگوالیا۔

مدرسہ کے لیے انھوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے۔ پٹنہ، گورکھپور، الٰہ آباد، مراد آباد، لاہور، امرت سر، پٹیالہ، حیدر آباد، نینی تال، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں صرف مدرسہ کی دُھن میں گئے۔ لاہور اور حیدر آباد متعدد دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا۔ ہزارہا روپیہ ان سفروں میں اُن کا صرف ہوا۔ اگرچہ اُن کے دوست اور رفیق بھی جو اُن کے ہمراہ جاتے تھے اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا، اس کے سوا ہمیشہ نزرو ڈگاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سید کو پورا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُن کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک بار دورہ کیجیے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ اُن کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا، مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کرسکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انھوں نے یہ نکالا تھا کہ جو احباب

دعوت کرنی چاہتے تھے اُن سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انھوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہانداری میں صرف کرنا چاہیں از راہِ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اُس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرستہ العلوم کے کئی مزدوروں کی مزدوری ملی وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ چند دوست بھی ہوں گے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیروں گا اُن پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی "گدھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن"

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو ۱۸۸۲ء میں سرسید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انھوں نے چندہ میں جمع کر دیا تھا جب وہاں سے واپس آئے تو علیگڑھ میں اُن کے احباب نے فی کس بیس روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیہ اس لیے جمع کیے کہ سرسید کو شکر گزاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرسید نے کہا اس کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ سب روپیہ ان سے لے کر اور بیس روپیہ اپنے حصہ کے اُس میں ملا کر دو سو چالیس روپیہ کی دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ اُن کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سید صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا چنانچہ انھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سید محمود کی شادی میں نواب اقتصار جنگ نے سو روپیے بطور اظہار مسرت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اس پر سرسید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار

میں لکھا کہ "ہمارے بعض دوست نیوتا نہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتا لینے کو موجود تھے اگر اُس کا روپیہ اسی طرح مدرسۃ العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا"۔ پھر لکھا کہ "بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی، مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں۔ اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے، سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا"، پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۱۸۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرسید نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حیدرآباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن لیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے، چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا سرسید کے دوستوں نے جو کچھ اُن کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپے نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی، سرسید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہونے دیجیے، سرسید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرسید کی نذر کیا۔

ابتدائے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقہ سے سرسید نے نواب مختار الملک مرحوم کو مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے۔ اُنھوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور اُن کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی۔ اُس کی صورت یہ تھی کہ سرسید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں اور اُس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک مع دو مصاحبوں کے استادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے۔ جہاز جس میں بہت سے مسافر سوار ہیں اُس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں اُن ڈوبتوں کے بچانے کو جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ اُس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "دَن

لکس ڈو پینز " سرسید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ " ناٹ سفیشنٹ " یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے) ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے "لُک ایٹ دِس نوبِل مین" یعنی اِس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اس سے مدرسۃ العلوم مراد ہے، اس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے بچانے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے۔ اس وقت خدا کی طرف سے اُن کے دل میں یہ القا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا اُن کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیہ ماہوار کا دو دفعہ کرکے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈپوٹیشن لیکر حیدر آباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعۃً دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اُسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اسی قسم کی بیشمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے۔ اس عرصہ میں برابر اُن کو یہی اُدھیڑ بُن لگی رہی کہ کس

طرح روپیہ فراہم ہوا اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں مہیا کیا جائے، اُن کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اُنھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً انھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرسۃ العلوم کے سوا رفاہِ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قلم بند کر دیے اور جہاں تک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو اُن کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں اور عزیزوں نے پہلوتہی کی تو اُن کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انھوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

سرسید نے جب سے اُنھوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروّت اور لحاظ کو جو اُن کی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور ادھر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دیے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اُس لکھے کی بدولت ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد

آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگ جائیں تاکہ حسبِ حال ہو جائے، سو ایک خدا کے بندے نے مصرعے لگا دیے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

بیش ازیں سعدیِ روشن دل وآزاد منش گفت در بابِ گدایان سخن از صدق ویقیں
"گر گدا پیشرو لشکرِ اسلام بود کافر از بیم توقع برود تا در چیں"
لیک در نوبتِ ما کار بجائے برسید کہ بہ کافر چہ رسد خود تواں گفت چنیں
گر گدا پیشرو لشکرِ اسلام بود ہم مسلماں رود از بیم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا۔ سرسید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا تقاضا کیا۔ انھوں نے بدمزہ ہو کر کہا "صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے" سرسید نے کہا "ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا"۔ یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی اُن کو دوستوں سے کچھ اُچک لینے کا موقع ملا انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب"۔ ایک روز مسٹر تھیوڈور بک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سرسید نے بہت بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔ انھوں نے وہ اشرفی لے لی۔ سرسید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور اُن سے لیکر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کر دی۔ اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہارے پچاس روپے مدرسہ میں دے، اتفاق سے سید محمود ہار گئے، وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس دیجیے اور نوٹ لیجیے۔ انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے

شوا ہد ناجائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہاں موجود تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سید محمود کو دیدیے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روزمرہ گذرتے تھے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولتمند مسرف یا بخیل، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں، وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی مقصود ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فنا نہ کر دے اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقلمندی، شہرت لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں ان کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا تھا چندہ طلب کیا۔ اس نے بہت دکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا "بیشک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے اتنا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے" وہ انگریز یہ سنکر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسید کی نذر کیا۔

سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرستہ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوششیں بظاہر خاص اپنی ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے اُن سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود اُن کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچتا تھا جس قدر کہ مدرستہ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے یا پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرستہ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک جلیس سے کہا کہ "تو اوروں کے فائدے کے لیے سفارش مت کیا کر، کیونکہ اس سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی" اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی اس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے اس پر عمل کیا وہ ایک جوانمردانہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا برا منانا گوارا کرتے تھے اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسید کے ایک معزز ہموطن نے ایک رفاہِ عام کے کام میں اُن کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گذری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی"۔ سرسید نے اس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا۔"

عماراتِ کالج | ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور اُن کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی

جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے اُنھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضرور ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اُس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ سرسید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے اُنھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے اُن کو کسی قدر بیان کرنا ضرور ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ دلبستگی رکھتے تھے اُن میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں، کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرسید نے کالج کی ترقی بلکہ اُس کا قیام و دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پر عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اُس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدود آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارت کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا بہ زیادہ تر اُس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اُس کی

وقت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ [illegible] میں جب کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اُس وقت علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے علیگڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں بورڈنگ ہوس محمدن کالج کی پختہ بارگ کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "جس وقت میں نے کمروں کی اُس قطار کو دیکھا جو بعد تکمیل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجھکو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آیندہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو" میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پاکر آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ "انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کینن بارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے محمدن کالج کے نہیں دیکھا۔"

سرسید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ آیندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کا عظم و شان دیکھ کر اُس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اُس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُن کو پورا کردیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی اُن کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روز میں کھنڈر ہوگئیں لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظم و شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اُس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ "جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گذرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔" بہرکیف اس انسٹیٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انھیں عمارتوں کی بدولت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔

سرسید نے ان عمارتوں میں آیندہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت مؤثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر ان کے بانیوں کے اور کالج کے محسنوں مربیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کرائے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیرِ تعمیر ہیں، کچھ ناتمام پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی اور اس قومی یادگار کو صفحۂ روزگار سے مٹنے نہ دے گی۔ سنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یوروپین افسر نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے۔"

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں اُن عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو، مثلاً اکثر محرابیں سیرسنک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بورڈنگ ہوس کے صدر دروازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال وتاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے، مثبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی اسپیچیں جن میں مسلمانوں کو غیرت اور اُن کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے جابجا پتھروں پر کندہ کرادی ہیں۔ جن یوروپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے اُن کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آیندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ اُن کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکرگذار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لیے ماہواری یا سالانہ ایک رقم معین ہونی چاہیے کہ اُس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بیشک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید کے لیے ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا اور کالج کی ذمہ

دفعۃً تمام زمانے کے دل میں پیدا ہو گئی اُس کے لیے ایک مدت دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور امنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کراتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہمیشہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے باوجود اس کے انھوں نے اس قطعۂ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلا ناغہ دو دو پہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مونڈھا بچھا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے، زمین ہموار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو اُن کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی، باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام اُن کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینیر یا اوورسیر تھا جس سے اصلاح لی جائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو۔ جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے انھوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا اور خود ہی اُس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اسی طرح کام بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یوروپین انجینیروں نے کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ بااینہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینیرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس قومی انسٹیٹیوشن کے لیے ایسا انجینیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے

خود ہی عمارت بنوائے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانتداری سے اپنا کام انجام دے علاوہ ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرور تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی جس قدر روپیہ آتا جاتا اُسی قدر عمارتیں بنتی جاتیں۔ بعضے اور طرح اعتراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ نہ انھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پُرس کار فرمایان چرا خود کار کمتر می کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سر سید کی لائف میں ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سر سید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر درحقیقت اُنھیں کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں اُن کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو اُن کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسۃ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ کلکتہ کے اخبار اُردو گائڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا۔ مگر سر سید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج اُن کے نام سے موسوم کیا جائے۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے سر سید کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت اُن کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ اُن کی یادگار میں بنانا اور اس پر سر سید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا اُنھوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں اُن کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سر سید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔

ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اُس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسمٰعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے حاجی صاحب نے پہلی شرط تو بہ اکراہ قبول کرلی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سُنا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں۔ سرسید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا بڑی وجہ سرسید کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ اُن کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطۂ بورڈنگ ہوس اور کالج کا صدر دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہوس کے چھ پختہ کمرے تیار ہوتے نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۹ رجون ۱۸۸۰ء کے جلسۂ کمیٹی یادگار سید احمد خاں،، میں مولوی سید فریدالدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے بورڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بننا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یوروپین افسروں نے یہ تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فونڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہواخواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں، اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس

کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کرکے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہوا اُس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کیجائے، اس لیے میرے نزدیک بجائے فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے" چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دنیا میں اور خاص کر اُن ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد اُن لوگوں کی شکرگذاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں اور اُس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ناشکری و احسان فراموشی کا دھبا نہ لگے اور آیندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیرخواہی کا حوصلہ پیدا ہو۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیرخواہی میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر جو ایسے کام کرتے ہیں خودغرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کا احسان مانتے ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکرگذاری اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص بے شایبۂ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے، رات دن اسی اُدھیڑبن میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لے۔ اس لیے اگر حسن اتفاق سے قرنوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے بند کرنے پڑتے ہیں تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع ہو

اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور اعانت سے پہلوتہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا کسی وجہ سے جو سر سید اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف اُن کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست اُن کی طرف سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

تعلیم | کالج میں اول دو ڈپارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورنٹیل ڈپارٹمنٹ جس کی پڑھائی مقرر کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اردو میں علوم جدیدہ اور فارسی و عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھائے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے لیے بطور سکنڈ لینگوج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سر سید انگلستان سے بڑے بڑے نامور علما و فضلائے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علما نے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں اُن کا ترجمہ کرا کر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کریں مگر سوا اس کے کہ شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ نے اُس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اُس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ بلا مبالغہ طلبہ کی تعداد سے استادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالب علموں اور اُن کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید دنیوی فائدے کی نہ تھی اس لیے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اُس کو توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا، روز بروز ترقی کرنے لگا۔

کالج کلاس قائم کرنا | ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ابتدائی مدرسہ کھولا گیا تھا اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی۔ نیز اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے

ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ایفلیئیٹ ہو گیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۲ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اُس کے متعلق مفصل حالات کالج کی سالانہ رپورٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبۂ شمال مغرب و اودھ کے مسلمان گریجوٹس[1] کی تعداد میں بمقابلۂ ہندو گریجوٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۸۹۳ء میں جو لکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجوٹس فیصدی ۹ ، ۵ ۴ ہونے چاہییں وہاں اُن کی تعداد ۴ ، ۳ سے زیادہ نہیں نکلی اسی طرح مدراس میں بجائے ۸ ، ۶ کے صرف ۹ ، اور بمبئی میں بجائے ۵ ، ۲۱ کے ۲ ، ۱ اور پنجاب میں بجائے ۹ ، ۱ کے ۵ ۲ فیصدی برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اودھ کے جہاں نسبتہً مسلمان گریجوٹس کی تعداد ۲ ، ۱۱ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۲ ، ۱۰ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمدن کالج نے قطع نظر اور فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاص کر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس قلیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔

تغیر لعت ترن | معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سر سید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق

---

[1] صوبۂ شمال مغرب و اودھ کے گریجوٹس سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پا کر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجوٹ جو خاص صوبۂ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے پنجاب سے آکر محمدن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے ۱۲

میں اُس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر بانی الحقیقہ عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے ایسی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے اسی لیے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں چنانچہ سنہ ۱۸۸۶ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تغیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے ایک اسپیچ میں خاصکر مدرستہ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ بس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔"

لیکن باوجود اس اندیشہ کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ جیسا کہ اُنھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتے تھے، اُس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے اُن کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں اور اس لیے

مسلمانوں میں اُن کا پھیلنا نہیں چاہتے، وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ "جو حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوےٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی بھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا" البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعۂ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زماننا اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض اُن کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اُن کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقۂ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا وہ کسی طرح فلسفۂ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ برخلاف یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفۂ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اُسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفۂ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ نہ صرف کرسچینٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے

ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے۔ اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آزادی کا جوہر اُن کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

بہرکیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علما اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس اُنھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ اُنھوں نے اپنی ایک اسپیچ میں اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ "جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلاشک اُن کا ایمان اور اُن کا یقین بہ نسبت اُن لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ اُن کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے . . . . میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اُن کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا ہوں . . . خدا کے ماننے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے اُن کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں۔ کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صحیح یا غلط اُن کے سامنے یہ کہہ کر کہ "خدا و رسول نے فرمایا ہے" بیان کیجائے، وہ فوراً اُس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں اُن کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں۔"

"مگر اُن کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تاکہ اُس کے دل کو تشفی ہو . . . . وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے۔ یہی وہ

لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔"

"جس زمانہ میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی . . . اُس وقت مسلمانوں میں فلسفۂ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کیونکہ جو لوگ اُن مسائل فلسفۂ علم طبیعی کو سچ جانتے تھے اور اُن میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے اُن کو اسلام کی نسبت شبہ پیدا ہوتا تھا . . . وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملہ سے بھی اُس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اُس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انھوں نے اُس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا اُن کی کوششوں کو قبول کرے . . . پس میرا خیال ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کی ایسی حالت ہوا اور اُس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اے دوستو تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے جس کے مسائل اُن اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اُس زمانہ میں تھے . . . مگر اس زمانہ کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اُس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے . . . ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور اُن کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں . . . مسائل علم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیے جاتے ہیں یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیے جائیں یا اُن تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانہ کے عالموں نے قرار دیے ہیں ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں۔"

"اس لیے اس زمانہ میں . . . ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھیرا دیں۔ یا اسلامی مسائل کو اُن سے مطابق کر دکھائیں اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں اُن سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین

کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا اُن کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں"

"میں ایک شخص ہوں جس کا یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہوا اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہوگیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے، اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی اُن کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اُسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی ہیں"

"میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے اُن غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا دعوے کروں یا حمایتِ اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں، یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا ہے؛ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اُن علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اُس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار رہوں گا"

"اے میرے دوستو میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں، اور کچھ چارۂ کار نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کرنا

جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہیگا معاف کرے گا، چاہے گا نہ کرے گا، اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اُس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ تبلاتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر تبلاتے ہیں میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا جو بھلا یا بُرا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آیندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔"

الغرض سرسید نے مذکورۂ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پا سکے یعنی یہ کہ اُس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو۔ کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اُس کے فعل اور اُس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اس امر پر غور کی کہ اسلام جس کی نسبت ہمارا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانونِ فطرت کے مطابق ہے اُس سے کیا مراد ہے؟ اور اُس کی حد کیا ہے؟ اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کہاں تک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق اُنھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزماں کے دل میں القا ہوا ہے اُسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اُس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے پس اُنھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ "حَسْبُنَا كِتَابُ الله" اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا، اور اُس کے سوا تمام

مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ اُن میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علما و مفسرین کے اقوال و آرا اور تمام فقہا و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ اُن کے جواب دہ خود علما و مفسرین اور فقہا و مجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کر دیا۔[1]

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور مضمون کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سرسید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو اُنھوں نے ابتدا سے قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی اُن کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اُس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیام اجل آ پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اُس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اُس کی تمام جزئیات کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اُس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور باوجود اُن بےشمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت اُن کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

---

[1] سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی اعتراض سائنس کی رو سے قرآن مجید پر وارد نہیں ہو سکتا اس لیے انھوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعۂ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعۂ کتاب و سنت و اجماع و قیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حملے سے بچائیں، عام اس سے کہ اُس کو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں، یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا اُن کو غیر محقق ٹھہرائیں ۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں باایں ہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ اُن کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر اُنھوں نے اکثر جگہ تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح جیسے چالاک وکیل کسی حیلے سے جج کو فریق مخالف پر برافروختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو اُن سے اور اُن کی تفسیر سے نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے اگر یہ لوگ فی الواقع حمایت اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُن کو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اُس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اس کے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنے کا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں اگر ٹھیک ہے تو اُنھوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اُس طریقے کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اُس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اُس طریقے سے اُن شبہات کا جو علوم جدیدہ کی تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استیصال کیا جائے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے

مراتب مذکورۂ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام ہمت اس بات میں صرف کی ہو کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے تعصبات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ اُن کی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ اُن کو بہت بڑا حامیِ دینِ اسلام سمجھیں۔

لطیفہ ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں، آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجے؛ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگیِ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

چھٹا باب

۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن کمیشن میں شہادت، محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن، محمڈن ایسوسی ایشن علیگڑھ، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن، کے سی ایس آئی کا تمغا ملنا، ایل ایل ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلاف، کالج کے روپیہ میں غبن ہونا، سرسید کی وفات،

۱۸۷۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور اُن کے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا۔ قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سب سے اول سرسید ہی نے کی تھی اُنھوں نے اپنے رسالہ اسباب بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کے بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بے خبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس عزت و امتیاز کا دروازہ اُنھوں نے اپنے ہم وطنوں کے لیے کھولا تھا اُس کا استحقاق فی الواقع سرسید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ بمبئی گزٹ میں اُن کے انتخاب کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "گورنمنٹ اُن نقصوں کے پورا کرنے سے جو سید احمد خاں نے اسباب بغاوت میں ظاہر کیے تھے غافل نہیں تھی۔ خود اُس کو لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کا ممبری کے لیے منتخب اور نامزد کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت تھی کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کے ایک عمدہ حصہ کی ضروریات اور خواہشات سے آگاہ ہو"

ہندوستانیوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون بنایا۔ وہ چار برس متصل وائسریگل کونسل کے ممبر رہے، اس عرصہ میں اُنھوں نے

دو مسودے کونسل میں پیش کیے، چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے، اور اُس سے آج تک اُن کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

قانون ٹیکہ چیچک | چیچک کے ٹیکے کا قانون جس کا مسودہ ستمبر ۱۸۸۰ء میں کونسل میں پیش ہوا، اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اضلاع شمال مغرب، اودھ، ممالک متوسط، برٹش برما آسام، اجمیر اور کورگ میں، اور نیز فوجی چھاؤنیوں میں لازمی کر دیا جائے چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شخصی آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی اس لیے سرسید نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اُس پر ایک لمبا ریمارک کیا تھا، اُس میں اس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ "شخصی آزادی کی رعایت اُس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے اور نیز چیچک کا ضرر بالخصوص اُن بے گناہ بچوں کو پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔ پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی یا بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت اُن کے والدین کی بے وقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی" پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "جس طرح پہلے زمانے میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا، اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں۔"

مع ذالک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہاں تک کہ ممکن تھا ہر طرح کی آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے۔ اولاً لوکل گورنمنٹوں کو اُس میں اختیار دیا گیا ہے کہ جس میونسپلٹی سے مناسب سمجھیں اُس کو متعلق کریں۔ اس کے سوا ٹیکا لگوانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانوں پر جا کر ٹیکا لگایا جائے۔ میونسپل کمشنروں میں سے کوئی ممبر خود جا کر اپنے سامنے ٹیکا لگوائے۔ پولیس کی دست اندازی جہاں تک ممکن ہو نہ ہونے پائے، اطفال غیر محفوظ

کی تحقیقات اور اُن کے رجسٹر کی ترتیب میونسپل کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹ ویکسینٹروں سے متعلق رہے تاکہ بچوں اور اُن کے مربیوں کو مجسٹریٹ کے روبرو جبرًا حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے، کسی بچہ کے بازو سے مادہ نہ لیا جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو حیوانی مادہ سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں صرف جرمانہ پر محدود رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلاف رائے سے محفوظ نہ رہ سکا، خصوصًا نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالف تھے، مگر کونسل کے اکثر لیجسلیٹو ممبر اُس سے اتفاق رکھتے تھے آخر ایک آدھ دفعہ کی جزوی ترمیم کے بعد ۱۸۸۰ء میں پاس ہوگیا۔

قانون تقرر قاضیان | قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۸۸۰ء میں کسی قدر اختلاف کے بعد مجارٹی سے پاس ہوگیا۔ اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ گو عہدۂ قضا کی وہ حیثیت جو اہل اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی، انگریزی عملداری میں باقی نہ رہی تھی، مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہد حکومت میں اس عہدہ کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ سے جو ۱۷۹۳ء سے ۱۸۲۷ء تک وقتًا فوقتًا جاری ہوتے رہے، بنگالہ، اُڑیسہ بہار، بمبئی اور مدراس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے، جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا، نکاح خوانی اور طلاق کی مجلسوں میں صدر نشین ہونا، انواع واقسام کے آداب و رسومات مذہبی کا انجام دینا، قرق شدہ جائداد کے نیلام کی دیدبانی، زرِ خیرات و پنشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت اُن کی خدمات محدود ہو گئیں، یہانتک کہ ۱۸۶۴ء میں جملہ قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور اُن کے کاموں سے متعلق تھے منسوخ کیے گئے اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعہ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرین مصلحت نہیں ہے اور قاضیوں کو اجازت دی گئی کہ جس وقت لوگ اُن سے کسی رسم مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اُس کو انجام دیں۔

مگر جس طبقہ کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے قاضیوں کو ضرورت ہوتی تھی اُن کے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانان صوبۂ مدراس کے ذریعہ سے خصوصاً بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں لوگوں کے کاموں میں حرج واقع ہوتا ہے اس لیے سرسید نے یہ مسودہ تیار کیا جس کا مقصد صرف اس قدر ہی کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اس کو وہ پھر اپنے ہاتھ میں لے اور اول صوبۂ مدراس میں اُس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کہ جس صوبہ کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبہ میں جاری کرانا چاہیں وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ امید ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے یا آیندہ جاری ہوگا وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس مپرسی حالت میں تھے اُن کی قدر و پرسش زیادہ ہونے لگے گی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں اُن سے مدد ملے گی۔

قانون وقف خاندانی ان دونوں قانونوں کے علاوہ سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی، مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر پوری نہ ہو سکی۔ اُنھوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے اُن کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے دو تین پشتوں کے بعد اُن کی جائدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں فروخت ہو جائیں گی، اس لیے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور اُن میں کچھ ایسے ذی مقدور اور رئیس دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول اُنھوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے سنی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائداد کو اپنے لیے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے

لیے ہمیشہ کو وقف کر دے جس کی رو سے وہ جائداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائدادیں اس طرح پر اپنے خاندان کے لیے وقف کی تھیں اُن کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو، اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا مداخلت سرکار اپنی جائدادیں اپنے خاندان کے لیے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خلشیں پیدا نہ ہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے، دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فریبی ہونے کا الزام لگا کر اُس کی منسوخی کے دعوے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں، تیسرے چونکہ اکثر جائدادیں دیہات مالگذاری سرکار ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی نالائق متولی یا جانشین زر مالگذاری سرکار ادا نہیں کرتا تو امر شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ جائداد بعلتِ باقی نیلام ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بذریعہ ایک قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے اُنھوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اُس کے مشتہر کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علیگڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتہر کرایا۔ بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اُس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا، بعضے شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کیے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا، بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اُس کے جواز پر فتویٰ لکھ دیا، مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاصکر مولوی ابوسعید عظیم آبادی اور اُن کے پیرووں نے سخت مخالفت کی۔ چنانچہ وقف خاندانی کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اُس کے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئیں۔

جس زمانہ میں اس مسودہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی نعماد پسند مسلمان نے ان فتووں کے خلاف ایک آرٹیکل لکھا تھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا " انگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اُس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجائب چیز ہے " ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یوروپ میں پیدا ہوا تھا اس لیے شاید اُس نے عمر بھر میں کوئی قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہوگا، اور اسی لیے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اُس کی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اُس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ عجیب نہیں ہے "

بہرحال سرسید نے یہ تدبیر مسلمان رئیسوں کے لیے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے ۔ نہ اس لیے کہ مسلمانوں نے اُس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اُس کی پابندی محض مالک جائداد کی مرضی پر منحصر تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اصول قانون کی رُو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لیے کیا جائے وہ وقف دوامی ہو نہ میعادی، مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے اُن کو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودۂ قانون پیش کرنا عبث ہے کیونکہ اُس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے جس سے جائداد ایک مدت معین تک ناقابل انتقال رہے اور اُس کے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس لیے لاچار اُس سے دست بردار ہونا پڑا۔

کونسل میں اسپیچیں | سرسید نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر

جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے غیر معمولی لیاقت ظاہر کی ہے۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا وہ گفتگو کرتے تھے اور اس لیے اُن کو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اس طرح کافی اطلاع حاصل کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیچ کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیچیں وہ اول خود اردو میں لکھ کر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں اسپیچ دیتے تھے اور بڑی بڑی اسپیچیں جو وہ تیار کرکے لیجاتے تھے اُن کو اکثر کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ اُن کی ایک اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سُنی تھی" یہ اسپیچ غالباً مسودۂ قانونِ مزارعانِ دکن پر تھی، جس کا انتخاب کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔

ایک اور اسپیچ مسودۂ قانونِ انتقالِ جائداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سرسید نے ۲۰؍ جنوری سنہ ۱۸۸۲ء کو بل کی تائید میں کی تھی۔ اُس بل پر انگلشمین میں ایک لمبا آرٹیکل چھپا تھا جس میں سرسید کی اسپیچ کی نسبت لکھا تھا کہ "کسی ہندوستانی جنٹلمین نے ابتک اس مسئلہ کی تائید کہ ملک کا قانون کوڈیفکیشن (یعنی مجموعہ احکام بنانے) کا محتاج ہے اور اُس میں کوڈیفکیشن کی گنجائش ہے، اور ملک کے دو لمبے قرنوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آنریبل سید احمد خاں نے کی ہے۔"

اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعۂ ضابطۂ فوجداری جو ہندوستان میں ہمیشہ یادر رہے گا اور نیز دیگر قوانین پر اُنھوں نے بہت باوقعت اسپیچیں کی ہیں خصوصاً وہ اسپیچ جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقۂ اضلاع متوسط پر ۱۲؍ جنوری سنہ ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن کے زمانہ میں کی تھی وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔ قانونِ مذکور میں جو کہ خاص اضلاع متوسط کے لیے بنایا گیا تھا

اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث گورنمنٹ کے انتخاب سے مقرر ہونے تجویز کیے گئے تھے مگر لارڈ رپن کی پالسی سے اس بات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الکشن سے مقرر ہوا کریں گے۔ چونکہ سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی اور اُن کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اُس وقت تک جبکہ ان صوبوں کے لیے قانون بنایا جائے گا کونسل میں ممبر رہیں گے اس لیے اُنھوں نے اپنی اسپیچ میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اسی اصول کے موافق دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومینیشن سے مقرر ہوا کریں چنانچہ انھیں کی اسپیچ پر لارڈ رپن نے شمالی ہندوستان میں ایک ثلث ممبروں کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ثلث کے لیے الکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیچ سرسید کی اور اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ ایک مجموعہ میں چھپ گئی ہے اس لیے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اُس کے بعض فقرات ہم اُس موقع پر نقل کریں گے جہاں انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔

لارڈ رپن کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اُس کے پورا ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور اُن کے پورا کرنے کے لیے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا اس لیے اُنھوں نے بذریعۂ تار کے کونسل سے استعفا بھیج دیا مگر اُس کے بعد سنہ ۱۸۸۷ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی اُن کو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لیے پھر انتخاب کیا اور اُس وقت سے سنہ ۱۸۹۲ء تک وہ برابر اُس میں ممبر رہے۔ آخر پھر اُن کو مدرسہ ہی کے کاروبار کی ضرورت اور نیز ضعیفی کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔

کرنل گراہم سرسید کی لائف میں اُن کی ممبری کونسل کی نسبت لکھتے ہیں کہ "جب سر جان سٹریچی کو بورڈ آف ڈائرکٹرز نے عہدۂ گورنری پر مقرر کیا تو اس تقریب میں گریٹ ڈیوک آف ولنگٹن نے سر جان سٹریچی کو ایک ڈنر دیا تھا اس موقع پر جو تقریر ڈیوک نے کی تھی، اگر اُس تقریر میں بجائے انگلستان کے ہندوستان اور بجائے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ تقریر سید احمد خان کے

ممبر کونسل ہونے پر خوب چسپاں ہوتی ہے اور وہ فقرہ یہ ہے "ایک ایسا تقرر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے انگلستان کے تمام عرض و طول پر، اور کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال پاتا ہے جس کی وہ تقلید کرے، اور ایک کامیابی پاتا ہے جس کو وہ حاصل کرے، اور ایسے فیلنگز کے جوش سے جو بھلائی ملک کو حاصل ہوتی ہے اُس کی کچھ انتہا نہیں۔"

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت سنہ ۱۸۸۲ء میں جب کہ سرسید لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے اُن کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی۔ اُن کا طولانی اظہار علیگڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے اُن کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سرسید اول کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے، مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی کا تھا وہ اُن کی رائے کے خلاف تھا۔ اول تو ممبروں کو کسی کارروائی کی اطلاع پہلے سے نہیں دیجاتی تھی، تمام رزولیوشن دفعۃً پیش کیے جاتے تھے اور ممبروں کو اُن پر کافی غور اور بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ ہر ایک رزولیوشن پر ہوتا تھا وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے ایک آدھا جلاس کے بعد پریسیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو پہلے سے اطلاع ہونی چاہیے کہ کونسی تاریخ کیا کارروائی ہوگی تاکہ اُن کو غور کرنے کا موقع ملے دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہو وہ بالکل قلمبند ہونا چاہیے۔ مگر پریسیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ موجودہ حالت میں بھی کام کی کثرت بہت ہے، اگر ایسا کیا جائے گا تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ سرسید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھکو معاف رکھا جائے۔ جب لارڈ رپن کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سرسید سے کہا کہ اگر آپ ممبری سے علیحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیے۔ چنانچہ سید محمود[1] اُن کی جگہ مقرر کیے گئے اور سرسید نے شہادت دی۔

---

[1] سید محمود نے اپنی ممبری کے زمانہ میں ۱۰ رزولیوشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو خاص مسلمانوں کی ترقی تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے مگر گورنمنٹ سے اُن کی نسبت یہ حکم ہوا کہ اُن کے اجرا یا عدم اجرا کا [illegible]

سرسید کے اظہارات میں سے چند دلچسپ جواب جو انھوں نے بعض عام سوالات بابت تعلیم کے سوالات پر کمیشن میں دیے اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ تعلیم سے متعلق

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳۲) اختیار لوکل گورنمنٹوں کو ہونا چاہیے جس تجویز کو وہ اپنے صوبہ میں مناسب سمجھیں جاری کریں اور جس کو مناسب نہ سمجھیں جاری نہ کریں۔ وہ رزولیوشن یہ ہیں (۱) مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بار لوکل میونسپل اور پروونشل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے (۲) جو دیسی مدرسے مسلمانوں کے ہیں اُن کو ترغیب دی جائے کہ اپنے ہاں کی خواندگی میں خاص دنیوی تعلیم اضافہ کریں (۳) مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص سٹینڈرڈ مقرر کیے جائیں (۴) پرائمری اور مڈل اسکولوں میں سوائے اُن مقامات کے جہاں اسلامی جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اردو ہونی چاہیے۔
(۵) جہاں دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے وہاں بطور اختیاری مضمون کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے پبلک فنڈ سے قائم ہیں دفاتر کی زبان خواندگی میں پڑھائی جائے اور نیز حساب اور سیاق اسی زبان میں سکھایا جائے۔
(۶) جن مقامات میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتد بہ ہے وہاں پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایسا انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دی جائے (۷) مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے خوب اچھی طرح ترغیب عمل میں لائی جائے، کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جس میں اس جماعت کو خاص مدد کی ضرورت ہے (۸) جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ وار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیے جائیں یعنی (الف) جو پرائمری اسکولوں کی کامیابی پر مڈل اسکولوں میں دیے جائیں (ب) جو مڈل اسکولوں کی کامیابی پر ہائی اسکولوں میں دیے جائیں (ج) جو انٹرینس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دیے جائیں (۹) ہر قسم کے اسکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایک خاص نسبتی تعداد وظیفوں کی بتخصیص مسلمان طلبہ کے لیے رکھی جائے (۱۰) جن تعلقات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے ہیں اور گورنمنٹ کے زیر انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہونی چاہیے (۱۱) جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیویٹ لوگوں یا جماعتوں کے زیر انتظام ہیں وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈ دی جائیں اور (پرائیویٹ لوگوں کو) ترغیب دی جائے کہ گرانٹ ان ایڈ کے قاعدہ کے موافق انگریزی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قائم کریں (۱۲) جہاں ضرورت ہو نورمل اسکول بلحاظ مسلمان معلموں کی تربیت کے لیے قائم کیے جائیں (۱۳) جن مسلمانی مدرسوں میں (جو اوقاف سے قائم ہیں) اُردو میں درس ہوتا ہو وہاں کوشش کی جائے کہ حتی الامکان مسلمان معلم تعلیم دیں (۱۴) افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری اسکولوں کا معائنہ جو مسلمانوں کے لیے ہیں موجودہ دستور سے زیادہ کیا کریں (۱۵) ترقی تعلیم مسلمانان کے واسطے جو ایسوسی ایشن ہیں اُنکو تسلیم کیا جائے اور اُن کی ہمت بڑھائی جائے (۱۶) پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں کی تعلیم پر ہوا کرے (۱۷) لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اُس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے (۱۸) اصول مذکورہ بالا جو سفارشوں میں بیان کیے گئے ہیں وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں عائد ہوں ۔۔

بڑا اہم سوالات ہیں اُن کی نسبت اُن کی اصلی رائے جو اُنھوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے، ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

اُنھوں نے اس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی؟ اس طرح جواب دیا کہ "اُن ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ اُن میں پڑھائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جانا بے شک ملک کے حق میں بہتر ہوگا، مگر انگریزی ابتدائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یوروپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ اُنھوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یوروپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں؛ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ بہت سے مباحثے بہت سے جلسوں میں کیے، اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا، مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا مجھکو ایک مشہور لبرل اسٹیٹسمین کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جس نے کہا تھا کہ وہ جو کچھ ہمارے زمانے کے ہندوستانیوں کو درکار ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، وہ یہ ہے کہ وہ اُس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو اُن کے زمانے کی اور اُس قوی قوم کی جان ہے اور جو ان

کے نزدیک تمام علوم اور تمام لطافت کا مخزن ہے" میں لارڈ ولیم بنٹنک کی اس پالسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ "ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے"

"خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم خود اس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو، مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اس کی جان کہنا چاہیے چھوڑ دیا گیا ہے، درحقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اس ملک پر حکمراں ہے، ہندوستان میں جو زبان حکمراں ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے، اس لیے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمراں قوم کی زبان نہ ہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔"

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اس کے اختلاف نوعی کا محفوظ رکھنا اس طریقہ پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لیے قرار دیا ہو۔ پس ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ میں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے گفتگو کروں گا۔ یہ یونیورسٹی لا، انجنیرنگ میڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے اور ہر شخص کو اس بات کی بالکل آزادی ہے کہ ان میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔ وہ بلاشبہ تعلیم کی آزادی اور اختلاف نوعی کو لوگوں کے حق میں جہاں تک کہ اس کو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبجکٹ ایک وسیع سبجکٹ ہے اور آزادی و اختلاف نوعی کو جواب تک اس میں محفوظ نہیں رکھا گیا، یا نہایت محدود کر دیا گیا ہے اس کا محفوظ رکھنا نہایت ضرور ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لندن کی یونیورسٹی کی ایک ناکمل تقلید پر قرار دیا گیا ہے،

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے گریجویٹ کسی سبجکٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس میں طریقۂ مروجہ کے برخلاف ہوں۔ مگر چونکہ یہ بحث کمیشن کے احاطۂ تحقیقات سے خارج ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ کو اُس کی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ہز ایکسلنسی وائسراے کی اسپیچ میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضور ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخاب مندرجۂ ذیل کمیشن کی اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں"۔ "جس بات کی سب سے اول تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ قوائے عقلیہ کو چیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے" اس کے بعد فرمایا کہ "ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ سو علم ناکامل طور پر سیکھے جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ اس طرح جواب دیا کہ "اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اُس وقت تک مناسب طور پر اُن کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ مگر پبلک کی رائے اس رائے کی مؤید نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہے۔ ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جس کا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھ سے کہا کہ "یہ خیال کہ ہم کو اب اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے بالکل ایک غلط خیال ہے، اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرنا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کر سکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کا پولیٹیکل اور انتظامی اقتدار گورنمنٹ اور اُس کے یوروپین عہدہ داروں کو حاصل ہے اور جو شخص ہندوستان

میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی یورپین ہیں اور اس وجہ سے قومی حیثیت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کے لیے جو اس ملک میں ہندوستانیوں کے فائدہ کے واسطے قائم کیا جائے زرِ نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ علی العموم اُس سے اس طرح پر علٰحدہ رہے ہیں کہ گویا اُن کو اُس سے مطلق کچھ سروکار نہ تھا۔"

اس کے بعد سر سید نے کہا کہ "اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے یعنی جس زمانہ میں کہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علیگڑھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اُس کی امداد کی درخواست کی اُس نے جواب دیا کہ "ہم پر اُس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے، وہ تمہارا بچہ ہے، ہمیں اس کو دھکا دیدینا چاہیے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اُس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے، پس پبلک اُپینین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیے اگر ہم ہندوستان کی حالت موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر لوگ اس قسم کا کوئی ارادہ کریں گے تو اُس میں ایسی بے انتہا مشکلات ہیں جن کے سبب سے اس میں سراسر ناکامی کے ہونے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد اسی سوال کے متعلق اُنھوں نے کہا کہ "اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے. . . . پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برخاست کرے گی تو گو وہ کیسی ہی واجبی اور معقول دلیل پر کیوں نہ ہو، لوگوں کو یہی خیال ہوگا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کا ہے۔"

پھر کہا کہ "گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائیبل پڑھنا کسی طرح پر مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے، مگر مسلمانوں کی عام فیلنگ بیقین میری اس رائے کے خلاف ہے اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اُس

کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ پس گورنمنٹ کو اس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فیلنگ کی اصلی حالت دریافت کرنا مناسب ہے"

پھر کہا کہ "جہاں مشنری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ اُن میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا پسند نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں اور گورنمنٹ بھی اُس کو بغیر لحاظ اس بات کے کہ وہاں مشنری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اس صورت میں اور مدرسوں کی ضرورت نہیں، کسی قدر مدد عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ اس بات کی بھی خبرگیری کرے کہ حکام ضلع اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب داب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لائیں، جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوتا ہے"

پھر اس سوال پر کہ گرانٹ اِن ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اس طرح جواب دیا کہ "ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اُس میں ایک یوروپین ہیڈ ماسٹر اور اُس کے ماتحت ماسٹر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور سکنڈ لینگوج یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت کے تین لائق ٹیچر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسا اسکول بغیر نو سو روپیہ ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہو سکتا اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعد مروجہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کس قدر گرانٹ اِن ایڈ دیا جاتا ہے۔ اُن قواعد میں یہ شرط ہے کہ لڑکوں کی اوسط حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے زیادہ گرانٹ اِن ایڈ کا اوسط نہ پھیلے۔ پس ایسے اسکول میں جس کا اوپر ذکر ہوا جب تک کہ اوسط حاضری انگریزی پڑھنے والوں کی کم سے کم تین سو نہ ہو گورنمنٹ سے اس قدر گرانٹ اِن ایڈ کے ملنے کی بھی توقع نہیں ہو سکتی جو اُس کے نصف خرچ کے برابر ہو۔ یہ شرط عملاً اُس کے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص گورنمنٹ سے مناسب گرانٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم کرنے کا قصد نہ کرے . . . . میرے نزدیک گرانٹ اِن ایڈ طالب علموں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دی جائے اُس کی عمدگی کے لحاظ سے تجویز کرنا چاہیے . . . . چند طالب علموں کو ایک عمدہ تعلیم دینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں کو ناقص تعلیم دی جائے"

پھر سوال متعلقہ اسکالر شپ پر اس طرح جواب دیا کہ "میں اسکالرشپوں کے قاعدہ کا طرفدار ہوں اور اس رائے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالرشپ دے کر پڑھانا گویا تعلیم کے لیے رشوت دینا ہے .... بالتخصیص ہندوستان میں اور زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے اسکالرشپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالرشپوں سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانہ کے مشہور و معروف شخصوں میں جنہوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی ہے، یا اپنی عمدہ تصنیفات سے لٹریچر کو رونق دی ہے، مسلمانوں اور نیز اور قوموں میں اکثر وہ لوگ تھے جو غریب اور نہایت مفلس شخصوں کی اولاد میں سے تھے۔ اب بھی اس قسم کے لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کی جا سکتی ہیں ... اگر میری معلومات میں غلطی نہ ہو تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لیے جو "سیزر" کہلاتے ہیں کوئی طریقہ جاری ہے۔ مگر اُن کے زیادہ خوش حال اسکول فیلو اُن کو کسی قدر حقیر سمجھتے ہیں۔ محمڈن کالج علیگڑھ میں بھی مینجنگ کمیٹی نے اس قسم کے سیزر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے۔ لیکن وہ اُس کو ایسے مخفی طور پر امداد کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اس قسم سیزرس کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اُس حقارت سے بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کی جاتی ہے۔"

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اس لیے قاصر رہتی ہے کہ مضامین تعلیم بے شمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی ... اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے جن کا نام غالباً باقی رہتا، یا جن کا اثر قوم پر پڑتا۔ مورل اور سوشل ترقی کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرتِ مضامینِ تعلیم کے برخلاف ہے، اگر اس کا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو۔ ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "نیم حکیم خطرۂ جان و نیم ملّا خطرۂ ایمان" اور میں نے سنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے؟

اُس کی کامیابی کی کیا توقع ہے ؟ مفصّل جواب دینے کے بعد کہا کہ "گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف یورپین بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں کا شوقین ہو، مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا، بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو . . . جس حیثیت اور وقعت کے مدارس نسوان ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو اُن مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیجنا پسند کریں گے ؟ ہرگز نہیں . . . عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اُس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا ؟ جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اُن کی قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اُس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی نسبت کے بندوبست کے جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے . . . . اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اُس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع جائے گی۔"

مسٹر پیرسن نے سوال کیا کہ "آیا ہندوستان کے مزدوری پیشہ لوگ اس بات کا فیصلہ

کرسکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دیجاتی ہے وہ اُن کے بچوں کے لیے مناسب ہی یا نہیں؟ سرسید نے اس کے جواب میں کہاکہ "اُن کو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں"

پھر اُنھوں نے یہ سوال کیاکہ "تعلیم کی ترغیب کے لیے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ سرسید نے کہاکہ "یہ دربار بجز نمائش کے اور کچھ نہیں"

مسٹر وارڈ نے سوال کیاکہ "کیا آپ کوئی ایسا یوروپین اسٹیشن ہندوستان میں بتاسکتے ہیں جہاں اہل یوروپ کسی مشن اسکول یا اور پرائیویٹ اسکول کے مصارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لیے ہو، کنٹری بیوشن یعنی چندہ نہ دیتے ہوں؟ سرسید نے اس کا یہ جواب دیاکہ "یہ سوال پیچیدہ ہے ..... اس سے ضمناً یہ تسلیم کرلینا نکلتا ہی کہ ہندوستان کے ہر ایک یوروپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لیے کنٹری بیوشن دیتے ہیں۔ میں اس ضمنی تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا۔ باقی سوال دو جداگانہ امور سے متعلق ہے۔ اول مشنری اسکولوں سے۔ سو اُس کی نسبت میرا یہ جواب ہی کہ میں کسی ایسے یوروپین اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنری اسکول کنٹری بیوشن کے ذریعہ سے مقرر ہوا ہو اور انگریز اُس کی مدد نہ کرتے ہوں۔ دوسرے یہ سوال پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ہے۔ اس حصہ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اُس کی امداد انگریز بذریعۂ کنٹری بیوشن کے کرتے ہوں، سوائے محمڈن کالج علیگڑھ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوشن یوروپین کی طرف سے مقرر ہے . . ." اس کے بعد لارڈ نارتھ بروک، لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور ارکان سلطنت کے عطیات کی شکرگذاری کے بعد کہاکہ "مگر اسٹیشن کے یوروپین عہدہ داروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی ماہواری یا سالانہ کنٹری بیوشن اور سوائے ایک کے کسی نے اُس کو یکمشت چندہ بھی نہیں دیا"

مسٹر وارڈ نے سوال کیاکہ "محمڈن کالج کے پروسپکٹس میں کیا فی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھاکہ صرف مسلمانوں پر چندہ کا محدود رکھنا مناسب ہے؟" اس کا جواب سرسید نے اس طرح پر دیا

کہ "کمیٹی نے تجویز کی تھی کہ انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے کیونکہ کمیٹی کے نزدیک ایسے کالج کو قائم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جدا ہو پولٹکل مصلحت کے برخلاف تھا پس اُس نے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان۔ انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں۔"

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ "کیا فی الواقع۔ سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپیہ اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؟" اس کا جواب سرسید نے یہ دیا کہ "سوائے مسٹر برائلی کے جنھوں نے مجھ کو ایک ہزار روپیہ دیے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی۔ مگر اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی"

محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

۱۸۸۳ء میں سرسید نے "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسیشن" قائم کی۔ اول اُن کو ۱۸۶۹ء میں جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے چند سال گذرے تھے یہ خیال ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہوں اور خواہ مسلمان، تعلیم کی غرض سے یوروپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیے ایک ایسوسیشن قائم کیجائے اور اُس کے ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دیا کریں جو بطور ایک فنڈ کے یوروپ کے سفر کے لیے جمع ہوتا رہے، مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اُس وقت یوروپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اسی قسم کے توہمات رکھتے تھے اس کے سوا یوروپ کا سفر اس زمانہ میں فی نفسہٖ مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یوروپ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور ہندوستانیوں کے لڑکے تعلیم کے لیے ولایت جانے لگے تھے لیکن خاصکر مسلمانوں کے لیے حالت موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جاکر پاس کرنا جیسا کہ سرسید نے علیگڑھ گزٹ مورخہ ۱۱ر اگست ۱۸۸۳ء میں مفصل بیان کیا ہے ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو، عزت نہیں ہو سکتی۔ دولتمند مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں۔ اس وقت سول سروس کے قاعدہ کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جاکر سول سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ امرا کے لڑکے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے

تھے اور سمجھے جاتے ہیں یہاں تک کہ بقول سرسید کے اُس وقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی اُن کے گلے سے نہیں اترتی۔ ہاں متوسط درجہ کے لوگوں کو بلا شک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہر مگر ولایت کے سفر کا پورا خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے سرسید نے ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کے لیے اس غرض سے قائم کی کہ اگر کم سے کم پانسو مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی تاکہ جن مسلمانوں کے لڑکے ولایت کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کر سکتے اُن کی اس فنڈ سے امداد کی جائے۔ اور مدرسۃ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی جس کی تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اُس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا مگر درحقیقت اُس کے طالب علموں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کر لیں۔ (۱) سول سروس کا امتحان مقابلہ (۲) کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنی (۳) کسی پیشہ میں مثل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجینئری کے ڈپلوما حاصل کرنا۔

پھر اس ایسوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لیے انھوں نے شمالی ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور سب کمیٹیوں کے لیے قواعد مقرر کر کے شایع کیے، مگر اس تمام کوشش کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ایسوسیئشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے جو کچھ عرصہ تک دو روپیہ ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور ڈونیشن کے بھی کسی قدر روپیہ دیا آخر سب کے ارادے سست ہو گئے اور جیسا کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے، رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہو گیا۔

ایسوسیئشن مذکور کی آمدنی سے چار ہزار ایک روپیہ جمع ہوا تھا جس کو ممبروں کی منظوری سے سرسید نے الہ آباد بنک میں جمع کرا دیا تھا، تاکہ جس کام کے لیے وہ جمع کیا گیا تھا جب اُس کا موقع آئے وہاں خرچ کیا جائے اور اُس وقت تک اُس کے منافع سے محمڈن کالج علیگڑھ کے

طلبہ کو امداد دی جائے۔

محمڈن ایسوسی ایشن علیگڑھ | اسی ۱۸۸۳ء میں سرسید نے بشرکت رئیسانِ ضلع علیگڑھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اُس کا چلنا بھی ایسا دشوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا دشوار تھا کیونکہ اُس کے مقاصد رؤسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے، مگر چونکہ سرسید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اُس کے پیرو کار نہ تھے اس لیے وہ چند روز کے بعد بالکل مدھم پڑگئی اور اب اُس کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوا | ۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہوگئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہوگیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کرسکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں، ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہورہے ہیں اُن میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اُس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔

اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دیے گئے تھے (۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں اُن میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا مقدور عمدگی سے اُس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے

اسلام جابجا بالطور خود دیتے ہیں اُس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اُس کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن میں جو تنزل ہوگیا ہے اُس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لیے دو طریقے تجویز کیے گئے تھے، ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں، کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے اُن کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے؛ دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لیے کمیٹیاں قائم کی جائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو انھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبہ کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب و صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزل کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں تحریر کرکے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں اُن میں سے جو تجویز اُن کے علاقہ میں قابل اجرا ہو اُس کے جاری کرنے میں کوشش کریں۔

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک اُس کے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سال گذشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انسداد کے لیے ریل کے مسافروں کے ساتھ جابجا کی جاتی تھی۔ اور زیادہ تر سرسید کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی، اُس کا اجلاس موقوف کیا گیا منجملہ گیارہ کے اول کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۲۵ رپورٹیں سالانہ

انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھ کر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آکر پیش کیں۔ اُس کے بعد ظاہراً پھر کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریباً اتنی رزولیوشن اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوئے۔

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپکر ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی جس میں کیفیت انتظام کانفرنس، فہرست ممبران و وزیٹران، تعداد زرچندہ، رپورٹ سکرٹری متضمن حساب جمع وخرچ زرچندہ و کیفیت تعمیل و عدم تعمیل تجویزات سال گذشتہ، رزولیوشن جو اجلاس میں پیش ہو کر پاس ہوئے اور اُن کے متعلق ممبروں کی اسپیچیں اور مباحثے، رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول ہوئیں، لکچر اور نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں۔

اس اجتماع کا نتیجہ براہ راست یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے اجلاس میں ہر سال منظور ہو کر شائع ہوئیں اُن کے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی اپنی بستیوں اور شہروں میں عمل درآمد کرتیں، جو تعمیلیں کانفرنس کے سکرٹری سے تعلق رکھتی تھیں اُن کو سکرٹری انجام دیتا اور عام مسلمان جہاں تک اُن کے قبضۂ اختیار میں تھا، کانفرنس کی تجویزوں کی تائید اور کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی اولاد کی ترقی تعلیم کا انتظام کرتے، کیونکہ کانفرنس اس کے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کو اُن کی واقعی حالت سے اور جو تدبیر اُن کی بھلائی کے لیے مناسب سمجھے اُس سے آگاہ کردے۔

لیکن سوا اس کے کہ سرسید نے جو ابتدا سے اخیر دم تک سکرٹری رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور انہیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس برابر گیارہ برس تک ترقی روزافزوں کے ساتھ ہوتے رہے، اُس کی تجویزوں پر بہت ہی کم عمل درآمد ہوا۔ سرسید ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے خود پہنچتے تھے، وہاں کی لوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام میں مدد دیتے تھے۔ انہیں کی صلاح اور مشورے سے اجلاس کے لیے اکثر ہال کی تیاری اور ممبروں کی آسائش کا بندوبست ہوتا تھا، وہ خود کانفرنس کی کارروائی کے قواعد

اور پروگرام بناتے تھے، ٹکٹ چھپواتے تھے، رزولیوشن انتخاب کرتے تھے، سال گذشتہ کا حساب اور تفصیلات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تیار کرتے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے، اُس کو چھپوا کر تمام ممبروں کے پاس بھیجتے تھے۔ مینجنگ کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لیے مقرر ہوتی تھی، اُس سے خط و کتابت کرتے تھے، سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علیگڑھ میں ہوتا (اور زیادہ تر علیگڑھ ہی میں ہوتا تھا) تو لوکل کمیٹی کے تمام فرائض خود انجام دیتے تھے۔ انھوں نے صرف اس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہو کر آیا کرے، دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علیگڑھ کی مفصل رپورٹ بطور نمونہ کے لکھنؤ میں خود لکھ کر پیش کی تھی۔ جن رزولیوشنوں کی تعمیل بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے متعلق ہوتی رہی اُنھوں نے برابر اُس کی تعمیل کی، کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتۂ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے اُن کو خط کتابت کرنی پڑتی تھی اور تمام خط کتابت کا خلاصہ اور اُس کا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا، باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولیوشن پیش کرتے اور اُن پر لمبی لمبی اسپیچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق اُن کو انجام کرنے پڑتے تھے جیساکہ کانفرنس کے گذشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندہ کی فراہمی اور ممبروں کی مدارات اور اُن کی آسائش و خورد و نوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جانفشانی سے کیا مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اُس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں بہت سے رزولیوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید تھی، مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا، مسلمانوں کے اوقاف کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا، تمام شہروں اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید کے لیے

کمیٹیاں قائم کرنا اور اسلامی انجمنوں سے اس کی تائید کی خواہش کرنا، تمام اسلامی انجمنوں کا کا باب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کی جائے، سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست کرنا، تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہل اسلام کے موافق مدرسے جاری کرنے، یوروپ کے مورخوں نے جو غلط اسلام مسلمانوں پر لگائے ہیں اُن کی غلطیاں دور کرنے کے لیے رسائل لکھے جانے، مسلمان بادشاہوں کے قدیم فرامین جمع کرکے اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے چھپوانا، صاف اور سلیس اردو میں اخلاقی رسالے اور کتابیں لکھنا جو لڑکوں کی تعلیم میں کام آسکیں، مسلمانوں کی قدیم اور مستند کتابوں کا جو کہ اب نادرالوجود ہیں، پتا لگانا اور تا بمقدور اُن کو بہم پہنچانا، اس بات کی تحقیقات کرنا کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے حاصل کیے تھے اُن پر کس قدر اضافہ انھوں نے خود کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر افسوس ہے کہ اُن میں سے کسی تجویز پر الّا ماشاء اللہ کوئی معتد بہ توجہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوئی۔

باایں ہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذّات یا بالعرض پیدا ہوئے وہ بھی امید اور توقع سے زیادہ تھے۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہوگئی، نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے، نہ کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادہ سے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کرکے کانفرنس کے جلسوں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہنستے تھے، بولتے تھے۔ انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا، دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اور اس طرح ایک مردہ اور پراگندہ قوم کے اجزا میں روز بروز التیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اس کے سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ ہوگیا خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا

تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اُس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گزشتہ برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود کانفرنس کے چندہ میں سے بعد منہائی اخراجات کے جس قدر روپیہ بچا وہ وظائف میں صرف ہوتا رہا، نیز پنجاب کی اکثر اسلامی انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا اقتضا سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جن سے اُردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے جیسے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، الجزیہ، مضمون کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب، ابوریحان بیرونی کی لائف، کتاب کلیلہ و دمنہ کے تاریخی حالات، اشاعت اسلام بلا استعانت حسام، شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ پبلک سپیکنگ کی لیاقت میں کانفرنس کے مباحثوں سے بہت ترقی ہو گئی جن لوگوں کی طبیعت میں اس کی خداداد قابلیت موجود تھی، مگر اُس کے ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا اُن کو کانفرنس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور اُن کا ایک مختفی جوہر ظاہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام اسپیچیں کانفرنس کی رودادوں میں ہر سال چھپتی تھیں اس سے اُردو لٹریچر میں ایک مفید اور بکارآمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے "کاکس ہسٹری"، کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین مندرج تھے، ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا اور جب کہ یونیورسٹی میں نہایت زور شور سے اس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کی جائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک باوقعت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اُس کو معلوم ہو گیا کہ اگر فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اُس سے مسلمانوں کی دل شکنی ہی نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اُس کے علم مجلس اور اُس کی ملکی زبان یعنی اُردو کو سخت صدمہ پہنچے گا نیز کانفرنس ہی کی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی

جرأت ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے بعض شرائط پر اُس کی اجازت دیدی جس کا شکریہ گیارھویں اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی مسٹر ٹھیوڈور بک پرنسپل علیگڑھ محمڈن کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلواتے اُن کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کس قدر ہیں؟ اور کیوں وہ اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے؟ آیا مذہبی خیالات سے، یا اس وجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات کا مقدور نہیں رکھتے، یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انگاری کے سبب؟ اور جن کی نسبت تیسری وجہ معلوم ہو اُن کو اولاد کی تعلیم پر متوجہ کیا جائے، ان سے اس غرض کے لیے خط کتابت کی جائے اور اُن کے سمجھانے کے لیے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوشش برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں مگر ایسے مجمعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ ان باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُس کو برابر ترقی روز افزوں کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے یا نہیں؛ اگر قوم میں اس کے تھامنے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُس کی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجہ تک پہنچانے والی ہوگی، لیکن اگر اُس کا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے، کیونکہ اس قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُن کے عادی چلے آتے ہیں اور اُن سے بے شمار فائدے اٹھا چکے ہیں، مدت دراز کے بعد ظہور میں آتے ہیں پس ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں محض یوروپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں،

جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طاقت اور جہاں قومی مجلسیں پبلک پر کسی قسم کا رعب وداب نہیں رکھتیں یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگرس قوم کو چند سال میں کوئی معتدبہ فائدہ پہنچا سکے جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے آج تک کوئی کار نمایاں نہیں کیا وہ گویا اُس کو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جس میں برتن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہائے دراز تک انتظار کرنا چاہیے۔

اگرچہ سال گذشتہ میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا اُس سے بہت بڑی مایوسی ہوگئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سرسید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اٹھا ہے اُس سے کانفرنس میں پھر جان پڑتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے سرسید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی خصوصاً ۱۸۹۷ء میں۔ جیسا کہ گیارھویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے، جو کوشش اور جانفشانی اُنھوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گذشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمڈن کالج کی ترقی پر متوجہ ہوئے ہیں اُسی طرح اُنھوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ اس سال زندہ دلانِ پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی امید بندھی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۷ء میں سرسید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا۔ اس کمیشن میں سرسید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت نہ رکھتا ہو۔ صرف سرسید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سوا اس کے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدرِ ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے، اور کچھ نہ جانتے تھے۔ باوجود اس کے جیسا کہ سنا گیا ہے ممبری کمیشن کے فرائض اُنھوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیے جس طرح وائسرگل کونسل کی ممبری میں انھوں نے ہر ایک

قانون پر جو اُن کی موجودگی میں پیش ہوا تھا بڑی اچھی اسپیچیں کیں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح سول سروس کمیشن میں تمام سوالات پر جو کمیشن کے زیر بحث تھے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے مباحثے اور اُن کی اسپیچیں جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو، بالکل درج نہیں کی گئیں اور اس لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات کا ایسا نہیں جس سے سرسید کی کارگزاری اور اُن کی رایوں کا، جو کمیشن میں اُنھوں نے ظاہر کیں سُراغ لگ سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا۔ جو راقم کے خط کے جواب میں اُنھوں نے اسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے، اُس میں سے چند سطریں جو کہ مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"سول سروس کمیشن کا حال دریافت کرنے کے لیے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اُس میں بجز اس کے کثرت رائے فلاں امر کی طرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے، یہاں تک کہ اُن ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی، نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں میں اس بات پر سامی تھا کہ اسٹیٹیوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یوروپین کے عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہ ہو، اور جو قواعد اُس کی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اُن میں کچھ اصلاح کی جائے۔ کثرت رائے اس کے برخلاف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قانون مذکور منسوخ ہو اور اُس کی جگہ دوسرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اُس میں جدید قواعد مرتب کیے جائیں۔ اسی کثرت رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی۔ مگر ولایت میں یہ تجویز ہوئی کہ اسٹیٹیوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ کرنا ضرور نہیں اور جدید قانون کے بھی جاری کرنے کی حاجت نہیں

مگر ولایت سے اسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرت رائے سے جدید قانون بنانے کے لیے لکھی گئی تھی، کچھ قواعد بن کر آئے جن کے بموجب اب عمل درآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ زیادہ تفصیل اس کی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہوسکتی۔"

سرسید کا یہ خط ۲۲ر نومبر ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئے گا اُس وقت اُس کی مفصل کیفیت دریافت کرلی جائے گی، اُن سے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی یکایک خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا تو اُس وقت وہ دُنیا میں نہ ہوں گے۔ لاچار اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا۔

انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت

سرسید کی لائف میں کانگرس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پر مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے، اس لیے ہم اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

مئی ۱۸۷۷ء میں بابو سرندر ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر جو ۲۱ برس سے گھٹا کر ۱۹ برس کی قرار دی گئی ہے اُس کی گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ۲۱ کی عمر کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لیے پہلے مقرر تھا وہی اب پھر جاری کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں تاکہ جب کبھی اُن کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنے کی ضرورت ہو اُس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دورہ میں اُنھوں نے ایک مقام علیگڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس مقصد کے لیے علیگڑھ میں ہوا تھا اُس میں سرسید صدر انجمن تھے۔ نیز جو درخواست سول سروس کی عمر بڑھانے کے لیے ولایت بھیجی گئی تھی اُس کے بھیجنے میں بھی سرسید شریک تھے۔

غالباً اسی سنہ میں بنگالیوں نے کلکتہ میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام اوّل بنگال نیشنل لیگ

رکھا گیا تھا اور جس کا مقصد مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اُن کا مطالبہ کیا جائے ۱۸۸۳ء کے شروع میں نیشنل لیگ کی طرف سے انگریزی میں ایک گمنام پمفلٹ شائع ہوا جس کا نام "دی سٹار اِن دی ایسٹ" یعنی ستارۂ شرقی تھا۔ اس پمفلٹ کے شروع میں جو چند انگریزی اشعار تھے اُن کا یہ مضمون تھا "اے آسمان! کیا امید اور انصاف مر گئے؟ کیا کوئی نیا دن کبھی نمودار نہ ہوگا؟ آہ اے بچو تمھاری ماں (ہندوستان) ہمیشہ اسی طرح عبث طعنوں پر نشتیں کیے جائے گی؟ ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاف افق پر چمک رہا ہے اور اے ہندوستان! تیرے بچے جادو کے زور سے ایک مدت سے سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے تیری جگانے کی آواز اُن کے کان تک پہنچ گئی ہے"

پھر انھیں دنوں میں ایک رسالہ بطور سوال وجواب کے اور ایک اور رسالہ جس میں مولوی فریدالدین اور رام بخش دو فرضی شخصوں کا مکالمہ چھپا تھا شائع ہوئے۔ ان تینوں رسالوں کی پچاس ہزار جلدیں ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہندوستان کے تمام اطراف وجوانب میں مشتہر کی گئیں ازاں جملہ اُس کا ایک ترجمہ اُردو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ انتظام کی بُرائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی تھی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر بُرا اثر ہوتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھیں رسالوں کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں کے درمیان اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا۔" اسی طرح اُنھوں نے ولایت جانے سے پہلے اہلِ کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت کہا تھا کہ "گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کے لیے کوشش مت کرو جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اسی قسم کی غلط بیانیاں زبردست باعث اس بات کا ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔"

۱۸۸۷ء کے شروع میں جب کہ سرسید سول سروس کمیشن کے ساتھ لاہور گئے تھے اُن اشعار کے مضمون پر جو شارۂ شرقی کے شروع میں چھپے تھے بہت سے مسلمانوں کے مجمع میں خود راقم کے سامنے نہایت افسوس کرتے تھے اور بنگالیوں کے ساتھ شریک ہونے کو مسلمانوں کے حق میں مضر بتاتے تھے۔ پھر جب مولوی فرید الدین اور رام بخش کا مکالمہ مشتہر ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ اُس میں ایک فرضی نام مسلمان مولوی کا ہے اُن کو زیادہ خوف ہوا کہ مبادا مسلمان جو پہلے ہی سے بدنام ہیں اس مجمع میں شریک ہوجائیں۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ یہ رسالے فی الواقع بدنیتی سے اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے لکھے گئے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ سرسید کا خوف بالکل بجا تھا۔ اُنھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات صرف آنکھ ہی سے نہیں دیکھے تھے بلکہ خود اُن کو بھگتا تھا اور جو مصائب انگریزوں اور ہندوستانیوں پر گذرے اُن میں وہ خود اور اُن کے اکثر عزیز اور رشتہ دار شریک تھے۔ کلکتہ اور بمبئی میں جس آگ کا دھواں تک نہیں پہنچا تھا وہ خود سرسید کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے اور اپنی کتاب اسباب بغاوت میں بدلائل ثابت کرچکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو تباہ کردیا وہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا، نہ کسی ملکی سازش یا پولیٹکل نفرت کا۔ بس گو یہ رسالے بُری نیت سے نہ لکھے گئے ہوں مگر نہایت قرین تھا کہ جاہل اور ناواقف لوگ اُن کا مضمون سُنکر گمراہ ہوجائیں، یا گورنمنٹ اُن کو بغاوت کی ایک تحریک سمجھے۔

سرسید تیس برس سے جیسا کہ اُن کی لائف علی الاعلان شہادت دیتی ہے برابر کوشش کررہے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست اور دوستی پیدا ہو اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر زیادہ بھروسا اور زیادہ اعتماد ہو۔ اس لیے اُن سے زیادہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ مسلمان کہیں پھر انگریزوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ وہ غدر میں یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر لپٹ گئی۔ اُن کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیز بنگالیوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے

وہ مسلمانوں میں آکر میونٹنی نہ بن جائے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن باز یا جرہ اُس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اُس کی گردن توڑ ڈالتا ہے" وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر، اُن میں غالب حصہ اُن لوگوں کا ہی جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہوکر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجیٹیشن پھیلانا بعینہٖ ایسا ہی جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا، پس اُن کی اور خاص کر مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی ہدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں اپنے کان بند کرلیں۔ اُن کو یقین تھا کہ ۵۷ء کی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں جوان والنیٹر ہوتے، ایکٹ اسلحہ کبھی وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے"، پس اس بات کا خوف کرنا کچھ بیجا نہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں ازسرِنو حاصل کیا ہی یا کرتے جاتے ہیں وہ پھر اُسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے ہوگئی تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے سرسید نے علی الاعلان کانگرس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی مغایرت کا خیال نہیں کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں اُن کا برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایام غدر میں بجنور کے ہندو رئیسوں نے خود درخواست کرکے ضلع کا انتظام اُن کے سپرد کرایا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۹۳ء میں جب کہ شمال مغربی اضلاع کی اکثر ہندو سبھاؤں اور انجمنوں نے اُردو

زبان اور فارسی حرفوں کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی، سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف سے کھٹک گئی تھی، اور اُن کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمان مثل ایک قوم کے مل جل کر کوئی کام کریں گے، اس کے سوا بنگالی اخباروں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی اُن جزوی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور اُن کی وہ مخالفانہ اور دل شکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں، اور بھی مایوس کرنے والی تھیں، مگر پھر بھی جہاں تک ممکن تھا وہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بارہا اپنی پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے مغایرت پائی جائے۔ یہاں تک کہ گائے کی قربانی کی نسبت جیسا کہ اُنھوں نے ایک آرٹیکل میں ظاہر کیا تھا، ہمیشہ اُن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ محمڈن کالج علیگڑھ میں اُنھوں نے کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمان طالب علموں کی ہندوؤں پر ترجیح لازم آئے چنانچہ اب تک تقریباً دو سو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگرس کے طریقِ عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خیال سے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے، دو برس تک اُنھوں نے کانگرس کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اس بات کے منتظر رہے کہ کانگرس میں کیسی تجویزیں پیش ہوتی ہیں اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؟ یہاں تک کہ کانگرس کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اُس کے مقاصد اُن کو معلوم ہوئے تو اُن کو بخوبی یقین ہو گیا کہ اگر بالفرض کانگرس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کچھ اعتراض نہ ہو اور اُس کے مطالبے

بھی سراسر ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور اُن تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں کانگریس میں شریک ہونا اور اُس کی تائید کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ کانگریس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہوجائیں تو مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً مقابلہ کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لیے ولایت میں ہوتا ہے اُس کا ہندوستان میں ہونا یا تمام متعہد عہدوں کا مقابلہ کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا، یا لجس لیٹو کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی کے ساتھ اُن کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگریس کا اجلاس ہونے والا ہے اُس میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے اُن کو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اُن نتائج سے آگاہ کردیں جو اُن کے نزدیک کانگریس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔

۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہورہا تھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور پُرزور لکچر دیا جو اُن کی اسپیچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے اور اس لیے اُس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اُس میں کونسل کے الکشن اور امتحان مقابلہ پر کی گئی ہے اس کا لُبّ لباب ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔ کونسل کے الکشن کے متعلق اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے، پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اُس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے۔ اور اگر بفرضِ محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔" اس موقع پر انھوں

نے صاف یہ بات کہی کہ "میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہو مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے بدتر کوئی ممبر نہیں ہوسکتا" اس کے بعد جو تقریر انھوں نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر، سفر کی تکلیف گوارا کرکے، تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لیے زیبا ہیں اپنے پاس سے برداشت کرکے یا قوم سے چندہ کرکے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہے گا"۔ مقابلہ کے امتحان کی نسبت اُن کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس امتحان کے لیے ہمارا ملک تیار نہیں ہو انگلستان میں مقابلہ کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لے کر ایک ادنیٰ درزی کے بیٹے تک دے سکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلہ کا امتحان دے کر یہاں آتے ہیں اُن میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم مقرر ہوکر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی کے۔ اس لیے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ حکومت کر رہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے، ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنیٰ درجہ کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گی۔ اس کے سوا مقابلہ کا امتحان اُس ملک میں ہوسکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مل جل کر ایک ہوگئی ہوں مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا امتحان قرین مصلحت نہیں پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متفاوت ہو کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی پس اگر ہندوستان میں تمام متعہد اور غیر متعہد عہدوں کے لیے مقابلہ کا امتحان مقرر کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی ٹکڑا ملک کا ایسا نہ رہے گا کہ سوائے بنگالیوں کے کسی

قدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے۔

سرسید کا یہ لکچر اُردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہوگیا، اور نیز انگلستان کے اکثر نامور اخباروں نے اُس سے نوٹس لیا اور اس پر عمدہ ریمارکس کیے۔

اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو بمقام میرٹھ انھوں نے دوسرا لکچر اسی قدر طولانی جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جلسہ میں دیا۔ اس لکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگرس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگرس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے اور معدودے چند مسلمان جو اس میں شریک ہوئے ہیں اُنھوں نے غلطی کی ہے اور اُن کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگرس میں شریک ہیں۔ یہ لکچر بھی نہایت پُر زور اور مؤثر تھا۔ ان دونوں لکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سرسید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت یا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے اُنھوں نے بالاتفاق ان کی رائے کو تسلیم کرلیا، اور باستثنائے معدودے چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اُس پر پورا پورا عمل کیا، نیز پرانے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان اُن کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

پٹیریاٹک ایسوسیئشن | اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے بمقام علیگڑھ "پٹیریاٹک ایسوسیئشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگرس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائیں اور خیالات اور خط کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے۔

اس ایسوسیئشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگرس کے برخلاف

جلسے کیے گئے۔ تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور جس قدر کارروائیاں کانگرس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں اُن کی روئدادیں ایسوسیئشن کے ذریعہ سے وقتاً بعد وقت چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگرس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاصکر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور اُن کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض اُن پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپرزنٹیٹو اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور اُن کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس پر جو ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے، معترض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں اُن کی اب بھی وہی رائے تھی جو ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے تھے۔ اُنھوں نے خود لکھنؤ کے لکچر میں اقرار کیا تھا کہ "میں کنسرویٹو نہیں ہوں بلکہ بہت بڑا لبرل ہوں" اُنھوں نے کونسل میں جب کہ لارڈ رپن کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا، اپنی اسپیچ میں صاف کہا تھا کہ "میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشن پیدا کیے ہیں اور اُس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے"

لیکن اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں اُن سوشل اور پولٹکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ . . . ہندوستان فی نفسہٖ ایک براعظم ہے اور اُس

ہیں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں اور ایک گروہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجہ سے بہت اعلیٰ ہو ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کر لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہ ہو۔ پس ان وجوہ کی میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکلیں اور سوشل اور پولٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے، جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں، وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آئیں۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل اور پولٹکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے . . . . لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے، جہاں ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں، جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، مجھ کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص اوصاف

اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولٹکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اور اُن معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر متعلق ہیں اُس کے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اُس وقت تک الکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہو سکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب ہو گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جوابدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔"

یہ اسپیچ سر سید نے ۱۲ر جنوری [illegible] کو یعنی اُس لکچر سے جو کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں دیا پانچ برس پہلے لارڈ رپن کے سامنے کی تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اُسی طرح وہ ہندوستان کو موجودہ حالت میں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں ریپریزنٹیٹو اصول کے موافق عمل در آمد کیا جائے۔ انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر اُس کو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئرلینڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے۔ پس اگر بل پاس ہو جائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں، ایک فرقہ کی مجارٹی دوسرے فرقہ کے حق میں اس قدر مضر خیال کی جاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں برخلاف تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقیٔ تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں ریپریزنٹیٹو اصول سے کیا بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟

سر سید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگرس کے قائم ہونے سے پہلے جب کہ بابو سریندر ناتھ بنرجی علیگڑھ میں آئے تھے اور اُنھوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سر سید نے کیوں اُن کے ساتھ اتفاقِ رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن

سے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لیے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثے پیش کیے جائیں اُن کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو پھر نیشنل کانگرس سے جس کے لیے وہ فنڈ جمع کیا جاتا تھا، کس لیے مخالفت کی گئی؟

اس کا جواب بہت صاف ہے جس جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اُس میں صرف ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی یعنی یہ کہ ایک عرضداشت ولایت میں اس غرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بجائے ۱۹ برس کے ۲۱ برس کی قرار دیجائے۔ اس کے سوا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اور کسی خاص مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق جس کے لیے وہ جلسہ منعقد ہوا تھا سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں اُنھوں نے برابر اُس کی تائید کی اور وہ مقصد اُسی طرح حاصل بھی ہو گیا جس طرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی اور اگر دیگر تجویزیں جو آخر کو کانگرس میں پیش ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا یقین کیا جاتا ہے اگر اس انجمن والے جلسہ میں اُن کی تصریح کی جاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید اُن تجویزوں سے اتفاق کرتے کیونکہ جو اسپیچ انھوں نے پانچ برس پہلے قانون سیلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی تھی اُس کا سارا نچوڑ اس بات پر ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام قومیں برابر مستفید نہ ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اس کے سوا جو طریقہ کانگرس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا سرسید اُس طریقہ کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب "اسبابِ بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا مگر اُس کی ایک کاپی بھی اس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگرس نے تمام ملک میں تقسیم کیے ہندوستان میں شائع نہیں کی بلکہ جس قدر جلدیں چھپوائیں اُن میں سے ایک آدھ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لیے اور باقی کل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیج دیں۔ وہ اس قسم کے ایجیٹیشن کو جیسا کہ کانگرس نے ہندوستان میں شروع کیا تھا تمام ملک کے حق میں مُوما

اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدرالدین طیب جی کے نام اُنھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "امریکا میں اول اسی قسم کا ایجیٹیشن شروع ہوا تھا۔ اور آخر کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو اُن کے مُنہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ "نو ٹیکسیشن وِدآؤٹ ریپریزنٹیشن" پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اس کانگرس کے ایجیٹیشن میں شریک ہوں نہ کہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتی ہیں" پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "غدر کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل چلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔"

اگرچہ کانگرس سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرسید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنے اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہوا لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرسید کی اس پالسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اول ہی اول ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اُس وقت ہندوؤں نے اُس کو خوشی سے قبول کر لیا تھا مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اُس سے انکار کیا تھا لیکن آخر کار مسلمان اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہو کر اُن کو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو کہیں نیشنل کانگرس کی علیحدگی سے بھی آخر کو پہلے کی طرح پشیمان ہونا نہ پڑے" مگر سال گذشتہ میں جو افسوسناک واقعات پونا میں گذرے اور جو عبرت انگیز نتیجے اُن پر مترتب ہوئے اُن کو دیکھ کر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور معلوم ہو گیا ہوگا کہ سرسید کی رائے اس باب میں کس قدر صائب تھی اور کانگرس سے علیحدہ رہنا ایک ایسی قوم کے لیے جیسے کہ مسلمان ہیں کس قدر ضروری تھا۔

اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے سرسید پر بے انتہا لے دے ہوئی، اُن کو خوشامدی، زمانہ ساز، شائم سرور اور کیا اور کیا کہا گیا، اُن کی پچھلی تحریروں کا حال کی تحریروں سے مقابلہ کر کے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم

کے حق میں بہتر سمجھ لیا تھا اخیر دم تک اسی پر قائم رہے اور کسی کے کہنے سننے پر مطلق التفات نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نکتہ چینیوں کے ترکش خالی ہو گئے اور سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کے سی۔ ایس۔ آئی کا تمغا ملنا

۱۸۸۸ء میں سر سید کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند" سے ممتاز کیا گیا۔ ۱۴ر مئی روز دوشنبہ کو اس تقریب سے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علیگڑھ کے رئیس اور سر سید کے مسلمان ہندو اور یوروپین دوست جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمولی آرائشوں کے مشرقی وضع کی تلواروں اور مغربی وضع کی بندوقوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور راجہ جیکشن داس سی۔ ایس۔ آئی اپنے اپنے تمغے پہنے ہوئے سر سید کو ہال کے اندر لائے۔ تمام حاضرین ان کے آنے پر کھڑے ہو گئے اور تنظیمی گارڈ نے جس کو ضلع کی پولیس نے مامور کیا تھا ہتھیاروں سے سلامی ادا کی۔ اس کے بعد مسٹر ای۔ ایچ ریڈیچی اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے فرمان شاہی حسب ذیل پڑھ کر سنائے۔

(اول)

(دستخط) وکٹوریا آر آئی

وکٹوریا مد ظلہ متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین قیصر ہند فرماں روائے طبقہ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بسلامتی و مبارک باد آنکہ

چونکہ یہ مد نظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور ان خدمات کے شایاں ہو جو آپ سے اس

سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں، لہذا یہ مناسب اور زیبا ہے کہ آپ کو اعزاز ہٰذ نائٹ کمانڈر طبقہ اعلائے ستارۂ ہند سے ممتاز و سر بلند کیا جائے۔ اس لیے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز نائٹ کمانڈر ہٰذ طبقہ اعلائے ستارۂ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز و مفتخر ہو کر حقوق جزو کل متعلقہ طبقۂ اعلائے موصوف ہوں

عدالتِ عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف
آج یکم جنوری ۱۸۶۹ء اور سنہ ۳۲ جلوسی کو جاری ہوا
(دستخط) اکراس (وزیر ہند)

(دوم)

(دستخط) وکٹوریا آر آئی

وکٹوریا مدظلہ متحدہ گریٹ برٹن آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین۔ قیصر ہند۔ فرماں روائے طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل قانونی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی۔ بسلامتی و مبارکباد آنکہ

آپ کو اعزاز طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجا کہ ہم کو حسب اختیارات دائین طبقۂ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری ولایت کی بغرض استفادہ اعزاز طبقۂ اعلیٰ کے معاف کریں لہذا حسب اختیارات خسروانہ طبقۂ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہننے و استعمال کرنے ستارۂ موصوف کی بجانب چپ بالائے پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور نیز نشان خاص و بندش متعلقۂ نائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں۔ اور حسب فحوائے اختیارات مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوق جزو کل متعلقۂ طبقۂ نائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص نائٹ بیچلر سلطنت موصوف سے مستفید و بہرہ یاب ہوں اور یہ اُسی طریقہ اور مراسم سے متصور ہے جیسا کہ آپ اس نائٹ ہڈ سے ہم

سے یا بجائے ہمارے ہمارے نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گرینڈ ماسٹر طبقۂ موصوف ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالتِ عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف

آج ۱۱ فروری ۱۸۸۸ عیسوی اور ۵۱ جلوسی کو جاری ہو

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

اس کے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینڈی اپنی کرسی پر سے اُٹھے۔ سب لوگ اُن کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے پھر سلامی ادا کی۔ صاحب ممدوح نے حضور ملکۂ معظمہ کوئن وکٹوریا کی طرف سے ستارہ ہند سر سید کے سینہ پر لگا دیا اور رفیتہ مع تمغے کے جو اُس کے ساتھ تھا اُن کے گلے میں ڈال دیا۔ سب لوگ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اُردو میں ایک لمبی تقریر کی جس میں سر سید کی بہت تعریف کی تھی اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ "اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے .... اُن میں نوجوانی سے دو وصف برابر پائے گئے ہیں ایک علم کی محبت دوسرے وطن کی محبت کہ یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں"۔ لبرل نے اُن کو کنسرویٹو خیال کیا کیونکہ اُنھوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسرویٹو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عمدہ چیز پا سکیں گے اُنھوں نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے" سید صاحب وسیع ہمدردی، دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی کی مثال ہیں اور نیز وہ وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اس لیے اُن کے ملک کے لوگ اور ملکۂ معظمہ اُن کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"

اس کے بعد سر سید نے اس مضمون کے معمولی اقرار نامہ پر کہ وہ طبقۂ مذکور کے قوانین

کی اطاعت کریں گے دستخط کیے اور جلسہ برخاست ہو گیا اور مسٹر کینیڈی نے اسی تقریب میں چند انگریزوں اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری پر دعوت کی۔

اس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ رؤسائے ضلع علیگڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سرسید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہے تو انھوں نے سرسید کو اور یورپین افسروں کو اس خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا چاہا اور کچھ لوگ رئیسوں کی طرف سے مع ایک خط کے سرسید کے پاس آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا منظور کریں۔ سرسید نے اس کے جواب میں بعد شکریہ روسائے ضلع کے یہ لکھ بھیجا کہ "چونکہ قوم کی حالت ابتر ہے اور اُس کو بہم رسانی تعلیم کی سخت حاجت ہے اس لیے میں ایسے فضول اخراجات کا سخت مخالف ہوں .... پس اس ڈنر اور جلسہ سے آپ مجھے معاف رکھیں" اور اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ایسی خوشی یا تقریب میں ڈنر دینے محض فضول ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس وقت مسلمانوں کی تعلیم میں خرچ کرنے کی ہے۔ ہمارے لیے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اُس کے لیے بارہ سو روپیہ کا تخمینہ ہوا تھا اگر وہ روپیہ تعلیم مسلمانان کے اخراجات میں صرف ہوتا تو کس قدر مفید ہوتا۔"

سرسید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی تھی مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے یعنی کبھی ۲۰ سے زیادہ نہیں ہونے پاتی کہا ہے جب تک نائٹ کمانڈر کا عہدہ خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو تمغا نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ ملٹن نے دربار قیصری کے بعد اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ کمانڈر کے عہدہ کے اس وقت سرسید کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔

ڈاکٹر آوف لاز کی ڈگری ۱۸۸۹ء میں سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف اور حامیٔ علوم و فنون کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں دستور ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں اُن کو اہل علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جس کو "ڈگری اوف ڈاکٹر

اوف لاز مہ کہتے ہیں۔ سرسید کی شہرت خطباتِ احمدیہ اور دیگر تصنیفات وتحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کے سوا مدرستہ العلوم کے قائم کرنے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علوم جدیدہ کے بہت بڑے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بغیر اس کے کہ سرسید کو اطلاع ہو ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے اُن کو ایل ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنی تجویز ہوئی۔

۱۵ اپریل کو شہر اڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائنڈ ہال کے نام سے مشہور ہے گریجویشن کی رسم ادا کی گئی۔ یہ جلسہ جیسا کہ علیگڑھ گزٹ مطبوعہ ۲۸ مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالہ اخبارات وچٹھیات ولایت مفصل مذکور ہے، بڑی شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ تمام گیلریاں اور ہال کا ایک حصہ عام لوگوں سے جو مدعو کیے گئے تھے بھرا ہوا تھا اور دوسرا حصہ یونیورسٹی کے گریجویٹس سے مزین تھا۔ اس جلسہ میں دو تہائی لیڈیاں تھیں جن میں لیڈی میور صاحبہ جنھوں نے مدرستہ العلوم علیگڑھ کی "میور پارک" میں سب سے پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا موجود تھیں اور اُن کے معزز شوہر سر ولیم میور بھی جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی لارڈ چینسلر کے ہمراہ، جو جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے تشریف لائے تھے۔ جس وقت لارڈ چینسلر کے سامنے سرسید کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اُس پر تحسین وآفرین کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور اور لیڈی میور صاحبہ خوشی سے باغ باغ ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے یہ ڈگری ملنی تجویز ہوئی تھی۔ پروفیسر کرک پیٹرک نے سرسید کو لارڈ چینسلر سے انٹروڈیوس کرتے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید احمد خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو اُن کی غیر حاضری میں ڈاکٹر اوف لاز کی آنریری ڈگری عطا کی جائے۔" اس کے بعد سرسید کی تاریخ ولادت، خاندان سلطنتِ مغلیہ کا قدیم توسّل، سرکاری ملازمت، ایامِ غدر کی خدمات اور تیس انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شریفانہ ہیرو ئزم ظاہر کرنا، پولٹکل پنشن اور خطابات کا ملنا، وائسریگل کونسل

کی ممبری، ملکی اور قومی خدمات، آثار الصنادید اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطباتِ احمدیہ کا لکھنا، سپیکنگ کی اعلیٰ لیاقت، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر ہونا، محمڈن کالج قائم کرنا اور بڑے بڑے ارکانِ سلطنتِ ہند کا اُس میں مدد دینا۔ یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ "سرسید سب سے زیادہ نامور مسلمان ہجکٹ حضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند کے ہیں اور اس لیے خصوصیت کے ساتھ یونیورسٹی کے اس اعزاز کے مستحق ہیں"۔ اس کے بعد تمام حاضرین جلسہ نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے اور سرسید کو ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سند اڈنبرا کی یونیورسٹی نے سرسید کو بھیجی تھی وہ اس کتاب کے لکھتے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم یہاں اُس کے نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سرسید اڈنبرا یونیورسٹی کی اس قدر شناسی کے نہایت شکرگذار تھے اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے لیکن اُنھوں نے ایسی آنریری ڈگریوں کو ڈگری پانے والوں کی اصلی لیاقت کا معیار کبھی نہیں سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ایڈریس کے جواب میں جو اہلِ پنجاب نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو بمقام جالندھر دیا، صاف کہا تھا کہ "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کیسی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا بُرا علم کا وہ دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے، فلسفہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو میں خود بھی اُنھیں میں ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری

دی ہے۔ ہم آدمی جبھی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

ٹرسٹی بل پر اختلاف کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی متعلق تھا۔ لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں چنانچہ ۱۸۸۳ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہو کر نئے بائی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔ (۱) کمیٹی ڈائرکٹران تعلیم السنۂ مختلفہ و علوم دنیویہ (۲) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت (۳) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اثنا عشریہ (۴) منیجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہوس کا انتظام اور بورڈروں کی ہر طرح کی نگرانی تھا۔

اس کے بعد جب کالج کی حالت اور اُس کی جائداد بہت ترقی کر گئی اور اس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ لوگ ہزار ہا روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پیشگی طور پر کمیٹی میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اس خیال کو پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہو گئے جب صحت ہوئی تو اُنھوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ اُن کی زندگی میں سرکاری قانون مروجہ وقت کے موافق کالج اور اُس کی جائداد کے لیے ٹرسٹی (امین) مقرر ہو جائیں۔ اور ایسے قواعد اور ریگولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری جزئیات کالج پر حاوی ہوں اور جہاں تک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اصول پر کالج کی بنیاد رکھی گئی ہے انھیں اصول پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ سرسید کے معزز یورپین دوستوں نے بھی دور اندیشی کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایما پایا گیا کہ جب تک اطمینان کے قابل آئندہ انتظام نہ ہوگا گورنمنٹ اور حیدرآباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اُس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی نے اس کی بعض دفعات سے اختلاف

کیا جن میں سے ایک وہ دفعہ تھی جس کی رو سے آنریبل مسٹر محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اور اُن کے ساتھ اُن کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علیگڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے اس اختلاف میں شریک ہو گئے۔ اگر یہ اختلاف اختلاف رائے کی حد سے متجاوز نہ ہوتا اور ٹرسٹی بل کے پاس ہو جانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اُس کو خدا کی رحمت سمجھتے، مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبران کمیٹی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر اُن کی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً اُن کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ سر سید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جبکہ ٹرسٹی بل قاعدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہوا خواہوں کو اُسے سر پر رکھنا چاہیے تھا۔ یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شائستہ ملکوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اور روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں۔ جب تک کوئی تجویز کثرت رائے سے پاس نہیں ہوتی اس سے نہایت زور شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لیے تمام وسائل جو اُس کی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے مگر جہاں ایک پارٹی کثرت رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے ہتھیار ڈال دیے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا۔ چنانچہ انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہو جانے کے بعد اُس کو بسر و چشم قبول اور منظور کر لیا اور کالج کے پہلے سے زیادہ حامی و مددگار بن گئے مگر اور صاحبوں نے قانون ٹرسٹیان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔

اگرچہ سر سید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت اُن کو ایسی شاق نہیں گذری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کی پارٹی کی مخالفت جس سے فی الواقع اُن کا حوصلہ تنگی کرنے لگا تھا اور صبر و تحمل کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اول تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور بورڈنگ کے انتظام اور نگرانی

میں اُن سے بے انتہا تقویت پہنچی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنا فی الواقع ناقابل برداشت تھا۔ دوسرے اُن کی مخالفت اُنھیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون اُن کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے سرسید کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹک جائے چنانچہ اُنھیں دنوں میں جو اُنھوں نے ایک نہایت پُرجوش آرٹکل علیگڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں فرانس چل کر ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈِکٹیٹر طبیعت کے آدمی تھے، اس خصلت کو چاہو اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو بہر حال یہ خصلت اُن میں ضرور تھی، گو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے مگر جن اصول پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو اُن میں مخل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے امکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو شروع سے لیکراخیردم اُن کے پیش نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یکجہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے اُنھوں نے یورپین اسٹاف کو کالج کا جزو غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے چیدہ چیدہ آدمی بلوا کر کالج میں جمع کیے تھے مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یورپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آیندہ کے لیے سکرٹری شپ کا کوئی انتظام نہ کیا تو اُن کے بعد ضرور مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری ہوں گے۔ اُنھوں نے اور نیز بعض اور یورپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کر دیں تاکہ یورپین اسٹاف کا جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے، سرسید کے آیندہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے۔ اگرچہ سرسید کو

نہیں تھا کہ سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے، جیسا کہ اس کتاب کے صفحات میں جابجا مذکور ہے، وہ سو سو کوس بھاگتے تھے۔ اس کے سوا سید محمود کی نسبت معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے کہ وہ جائنٹ سکرٹری یا سکرٹری بننے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چونکہ یوروپین اسٹاف کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور اُن کو کالج کی آیندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضرور تھا اس لیے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے کے لیے داخل کرنی اور سید محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے اُن کا فرض تھا کہ اول تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرتے کیونکہ وہ ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسید نے ہمیشہ نظامِ کالج میں سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے، یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرتِ رائے سرسید کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسید قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے اور یوروپین اسٹاف یقیناً کالج کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا اور پھر کوئی یوروپین جنٹلمین یہاں آنے کی ہامی نہ بھرتا اور اینگلو انڈین افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی۔ اور اگر انھوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ اگر اس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعۂ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اگر اُس مخالفت پر باوجود پاس ہو جانے بل کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نااتفاقی پر سارا زمانہ ہنسے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اس لیے ہم کو غلط مجارنی کا اتباع کرنا ضرور نہ تھا، بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی پر فیصلہ کا انحصار کریں اور جب قرعہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ عذر کرے کہ اس میں میری حق تلفی ہوتی ہے اس لیے میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کالج سے

بالکل بے تعلق ہوگئی تھی مگر مدت تک اُن کے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سرسید اُن سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو جو جدید قواعد کے بموجب کی جاتی تھی، غلط سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے کبھی کچھ جواب نہیں دیا آخر ایک عرصہ کے بعد مجبور ہو کر اُن کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب سر وقار الامرا بہادر مدار المہام ریاست حیدرآباد نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظہ کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے، بنظر سرپرستی کالج و خیر خواہی اہل اسلام سرسید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرا دی تھی چنانچہ سرسید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیان میں مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرین جلسہ نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا، مگر بعض معقول وجوہات پر جن کی تفصیل طولانی ہے اُنھوں نے ٹرسٹی بننا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ ہز ایکسلنسی نے کرائی تھی سرسید کی زندگی میں اُس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہ ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نواب لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کی بدبختی پر رحم فرما کر آنریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خاں سی ام جی کے باہم پھر صفائی کرا دی ہے اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا اور تمام لائق اور ذی رعب مسلمان متفق ہو کر اس قومی انسٹیٹیوشن کے استحکام و دوام اور ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں گے۔

اگرچہ قوم کے اُن دو معزز ممبروں میں صفائی ہو جانے کے بعد ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ ٹرسٹی بل کے ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلائیں جو قومی کالج اور قومی تعلیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا مگر چونکہ سرسید کی بایوگرافی میں اُن تمام واقعات کا جن سے اُن کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو، استقصا کرنا ضرور ہے اس لیے جو کچھ اس معاملہ کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا بے کم و کاست بیان کر دیا گیا۔

کالج کے روپے میں غبن ہونا

عربی میں یہ مثل مشہور ہے۔ "الھُمُومُ بقدرِ الھِمَم" یعنی جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سرسید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھر لیے تھے کہ ایک آدمی کا اُن سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں اُن کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا۔ منجملہ اہلکارانِ دفترِ سکرٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا جو علیگڑھ کے ایک ممتاز کایستھ خاندان کا آدمی تھا۔ اُس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا اور اب پنشن پاتا تھا اور اس کا دادا لفٹنٹی پنجاب میں میر منشی تھا سرسید نے اس کو ایک اشراف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا اگرچہ سرسید کو اُس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزائے قید پا چکا ہے مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو دوسرے اشراف آدمی ایک دفعہ زک اٹھا کر پھر ویسی ہی خطا نہیں کرتا، اُس کو بدستور اُس کے عہدہ پر بحال رکھا۔ سرسید میں ایک خاص خصلت تھی جس کو اگرچہ پرانی سوسائٹی میں ایک نہایت شریفانہ خصلت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے خاصکر اُس صورت میں جبکہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گذر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے، اُن میں ایک خاص قسم کی مروت بدرجہ غایت تھی وہ کسی کو ملازم رکھ کر، عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا نہ ہو، باوجود متواتر شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کے باب میں کسی قسم کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے کسی کی نسبت اُن کو مطلق بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا اعتماد کر لیتے تھے اور جو کام اُن کو سپرد کر دیتے تھے اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بغیر اعتبار کے دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ "الحزم سُوءُ الظّن" ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحاناً اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ

سمجھتے رہیں، مگر سرسید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا۔ شام بہاری لال جون [illegible] سے جولائی ۱۸۹۵ء تک اُن کے دفتر میں رہا اس عرصہ میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سا روپیہ بنک بنگال میں بصیغہ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً بہ حسبِ ضرورت چکوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرامیسری نوٹ مالیت کالج بطور کیپٹل فنڈ کے بنک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بنک سے ہر سال وصول ہوتا تھا۔ چک بک سرسید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اُس کی کنجی بھی انہیں کے پاس رہتی تھی مگر جب چک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سرسید سے کنجی لے کر چک نکال لیتا تھا اور اور اُس کی خانہ پُری کر کے سرسید سے دستخط کرالیتا تھا اور چک جاری کر دیتا تھا۔ سرسید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چک پر دستخط کر دیتے تھے کئی سال تک تو وہ ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ سکرٹری کو اُس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اُس نے ہاتھ پانو نکالنے شروع کیے جب چاہتا سکرٹری سے کنجی لے کر چک نکال لیتا اور جس قدر روپیہ چاہتا اُس میں درج کر کے کبھی خود سکرٹری سے دستخط کرالیتا اور کبھی آپ اُن کے جعلی دستخط بنا کر چک جاری کر دیتا۔ یہاں تک کہ جب زرِ امانت جو بنک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اُس نے ایک نہایت دلیری کا کام کیا۔ ۹۴ ہزار کے پرامیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے بنک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو اُن کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف کرنے کا اختیار نہ تھا اُن پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بنک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اُس کو بنک میں بھیج دیا کچھ کم ۶۳ ہزار روپیہ تو وہ زرِ امانت میں سے غبن کر چکا تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بنک سے وصول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ علاوہ زرِ امانت کے بیالیس ہزار پانسو ستر روپیہ

اور بینک سے وصول کرکے خورد بُرد کر گیا۔

سچ یہ ہے کہ ماہ جولائی سنہ ۱۸۹۵ء کالج کے حق میں، سرسید کے حق میں اور خود اُس ناخدا ترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی کوڑی دکان مانگا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برباد کر دیا، سخت منحوس اور نامبارک مہینا تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بالکل بند اور آگے کو چندہ کی راہ مسدود ہو گئی، سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال فالج میں مبتلا ہوا، اسی حالت میں پکڑا گیا، دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی اور رسوائی کے ساتھ حوالات ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اس صدمہ کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے جو اس غبن فاحش سے سرسید کے دل پر گذرا ہوگا اُنھوں نے بھیتوں بھیتوں تالاب بھرا تھا اور قطرہ قطرہ اوس جمع کرکے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمہ کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ اُن کی زندگی میں یہ راز کھل گیا اور شام بہاری لال کی بداعمالی سب پر ظاہر ہو گئی۔ اگر وہ دفعۃً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جانے یہ مادۂ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اُس سے آخر کو کیا نتیجے پیدا ہوتے۔ سرسید نے اُنھیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حلفی اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو امور تقدیری ہیں اُن سے کچھ چارہ نہیں۔ . . بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مر جاؤں گا اور جو کچھ اس نے جعلسازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اُس کی جعلسازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔ یہ خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔ بعض

لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا، حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانونِ ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی چکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو"

الغرض جب شام بہاری لال دفعتہً فالج میں مبتلا ہوگیا اور اُس کی غیبت میں بینک سے چٹھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا مضمون سُنکر سرسید کو شُبہ پیدا ہُوا۔ اُنھوں نے چیک بُک نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہُوا کہ بہت سے چکوں کے نصف ٹکڑے جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں ندارد ہیں اور اُن کے ثنّے جو چیک بُک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر لکھے لگے ہوئے ہیں۔ جب روزنامچہ دیکھا تو اُن نمبروں کے کسی چیک کی روانگی روزنامچہ میں مندرج نہ پائی گئی اور جو ڈرافٹ کہ چکوں کے ساتھ حسبِ قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے اُن کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بینک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جعلسازیاں من و عن ظاہر ہوگئیں۔ اُنھوں نے حسبِ منشائے قانونِ ٹرسٹیان فوراً اس واقعہ کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیجدی اور دس مقدمے شام بہاری لال پر فوجداری میں دائر کیے گئے یہاں تک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپردِ سشن کردیا۔ لیکن ابھی عدالتِ سشن میں روبکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھاکر دفعتہً مرگیا۔

سرسید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ یکم جنوری ۱۸۹۵ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بے شک اُن سے یہ بہت بڑی فروگذاشت ہوئی کہ ایک مدت دراز تک یہ دھاڑی چور چیک بُک میں سے نکال نکال کر جعلی چیک جاری کرتا رہا اور اُن کے ثنّے کورے بغیر لکھے چیک بُک میں لگے رہے اور کبھی

کسی نے چک بک کو کھول کر نہ دیکھا کہ اس میں دن دہاڑے کیا لوٹ مچ رہی ہے اور اس کا سبب سرسید کی وہی نیک دلی اور ان کا حسن ظن تھا جس کی وجہ سے خبث نفس کی طرف کبھی ان کا ذہن انتقال نہ کرتا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے "اِنَّ الْکَرِیْمَ اِذَا خَادَعْتَہٗ انْخَدَعَا" یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دو گے وہ دھوکا کھا جائے گا۔ اس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کی جا سکتی۔ ان کا کلرک کی انگریزی تحریروں پر بلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفاتر سرکاری و غیر سرکاری میں اسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ اگر ان پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی ان کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا۔ اس کے سوا کلرک مذکور نے تمام جعلی چکوں اور جعلی ڈاکٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بنا کر چک جاری کیے۔ جو روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بینک سے وصول کیا گیا اس کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا کیونکہ ان کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہونا چاہیے تھا کہ کیپٹل فنڈ کی کفالت پر بینک کسی کو ایک حبہ قرض نہیں دے سکتا۔ اور جو جعلی مختار نامہ کلرک نے بینک میں بھیج کر اس کو دھوکا دیا اس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ نہ اس پر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی کے، بلکہ سب کے دستخط کلرک نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ بالا ہی بالا تیار کر کے بینک کو چلتا کر دیا تھا۔ مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی۔ اے سکنڈ ماسٹر اسکول ڈیپارٹمنٹ نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اس کا مقابلہ بینک کے حسابات سے کیا اس سے، جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے، صاف پایا جاتا ہے کہ بینک میں پہنچنے سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سکرٹری میں نہیں ہوا، بلکہ بینک میں پہنچنے کے بعد جعلی چکوں کے ذریعے سے روپیہ نکلوایا گیا۔ چنانچہ سرسید کی رپورٹ مذکورہ بالا سن کر تمام ٹرسٹیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اس میں کسی طرح کی فروگذاشت نہیں کی اور جس طریقے سے کہ غبن وقوع میں آیا اس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور شام بہاری لال کے ہاتھ

میں کسی رقم وصولی کا نہ رہنا اور تمام رقوم مندرجۂ روزنامچہ کا بالیقین بینک میں جمع ہوجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ سرسید کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو۔ اسی بنا پر جلسہ حاضرین نے بالاتفاق ایک ووٹ اوف فل کانفیڈنس اس مضمون کا پاس کیا کہ سرسید نے حسابات کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگذاشت نہیں کیا اور ہیڈ کلرک پر اُس سے زیادہ بھروسا نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدہ داروں پر کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے اس ووٹ کے پاس ہونے کا حال سُن کر کہا کہ "ٹرسٹی اگر ایسا ووٹ پاس نہ کرتے تو اور کیا کرتے؛ وہ خود اُس الزام میں جس سے اُنھوں نے سکرٹری کو بری کرنا چاہا ہے، سکرٹری کے شریک غالب تھے" حق یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط موسومۂ سکرٹری مورخہ ۲۵؍جنوری ۱۸۹۶ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر ٹرسٹی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپیہ سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد گیا، کالج پر کیوں نازل ہوتی"، سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اس کی خبر لینی بالکل نہیں جانتے اور ٹرسٹیوں میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملہ کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔ پس جب تک مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کے لیے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اُس کے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے، اور جب تک تمام ٹرسٹی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جوابدہ نہ سمجھیں گے اور اپنے فرائض کو جو قانون ٹرسٹیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھیں گے اُس وقت تک کالج کا سرمایہ بدستور خطرے میں رہے گا۔ ایک سکرٹری کس کس چیز کی خبر رکھے گا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائے گا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکرٹری کہاں سے آئے گا جو فکر معاش سے فارغ البال اور خانگی کھیڑوں سے بالکل آزاد ہو۔ رات دن کالج کے انتظام میں

مصروف رہے اور جب روپیہ کی ضرورت ہو تو در در بھیک مانگتا پھرے، گورنمنٹ اور قوم دونوں کا معتمد علیہ ہو، سپیکر ہو، رائٹر ہو، خزانچی ہو اور باوجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کار آموز مگر بھی ہو جو کلرکوں کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ اور خبردار ہو۔

سرسید کی وفات اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوش دلی کو بہت کچھ مکدر کر دیا تھا مگر اس صدمہ سے اُن کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی ہمت اور کوشش میں فتور آ جائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اُس کے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خلش سے ابھی نجات نہ ہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اُس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سنہ ۱۸۹۷ء کے نصف اخیر میں اس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آدھے کی طرح بٹھا دیا۔ گو بظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمل کے ساتھ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے برابر جھیلتے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اس زمانے میں اُن پر گزری اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے اُن کے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ اُن کو نہ پہنچتا تو اُن کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اس کوہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہوگا۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چپ لگ گئی تھی، بولتے بہت کم تھے اور ہاں اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے یار غار محسن الملک اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُن کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ صحبت کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سرسید نے کہا "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

باایں ہمہ قومی خدمات کی دھن اور خاصکر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن کے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اُسی حالت میں انھوں نے متعدد آرٹکل تعلیم پر لکھے۔ انھیں دنوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اُٹھا تو اُنھوں نے اس معاملہ کی نسبت بھی اپنی قلیم رائے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الٰہ آباد میں اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اُس سے خط کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی معذوری کے تا بمقدور اُس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا۔ اُنھیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالۂ اُمہات المومنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلعم کی ازواج اور آپ کے اخلاق پر نہایت دریدہ دہنی سے اعتراض لکھے تھے۔ سرسید نے اول بطور تمہید کے ایک بڑا آرٹکل اصولِ تنقیدِ روایات پر اسی رسالہ کو دیکھ کر لکھا اس کے بعد اُس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب[1] ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتباسِ بول کا عارضہ ہوا۔ صاحب سول سرجن علیگڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر سوربانی کو بھی مشورہ کے لیے بلایا گیا مگر چونکہ وقت موعود آپہنچا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ۲۶ کی شام کو علاماتِ ردیّہ ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷ مارچ کی صبح سے نہایت سخت دردِ سر لاحق ہوا جو اس بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دورانِ خون میں شامل ہو کر جلد جلد دماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُن کی عادت تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل" بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو آیتیں برابر اُن کی زبان پر جاری تھیں "(۱) حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۲) اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" مگر تپ کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ میں آئے اُن کی زبان سے نہیں نکلی۔ گویا کہ تپ کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر

[1] یہ جواب جس قدر لکھا گیا تھا کالج میگزین میں چھپ گیا ہے۔

بعد احتضار شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور رات کے دس بجے حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے حالتِ صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ گئے تھے، وفات پائی۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کا کل اسٹاف اور تمام طالب علم، اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانی افسر اور اہل کار، علیگڑھ کے رئیس اور ہر درجہ کے مسلمان ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازہ کے ساتھ تھے کہ غالباً علیگڑھ میں اس نوعیت کا ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جو راج مزدور بڑھئی اور سنگتراش ۲۵، ۲۶ برس سے کالج میں کام کرتے تھے وہ اور اُن کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ خبر سُن کر آئے تھے جنازہ کی گذرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے اپنے مربی کے جنازہ کو تک رہے تھے اور اکثر طالب علم زار و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض ۶ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ نماز کے بعد جب جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہوس کے احاطہ میں داخل ہوا تو گارڈ آف آنر نے، جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا، پریزنٹ آرمس کی سلامی اُتاری اور قبیل مغرب مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اُس کے احاطہ کے اندر بے کار پڑی تھی وہاں اُس قوم کی امیدگاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت — بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند — کایں مصیبت بر سرِ اسلامیاں انداختند

اگرچہ سرسید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں ایک "غُفِرَ لَهٗ" اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ"[1]۔

[1] اس آیت میں عیسیٰ کی طرف خطاب ہے جس میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھکو موت دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور تجھکو کافروں کے اتہام سے پاک کرنے والا ہوں ۱۲

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہی، اُس کی مثال ملنی دشوار ہی. تعزیت کے کچھ کم دو سو تار جن میں سے کسی قدر بذریعۂ کالج میگزین کے شائع کیے گئے تھے، اطراف ہندوستان سے اُن کے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ حضور وائسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کے علاوہ اکثر یورپین افسروں اور حاکموں نے بذریعۂ تار یا تحریر یا تقریر کے اس بزرگ کی موت پر رنج ظاہر کیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے صاحب کلکٹر علیگڑھ کو بذریعہ تار کے اطلاع دی کہ ہز آنر کی طرف سے جنازہ کی مشایعت اور دفن میں شریک ہوں ملک میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اس عالمگیر حادثہ پر آرٹکل یا نوٹ نہ لکھے گئے ہوں اور بہت سے اخباروں نے تو آج تک اپنے کالم اس مضمون کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں (جیسے ٹائمز آوف لندن، پال مال گزٹ، ایوننگ سٹینڈرڈ، اِیکو، ہیرلڈ، ڈیلی میل، لائڈز، ایوننگ نیوز وغیرہ وغیرہ) اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا گیا اور اینگلو انڈین اور مسلمان دونوں کے لیے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم بہ "مسلم پیٹریاٹک لیگ" ہی اُس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ اور اُن کی وفات پر رنج و افسوس اور اُن کے وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ ٹائمز آوف لندن نے بھی اس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سرسید کی وفات پر ایک لمبا آرٹکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ (یعنی سرسید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو سائنس کے حملوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہے ہیں اور خود ہمارے کالملہ ا ؎نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے اُن کی اس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہی

جو اُنھوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی"۔ اس کے بعد اُس میں لکھا تھا کہ "کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُن کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملے کا خیال دلانے میں اُن کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقۃ جب اس معاملے میں اُن کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علیگڑھ کی سوسائٹی، اُس کا مطبع، اُس کا اخبار اور محمڈن کالج جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونے پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لیے بنایا گیا ہے یہ سب اُس کی ہمت، عقل اور فراخ حوصلی کی شاندار یادگاریں ہیں"۔

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ مارچ میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا"۔

انگلستان کے اخباروں کے حوالے سے یورپ کے اکثر اخباروں میں اور نیز ممالک اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اس حادثہ پر افسوس کیا گیا تھا چنانچہ المؤید میں انھیں کے حوالہ سے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بڑے زبردست پولیٹیشن تھے اس لیے مرحوم کی وفات اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور مسلمانوں کو اُن کا نعم البدل عنایت کرے۔

پاونیر مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء میں اس واقعہ کی خبر پہنچتے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دوراندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بارآور اور نہایت زبردست پولٹکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر رُبع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا"۔

ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء میں جو ایک لمبا آرٹکل کسی اینگلو انڈین کا لکھا

ہوا اس واقعہ سے متعلق چھپا تھا اُس میں سر سید کی نسبت کہا تھا کہ "اُس کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اُس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارھویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مربی ہونے کی حیثیت سے اُس کو حاصل تھا۔"

جو اسپیچیں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے اطراف ہندوستان کے ماتمی جلسوں میں سر سید کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں یہاں ہم صرف دو معزز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں جن کو مدت دراز تک علیگڑھ میں رہنے اور سر سید سے ملنے جلنے اور اُن کے حالات پر غور کرنے کا اتفاق رہا۔

مسٹر پورٹر کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے ماتمی جلسہ واقع ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُس میں اُنھوں نے کہا "آج اِس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ سر سید احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک بڑا رکن سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے ..... اگر میں نے اُس کی زندگی کے مطالعہ میں غلطی نہیں کی تو (میں کہہ سکتا ہوں) کہ جہاں اُس میں اور بڑے بڑے اوصاف موجود تھے اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے، اول اُس کی اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری اُس نے گویا ابتدائے عمر ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مایوسانہ جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمی درکار ہوتے ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُن کی ضرورت رفع کرنے کو اُٹھا۔ سر سید احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے تئیں تقدیر کے حوالے نہیں کیا اور نہ اُس نے گورنمنٹ سے مدد چاہی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو کام اُس کو در پیش ہے اگر اُس کو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اُس کو پورا کرے گی اور اس لیے اُس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چُراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں، اپنا وقت، اپنی طاقت، اپنا روپیہ، اور سچ پوچھو تو اپنا سب

کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص ان مشکلات کا جن کا اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اُس عزم جزم کا جو ان مشکلات کے مغلوب کرنے کے لیے مطلوب تھا تصور اور اندازہ نہیں کر سکتا لیکن باوجود تمام مشکلات اور تمام نا امیدیوں کے وہ اپنے منصوبہ پر کامل وثوق رکھتا تھا اور اُس کو اپنی کوششوں کا ثمرہ مل گیا۔"

اس کے بعد مسٹر بوریژ نے کالج کی ابتدا اور اُس کی ترقیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ "لندن کے سینٹ[1] پال کیتھیڈرل میں سر کرسٹوفر رَن کی لاش مدفون ہے اور اُس کی قبر پر لیٹن میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے کہ "اگر تم اُس کی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو" جن لوگوں نے یہ کتبہ وہاں کندہ کرایا تھا انھوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گرجا ہے جو اُس کے مجوزہ نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ سرسید کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جس کی بنیاد اُس نے ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمھاری آیندہ نسلیں اپنے بڑے لیڈر کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کر لیں گی تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُس کے لیے قائم کریں گی۔ تم نہ صرف بے جان پتھر اینٹ اور مسالے کو بلکہ ایک بڑے قومی کالج کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اُس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے تھم تربیت حب الوطنی، خود اعتباری اور سب سے بڑھ کر اُن کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی حالت کو پیش کر سکو گے۔"

"صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف نسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والا ہوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمھیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم لیڈر کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیف خفیف باتوں یا مذہبی خیالات میں تم سرسید کے ساتھ یا باہم کیسا ہی اختلاف رکھو مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی جو اُس نے اسلام کی حمایت میں ظاہر کی اور اُن اعلیٰ

---

[1] یہ لندن میں ایک نہایت شاندار اور مشہور گرجا ہے جو عمارت اور نقشہ کی خوبی میں ضرب المثل ہے۔

نتائج کی جو اس جانفشانی کی وجہ سے اُس نے حاصل کیے، قدر کرنی چاہیے۔ اگر تم صرف اُس کے کام ہی کو جاری رکھو گے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ دنیا میں اتفاق اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے"

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ماتمی جلسہ واقع ۲۹ مارچ سنہ مذکور میں سر سید کی وفات پر تقریر کی اُس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں، انھوں نے کہا "میں امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر مجھ کو اس لحاظ سے کہ دس برس تک اُس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جس کی موت پر ہم اس وقت رنج والم ظاہر کرتے ہیں، چند الفاظ کہنے کی اجازت دی جائے گی۔

مجھ کو دس برس تک اس عجیب و غریب اور بالا ترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے انھوں نے مجھ کو مخاطب کیا ہے۔ اس دس برس میں سوائے زمانۂ تعطیل کے مجھ کو سر سید سے روزانہ ملنے جلنے کا اتفاق رہا۔ اُن کا مکان میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا رہتا تھا۔ جس قدر سر سید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اُسی قدر اُن کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا... کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد خاں اُس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن اُن میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں مجتمع ہوں، وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل رفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا، اُس کا اثر اُس سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکساتے بلکہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اُس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اُس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار

کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کاہلی، غفلت، جہالت اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اس کی پکار پر ایک نئی نسل اٹھ کھڑی ہوئی لوگوں نے سرسید کو جھوٹا سمجھا، ان کی باتوں کو بدنیتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی مگر اس نے تمام مخالفتوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کی تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہو لیا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔ جو منصوبے وہ باندھتا تھا ان کی طرف سے اول گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا تھا جو ابتدا میں اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن میں مخل انداز نہ ہوں مطمئن نہ تھی۔ اور پھر اپنے ہم مذہبوں کے تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو سرسید سے اس لیے بدگمان تھے کہ اس نے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کو ملحد اور بے دین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اس مقناطیسی قوت پر پاتے ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم میں جس کی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جب کہ وہ نیچری اور کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کا مسلّم سردار مانا گیا۔ تاریخ اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے شروع کر کے تکمیل تک پہنچایا اور ہزاروں پیرو ان لوگوں میں سے جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کر لیے۔ لیکن کوئی تحریک ایسا کہ میں یقین کرتا ہوں، اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سردار تسلیم ہوا ہو جو اس کے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں۔"

"جب سر انگلینڈ کالون ہندوستان سے جانے لگے تو علیگڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو انھوں نے گریٹ مین کے لفظ سے یاد کیا تھا غدر کے اس ہولناک زمانے کا ذکر کیا جب کہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موجزن تھے۔ انھوں نے کہا کہ "اس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اس خرابی کا کیونکر علاج ہو اور حاکم و محکوم میں کس

طرح آشتی پیدا ہو۔"

"سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُس وقت سے مرتے دم تک وہ اسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے، زبان سے اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم و محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور اُن میں ایک مضبوط اتفاق پیدا کریں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسید کی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دنیا کے سنگ طینت لوگ اس بات پر جس قدر اُن کا جی چاہے ہنس لیں لیکن میں جو برسوں سے سرسید کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں میں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سرسید سے زیادہ شریف زندگانی بسر کی ہو جو جاہ طلبی میں اُن سے زیادہ بے غرض ہو اور جو اُن سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کر دینے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اُس کی موت پر روتے ہیں اب اُس جیسا کوئی کہاں ملے گا"۔

"ایک اور بات رہ گئی ہے جس کو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کے یہ آنسو جھوٹے نہیں ہیں اور آپ جو سرسید کے ہم مذہب اور ثناخواں ہیں اگر آپ کا یہ غم والم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے؟ سمجھ لیجیے کہ یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں یہ اس قدر مفلس تھا کہ نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو لیکن پھر بھی اُس نے ایک دولت آپ کے لیے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کے لیے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں اُن سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپ کے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اُس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی"۔

جس قدر مرثیے اُردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثہ پر لکھے گئے ہیں ظاہرا واقعۂ کربلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہوں گے کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرائے عرب نے بے شمار مرثیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسید کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مرثیے ان مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اُن میں شعرا اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی منفعتوں کو روتے تھے جو اُن کی ذات کو جعفر اور معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور اِن میں اُس نقصان عظیم پر افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ اُن شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں درہم و دینار سے بھرتے تھے اور یہ اُس شخص کے لیے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ اُن کا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلہ کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور اِن کا موضوع تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرنا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اشجع بن عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیہ میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے سچ یہ ہے کہ سرسید سے بہتر اُن کے مضمون کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔

"مَضَى ابْنُ سَعِيدٍ حِينَ لَمْ يَبْقَ مَشْرِقٌ　　وَلَا مَغْرِبٌ إِلَّا لَهُ فِيهِ مَادِحُ
وَمَا كُنْتُ أَدْرِي مَا فَوَاضِلُ كَفِّهِ　　عَلَى النَّاسِ حَتَّى غَيَّبَتْهُ الصَّفَائِحُ
كَأَنْ لَمْ يَمُتْ حَيٌّ سِوَاهُ وَلَمْ تَقُمْ　　عَلَى أَحَدٍ إِلَّا عَلَيْهِ النَّوَائِحُ"

(ترجمہ۔ ابن سعید گزر گیا جب کہ مشرق اور مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں اُس کا کوئی نہ کوئی مداح نہ ہو جب تک کہ وہ قبر میں دفن نہ کیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اُس کے کس قدر احسانات ہیں۔ گویا اس کے سوا دنیا میں نہ کوئی زندہ آدمی مرا ہے اور نہ کسی پر نوحہ کیا گیا ہے۔)

منجملہ اُن بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثۂ عظیم پر لکھے گئے ہیں چند اشعار ایک یوروپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیے ہیں چونکہ لٹریری دنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اس لیے ہم اُس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام

لکھتے ہیں

"ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اُس کی سایہ دار شاخیں جو چاروں طرف دُور تک جھومتی تھیں صحت بخش شبنم اُن سے ٹپکتی تھی اور اُنھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، اُن کے سایہ میں بنجر زمین اصلاح پاگئی۔
بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوب صورت نونہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنادیا۔ رو ؤ اب شاہانہ درخت کے لیے کہ اجل نے اُس کو گرادیا ہے۔
غم کرو مگر امید کے ساتھ کیونکہ اس کی ہری بھری کھیتیاں جو اُس کی سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اُس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں کو اُس نے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اُسی کی طرح زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانے کو گلزار بنا جائیں۔"

سرسید کی وفات پر لوگوں نے صرف زبانی مدح و ثنا اور مرثیہ خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چیٹک ایک ایسی مُردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور نا اتفاقی میں شہرۂ آفاق تھی۔ سرسید کے مرتے ہی کچھ لوگ اُن کی ایک عظیم الشان یادگار یعنی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے جن کا اپیل مسلمانوں نے اور خاص کر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے بڑی توجہ اور نہایت ذوق شوق سے سُنا اور اس کی تائید پر فوراً کمربستہ ہوگئے۔ اہل پنجاب نے سخت تقاضوں سے اُن کو لاہور میں بُلایا اور اثنائے راہ میں اسی گرمجوشی کے ساتھ جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کی جاتی تھی، اُن کی آؤ بھگت اور مدارات کی گئی۔ یونیورسٹی کے لیے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی امنگ اور چاؤ سے لوگوں نے چندہ دیا اور صرف صوبہ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جن کی آنہ دو آنے سے زیادہ قیمت نہ تھی پانچ پانچ روپیہ کو لوگوں نے خریدیں۔ بعض جواں مرد تاجروں نے اپنے منافع کا ایک معتد بہ حصہ سرسید کی یادگار کے لیے مخصوص کر دیا۔ اکثر تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی ایک ایک پوری تنخواہ چندے میں دیدی کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالب علموں کی ایک جماعت نے خاص اسی کام کے لیے دوکان لگائی تاکہ جو کچھ اس سے فائدہ ہو اس فنڈ میں جمع کیا جائے۔ پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اس کی تحریک شروع ہو گئی ہے یہاں تک انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے انجمن اسلامیہ قائم کر رکھی ہے اس میں بھی گرمجوشی سے چندہ کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسے میں حاضرین نے بیس پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور آیندہ چندہ کے لیے کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اضلاع شمال و مغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہے اور دکن میں بھی اُس کے لیے تحریک ہو رہی ہے۔ چندہ کی تعداد صرف تین مہینے میں پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنھوں نے درحقیقت سرسید کا جوا اپنے کندھے پر رکھا ہے اُن کو مسلمان اُسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے کہ سرسید کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر میں اُن کی وقعت ویسی ہی ہے جیسی اُن کے اُس بڑے پیش رو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسید کے سینے میں مشتعل تھی اُس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُس کی آنچ دور دور پہنچ گئی ہے اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسید کی یادگار کے چندہ میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ مینلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آرنلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لیے ایک یوروپین کمیٹی کا قائم ہونا، بڑے بڑے افسروں کا اُس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندہ میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ تعجب نہیں ہوا، ان لوگوں کا خمیر اس سرزمین کی خاک سے ہے جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ آڑ کر شریک ہوتے ہیں اور انسانی

ہمدردی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے قومی ریفارمروں کی کوشش سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچے ہیں اور اسی سبب سے ہر قوم کے ریفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اُس کی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائض انسانی کے سمجھتے ہیں، پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ بھی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر تعجب ہے تو ہم کو اپنی مردہ دل قوم کی حالت پر ہے جو آج سے تیس برس پہلے ہمدردی، قومیت اور ریفارمیشن کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے جنھوں نے سلف کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاہ عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکام کے رعب داب کے ایک پیسا ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایسی قوم میں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنے کا جوش، یا اُس کے منصوبے پورے کرنے کا خیال، یا ایک قومی درسگاہ کو یونیورسٹی بنانے کا ارادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ بیشک یہ بیج سرسید کے بابرکت ہاتھ کا بویا ہوا ہے جس کو اُن کی مساعی جمیلہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اُن کی کوششیں انھیں کی ذات پر ختم ہو جاتیں اور قوم میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوتا تو اُن کی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رائگاں جاتی اور اُس گھنگھور گھٹا کی طرح جو ایک ناقابل زراعت زمین میں خوب زور شور سے برس کر کھل جائے، درحقیقت سرسید کی کوئی پائدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہے اور قوم کے بہت سے افراد میں وہ اپنا درد مرض متعدی کی طرح پھیلا گیا ہے۔

فَتًى عَيْشُ فِي مَعْرُوْفِهٖ بَعْدَ مَوْتِهٖ كَمَا كَانَ بَعْدَ السَّيْلِ مَجْرَاهُ مَرْتَعَا

(یعنی وہ ایک جوان تھا جو خود مر گیا اُس کا فیض زندہ ہے جیسے رو کی گذرگاہ، جب رو کا پانی نکل جاتا ہے تو مویشی کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے)۔

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفر یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہے۔ وہ اہل یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور بزرگ تر کر دیا ہے۔ یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنے والے

کی صرف اُن خدمات کو دیکھتے ہیں جو اُنھوں نے عام بھلائی کے لیے کی ہیں اور اُن کے عیبوں پر مطلق نظر نہیں کرتے۔" اس کے بعد اُس نے اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور روس کے چند محبانِ وطن کے نام لیے ہیں اور اُن کے بڑے بڑے اخلاقی عیوب جو تاریخ میں مذکور ہیں بیان کیے ہیں، اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "اُن کے ہم وطن اُن عیبوں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُن کے احسانات کو جو اُنھوں نے قوم پر کیے ہیں یاد کر کے اُن کے نام پر سر جھکاتے ہیں، اُن کے اسٹیچو جو ملک میں قائم کیے گئے ہیں اُن کی زیارت کے لیے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُن کی تعظیم کے لیے سروں سے ٹوپیاں اور تاج اتار لیتے ہیں اور اُن پر فخر کرتے ہیں۔"

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کمیاب ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوشِ ہمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہے اور جس گرمجوشی کے ساتھ سرسید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اٹھا ہے اور جس توجہ اور خوشی سے اُس کے محرکوں کا اپیل سنا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جو اُن ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں اُن کی عظمت دلوں میں بیٹھی جاتی ہے یہی قوموں کی زندہ دلی کی علامت ہے اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہے وہ قوم جیتے جی مر جاتی ہے۔

"مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے"

مذکورہ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳ر جولائی ۱۸۹۸ء کو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اضلاع شمال مغرب محض سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کی تائید کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسہ میں جس میں علیگڑھ اور اُس کے گرد و نواح کے رئیس شریک تھے، کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن وائسرائے کشور ہند کی چٹھی جو اس موقع پر اُن کے نام موصول ہوئی تھی، حاضرین کو پڑھ کر سنائی جس میں حضور ممدوح نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج پر نہایت مربیانہ توجہ اور کمیٹی کی اُن کوششوں پر جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی ہے، کمال خوشنودی ظاہر فرمائی تھی اور

مسلمانوں کو اور نیز غیر قوموں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی امانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ "میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھوں گا کہ سال گزشتہ میں مجھ کو علیگڑھ جانے کا موقع مل گیا اور سر سید سے ملاقات کرنے اور اُس دار العلوم کو دیکھنے کا جو سر سید کو نہایت عزیز تھا ایسی حالت میں کہ اُن کی ذات کا حوصلہ بخش سایہ اُس پر چھایا ہوا تھا، امتیاز حاصل ہوا" اس کے بعد لکھا تھا کہ "اُس دن کی یادگار میری اس خواہش کو قوی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرہ میں شامل کروں اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو فنڈ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں دو ہزار کا چندہ شامل کر کے اپنی ہمدردی کا عملی اظہار کروں۔ امید ہے کہ آپ از راہِ مہربانی میری اس خواہش سے کمیٹی کو مطلع کر دیں گے"

اس کے بعد ہز آنر کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چندہ کی فہرست پیش کی گئی اور اُسی جلسے میں تقریباً پچیس ہزار کا چندہ جس میں حضور وائسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کا چندہ بھی شامل ہے لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ "اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے اُس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اُس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے"۔ یہی مثال ہمارے ہیرو سر سید کی تھی۔ وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں زبان قلم جان اور مال سے اُن کی مدد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُن کی بھلائی کا کام جو اُس نے ادھورا چھوڑا ہے اُس کو سب مل کر پورا کریں۔ حق یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے جَمَالُ ذِی الْاَرْضِ کَانُوا فِی الْحَیٰوۃِ وَهُمْ بَعْدَ الْمَمَاتِ جَمَالُ الْکُتُبِ وَالسِّیَرِ۔

دوسرا حصہ

سرسید کی لائف اُن کی تصنیفات اور اُن کے کاموں پر ریویو

سرسید کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو اُن کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو۔ میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلشمین نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی امپائر میں وزیر یا علم کے درجہ تک پہنچتا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں اُن کو باعتبار پولٹکل لیاقت کے سرسالار جنگ اول سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے، مگر اخبار براڈ ایرو مطبوعہ ۱۲ فروری ۱۸۶۹ء میں اس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سرسالار جنگ سے دوسرے درجہ پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جس کی تمام زندگی شمالی ہندوستان کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے"

بہر حال یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ عہدہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت و جاہ و حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشرف خصائل انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں اگر اُن کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی اُن سے اس قدر ضرور ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے ایک مردہ دارالخلافہ کی پژمردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشو و نما پائی، اُس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانکاہ محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دیا پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اُس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ "كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ" یعنی ہر شخص کو اُس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے۔ لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی کو ہم آیندہ نسلوں کے لیے ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے اُن کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقات حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ اُن کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسنِ تدبیر اور علم و فضل سے اپنے

اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی۔ اُن کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہرِ قابل کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حسنِ اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ اُن کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ اُن کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا، وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ اُن پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ اُن کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

اُن کے والد ایک آزاد منش اور تعلقاتِ دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب داب کے نہایت متحمل و بُرد بار تھیں پس وہ بیجا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے، سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین صحبتوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حُبِّ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

"دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا"

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا مؤید سمجھا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوچکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ پُرانے طریقہ کی تعلیم پوری کرلیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ بند ہوجاتے اور تعصب کے تو بر تو پردے اُن کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی اُن نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سولزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اُس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کردیتی ہیں، یہاں تک کہ وہ اُن کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کیجاتی ہیں محض بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پُرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ اُن اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُن کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو اُن کی ترقی کے اسباب میں شمار کیا جائے، کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سدِّ راہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاصکر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ نہایت استقلال سے بسر کیا ہے اُن کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرد اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا ہی اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی اگر وہ دوسرا نکاح کرلیتے تو ہرگز اُن گراں کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر

پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست، ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا اور تجرد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور متبادر ہوتی ہوگی یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے جنہوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں اُس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک یا قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انہیں یورپ کے فیفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات سُن کر اُن کی ریس سے کیا ہو لیکن اول تو جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی۔ دوسرے اگر بالفرض یہ بات مان بھی لیجائے تو صرف اسی قدر مانی جاسکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُن کے دل میں بھی حب وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا ہو جاتا ہے مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دُھن میں اپنے تئیں فنا کر دے۔ جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سُن سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح

ابتدائے آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص یعنی بادشاہ ملک کا خیرخواہ ہوسکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ مِل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کرسکے تو اُس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی" اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرز حکومت بدل گئی ہے جس کا مقتضا یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو مگر جو سکون اور انجماد ہندوستان کی قوموں میں صدہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جو اُن کے آب و گل میں خمیر ہوگیا ہے اُس کو برٹش طرز حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں زائل نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سُن سُن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش دفعۃً اُٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گذرتے کہ وہ آپ سے آپ بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاصکر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادہ پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر ناقابلِ برداشت تکلیف اُٹھاتا ہے۔ مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اُس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خودمختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہوجاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلاواسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پایدار اور مستحکم ہوجاتی ہے کہ خودمختار سلطنت کا دور ختم ہوجانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند

کرتے اُسی شاہراہ پر پڑ لیتے ہیں، دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اُس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اُس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھوجنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اُس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے یہیں سے اُس چیز کا سُراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ اُن کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ اُن کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے اُن کی تمام ترقیات کا منبع، اُن کے کل مقاصدِ عالیہ کا محرک اور اُن کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دارالخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ۔ جو اُس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی، اُس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا۔ ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدت دراز تک اُنھوں نے وہاں کا رنگِ صحبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اُن کی والدہ کے سوا اُن کے ننھیال والے جہاں اُنھوں نے نشو و نما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دور دورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ

جس عمر میں مذہب سے دل اچاٹ کر سکتے ہیں اُس عمر میں سرسید پر اُن کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر اُن کی لے اُس وقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی اور جب کہ سائنس کو بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اُس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلّی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے اس لیے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقاید سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں، چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں، میں اپنی والدہ کے عقاید میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا"، یہی عقاید ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی اُنھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیفات نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُن کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا، وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف اُنھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے، مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور خود اُس یقین نے جو اسلام کی حقیت کی نسبت اُن کی گھٹی میں پڑا تھا، اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو چھوڑا اور جو اُس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زید و عمر کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمر کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اُس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اُس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے مگر مذہب نے اجازت دی اس لیے

انگریزی نوکری بے تامل اختیار کرلی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی وایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیے؟ یا تہ دل سے اس کے فرائض ادا کرنے چاہییں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اس کے فرائض تہ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے؛ اس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن و آزادی حاصل ہو اس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو؛ لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کردی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی میل جول اور کھانا پینا، دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضرور ہے، کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور اُن کے پنپنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جاکر رہنے کا ہوگیا۔ اُس وقت بھی انھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچاکر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ بانیٔ اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی، وہ گمراہ تھے اُن کو ہدایت

کی، وہ وحشی تھے اُن کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُن میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا، اُن کا دین، ور دنیا دونوں درست کیے۔ اُن کی خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں۔ ملک کی محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ"۔ قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ "حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ" قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھیرایا اور کہا کہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" اخیر دم تک اُمت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور "اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ" کہتا دنیا سے رخصت ہوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کیے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دنیوی تعلقات کو جن سے بغیر قوم کی خیر خواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قویٰ کو نفس واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعے سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے اُن کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہٖ اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز اُن کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں اُن کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے اُن کی دنیوی ترقیات کے تھے اُن کے لیے مہیا کیے۔ سب سے زیادہ اُن کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ اس لیے گو ایک زمانے نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی، مگر انھوں نے اُس کو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پُرزور تحریروں سے اُن کی غلطی ثابت کی، سوشل اور اخلاقی خرابیاں جو قوم میں شائع تھیں، جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں اُن کی

اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی، قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو بے اصل بدگمانیاں تھیں اُن کو رفع کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں مغایرت یا دہشت یا جھجک تھی اُس کو دور کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت مہیب اور خوفناک مذہب خیال کرتے تھے اور اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے، اُن کو اسلام کی اصلی صورت دکھائی اور ثابت کیا کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست، عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اُس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس۔ ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں، جتنے مدرسے اور انسٹیٹیوشن قائم کیے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے ہمیشہ اپنی پبلک اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں، جہاں تک ممکن تھا اُن میں اتفاق والتیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ اپنے سُنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا۔ باوجودیکہ اُن کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی۔ کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اُس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا، کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مذہب ہی نے اُن کو اُس یقین پر قائم رکھا کہ جو صدمہ یورپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام

کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب کہ انگریزی تعلیم اُن میں جاری ہوگئی اور اُس کو روز بروز ترقی ہونے لگی اس وقت بھی مذہب ہی نے اُن کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب تک اُن کورے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوسکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے اُن کے دل میں مذہب کی طرف سے سوءظن پیدا ہوجانا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب نے اُن کو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو اُس کا مظلمہ تمام تر اُس شخص پر ہوگا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم و عقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے محض بے سروپا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جابجا اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۹۳ ہجری میں "ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار" کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورۂ بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے اس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اُسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کش زاہد عبادت الٰہی بجالاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر اُنھوں نے مخالفتیں جھیلیں، اُن کے کفر کے بے شمار فتوے لکھے گئے، اُنکو دہری، ملحد، کافر اور دجال سب کچھ کہا گیا، اُن کو بارہا قتل کی دھمکیاں دی گئیں، صدہا گمنام خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں، اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہوسکا اُن کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اسی ذوق و شوق کے ساتھ کیے گئے، بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اُسی قدر اُن کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی، لوگ اُن کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سُن کر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ اُن کی بہن کے انتقال کی خبر اُن کو اُس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن

کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے - جوان بیٹے کی موت سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا، پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فراموش نہ ہوا، با اینہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلّی کی آمد و رفت میں صرف ہوا اُنھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہو۔ دلّی میں انہیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے لوگوں[1] کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے اور حق یہ ہے کہ اُن کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ "من جهل شيئاً عاداه" الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُن کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی اُمنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی خلجان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی امنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ امنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ اُن کے حالات اور اُن کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے، غایت درجہ کی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے اُن کو حد سے زیادہ مسرف اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال اُن کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی اُن کی آمدنی میں سے ایک حبہ پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اُن کو تعلیم اہل اسلام کا خیال ہوا اُنھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیے۔ جو کچھ اُن کے ضروری اخراجات سے بچا وہ اُنھوں نے مدرسہ کے سوا اور کہیں صرف نہیں کیا سائل اُن کے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے تعلیم کے سوا کسی اور رفاہِ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے بخلاف اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے برابر بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے اُنھوں نے کئی مسجدوں

[1] نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو

کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لے کر لگایا، مگر غدر کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو اُنھوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ "میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔" ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہب جہاں چاہتا تھا ان سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا اُن کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ ممسک اور تنگدل بنا دے، جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں اُن کی داد و دہش کے آگے حاتم کی فیاضی ہیچ معلوم ہوتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جزرسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور رائے صائب کی ہدایت سے کیے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے کارہائے نمایاں اُن کی دانشمندی اور رائے صائب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے۔ لیکن اول تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہِ راست بتا دیتی ہے مگر اُس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اس

سلہ (نوٹ صفحہ ۱۳) مارچ [illegible] میں جبکہ سر شیر محمد خاں بہادر رئیس پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علیگڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈریس دیا، اُس وقت کالج کی خیر خواہی کے جوش میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سُن کر ہر شخص تعجب کریگا رئیس ممدوح نے چلتے وقت پچاس روپیہ سرسید کے پوتے سید مسعود کو اور پچاس محمد بشیر کو جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپیہ دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانسو روپیہ چندۂ کالج کے دیے تھے۔ دونوں بچوں نے تو خوشی سے کہدیا کہ ہم دونوں کے سو روپیہ کالج کی مسجد کی تعمیر میں صرف کیے جائیں مگر سرسید نے نوکروں کا روپیہ بھی لینا چاہا نواب محسن الملک نے تو اپنے نوکروں کے انعام کو اُن سے لینا ہرگز پسند نہ کیا اور پچاس روپیہ انھیں کو دیدیے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دیدو ورنہ ابھی اپنا حساب کر لو۔ وہ بیچارے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے اُنھوں نے مجبور پچاس روپیہ سرسید کو دیدیے اور سرسید نے بلا تکلف اُن سے روپیہ لے کر کالج فنڈ میں جمع کر لیا ۱۲

کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو غیر ممکن ہی۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہی اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفوں کو اُن کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہی کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے جو شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کرسکیں۔ یورپ اور امریکا میں اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں اُن کے بانی مبانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے، لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کولمبس، بنجمن فرینکلن جارج سٹیفن، واشنگٹن، ہمپڈن، ہیٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

سرسید کی ملکی خدمات اور اُن کے نتائج

اس عنوان کے تحت میں ہم سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی، تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیرخواہی اور حسن خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہا مدد پہنچی ہی اور اس لیے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں، اسی طرح ملک کے کسی فرقہ کو جو زمانہ کے انقلاب سے پست ہوگیا ہو، ابھارنا اور اُس کے ہم وطنوں میں اس کا اعزاز از سر نو قائم کرنے میں کوشش کرنا، درحقیقت ملک کے ایک ایسے عضوِ ماؤف کی اصلاح کرنا ہی جس کے سبب سے اُس کے تمام صحیح اعضا معرضِ خطر

میں ہوں۔

سرکاری خدمات سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر جو اُن کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور اُن کے تمام کارناموں کا ایک زبردست آلہ رہی ہیں، نظر ڈالتے ہیں، اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو گورنمنٹ سروس کے ذریعے سے اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ، نہ غلامانہ، اطاعت سے جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُس کے بعد ہمیشہ کاربند رہے، سبق لینا چاہیے، کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُن کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

سرکاری ملازمت کی ابتدا جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اُس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرزِ معاشرت اور انگلش گورنمنٹ کی طرزِ حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی اور دلّی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعۂ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے اُن کو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع ہوئے مگر چونکہ اُن کے نانا دبیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھیں اور اُن کے خالو خلیل اللہ خاں اس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لیے اُنھوں نے قلعۂ دہلی کے تبرک پر قناعت نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

کام سیکھنے کا شوق سرسید نے ابتدائے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اُس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضرور ہے۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں جب مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو عدالت ششن کا سررشتہ دار[1] مقرر کرنا چاہا تو اُنھوں نے اُس کے قبول

[1] چونکہ سررشتہ داری عدالت ششن کے قبول کرنے سے سرسید نے اس خوف سے انکار کیا تھا کہ مبادا اُس کے فرائض اُن سے ادا نہ ہو سکیں، اس لیے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے جو سفارش کی چٹھی مسٹر لنڈزی کے نام لکھ کر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اُس میں اُن کو عالی خاندان اور ہوشیار ہونے کے علاوہ ڈرپوک بھی لکھا تھا۔ اس چٹھی کو کرنل گریہم سرسید کی لائف میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈرپوک ہونے کی نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ عارف جنگ کے معنی باسٹراوٹ وار لکھ کر کہتے ہیں کہ غدر کے موقع پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے ۱۲

کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول اور اُس کے فرائض ادا کرسکتا ہوں؟ جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مالی سے واقفیت حاصل کرلی اور ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عدالتِ منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جس کو صاحب کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کرکے اُن کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔

حسن خدمت | اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانۂ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے اُن کو تفویض ہوا اُس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچائی اور اُس کو بعض بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سرانجام کیے۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے مہام گورنمنٹ نے اُن سے لینے چاہے اُن کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا۔ لیجسلیٹو کونسل کی ممبری اُنھوں نے ایسی لیاقت کے ساتھ کی کہ اُن سے پہلے کسی ہندوستانی ممبر نے نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے غالباً کسی نیٹو ممبر نے کوئی مسودۂ قانون پیش نہیں کیا تھا اُنھوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہوگئے کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جاننے کے نہایت سنجیدہ اور مدلل اسپیچیں کیں اور محض اپنی اعلیٰ لیاقت کے سبب دو وائسرائوں کے عہد میں دوبار منتخب ہوئے۔ اُن کی ایک اسپیچ کی نسبت جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوچکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کمیشن میں جیسی بسوط اور مفصل شہادت اُنھوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اُس سے زیادہ کسی شہادت میں نہیں سنی گئی غرض کہ اُنھوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگاریوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کیے اسی سبب سے اُن کے افسر ہمیشہ اُن کے مداح اور شکر گزار رہے۔

بے غرضی | جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُنھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحتہً یا کنایتہً اپنے افسروں سے درخواست نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی کارگزاری اور حسن خدمت سے اُن کے دل میں جگہ

کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا۔ ۱۸۸۸ء میں جب کہ سرسید کو بمقام علیگڑھ کے۔سی۔ایس۔آئی کا خطاب دیا گیا اُس وقت صاحب کلکٹر علیگڑھ مسٹر کینیڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی" پروفیسر آرنلڈ ایم۔اے جو دس برس علیگڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انھوں نے لاہور کے ماتمی جلسہ میں جو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ "گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب اُن کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اُن سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور اُن سے زیادہ بے لاگ اور بے غرض ہو۔"

دیانت داری کی صفت اُن کی تمام پبلک سروس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی۔ صُہیب رومی کی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْ لَمْ يَخَفِ اللّٰهَ لَمْ يَعْصِهِ" (یعنی صہیب ایک نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا) یہی حال سرسید کے تدیّن کا تھا، وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے تقاضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ غدر سے پہلے اُن کا تدیّن بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ اُن کے سامنے کچھ نذرانہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں، البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دورانِ مقدمہ میں اُن کے مکان پر صرف ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار، ہم نے سنا ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اُس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا، آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ نہ اُن سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو۔ صاحب جج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں اُن کی نسبت لکھا تھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"

غدر سے پہلے جو اکثر یورپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھیات میں رائے ظاہر کی ہے

اُس میں زیادہ تر اُن کے علو خاندان لیاقت اور دیانت داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اسی وقت بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی امتحان کا موقع پیش آئے یہاں ہم صرف ٹامس مٹکاف صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۸ء کا ترجمہ نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ " سید احمد خاں معزز خاندان کے ممبر ہیں اور نواب دبیرالدولہ خواجہ فریدخاں مرحوم کے جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے وزیر اعظم تھے، نواسے ہیں۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ ایمانداری اور لیاقت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں "

اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ اُن کی سروس ختم ہونے پر باوجودیکہ گورنمنٹ بہت خوشی سے اُن کو کام کرنے کی مہلت دینی چاہتی تھی مگر انھوں نے زیادہ مہلت لینی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرستہ العلوم قائم ہو چکا تھا جس کے لیے چندہ جمع کرنے کی ازبس ضرورت تھی اور وہ عام طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں خلاف احتیاط سمجھتے تھے چنانچہ جب تک انھوں نے پنشن نہیں لی بنارس میں اپنے دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

آزادی | اگرچہ سرسید نے اُس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک قدیم ڈسپاٹک گورنمنٹ کی یادگار تھا، جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور خوشامد کا بازار گرم تھا، نیز اُس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اس لیے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک ایشیائی طرز حکومت کی تمام خاصیتیں موجود تھیں، اہل کار خوشامد کو اہلکاری کا زیور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے یوروپین حکام اور افسر ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن جاتے تھے، باوجود اس کے سرسید کا برتاؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا سے اخیر تک نہایت آزادانہ رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور سرکار میں اُن کی اطاعت جیسی کہ چاہیے ہمیشہ کرتے تھے مگر اُن کا بے جا دباؤ کبھی نہیں مانا اور بے موقع کبھی اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت پہلے جب کہ دلّی میں جان پاٹن گبنس سشن جج اور سرسید منصف تھے، قسمت دہلی کے دو جاگیردار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا، جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور اُن کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے

بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خاں بہکاتا اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے، اس کو آپ سمجھا دیں کہ جب تک ہمارا جھگڑا عدالت سے طے نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑ دے۔ جان پاٹن گبنس کے طنطنے اور رعب و داب کی تمام قسمت میں دھاک تھی اور اُن کے کسی ماتحت کی مجال نہ تھی کہ اُن کا کہنا نہ مانے۔ اُنھوں نے ایک روز سرسید کو بلا کر سمجھایا کہ جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو۔ سرسید نے صاف کہہ دیا کہ میں بیشک آپ کا ماتحت ہوں، سرکاری معاملات میں جو کچھ آپ ہدایت کریں گے اُس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل دینا نہیں چاہیے، اگر آپ کہیں کہ تم چند روز کو اپنی ماں یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ اگرچہ انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا تحکم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے مگر چونکہ آزادی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد شخصوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف عام اشخاص کے اُن کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں۔ جب صاحب جج نے یہ معقول عذر سنا پھر کبھی ان پر ایسے جا دباؤ نہیں ڈالا۔

سنہ ۱۸۵۵ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت رہتک میں عجب کھلبلی پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گتری قائم مقام مجسٹریٹ نے جتنے مقدمے بد اعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کرا رکھے تھے، مخبری کا بازار گرم تھا، جو لوگ گتری صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے اُن سے سب لوگ دبتے تھے۔ خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم جو اُس وقت وہاں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے اُن کا بیان ہے کہ "سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل برخلاف کیے اور کبھی اُن کا دباؤ نہیں مانا۔ ایک شخص بابر خاں نامی قصبۂ رہتک کا نمبردار جس کو راقم بھی جانتا ہے، گتری صاحب کا بڑا مقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف اُن کو بہت مدد دی تھی۔ اُس نے کسی دیوانی کے مقدمے میں سید صاحب کے اجلاس میں جھوٹی گواہی دی۔ اُنھوں نے فوراً اُس کو ماخوذ کیا۔ ہر چند گتری صاحب نے اُس کی رہائی کے لیے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُس کو دورہ سپرد کر دیا جہاں

سے اُس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا"

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمہ میں گتری صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائداد بعلت مطالبۂ کمیٹی نیلام کرنی چاہتے تھے اور تمام ممبران کمیٹی سوائے سید صاحب کے اُن سے متفق الرائے تھے۔ سرسید نے اُس وقت کے قوانین کے مطابق یہ رائے دی کہ کمیٹی بدون حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائداد نیلام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو انھوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیجدی۔ آخر گتری صاحب کو بصد اکراہ انھیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔"

منشی صاحب ہی کا یہ بیان ہے کہ "جب سے گتری صاحب نے مسٹر کرک کو زک دی تھی صدر امینی کی کچھ وقعت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی خصوصاً ملازمان کچہری ضلع اُس کو لاشے محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا، صدر امینی میں بزمرۂ محرران نوکر تھا اور اس گھمنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسید نے اُس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اُنھوں نے کچھ التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوالی کی تعطیل میں دلّی چلے گئے۔ مگر تعطیل سے واپس آ کر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے اُس کو پھر بحال کر دیا۔"

یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جب کہ سرسید یوروپین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدہ دار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جو وقعت اور اعتبار اُن کو ایام غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اُس کا عشر عشیر بھی اُس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی اُنھوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ "منی صاحب جو مسٹر کرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لیے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے جب سرسید ان سے ملے تو دو ملکی

کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے اور اُن کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا مِنی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آثار الصنادید کا انگریزی ترجمہ جو مسٹر رابرٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا اُس کے پورا کرنے کا وعدہ اُنھوں نے سرسید سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں جج ہو کر گئے تو بہت سا ترجمہ اُنھوں نے کرایا۔"

تھیوڈور مارسن اُس آرٹکل میں جو اُنھوں نے سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل کرس پر لکھا تھا، ٹرکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذبذب اور مشتبہ آواز نہیں نکالی۔ اُس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطان ٹرکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اُس کے تنزل پر افسوس کیا . . . . وہ کہا کرتا تھا کہ عصائے سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور اُس کو یہ خوف تھا کہ مبادا مسلمان بھی پولٹکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لیے ٹرکی کے ہر ایک صدمہ پر وہ ویسے ہی سچے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اُس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی، وہ قیصر ہند کی وفاداری اور احسانمندی سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"

بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے اُنھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ خصلت اور ننگ انسانیت تصور کیا۔ اُن کی بے تعصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے، باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال خوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو

سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کیا جائے اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اس سے اُن کی غایت درجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں، اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے اس لیے اُن کو اس الزام سے بالکل بری کیا ہے اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اُس وقت تمام ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسا نے بشمول یوروپین حکام کے اُن کو ایک وداعی ایڈریس دیا تھا جس میں اُن کی سرکاری ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر اُن کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا کہ "اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اُس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھکو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھکو تفویض ہوا ہے اُس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدردانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جوابدہ سمجھا ہے، نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو، مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھکو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں اُن کی قدرشناسی میرے ہموطنوں نے کی ہے۔"

اُنھیں دنوں میں جب کہ سرسید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفا نے اُن کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جس کے پریسیڈنٹ راجہ شمبو نرائن سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طلبات

کی تحصیل کے لیے ایک سکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد خاں سکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

انتظام قحط ضلع مراد آباد کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اُسی کے ضمن میں وہ واقعہ جو راجہ جیکشن داس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے اُن کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" کو دیکھ کر اُنھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خانہ میں ہر مذہب اور ہر ملت کے ادنیٰ ادنیٰ کنگلوں کی خدمت گذاری میں اُن کو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور اُن کی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

وفاداری غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یورپین مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت اُن سے بن آئی اُس کو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو اُنھوں نے سنہ ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے اُنھوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اُس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا، میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے اُن کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے" اسی اسپیچ میں اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ "شمال مغربی اضلاع میں اُن سے زیادہ کوئی روشن ضمیر جج نہیں ہوا"، اور مسٹر شکسپیر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ "اگر صدر امین (یعنی سید احمد خاں) بیچ میں حائل نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں"۔ اسی رپورٹ میں اُنھوں نے سرسید کی دانشمندی بے مثل ایمانداری اور سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کی سول جسٹس ایڈمنسٹریشن رپورٹ سنہ ۱۸۶۷ء میں صاحب جج بنارس نے اُن کی نسبت لکھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور

جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ اور ان کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اُس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربہ سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں حاصل ہے، میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سرسید کی درخواست پنشن گورنمنٹ میں بھیجتے وقت حسب ذیل رپورٹ کی تھی" سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت بحیثیت ایک پبلک سرونٹ کے ہز آنر پر بخوبی روشن ہیں مگر یہ عدالت بوجہ بالادست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں ماتحت رہے ہیں، اُن کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بے داغ شہرت کو جو انھوں نے اپنے طول طویل زمانۂ ملازمت میں تمام جماعتوں کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے اور نیز اُس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو جو انھوں نے اس قدر عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے، اُن کی کنارہ کشی سے پہنچے گا"

نواب لفٹننٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ہے " سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے مجھکو ہدایت کی ہے کہ ان کی جانب سے میں اُن کی ہائی اپینین سید احمد خاں کی اُس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کردوں جو پبلک سروس میں اُن کے امتیاز کا باعث رہی ہے اور نیز اُن کی اُس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو اُنھوں نے اپنی پرائیویٹ لائف میں اپنے ہموطنوں کے فائدے کے واسطے کی ہے"

استحقاق اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سرسید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لیے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پاینیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارہ سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کردیے تھے۔

کتاب " پلرزآف دی انڈین امپائر" جس میں سرسید کو ارکانِ سلطنت ہندوستان میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے، اُن کی ممبری کونسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ "اُن طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لیے اختیار کیے تھے کوئی طریقہ از روئے استحقاق کے اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ شائستہ مسلمانوں کے اس واجب التعظیم لیڈر (یعنی سید احمد خاں) کا لیجس لیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوا ہے۔ اس اعزاز کو ہندو اور مسلمانوں نے مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانت داری، بے غرضانہ اور شریفانہ برتاؤ اور اُن کی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔"

پولٹکل خدمات

مسٹر ایچ جی کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار " ہوم ورڈ میل" میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ " سید احمد خاں جس سے میں نے سنہ میں جب کہ وہ لیجس لیٹو کونسل کا ممبر تھا، تعارف حاصل کی تھی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا ایک انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاص کر مشکل اور خطرہ کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی تعلیم یافتہ، لائق، وفادار اور ریفورمر اور جنرل اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سبجکٹ ہے، مگر باینہمہ وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقصوں سے بخوبی واقف ہے۔"

مسٹر تھیوڈور بک نے جو ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اُس میں اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر آکلنڈ کالون نے جب کہ وہ لفٹننٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ " کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔"

رسالۂ اسباب بغاوت جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی　　رسالۂ اسباب بغاوت اور اُس پر گورنمنٹ کی رائیں

بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام تھا، سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جن سے وہ ارکان سلطنت میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سید مہدی علیخاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ "میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ اُنھوں نے مجھکو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اُسے دیکھکر میرا بہت دل خوش ہوا۔ جو کچھ رائیں اُس کی بدولت قرار پائیں اُن کا بیان بے فائدہ ہے۔ اہل ہند ناقدر دان، دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہموطنوں کی بھلائی ہوئی۔"

اسی حال کو اُنھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ "ولایت میں سرجان کے فارن سکرٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو اُن کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ اُنھوں نے ہنس کر کہا کہ "تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اُس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اُس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اُس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کانفیڈنشل تھے اس لیے وہ نہ چھپے اور نہ اُن کا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا"

سر آکلنڈ کالون کی رائے

اسی کتاب کی نسبت ۱۸۸۸ء میں سر آکلنڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے ٹرسٹیان محمڈن کالج کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو واقعات سب سے پہلے مجھکو اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان میں آیا تھا، منجملہ اُن کے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سر سید احمد خاں نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اُس وقت اُنھوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف اُن کی دلی توجہ مائل تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں اُن کو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اُس رسالہ کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو اُنھوں نے اُن افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو ۱۸۵۷ء میں ظہور میں آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالہ کو دیکھا ہوگا اُنھوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کر کے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا جو ہندوستان میں میرے دور ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہیگا

کیونکہ انھوں نے اُس رسالہ میں خاصکر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جن کی پوری قوت کو میں آج کے بعد اپنے تجربہ کی رو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔ سرسید احمد نے اُس میں اشارہ کیا تھا کہ جو بات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ اُنھوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے، بجائے نارضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُن کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہو جائیں گے" اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ "انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علیگڑھ کالج ہے۔"

مسٹر ماریسن کی رائے | مسٹر تھیوڈور ماریسن نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر ایک آرٹکل لکھا تھا اُس میں وہ اسی رسالۂ اسباب بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ "انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستانیوں سے) دل کھول کر انتقام لیں اور اُن کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاصکر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں۔ . . . اُس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی، منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ . . . بشرہ میں یہ دلیری کے الفاظ تھے۔ باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام ماننے کی سچائی اُسی وقت سے تسلیم کر لی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اُس برتاؤ پر جو اُس نے نیشنل کانگرس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں اُن کے لیے اس بات پر غور نامفید ہوگا کہ اُس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ سنہ سے اب تک گذری ہے، گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔"

ہیوم نیوز کی رائے | انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ "سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے اُن میں سے بعض نہایت قیمتی اور علدر آمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت

دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربے سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔"

برنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے "برنگھم ڈیلی گزٹ نے سرسید کی اسی کتاب کا کسی قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ ۱؎ "ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی اور یورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شریک کیے گئے۔"

سینٹ جیمس بجٹ کی رائے اخبار "سینٹ جیمس بجٹ" نے اسی کتاب پر یہ ریمارک کیا تھا کہ "سید احمد خاں کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اُس کے ملک کے واسطے سراسر مفید ہے، وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب "اسباب بغاوت" میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کے عہد میں ممبر رہا ہے اور اُس کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اُس کی اس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرفداری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جُدا ہیں اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے، لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم عملی لوگ ہیں، اس لیے ہم کو خیالی شکایتوں پر توجہ نہ کرنی چاہیے تو بے شک ہم اُس غلطی میں گھر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے، ہمارے نزدیک سید احمد خاں

۱؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ ملکہ معظمہ کا اشتہار جس میں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ اُن کی کتاب کے پیش ہونے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی ۱۲

کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال اکھّن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں"

کرنل گریہم کی رائے

کرنل گریہم جنہوں نے سرسید کی لائف لکھی ہے، وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ہم میں سے بعضے لوگ سید احمد کی "اسباب بغاوت" سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہمارے خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفا میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے، فی نفسہٖ بدرجۂ غایت مفید ہے، کہ اُس سے ہندوستانی طرزِ خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے"

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو رسالہ کے مضامین بالکل نہ تسلیم کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورہ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا، وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا، یعنی سنہ ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجسلیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ راجہ دیو نراین سنگھ رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بو دیا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے۔ اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہیگا۔

یا مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی سنہ ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبھو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور

اُس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

پولٹکل خدمات پر پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر اُن کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر۔ وہ ابتداء سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقعت اور اعتبار انھوں نے اُن خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جچنا شاید محال سے کچھ ہی کم ہوگا، اُس کو بطور مشتے نمونہ از خروارے بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اُن کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے ہر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں اُن کی ملکی و قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے، مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُن کو ایک سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ منتظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر اُن کی طرف متوجہ کیا جائے اور اُن کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے، یا جو نتائج اُن خدمات پر مترتب ہوئے اُن کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ اُس کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہے سو کر گزرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اُس کے قبضے میں تھے کہ جو نیک صلاح اُن کو بتائے اُس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں بہ نسبت اس کے کہ اُس کی کوششوں سے ملک اور قوم کو کیا کیا فائدے پہنچے، زیادہ تر یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے اُن کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لیے

ہم نے سرسید کی کامیاب اور باردر کوششوں کے ساتھ اُن کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتد نتیجہ پیدا نہیں ہوا یا جو بسبب ناساعدت وقت کے ادھورے رہ گئے؛ تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دھن اور کس اُدھیڑبن میں گذری ہے۔

ملکی و قومی خدمات

ہمدردی | ہمدردی کا اصل مادہ بظاہر انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی اُس حد سے جو اُن کی فطرت میں رکھی گئی ہے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی برخلاف انسان کے کہ کبھی اُس کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کا تعلق اول گھر کی چاردیواری سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعات زندگی سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اُن میں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے منفعل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے بہت بڑھ کر پیدا کی گئی تھی۔ محبت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

خاندان کی محبت | محبت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبت ہے، سو اس کی شہادتیں اس کتاب میں جابجا ملیں گی، خاندان کے بعد وطن کی محبت ہے۔ سو دلّی کے ساتھ جو دلبستگی اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی، اُس کا ثبوت بھی اس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا۔

وطن کی محبت | اسی وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پُرانے کھنڈل اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اُٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں جس سے دلّی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دھندلی تصویر کا اجالنا مقصود تھا، اُن سے فوق العادت محنت کرائی لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوششیں انہیں کاموں پر ختم ہو جاتیں تو شاید

اُن کو ایک محبِ وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا، مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا، نظر کیجاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زمانۂ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی۔

عملی قوت

پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخوار بیان کیے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت پیدا کی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کرنیوالی نہ تھی جو وہ ابتدائے حال میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے، باوجودیکہ عدالت کا کام جو اُن کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تندہی اور نہایت غور و فکر سے انجام دیتے تھے، فی نفسہٖ ایک تھکا دینے والا کام تھا بایں ہمہ وہ بعینہٖ ایک مستسقی کی طرح، جس کی پیاس چلو دو چلو پانی سے نہیں بجھتی اور وہ کنویں یا دریا کی طرف دوڑتا ہے، ہمیشہ کسی بڑے کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، اُنھوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کیے مگر اُن کی پیاس کسی طرح نہ بجھی۔ آخر وہ وقت

خارجی اسباب سے متاثر ہونا

آ پہنچا جب کہ اُن کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے والے تھے۔ ۵۷ء کے ہنگامہ نے جیسا کہ سرسید کے کسی دوست کا قول ہے، اُن کے دل پر وہ کام کیا جو لوہے کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا جس طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصہ اپنے حیزِ طبعی سے بلند ہو جاتا ہے اسی طرح غدر کی آنچ نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا۔ دلّی، مراد آباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی اور بربادی دیکھ کر جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ اُس وقت اُن کا حال بعینہٖ اُس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لیے دیوانہ وار ادھر اُدھر ہانپتا پانو مارتا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آچکے اور جو خاندان بگڑ چکے اُن کو مدد پہنچانی تو اب امکان سے خارج ہے مگر جو باقی ہیں اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں اُن کو کس طرح غدر کے آیندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؟ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے

بدگمان ہوگئی ہے، مسلمان گورنمنٹ کے شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں آئیں اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہوگئے ہیں، جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوچکے ہیں اُن کی سوتیں بدستور جاری ہیں، جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاصکر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے، حکمران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹیکل لکھے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے، کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہوگئی ہے، وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں. غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرکے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا یہاں تک کہ اُنھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جاکر بود و باش کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا، مگر آخر کار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اس وقت جو کیفیت اُن کے دل پر طاری تھی اُس کا کسی قدر اندازہ اُس اُردو مناجات کے پُر درد الفاظ سے ہوسکتا ہے جو ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی شایع ہونے کے وقت انھوں نے بعد ادائے دوگانۂ شکر الٰہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مراد آباد پڑھی تھی اور جس کو ہم پہلے حصہ میں بجنسہٖ نقل کرچکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لیے جب کبھی جو تدبیر اُن کے خیال میں گذری اس کو انھوں نے کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں اُن کو یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی طریقۂ تعلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت چلی آتی ہے وہ رفع نہ ہوگی، چنانچہ مراد آباد میں آتے ہی انھوں نے اول ایک اسکول جس کو تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے، قائم کیا۔ نیز انھیں دنوں میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوچکا ہے ایک رائے جس میں زنگلش اسکولوں پر سخت اعتراض

مدرسۂ مراد آباد

سرکاری طریقۂ تعلیم پر اعتراض

کیے تھے اور گورنمنٹ کو نہایت شد و مد کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تعلیم دے، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کے شایع کی۔

بغاوت کے اسباب گورنمنٹ کو مطلع کرنا

پھر رسالۂ اسباب بغاوت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کو اُن تمام شکایتوں سے جو از راہ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں متمکن تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا۔[1]

انتظام قحط اور یتیموں کی حفاظت

اُسی ہمدردی کے جوش میں جو اُس وقت اُن کے دل میں موج زن تھا اُنھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی۔ پھر اُسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برخلاف انگریزی اخباروں میں زیادہ بوچھاڑ ہونے لگی تو اُنھوں نے ایک

رسائل لائل محمڈنز آف انڈیا

سہ ماہی رسالہ موسوم بہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، نکالنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں اُنھوں نے سُنا کہ ایک مسلمان کو اس جرم

شرح لفظ نصاریٰ

میں کہ اُس نے انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے۔ یہ سُنتے ہی اُنھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اُردو اور انگریزی میں شایع کیا جس میں نہایت

---

[1] اسی رسالہ میں جہاں اُنھوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی شکایت کی ہے وہاں اس اعتراض کا جواب کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکر شریک کیے جا سکتے تھے، اس طرح دیا ہے کہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے علیحدہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ پھر جو خط کہ سرسید نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقۂ انتظام سلطنت ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے۔ مگر جب راقم نے بذریعہ تحریر کے اُن سے اس کتاب کا حال دریافت کیا تو اُنھوں نے ایک نبی تحریر بھیجی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھتے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں، نہ وہ میری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُن کی۔ اس لیے کافی معلومات ملنے کا کوئی سامان میسر نہ آیا۔ پھر ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کے لیے کرایہ کی گاڑی پر جانا پڑتا تھا۔ اور جب تک گفتگو ہو گاڑی کو باہر کھڑا رکھنا پڑتا تھا اور مصارف کا تحمل ناممکن تھا اسی لیے جو چند یادداشتیں اور مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم کر دیے گئے ۱۲

خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو از راہ تحقیر کے نصاریٰ نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رو سے اُن کے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ معزز نہیں ہو۔

تفسیر بائبل | مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت ابتدائے شیوع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں اور جو تیرہ سو برس تک پکتے پکتے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھیر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی (اور اُن کا رفع ہونا ابھی کمیل نہیں ہے) اُس وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لیے کیجائے گی وہ اُس دوا کی طرح جو بغیر ازالۂ سبب کے کسی مرض میں علاج میں استعمال کیجائے بے سود ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خاں جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھنا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے جوں ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا مثا سرکار سے اُن کی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غدر کے زمانہ میں بندرہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً جیسا پہلے حصہ میں مفصل مذکور ہو اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں ڈالدی اور بائبل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کردی۔ جس بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اُس کے شایع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اُس کا ذکر مجملاً ہم پہلے حصہ میں کر چکے ہیں اُس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہو کہ یہ کام خاصکر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا۔ لیکن کچھ تو اس لیے کہ مسلمانوں میں اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منعطف ہوگئی اُس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

سائنٹفک سوسائٹی | غازیپور پہنچ کر اُنھوں نے دوسری طرح سے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اُس منافرت کے دور کرنے کی، جو ۵۷ء کی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کردی تھی، بنیاد ڈالی۔ اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے

قائم کی گئی تھی کہ لائبریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دیے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصولِ حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے ظاہر کیے جائیں جو اُردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے، ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اُس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہو اُس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سوسائٹی کے نتائج قطع نظر اُن اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اُس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے

انجمنوں کا قائم ہونا قائم نہیں ہوئی تھی۔ بعد ۳۰ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اُس کے بعد اور اُسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام دیسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ اُن میں بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سروپا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں، پولٹکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں

اخباروں کی اصلاح کے ساتھ چھپنے لگے اور بجائے اس کے کہ وہ محض دیسیوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے، اُن کو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اُردو لٹریچر کی ترقی پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اُس نے ایڈریس مورخہ ۹ مئی ۱۸۶۸ء میں بحضور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر بمقام علیگڑھ پیش کی تھی، ہز آنر نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی اُن میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۸۶۸ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ

آدمی مستفید نہیں ہوسکے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گذر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ اُنھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اُردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اسی ایڈریس میں جو کہ سر ولیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے جو اُردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے، دو کتابیں سید احمد خاں لائف آنریری سکرٹری تیار کر رہے ہیں، ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں، نام، اُس کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرز بیان اور مختلف مقامات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا۔ دوسری اُردو ڈکشنری۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی لیکن اُردو ڈکشنری جو سرسید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہوا اور اس پر بعض یورپین فاضلوں کے عمدہ ریمارکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرسید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم ضرورتیں جن میں سے بعضی ابتک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں، اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں یہاں تک کہ جب کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو باوجودیکہ سر و ہزار سودا ہونے کے خود ہی اُس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لیے وہ قائم کی گئی تھی اُس کا کھر ابھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس درد کی دوا نہیں ہو سکتی تھی با ایں ہمہ سرسید نے سوسائٹی کے

سوسائٹی کی ترقی میں کوشش

ترقی دینے میں کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ چندہ اور قیمت اخبار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔ ضلع کے رئیسوں کو اُس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اُس کی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے بڑھ کر اُس کو مالی

مدد پہنچائی، اُس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اُس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور، علیگڑھ، بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہانتک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دُھن برابر لگی رہی چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط اُنھوں نے مولوی مہدی علیخاں کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی وجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اُس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔"

سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اُسی ذوق شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو اُن کی جبلت میں داخل تھا اُس کو

غازی پور کا مدرسہ

سرانجام کیا۔ ۱۸۶۴ء میں اُنھوں نے غازیپور میں محض قومی چندہ سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اُٹھان مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ ہی کم کہنی چاہیے اور جو اب تک وکٹوریا اسکول کے نام سے غازیپور میں جاری ہے۔ پھر ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے علیگڑھ آکر

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

"برٹش انڈین ایسوسی ایشن" جس نے اب "نیشنل کانگرس" کی صورت میں جنم لیا ہے قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے دردِ دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے لیے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب سے کہ ملک میں اُس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اور سرسید جو اُس کے بانی مبانی تھے وہ یک انار و صد بیمار کے مصداق تھے، حاصل نہ ہوا، مگر اُس کے ذریعے سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور اُن میں سے اکثر میں کامیابی ہوئی جیسے مسافران ریل کی تکلیفات کی شکایت، کتابوں کے محصول میں تخفیف کی درخواست، ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنبانی وغیرہ۔ پھر

ہومیوپیتھک کی تائید

سنہ میں بمقام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیوپیتھک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، اُس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی، اُس کی تائید کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سکرٹری تھے، ایک ہومیوپیتھک ہوسپٹل کھولا، اس طریقۂ علاج کی ہسٹری اور اُس کے اصول پر لکچر دیے اور ایک رسالہ لکھ کر شایع کیا۔ پھر سنہ میں سرسید ہی کی سلسلہ جنبانی سے تمام اضلاع شمال مغرب میں

تعلیمی کمیٹیاں

تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام، نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔ پھر بنارس ہی میں انھوں نے

اُردو زبان کی حمایت

اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرفداری کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا بے انتہا کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے دفاتر سرکاری میں اُردو زبان اور فارسی خط بدستور بحال و برقرار رکھا گیا اور ہزارہا ہندو مسلمان جو بذریعۂ اُردو تحریر اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڈھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حرفوں کا سیکھنا اور اُس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا نیچر کا بدلنا، اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اُردو زبان جس نے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ٹکڑے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس صدمہ سے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اُس کو پہنچنے والا تھا محفوظ رہی۔ اس

مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنا

کے سوا بنارس ہی میں اُنھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جن کا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے اُن کو آج تک انگریزوں سے دور دور رکھا ہے اُن کی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے، اُن کو حکمراں قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کے اصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف صفائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جائے۔ اگرچہ اُس وقت اس رسالہ پر بہت لے دے ہوئی اور

سرسید کو اُس کے لکھنے پر جیسی کہ امید تھی سب کچھ کہا گیا مگر آخر کار اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جن کی انگریزوں تک رسائی اور اُن کے ساتھ ربط ضبط تھا یہ آن بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی جھجک نکالنے کے لیے اُنھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواکلت اختیار کر کے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقہ کو وسعت دے کر اُس کا اثر دور تک پھیلا دیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اُنھوں نے بہت سے آرٹکل اسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو اُنھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ رسالہ اسباب بغاوت میں متنبہ کیا تھا کہ اُن کو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبلک اسپیچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے سوشل تعلقات برادرانہ اور دوستانہ ہونے چاہییں نہ حاکم محکومانہ۔

مسٹر بلنٹ کی دعوت میں اسپیچ

اس موقع پر ہم سرسید کی ایک مختصر اسپیچ جو اُنھوں نے علیگڑھ میں ایک ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جامِ صحت پروپوز کرتے وقت سنہ ۱۸۸۳ء میں کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ میں ظاہر کی گئی تھی، بجنسہٖ نقل کرتے ہیں۔ سرسید نے کہا

”ہم کو نہایت خوشی ہے کہ مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا، ہماری قوم کے مختلف گروہوں سے ملے، ہم کو امید ہے کہ اُنھوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاج برطانیہ کا لائل اور کوئین وکٹوریا ایمپرس اوف انڈیا کا دلی خیر خواہ پایا ہوگا۔ اگر ہماری کسی آرزو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے یکجہتی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔“

”مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں یکجہتی قائم ہو، کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور اُن میں کوئی بنائے مخاصمت قائم ہوئی ہو، اُن کو ہم سے بدلا لینے کی رغبت ہو اور ہم کو

اُن کے عروجِ اقبال سے رشک و حسد ہو۔ کروسیڈ کے زمانہ میں جو ایک زمانہ ہر قسم کی عداوتوں کے برانگیختہ ہونے کا تھا، انگلش نیشن کو بہت ہی کم اُن معرکوں سے تعلق تھا۔"

"یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے۔ لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے ساتھ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل کی، کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہوگا۔ وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایسا زمانہ تھا کہ بیچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی، اُس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اُس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا تاکہ کلام (؟) کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں مگر اس وقت میں یہ کچھ کہنا ضرور نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا۔"

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی، ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں محض ایک غلط خیال ہوگا۔"

"انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی، مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانۂ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیے، ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لیے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور اُن میں سمپتھی نہ ہو۔ سمپتھی سے میری مراد پولٹکل سمپتھی نہیں ہے، پولٹکل سمپتھی تانبے کے برتن پر چاندی کے ملمع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی، اس کا اثر دونوں (فریق) کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا، ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے ملمع کی قلعی ہے۔ سمپتھی سے میری مراد برادرانہ دوستانہ سمپتھی ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ "یہ اسپیچ جب اخبار میں سرالیفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر کی نظر سے گذری اور اُس کے بعد میں اُن سے ملا تو انھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجب طرح کی اسپیچ دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی" غالباً ہز آنر کو اسپیچ مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہوگا کہ "انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے" شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں، اس لیے اس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اس فقرہ میں ہندوستان کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکار کمپنی کے رعب و داب اور امن کی پالسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آشتی سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلائیو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کا مرہٹوں کے حملہ کے وقت اپنے تئیں لارڈ لیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا اور نظام حیدر آباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ماننا اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قلمرو سے یکقلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں سے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سودا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرأت کر بیٹھے جس کی بدولت آخرکار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔ فروری سنہ ۶۷ء میں جبکہ ڈرمنڈ صاحب اضلاع شمال مغرب میں لفٹنٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے اس کمیٹی میں اُن کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیار دیے گئے تھے، کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا، نمائش کی اخیر تاریخ دربار کے لیے مقرر تھی اور دربار کا انتظام مسٹر پالک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا، صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لیے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لائن تو اُس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو کھچوا دیا اور دوسری لائن اُسی کے متوازی مگر اُس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر

خامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جا نکلے اور اتفاق سے اوپر کی لائین میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر اُن کو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لائین لگائی گئی ہے۔ وہ وہاں سے سیدھے سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح نہ تھا۔ سرسید کو نہایت تعجب اور اس کے ساتھ سخت ندامت ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا وہ غلط ہو گیا۔ یہ اُسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لائین میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر ان کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس سن سکرٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دربار کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے سارا حال بیان کیا انھوں نے بھی اس امر کو ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اس کا ذکر مسٹر بالک سے کریں۔ اتنے ہی میں مسٹر تھارن ہل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے جب اُن کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ سرسید پر نہایت افروختہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے غدر میں کونسی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی؟ اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہماری عورتوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو دربار میں بیٹھو؟ سرسید نے کہا اسی سبب سے تو یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر اُن کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچتی۔ تھارن ہل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے۔ آخر مسٹر جیمس سن نے سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ خبر نواب لفٹنٹ گورنر کو پہنچی تو انھوں نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو ناپسند کیا اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن ہر ضلع اور قسمت کے حکام کو چاہیے کہ اپنے اپنے ضلع اور قسمت کے ہندوستانی رئیسوں اور افسروں کے ساتھ نیچے کی لائین میں بیٹھیں۔ دربار کے بعد جو یورپین افسر سرسید سے ملتا تھا اس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے

تھے توبگڑتا تھا۔ لاچار انھوں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہوکر علیگڑھ چلے آئے۔ مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام پہنچی جس میں اُن سے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟ اور بلا اجازت کس لیے علیگڑھ چلے گئے سرسید نے آگرہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ باز پرس نہیں ہوئی۔ مگر اس نمائش سے۔ پہلے جو لارڈ لارنس مرحوم وائسرائے وگورنر جنرل نے آگرہ میں دربار کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغا دیے جانے کا حکم دیا تھا اور وہ تمغا اب تیار ہوا تھا۔ چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے نواب لفٹنٹ گورنر نے وہ تمغا صاحب کمشنر قسمت میرٹھ کو دیدیا تاکہ وہ میرٹھ جاتے ہوئے علیگڑھ میں سرسید کو اپنے ہاتھ سے پہنالتے جائیں۔ صاحب کمشنر جب علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سرسید حسب الحکم وہاں موجود تھے ان کو ایک طرف لیجا کر بسبب اُس رنجش کے جو تھارن ہل صاحب سے اُنھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغا پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں، یہ کہہ کر سرسید کو تمغا پہنانا چاہا سرسید نے یہ کہہ کر کہ میں بھی گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُن کے آگے سر جھکا دیا اور تمغا پہن کر چلے آئے۔ ہم نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ کا ارادہ سب ججوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اس کارروائی سے وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ اور لوگ بھی جو اُن کے ہم عہدہ تھے، اُس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد مسٹر پالک سے جب کہ وہ کمشنر تھے ایک دن سرسید کا ذکر آیا اُنھوں نے نہایت چیں بچیں ہوکر کہا کہ وہ بڑا مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا میں نے یہ حال سید صاحب کو لکھ بھیجا اُنھوں نے مسٹر پالک کو ایک مفصل چٹھی لکھ کر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اُس جسارت کا بیان کیا تھا۔ اس چٹھی کے آنے کے بعد پھر مسٹر پالک اُن کی طرف سے بالکل صاف ہوگئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف

سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو۔ خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں اُن کے متعدد آرٹکل اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

خصوصاً ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو جو انھوں نے ۱۸۷۲ء میں بمقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے، سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جس کے شکر سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا اس لیے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی بالکل جاتی رہی تھی۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ "غالباً ۱۸۷۰ء میں جب مسٹر گریفن ڈپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چونیاں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بجرم وہابیت زیر مواخذہ کر کے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو جو اُس وقت کمشنر تھے، یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو انھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کر کے اُن کی تبدیلی قصور میں کروا دی۔ اس کے بعد جب اُن کی تبدیلی قصور سے ہونے لگی تو مسٹر براؤن اسسٹنٹ کمشنر قصور نے اُن کو جو سرٹیفکیٹ بغرض صفائی کے دیا تھا اُس میں بڑا ثبوت اُن کی صفائی کا یہ لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا ہے جو سید احمد خاں صدر الصدور اضلاع شمال مغرب کا مذہب ہے اور اس لیے اُس کی نسبت بدخواہی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے۔"

ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیالات

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ بظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لیے انگلستان لیجا کر اُس کے آرام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اُس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن شغلوں اور جن منصوبوں میں انھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کیے اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا، در اصل منشا اس سفر دور دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا، اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سرسید کا حال بعینہٖ اس شعر کا مصداق تھا۔

"ترکتُ للناس دنیاھم و دینھم[لہ] شغلاً بحبّکَ یا دینی و دنیائی"

مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں اُن سے بن آئی اُس کا ذکر ہم اگلے عنوان میں کریں گے یہاں غرض یہ دکھانا منظور ہے کہ اس سفر کے آغاز سے لے کر انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی کو کس قدر لگی رہی ہر

دلسوزی کے آثار | اُن کے سفرنامہ سے جس کا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کے لیے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے، ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُن کے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا۔ خصوصاً اُن کے دل کی کیفیت اور تلملاہٹ اُن

دلسوزی کے پرائیویٹ خطوط | پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدرد اور دلی دوست سید مہدی علیخاں کو ولایت سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے لکھتے وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خاں نے راقم کو عنایت کیے ہیں۔ صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز میں انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کر کے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے۔ کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے۔ کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مؤرخوں کے اُن بیجا اعتراضات کا جواب دیا جائے جو انھوں نے مسلمان بادشاہوں یا خلیفوں پر وارد کیے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹیکل حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے ہندوستان سے چندہ طلب کرتا ہے۔ کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور اُن کو سلف کی ترقی

[لہ] شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دنیا اور اُن کا دین مبارک ہو، میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دنیا بھی تو ہی ۱۲

اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے غیرت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے۔ یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونے کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اُس عربی مدرسہ کا جو دلی میں منشی امو جان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "جان من و جناب من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے مونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا"۔

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں "جس کتاب[1] کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اُس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا، آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اُس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے جب آپ اُس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ

[1] یہ اس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سرسید نے وہاں پہنچ کر اور اپنے روپیہ سے اُس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اُس کے الگ الگ ترجمے کیے۔ اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اُس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا، مگر چونکہ سرسید نے اس سے پہلے کسی یورپین مصنف کی ایسی تحریر جس میں اسلام کی اس قدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لیے اُن کو اس کے شائع کرنے کا خیال ہوا۔

انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔"

"اب ایک اور بات ضروری ہے جو کہتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اُس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں، اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"

"دو بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے، ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی کی نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن، لیٹن، فرنچ، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسا نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا، فی کتاب چار سو روپیہ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے مجھ کو بھیج دیں چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے، صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو مثلاً آپ میر ظہور حسین، زین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور اور احباب سے ملاقات کریں اور تنہائی میں بات چیت کریں جس کی توفیق ہو اُس سے لے کر جمع کریں۔"

مولوی سید مہدی علیخاں کے لیے ہندوستان میں صاحب کمشنر نے خلعت کے لیے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبارکباد کے بعد سرسید ان کو لکھتے ہیں " بھائی مہدی! تم پایونیر اخبار الہ آباد کے آرٹیکل کا ترجمہ سنو وہ لکھتا ہے کہ " آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگال میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں جلد پنشن لیں گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا'، دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہرحال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے اور مجھکو دوہری خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ بااقبال رکھے"

مولوی امداد العلی جو سرسید کے سخت مخالف تھے اُن کو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے یہ خبر سُنکر سرسید مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں " بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار اوف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے چشم ما روشن و دل ما شاد۔ اُن کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار اوف انڈیا لیا اور اُنھوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر (نہیں نہیں بھول گیا اُن کے مونچھیں نہیں ہیں[1]) یہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے ایک اُن کو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو"

اور کئی خطوں میں مولوی مہدی علیخاں کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے واپس آنے سے پہلے ایک ایسوسیئشن مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کی اصلاح کے لیے قائم کرو اور ایک اخبار اسی مقصد کے لیے ایسوسیئشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو اور چناں کرو اور چنیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ لیے

[1] مولوی امداد العلی اتباع سنت کے خیال سے مونچھیں نہیں رکھتے تھے یہ اُس کی طرف اشارہ ہے ۱۲

مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دولتکہ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے انھوں نے سید مہدی علیخاں کو لکھے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کا دکھڑا رونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی تدبیریں

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے۔ اس رائے پر آکر ختم ہوگئے کہ ہندوستان میں چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمدن کالج یا محمدن یونیورسٹی قائم کیا جائے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولٹکل حالت درست کرنے کے لیے ایسوسیئشن قائم کرنی یا کاغذ کی ناو سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک اُن میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی اُن کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔ انھوں نے

ولایت میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر پمفلٹ لکھنا

پختہ ارادہ کرلیا کہ اپنی تمام زندگی اس کام پر وقف کردیجیے۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام ابتدائی مدارج جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے، اُنھوں نے وہیں طے کرلیے، ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اس کے جو طریقۂ تعلیم اُن کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اُس کو بیان کیا تھا، لندن میں

کیمبرج یونیورسٹی کو دیکھنا

شائع کیا تاکہ جن کی رائے اُس کے خلاف ہو وہ اخباروں کے ذریعے سے ظاہر کریں۔ نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر نہایت توجہ سے دیکھا اور اُس کے تمام جزئی و کلی حالات پر غور

اشتہار جاری کرنا

کی۔ پھر مسلمانوں اور نیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو اور انگریزی میں اشتہار چھپواکر سید مہدی علیخاں کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں آکر نہایت باقاعدہ اور دانشمندانہ طریقہ سے اُس منصوبہ کے پورا کرنے پر کمر باندھی جو اُن کی سالہا سال

انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔ ادھر تو انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی کوششوں سے آخر کار مدرسۃ العلوم قائم ہوگیا اور اُدھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے

تہذیب الاخلاق نکالنا

لیے پرچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔ سرسید کے ان دونوں کاموں کا مفصل حال

ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور مدرسۃ العلوم سے اُن کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آیندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے۔

تہذیب الاخلاق کے نتائج

ہندوستان میں دیسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو پبلک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں یہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور اُن کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں سوا اس کے کہ لوگ اُن کو ایک دل کا بہلاوا جانتے ہیں وہ کسی مرض کی دوا نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے جو ایک سب سے زیادہ افسردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے نکالا گیا تھا، کیا امید ہو سکتی تھی! باوجود اس کے جو نتیجے اُس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اُس وقت مسلمانوں پر بسبب اُس انقلاب کے جس نے غدر کے بعد اُن کی حالت دگرگوں کر دی تھی، دو مختلف حالتیں طاری تھیں۔ ایک طرف مذہبی تعصبات اور مذہبی جوش و خروش، جو ادبار اور تنزل کے زمانہ کے ہتھیار ہیں، نہایت زوروں پر تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی تعصبات کے ساتھ وہی نسبت تھی جو آگ کو باؤد کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے متعصب مولویوں کے گروہ میں تلاطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے اُن کو کام میں لانے کا موقع ملا۔

دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افسردہ اور مایوس طبیعتیں اپنے روز افزوں تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناؤ کی طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ رہی تھیں جس سے اُن کی ڈھارس بندھے لیکن کوئی اُمید کی صورت نظر نہ آتی۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل پر ٹھیک وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے۔ اس گروہ نے جبکہ وہ اپنے تئیں ناچیز اور

ایک نہایت کس مپرسی حالت میں سمجھ رہا تھا اور دنیوی ترقیات کے دروازے اپنے چاروں طرف مسدود پاتا تھا، دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دلسوزی سے اُن کو نیند سے جگاتا ہے، اُن کی غفلت پر ملامت کرتا ہے، اُن کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر اُن کو غیرت دلاتا ہے اور اُن کو ترقی کرنے کا گُر بتاتا ہے یہ گروہ اُس کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی بے سری فوج کا کوئی سردھرا پیدا ہو جائے اور وہ اُس کے اشارہ پر اِدھر اُدھر سے سمٹ کر اُس کے گرد جمع ہو جائے، غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن اُس کی طرف متوجہ ہو گئے دوسرا اس لیے کہ اُس کی آواز غور سے سنیں اور پہلا اس لیے کہ اُس کی آواز کسی کو سننے نہ دیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس قدر اُس کی موافقت سے قوم کو فائدہ پہنچا اُسی کے قریب قریب اِس کی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

مدارس اسلامیہ کا قائم ہونا

جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرسۃ العلوم کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں اُن کے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے شاید تین برس گزرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انبہٹہ میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد اُنھوں نے، جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر ۱ جلد ۴ میں منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چوکنا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا، خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے" اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہمارے مدرسہ انبہٹہ اور ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے مستفیض ہوں گے، گویا علیگڑھ ہمارے مدرسوں کے طلبہ کا قصر امید ہے۔ اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کریں گے تو وہ قصر ہمارے ہی لیے ہے پس کس قدر ہم کو اس کے بانیوں کا شکرگزار ہونا چاہیے۔"

اس قول کے نقل کرنے کے بعد سرسید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ "سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہؤا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعۂ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سُنی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے" سرسید نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۸۳ء کا لکھا ہؤا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اور بے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جس کی بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اُس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ یہ خیال فی نفسہٖ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی چیخ پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کردی ہے جس پر قومی ترقی کا دارومدار ہے۔

اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں اُن میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے اُن کی اصلاح کیے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلما جس کا پانچواں اجلاس سال گذشتہ میں ہو چکا ہے اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلۂ درس کی زمانۂ حال کی ضروریات کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلما کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار، نور الآفاق اور امداد الآفاق اور کیا اور کیا مدت دراز تک شایع ہوتے رہے، وہیں سے علما کی یہ جماعت اس غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانۂ حال کی طرز تعلیم کے سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لیے اکثر علما اس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارے سے قائم ہوئی ہے۔ ہم ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ "ھذا ایضاً من برکات البرامکۃ"

بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال اُن کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃ لائم سے خوف زدہ نہ ہوئے تو رفتہ رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے اُن کی طرف متوجہ ہوں گے۔

مخالف مولویوں کے خیالوں میں انقلاب

نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے وقت ندوۃ العلما کی روئداد میں سے اُس کے بعض ممبروں کی آتریر کا خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاق جدید کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے اُس کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ابتدائی جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر علوم جدیدہ کے مطابق کی تھی اور جس پر اُن کی تکفیر کی جاتی تھی، ہمارے علما کی رایوں پر اس نے کس قدر اثر کیا ہے اور اُن کے خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا قدیم علم کلام جو اس زمانہ کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لیے مدوّن ہوا تھا اس زمانہ میں اُس کا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے، اب فلاسفۂ زمانۂ حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو ہمارے علما علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ اُن سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد اور دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اُسکے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم نے ندوۃ العلما میں یہ کہا کہ "مذہب اسلام ایسا رہتے گھر کا نہیں جس پر نئے فلسفہ کا ریلا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا، پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلے گا۔ اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت دریافتی ہے وہ تو صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے" پھر کہا کہ "اسلام نے تاریخ کا بھی بطرز مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے عبرت و حیرت پیدا کر دیں۔ اگر بطلیموس کی ہیئت ثابت ہو جائے تو کیا اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا جزو

لا یتجزیٰ باطل ہوا تو کیا اور ثابت ہوا تو کیا، خلا کا بطلان ہوا تو کیا اور اثبات ہوا تو کیا، ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملے روکنے کے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کیے تھے جن کو آج کل محض جودتِ طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں لہٰذا ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے۔"

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سدِ راہ تھیں اُن کے دور کرنے پر علی الاعلان کمر نہ باندھتا تو ظاہر ہے کہ اُس کی مخالفت بالکل نہ ہوتی اور اس لیے جو عمدہ نتیجے اُس کی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے۔ نیز جس قدر اُس کی مخالفت کم ہوتی اُسی قدر اُس کے مددگاروں کا جوش کم ہوتا اور اس لیے وہ مخالف اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر لوگ اُس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اُس کا منتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کا اسلاف کی ترقیات سُنکر متنبہ ہونا

اُس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے، نہایت مؤثر طریقوں کے ساتھ اُن کو اُنکے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آباؤ اجداد کی بڑائی سُننے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجودہ تنزل کا مقابلہ زمانۂ سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں میں فخر و مباہات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن اُن نیچرل موانع کے سبب جو گری ہوئی قوموں کو مدت تک اُٹھنے نہیں دیتے، ابھی تک اُن میں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سُنکر ایک غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کو پستی و تنزل کے ننگ و عار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے تاہم جس قدر بیس بائیس کے عرصہ میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُس کو اسی تہذیب الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، ورنہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس

شدومد کے ساتھ کمر باندھی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُن کو بیں نہ ڈالے، ہرگز کھلنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کو تھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کا زینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بلاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مدرسۃ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُس کی کوششیں بالکل اکارت نہیں گئیں۔

مسلمانوں میں عیسائی مورخوں کے الزامات رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور اُن کا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ظاہر کیا گیا ہے، اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آیندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے تھے مگر اُن کی اکثر تحریرات عام طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لائق لائق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے۔ بہت سے مضامین تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر لکھے گئے اور ان کے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اُردو میں علیحدہ شائع کی گئیں۔ اس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، اُن اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وارد کیے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چلے تھے، کوئی عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا، مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھ کر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں خطور کرتے تھے وہ یک قلم زائل ہو گئے اور اُن کے دل کا زعم بالکل جاتا رہا۔ اب وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پراگندہ خیالات سے نادم ہیں۔

تعصب تقلید توکل قناعت اور تقدیر کی مزاحمتوں کا کم ہونا

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے

ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکما اور کاہل اور جمادات کی طرح بے حس وحرکت کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے خیالات بدل دیے اور تدبیر و کوشش کی طرف اُن کا رُخ پھیر دیا۔ اسی پرچے نے اُن کو اپنے دست و بازو پر بھروسا کرنا اور گورنمنٹ کا

سیلف ہیلپ کا خیال پیدا ہونا

سہارا چھوڑنا سکھایا اور سیلف ہیلپ کا اصول جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی ان کے ذہن نشین کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قومی کاموں میں چندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے یا دوسرے لفظوں میں سید احمد خاں کی تحریروں اور اسپیچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دو روپیہ مہینے سے زیادہ اولاد کی تعلیم میں خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی چیخ پکار سے اب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ مہینا بے دریغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں۔ سر سید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنے نتیجوں کو اعتراض کا ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جن کو ولایت جانے سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ہم کو اس باب میں اُن شاذ و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سر سید نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی بیاہ شادیوں کی بیہودہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے لیے جائداد خرید کر اُن کی عیاشی اور بدچلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیا کر جاتے تھے اب وہ روپیہ اُن کی لیاقت اور اصلی عزت اور اقتدار بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں۔

تہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدت دراز کے

قومیت کا خیال پیدا ہونا

بعد قومیت کے معنی یاد دلاتے ہیں۔ قومیت جو درحقیقت ایک لفظ اسلامی اخوت کا مرادف ہے اس کے مفہوم سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا۔ ان میں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت سے کچھ تعلق نہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ مغلوں کی فتوحات پر فخر کر سکیں، اور سادات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی عباس کے کارناموں پر نازاں ہوں۔ اس کے مذہبی فرقوں کے سوا اختلاف نے ان میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ جو تمام اہل قبلہ میں بسبب اتحاد اسلامی کے متحقق ہونا چاہیے باقی نہ رہا تھا۔ تہذیب الاخلاق نے ان دونوں تفرقوں کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں کے تفرقہ یا مذہبی طریقوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں سے جو اول سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں لوگوں کو بولنے سکھائے ہیں۔

اردو لٹریچر میں انقلاب پیدا ہونا

اردو لٹریچر کو بھی اس پرچہ سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ پرچہ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے چھبیس برس کے عرصہ میں تین دفعہ مختلف وقتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصہ تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس برابر نکلتا رہا۔ لٹریری خوبی کے لحاظ سے جس قدر عمدہ مضامین ان سات برس کے پرچوں میں شائع ہوئے پھر ویسے نہیں ہوئے اور جو نتائج کہ ہم نے اوپر بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر انھیں سات برس کے پرچوں سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اس پرچہ کو جاری ہوئے صرف تین برس کا عرصہ گذرا تھا کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے جیسا کہ جلد ۲ نمبر ۱ میں مذکور ہے ان کو لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور

یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے۔

مذہبی لٹریچر میں آزادی کا پیدا ہونا

یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل اخلاقی اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اور شائستگی کے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اُردو زبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔

اسی پرچہ نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح بے حس و حرکت چلا آتا تھا دفعۃً تموج پیدا کر دیا۔ تہذیب الاخلاق سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرسید کے سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا، تعصب اور تقلید نے آزادخیالی کی سوتیں بالکل بند کر دی تھیں، علمائے سلف کے اقوال اور اُن

مذہبی مناظرہ کے طریقہ کی اصلاح

کی رایوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف کی معراج تھی، غیر مقلد جو بہت آزادی کا دم بھرتے تھے اُن کی جولانگاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق بہ عبادات تھے اور بس، پادریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو اعتراضات وہ مذہب اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے تھے اُسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر توریت و انجیل کے حوالوں سے کیے جاتے تھے، یورپین سولیزیشن اور یورپین سائنس کے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے اول تو اُن سے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُن کو خبر بھی ہوتی تو تقلید کی بدولت اُن میں یہ قابلیت باقی نہ رہی تھی کہ ان نئے حملوں کو دفع کرنے کے لیے نئے ہتھیار ایجاد کریں، مناظرہ کا طریقہ اس قدر نامہذب اور خراب ہو گیا تھا کہ کتابوں کے نام لٹھ، جوت، آرہ، درہ، قبقاب اور کنشاپ رکھے جاتے تھے، تہذیب الاخلاق نے جہاں تک کہ اُس سے ہو سکا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی، مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانے میں کچھ بکار آمد نہ تھا اُس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسب حال تھا جاری کیا، مناظرہ کے ناپسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے ہدایت کی تھی کہ "وَجَادِلھُمْ

بالّتی ھی احسن ۝

اُردو شاعری میں انقلاب اُردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جاتے تھے اُس نے بھی زیادہ تر اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی نئے نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھنچنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔

محمڈن کالج کا ہونا سب سے عمدہ نتیجہ جو اس پرچہ کے اجرا سے مترتب ہوا اور جس کے لیے درحقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ اُن کی جھجک نکلنی شروع ہوئی یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اس کے ملک میں عزت سے رہنا ناممکن ہے۔

محمڈن کالج کے نتائج سب سے بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سرسید سے بن آئی اور جس کا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر مگر درحقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے، وہ مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا جس کی تعداد قریب چھ کروڑ کے ہے تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لیے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ایسا ہی مضر تھا جیسا کہ ایک عضو رئیس

ہندوؤں میں تحریک کا پیدا ہونا کا ماؤف ہونا انسان کے تمام اعضائے رئیسہ کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے سوا صرف مدرسۃ العلوم کی ریس سے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش حد سے زیادہ پیدا ہو گیا اور اُنھوں نے قومی چندہ سے متعدد کالج کھول لیے۔ پھر خود مدرسۃ العلوم میں کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کی رو سے وہ مسلمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جائے۔ اس میں ابتدا سے آج تک ہندو، مسلمان، عیسائی، بنگالی، پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے رہے ہیں چنانچہ ۱۸۷۵ء سے اب تک جس قدر ہندو طالب علم محمڈن کالج اور اس کی لا کلاس سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کی تعداد یہ ہے گریجویٹ ۲۲ انڈر گریجویٹ ۴۷،

انٹرنیس ۰۰، ال ال بی ۰، وکالت ہائی کورٹ ۲، وکالت ضلع ۰، میزان ۱۹۲ اور متعدد ہندو گریجویٹ اسی کالج کے بیرسٹری یا سیول سروس میں ولایت جا کر کامیاب ہو چکے ہیں۔ پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے کہ محمڈن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اُس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں

مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے موانع

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر اُن سخت مخالفتوں کے جو مدرستہ العلوم قائم کرتے وقت پیش آئیں اور جن کا حال ہم آیندہ عنوان میں لکھیں گے، مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لئے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذرانی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے۔ برخلاف اس کے ۱۸۳۵ء میں جب کہ واقعۂ مذکورہ پر گیارہ برس گذر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دو بالا ہو گیا تھا، کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اس وجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جا کر رہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی اُن کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ جس طرح اسپین میں جا کر انھوں نے

اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی، اسی طرح ہندوستان میں اگر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع اُن میں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ، فارسی کی تکمیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے۔

پس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اُس سے زیادہ اُن کی طبیعی نامناسبت جو تیرہ سو برس سے اُن میں متوارث چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی اُن کو اجازت نہ دیتی تھی۔ مدارس انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبجکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جس میں اُن کے اسلاف نے اگلے زمانے میں بے انتہا ترقی کی تھی اب وہ اُس کو محض لغو جاننے لگے تھے۔ تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت سرسید نے محمڈن کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء یعنی اس وقت سے جبکہ کلکتہ مدراس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ۱۸۷۵ء یعنی اُس وقت تک کہ علیگڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُس وقت تک ہندو گریجوٹس کی تعداد ۱۶۴۱ تک پہنچ گئی تھی جن میں ۱۵۰۰ بی اے اور ۱۴۱ ایم اے تھے۔ نیز جو نفرت یا نامناسبت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس سے اس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح

۱۸۷۵ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی کیا حالت تھی

ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُن کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُن میں انگریزی تعلیم کے ساتھ دلبستگی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا؟ اور وہ کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوڑ میں شریک ہوں۔

علیگڑھ کالج نے ۱۹ سال میں کتنے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دی

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصہ میں علیگڑھ محمڈن کالج سے ظہور میں آئے اُنکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ علیگڑھ محمڈن اسکول ۱۸۷۵ء میں اور محمڈن کالج ۱۸۷۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتائج ۱۸۸۱ء سے نکلنے شروع ہوئے اُس وقت سے ۱۸۹۸ء تک کہ جس کو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گذری اُس نے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۱۲۶ گریجویٹ اور ۱۰۴ انڈر گریجویٹ پیدا کیے ہیں۔

جو طالب علم کہ محمڈن کالج کی لا کلاس میں لکچر سنتے ہیں وہ ۱۸۹۱ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اُس وقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۴ ال ال بی کے امتحان میں اور ۸ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اور اگر اُس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے، نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورۂ بالا نتائج خاص کر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔

محمڈن کالج کا اثر ملک کے دیگر حصوں پر

مگر محمڈن کالج کے فوائد کو صرف اُن نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیے جو خاص کر اُس کے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورۂ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اُس کا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال نے ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگال کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "۱۸۸۱ء میں جبکہ میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبۂ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ بچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اب نے واپس آنے پر مجھکو معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نوبت قریب چار لاکھ نوے ہزار کے پہنچ گئی ہے"، چونکہ ۱۸۸۱ء ہی سے زیادہ

محمڈن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے اور صوبۂ بنگال میں ظاہر ہوا کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے نہیں ہوئی اس لیے سوا اس کے کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمڈن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد کالج[1] اور بے شمار اسکول خاص مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستان میں کھول لیے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۸۰ء سے لیکر اس وقت تک کہ محمڈن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے اور اس کی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا ولولہ پیدا ہوا۔ یعنی ۱۸۷۸ء تک جو کہ بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۴۲ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۰ء تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۴۲ سے بڑھ کر ۲۲۹ تک پہنچ گئی اور ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں صرف الٰہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۰۵ مسلمان بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بدقسمتی سے وہ مشکلات جو گذشتہ دس برس سے طالب علموں کو پیش آ رہی ہیں اور جنھوں نے خاص کر مسلمانوں کی تعلیمی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا ہے پیش نہ آتیں تو اور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر نتیجے ظہور میں آتے۔

تعلیم کی ابتدائی مشکلات

اس کے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ قومی تعلیم کی چال ابتدا میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ کم عمر لڑکے جن سے قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے، باوجودیکہ ان کو حد سے زیادہ ترغیب اور استمالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں کوئی سامان ایسا نہیں دیکھتے جس سے ان کو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے یا اس کی طرف کافی توجہ ہو۔ نہ تو قومی سوسائٹی میں ان باتوں کا چرچا ہوتا ہے جن سے تعلیم کا شوق اور اس کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو، اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے

---

[1] جیسے لاہور امرت سر اور کراچی کے محمڈن کالج یا حیدرآباد اور بہاولپور کے اسٹیٹ کالج ۱۲

مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو۔ برخلاف اس کے جب قوم میں تعلیم کی بنیاد پڑجاتی ہے تو اُن کو گلی کوچہ اور گھر کے درو دیوار سے یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آیندہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۲ برس میں بڑھتا رہا ہے تو اُن کی ترقی کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جائے گی۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان میں پیدا ہؤا

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اس وقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر انگلستان گئے ہیں۔ اُس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرأت زیادہ تر اس اسکالرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے، اپنے ولایت میں ٹھیرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمت گار برابر پانچ برس اُن کے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اوروں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے، اس لیے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ اُن کو اپنی جائداد اور کتابیں بیچ کر اور رخصت کے زمانے کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اُس سے بہت بڑی زیرباری ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آیندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قائم کر دی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے اُنھوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانیوں کے اور خاصکر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جن کا نتیجہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جس میں کچھ ہندو یا مسلمان طالب علم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں ایک معتدبہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور سول سرونٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا، اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز ترقی

جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے لکچر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمڈن کالج کے ۶۰ طالب علم بیرسٹرایٹ لا ہیں اور ۱۲ ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے ہیں۔

اس حالت کا مقابلہ جب شمالی ہندوستان کی اُس حالت سے کیا جاتا ہے جبکہ سرسید نے پہلی ہی بار ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جبکہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یورپ جانے کو عیسائی ہوجانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے سفر کے بالکل عادی نہ تھے تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسید کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہے۔

باوجودیکہ ہندو ۱۸۱۷ء سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تنا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گذر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسید کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اُس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسید کے شور وغل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کہ انھوں نے ولایت میں جا کر تعلیم پائی، برادری سے خارج کر دیے گئے۔ لیکن چونکہ تعلیم نے انکو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے، اس لیے اُنھوں نے وہ تمام قیدیں جو ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمڈن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلا واسطہ کی ہے اُس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اُس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی؟ یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغۂ ملازمت میں اُن کو پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے؟ بلکہ ہمارے نزدیک اُس کا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمڈن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے؟

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گذشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور انھیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی جاتی ہیں اُن پر لحاظ کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اُسی خواب غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ اُنھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری دفتر اور محکمے اُن سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

ذمہ داری کے عہدے جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجہ کی تعلیم یا سعی سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے ملجاتے تھے، اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیارات سے کسی مستثنےٰ آدمی کو دیدے، گریجوئیٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے۔ کومپٹیشن کے قاعدے نے ایجوکیٹیڈ کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے اور جس قدر ملازمت کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مڈل پاس اور انٹرینس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور بمشکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۸۳ء میں جبکہ محمڈن کالج کی عمر دس برس سے زیادہ کی نہ تھی سرسید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں "جب

صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ اُن پر رشک کرتا تھا دفعتہ سنہ ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہوگئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بارآور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کملا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے۔ اب ہائیکورٹ میں جاکر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ اُن پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کرسکتے ہیں، نہ ملک کا، نہ قوم کا تمام عہدوں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہوگئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنا وکالت کے امتحان پر قائم ہوتی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر و پرسش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لائق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیدواران ڈپٹی کلکٹری کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔"

سرسید کا یہ مضمون ۱۸۸۰ء کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گذر چکا ہے اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا اب تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پایونیر نے جو ۱۸۷۱ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پنشن لیں گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آیندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دے گا" بعینہ وہی حال صوبہ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب و اودھ کا ہوجاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں عام اس سے کہ وہ محمڈن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے، یہ سب اسی شور و غل

کا نتیجہ ہے جو سرسید نے ولایت سے آکر محمڈن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اُس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

ملازمت میں محمڈن کالج کے طالب علموں کی تعداد

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجہ پر خیال کرنے کے بعد اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ خاصکر محمڈن کالج کے جن مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ہو اُن کی گنتی بتائی جائے تاہم اُن لوگوں کی اطلاع کے لیے جو انگریزی تعلیم یا محمڈن کالج کی علت غائی ملازمت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے محمڈن کالج کے اُن طالب علموں کی فہرست[1] جو بالفعل سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں مامور ہیں یا عنقریب مامور ہونے والے ہیں نواب محسن الملک کی ایک تحریر سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں:۔

امپیریل سروس	۱	جو پولیس اسکول الہ آباد میں		اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ نمک	
سول سروس	۲	تعلیم پا رہے ہیں	۵	و اسٹیشن ماسٹر وغیرہ	۱۰
بیرسٹر ایٹ لا	۳۱	جج	۲	ملازمان سررشتہ تعلیم	۳۱
سول سرجن	۱	منصف	۷	ملازمان[2] ریاستہائے	
جو ڈاکٹری کے لیے ولایت		انسپکٹر و سب انسپکٹر پولیس	۲۹	ہندوستانی	۴۹
میں تعلیم پا رہے ہیں	۴	نائب تحصیلدار	۱۲	وکلا	۳۷
جو ڈاکٹری کے لیے لاہور		اسسٹنٹ سب ڈپٹی		تحصیلدار	۲۰
تعلیم پا رہے ہیں	۵	ادیم ایجنٹ	۲	ملازمان فوج	۷
ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۱۱	سررشتہ دار و ہیڈ کلرک وغیرہ	۶۴	میزان	۳۳۴

محمڈن کالج کی خصوصیات

علیگڑھ محمڈن کالج کے جو نتائج اوپر بیان کیے گئے اگرچہ ان کو مسلمانوں

[1] اس فہرست میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں مگر ہندو خال خال ہیں باقی کل مسلمان ہیں صرف وکلا میں ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہے ۱۲
[2] منجملہ اُن کے ایک جج ہائیکورٹ اور ایک سکرٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حیدر آباد ہے ۱۲

کی اُس پست حالت کے لحاظ سے جو بیس بائیس برس پہلے تھی اور جو روز بروز زیادہ پست ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی رو سے اُس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جا سکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹیٹیوشن نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ اُن کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے ایک ہی سے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل درباروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اُس کو سرِ دست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈھنا لاحاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی ہمت اور اُس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں فیلو سسٹم جاری کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں جیسے انگلستان فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں

رہیں جن کو ہندوستان کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو محمڈن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جا سکتا ہے از انجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اُس میں ہر سال جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہرا ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دیجائے اور تا بمقدور غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم ستائیس ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذی مقدور مسلمانوں کو منتظمانِ کالج کی نسبت ایک سوّاں حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔

سامانِ تربیت لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامان تربیت ہے جس کو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محمڈن کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چاہتے ہیں کہ اس مطلب کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں کیونکہ سر سید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیتِ اولاد کا کام زیادہ تر تعلیم و تلقین نصیحت و پند، زجر و توبیخ یا زد و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتد بہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ مذکورۂ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ نقش برآب کی طرح جلد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے اہل یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اسی سوسائٹی کے میسر نہ ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آئے ہیں اس کو بالکل ان کے دلوں سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر ان عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں، ہم خاصکر ان چند خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی تعصبات، باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضیع اوقات، ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، ناتوانی وغیرہ وغیرہ اور کچھ شک نہیں کہ ان میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کی طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار اُن کی طبیعت ثانی بن جاتی ہیں۔

انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمڈن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم کیا گیا ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اُس کو طلبہ کی تربیت میں کیا دخل ہے بیان کریں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح تعلیم کے نتیجے اعداد کے ذریعہ سے دکھائے جا سکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج نہیں دکھائے جا سکتے۔ نیز تعلیم کا اثر دفعۃً اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت کا اثر نامعلوم

اور بتدریج ہوتا ہی جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں اُن کو نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہوس کو قائم ہوئے کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا اس لیے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہی کہ محمڈن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ وہ کہاں تک اُن کی حالت کے مناسب ہی؟ اور اُس سے آیندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؟ نہ یہ کہ اس طریقۂ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؟

قومیت کا بیان | سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آیندہ نسلوں میں اتفاق و یکجہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ وعظ و نصیحت سے یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے یا اس مضمون پر زوردار اور موثر نظمیں شائع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا ایسی ہی بات ہے جیسے حُبّ کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ ان میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہی کہ اُن کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشوونما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں، مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں، ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں گیند کھیل کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح اُن کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضت جسمانی | ریاضت جسمانی جس کا سامان محمڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اُچاٹ ہو جاتی ہی

اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں اُن کے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر منفک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن صرف اُن کی تقلید ہی سے ریاضت جسمانی کو محمڈن کالج میں ضروری نہیں ٹھیرایا گیا بلکہ اس لیے اُس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ اُن میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں۔ وہ برخلاف اُن تمام کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی نذر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام اُمنگیں اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑیں تو لکھنے پڑھنے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں۔

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماع ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی وہ اُن فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرت مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی، چڑچڑے، نازک مزاج اور بددماغ نہ بن جائیں۔ اگر اُن کو یورپین افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر اُن کا ساتھ دینے سے عاجز اور اُن کی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں۔ اگر اُن کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ اُن میں ایسی مستعدی پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی، جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں "ہندی بطّال"[1] ایک مثال ہو گئی ہے اُن کو وبال معلوم ہونے لگے وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ جھجکتے ہیں، وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انھیں اغراض کے لیے محمڈن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک

[1] عربی میں بطّال نکمّے اور بیکار آدمی کو کہتے ہیں۔

کہ اُس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہدِ حکومت میں جب محمڈن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سنا تو اُس کا جواب دیتے وقت انھوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی" ایک حکیم کا قول ہے کہ "قومی قوت صحت پر منحصر ہے" اور چونکہ صحت بغیر ریاضت جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوت ریاضت جسمانی پر منحصر ہے۔

خصوصاً جس قوم کو خدا نے ہم پر حکمراں کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب کے ساتھ ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں اُن کے برابر کوئی قوم روئے زمین پر ریاضت جسمانی کی فریفتہ نہیں۔ اُن کو شیر خوارگی کے زمانے سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے۔ علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا بائیسکل پر یا پیادہ پا سفر کرتے ہیں، کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اُترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفرنامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ "مخاطر و مہالک میں گھس جانا، اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ ثبات اور استقلال سے اُن کا مقابلہ کرنا دُنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے" ایسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ اُنھیں کی برابر بلکہ اُن سے زیادہ جفاکش محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا کیڑا بننے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والنٹیر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دیے جائیں، جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں ایجوکیٹڈ سپاہی نہ بنائیں ہرگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے اور اسی لیے محمڈن کالج کے بانیوں نے ریاضت جسمانی کو تعلیم کا جزو غیر منفک قرار دیا ہے۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ فٹ بال اور جمناسٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے اُن کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں میں بمبئی اور پارسی ٹیم اور پٹیالہ ٹیم پر نمایاں فتحیں حاصل کی تھیں اُن میں کئی گریجویٹ تھے اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے ۔

وقت کا خیال | ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کے لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ بورڈنگ ہؤس میں رہنے سے اُن کو ضبطِ اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تضیعِ اوقات کرنے والی مشہور ہے، حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان نوکریاں کے خواستگار ہیں اُس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے اور فی الحقیقۃ جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی کبھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اُس کی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت تک اُس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے محمڈن کالج کے بورڈنگ ہؤس میں جو صغیر سن لڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں اُن کی ابتدا ایسی ڈالی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، یا گیند بلا کھیلنا، مارننگ اسکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا اور سونا یا سو کر اٹھنا غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک جب اُن کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گذرے گی تو امید نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو چھوڑ سکیں۔ اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہے، بخلاف بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو اُن کو بچوں کی

برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو ملاتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں اُن کا زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے محمڈن کالج میں بچپن سے رہنا بہ نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

اطاعت کی مشق | شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاصکر محکوم قوم کا زیور ہے اُس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہوس میں موجود ہیں غالباً ہمارا ہندوستان کے کسی انسٹیٹیوشن میں موجود نہیں ہیں، علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور نارمنگ اسکول اور نائٹ اسکول کے جہاں طالب علموں کو برابر پروفیسروں اور ماسٹروں کی آرڈر میں رہنا ضرور ہے وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ہیڈ یا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں جب تک وہ بورڈنگ ہوس میں ہیں پراکٹر کے محکوم ہیں، جب تک ڈائننگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورپین پروفیسر ان کا نگراں رہتا ہے۔ اسی طرح فیلڈ میں پرووسٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریذیڈنٹ یا اُس کا قائم مقام یعنی سکریٹری اور قواعد کے وقت ڈرل ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ ماسٹر، بیماری کی حالت میں ڈاکٹر، اور مسجد میں ایک دیندار عالم اُن کی روک ٹوک کے لیے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا اُن کو ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط کے ساتھ بسر ہوگی تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا ہو جائے گی؟ اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ ہردل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے؟

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اُس کی عادت اولاد کو ابتدائے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے الیل بچھڑے کو سدھا کر اور باگوں پر صاف کر کے سواری کے قابل بنانا جس طرح اوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا، اکثر انگریز افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ایسے فرماں بردار نہیں ہوتے جیسے ہندو اور اسی لیے یورپین افسر اُن کی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع

یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جن کا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے اُن کو سب سے زیادہ اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اُن سے بڑھ کر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمڈن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اُن کی تمام آئندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

قومی لباس کا خیال | اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا، حالانکہ وہ ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتہ غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اُلٹے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے پارسی، مرہٹے، بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغایرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی اُن کی مجلسیں، اُن کے میلے اور اُن کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گوبارے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ما بہ الامتیاز پیدا کریں، اور چونکہ بقول اُن کے آج ہندوستان

میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کرکے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لیے اُس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے بزرگوں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کرلیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوشنما ہونے کے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق ہے۔ اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جاکر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُن کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کرلیتے ہیں اور اس طرح محمڈن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جن کے ایسے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اس لیے محمڈن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج کی سوسائٹیاں | نیز بورڈروں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں از انجملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے روبرو انگریزی یا اردو میں معارضانہ بحث کرتے ہیں مگر کوئی بات آداب مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لاسکتے۔ جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں اُن کو انعام دیئے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونے کے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مجادلہ کا ناپسندیدہ

طریقہ عموماً جاری ہو اُس کی اصلاح کی آئی میں بنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنے کے لیے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر رائے قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بورڈنگ ہوس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کرکے کالج اور طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے اُن کے دل میں کالج کے ساتھ ہمدردی اور اُس کی امداد کے لیے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہو۔

ایک اور سوسائٹی برادرہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں اُن تمام طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں نوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چندہ محض کالج کی امداد کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے سوا دو اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں، دوسری لجنۃ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی حال ہی میں سائنس پر لکچر دینے اور اُس کے تجربے دکھانے کے لیے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گو ابھی ابتدائی حالت میں ہو مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اس لیے اُس کے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے۔

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لیے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کے لیے رائڈنگ اسکول ہے۔ اگرچہ رائڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم ہمتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضت جسمانی کے لیے قائم ہیں اُن میں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی یورپین اور ہندوستانی ٹیموں میں، جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے، توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہو۔

مذہبی تعلیم مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمڈن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اُس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے اور منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، اُنھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں؛ یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ باایں ہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے ہندوستان کے کسی کالج میں اُس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے اُن کے مقابلہ میں اس کالج کو مشکل سے ایک خاکا یا ایک ادھورا نمونہ اُن کالجوں کا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمڈن کالج بیس بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے مشہور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اسی طرح آہستہ آہستہ اُن کی حالت ترقی کرتی گئی پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے اگر انھیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس میں وہ کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔

بیشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خود رائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا اصل غلط نہ تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دنوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اُس حد تک پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اور ایک ریفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی ہو اُس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

یوروپین اسٹاف | ایک اور خصوصیت اس کالج کی یوروپین اسٹاف ہے جس کو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ اُن کی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طرز تعلیم کے لحاظ سے بھی یوروپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر میسر بھی آجائیں تو اُن کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا ہرگز نہیں پڑ سکتا جیسا انگریز پروفیسروں کا پڑ سکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال، وقت کی قدر، قواعد حفظ صحت کی پابندی، سیلف ہیلپ، مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت، یہ تمام خصلتیں یوروپ میں بھی انگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گنے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کالج کا نظم و نسق اور افسرانہ رعب و داب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے ہندوستانی معلموں سے اُس کی ہرگز توقع نہیں کیجا سکتی۔ اسی لیے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یوروپین ہونا چاہیے اور جہانتک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یوروپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جس کی علمی اور اخلاقی فضیلت پر اُس کے استادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچ دے کر بلایا جائے۔ چنانچہ اب تک چار

چار پانچ یا پانچ یوروپین افسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہے کہ عندالضرورۃ اُن کی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو بیش قرار تنخواہیں یوروپین عہدہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یوروپین اسٹاف نے عام طور پر اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے اُن کو کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی، مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمڈن کالج کو گویا اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں، وہ اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں، اُن کی مجلسوں میں، اور اُن کے مباحثوں میں خود بھی شریک ہوتے ہیں اور اسٹیشن کے یوروپین افسروں اور اُن کی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں اور اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو، اُن کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود اُن کا برتاؤ جو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت اُن کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے اُن کو غیرت دلاتے ہیں اور اُن کی غفلت کے نتائج سے اُن کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیماروں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اُس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اُس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اُس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں۔ وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں، مسجد کی غیر حاضری پر اُن کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی اُن کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور اُن کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔

ایک بڑا بدیہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمڈن کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر آف فلاسفی جو کالج کی بدقسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کر کے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں، اُن کی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو اُن کا لکچر سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسز آرنلڈ کو ان کی جدائی کا جس قدر رنج اور قلق ہوا تھا اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان سے پہلے جب مسٹر والس پروفیسر اور مسٹر موریسن ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اس وقت بھی تمام کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے جانے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈٹمن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مرجانے پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دلسوز اور مسلمانوں کے ہمدرد پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں لیکن بہر حال یوروپین اسٹاف کا اس کالج میں ہونا خاصکر مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے، بلکہ اُس وقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی، ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بعینہٖ ایک نوجوان بیوہ کا سا رہا ہے کہ کیسی ہی عفیفہ اور پاک دامن ہو مگر بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رُو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں، اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بیگانگی پائی جاتی ہے جیسی کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا انسٹیٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہوں اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں، جب تک کہ اُس میں متعدد یوروپین افسر اُن کے نگران اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے والے موجود نہ ہوں حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔

انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ [illegible] ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین افسر اور حکام عموماً اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں، دور دور سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لیے یہاں بھیجتے ہیں، ہر صوبہ میں یہاں کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لیے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آ کر دیکھتے ہیں، چار وائسرائے اور چھ سات لفٹنٹ گورنر اب تک یہاں آ چکے ہیں، لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ اسکالرشپوں کے لیے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور اُن کے سوا کئی والیسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں نے اس میں چندہ یا تمغے دیے ہیں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور مربیانہ سرپرستی حضور لارڈ ایلگن اور آنریبل مسٹر لاٹوش اور خاصکر سر انٹونی مکڈانل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے اُس کی شکر گذاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور منتظمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امتیازات زیادہ تر یوروپین اسٹاف اور خاصکر مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اس انسٹیٹیوشن کو حاصل ہوئے ہیں۔ انھیں وجوہات سے سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یوروپین اسٹاف کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی، جیسا کہ وہ خود اُن کے ساتھ رکھتے تھے، توقع نہ ہو۔

کالج کی نسبت مدبران سلطنت کی رائیں

جو رائیں اور خیالات محمڈن کالج یا اُس کے طلبہ اور اس کے بانی کی نسبت مدبرانِ سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کیے ہیں ان میں سے کچھ کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

سرجان اسٹریچی

[illegible] میں سرجان اسٹریچی نے اُس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان سے

جاتے وقت اُن کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ "سب سے بڑا اور اخیر کام جس میں اُنھوں نے یعنی سید احمد خاں نے اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے وہ یہی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور اُن کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان زیادہ تر اتحاد اور ہمدردی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے آئندہ زمانہ میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں گے لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی تواریخ کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں"

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب "انڈیا" میں اول ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا فقرہ جو محمڈن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ "بعض اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹیٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے آغاز سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علیگڑھ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی۔ اُن لوگوں کی جنھوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اُس بدرقہ کی جو سرکار کو تعلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہ ہوگی"۔ اس کے بعد وہ اپنی کتاب "انڈیا" میں اہل انگلستان سے محمڈن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اُنھیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خاں کے کالج کے واسطے بھیجنی چاہیے، اُن کو اس سے زیادہ طمانیت بخش موقع نیکی کرنے کا نہیں ملے گا"

ڈاکٹر ہنٹر | ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے اضلاع شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمڈن کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ جو ایجوکیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں کی اور کالج کی نسبت کہا "صاحبو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں، چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کی گئی ہے اس کمیشن کا پہلا اجلاس

جو اضلاع شمال مغرب میں ہونا چاہیے تھا علیگڑھ میں تجویز ہوا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اُس سیلف ہیلپ کی عظیم الشان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائے گا اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہیلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی" پھر کہا کہ " یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردہ پر ہوا ہوا اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے بیس برس کی پُرصبر اور پُر استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے" پھر کہا کہ " پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اُس کے اختیار کیے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اُس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پرضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اُس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا۔"

سر الفریڈ لائل | سر الفریڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ " اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے، کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو"

سر آکلنڈ کالون | سر آکلنڈ کالون نے محمڈن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ " جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علیگڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اُس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو

انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اُن کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں۔"

مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ | مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بنی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور مسکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں لکچر دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لیے آئے تھے، اُنھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ پکچرسک انڈیا لکھی ہے جس کے ایک باب میں علیگڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کیے ہیں اُن میں سے ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج دوسرے کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش پھیلانے والا ہے۔ اسی فیلنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے، نتیجہ ہے کہ اُس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے" دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول تو اس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سُن کر طالب علم اس وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدہ کے موافق عبادت کرنے کے لیے مسجد میں جمع ہوجاتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلۂ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے امید کیجاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگاویں گے اور اُس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اس کو قبول کریں۔ دوسرا اصول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے، یہ ہے کہ اُس میں بخلاف سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کیجاتی، بلکہ وہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے

نمونہ پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت
بخش کالج لائف سے حظ اٹھاتے ہیں کسی ملک میں ایک ایسے انسٹیٹیوشن کا پایا جانا مشکل ہے جو اس
کالج کی بہ نسبت زیادہ تر زبردست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹیٹیوشن
کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں
ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسا کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دیے
ہیں۔" پھر کرکٹ کلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام انڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے
گوئے سبقت لیجاتی ہے اور اسٹیشن کی نہایت عمدہ الیونوں کا مقابلہ کرتی ہے" پھر یونین کلب
وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ڈیبیٹنگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے
لڑکوں کو جلسہ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ کالج کی
دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ، فٹ بال اور اور جسمانی ورزشوں
کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کے مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لیے مدد ملتی ہے اور
اُن کی مختلف لیاقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معلموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی اختلاف سے
پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علیگڑھ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلب
اور دلی میل جول دیکھا جاتا ہے ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے
انگریز جنٹلمین اور لیڈیاں کالج کے طالب علموں کو لنچ پر دعوت کرتے ہیں اور کالج کے ہال میں اُن
کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح پر محبت کی فیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی
ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو جائے تو وہ ہندوستان کے باشندوں اور انگریزی حکومت دونوں کے
حق میں بیشمار فائدوں کا باعث ہوگی۔ ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے اکثر اوقات پُر جوش گرمی
کے ساتھ اپنی یہ دلی آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے
کے اتفاق سے کام کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اُس نے کالج کے اُس نشان کی طرف اشارہ
کیا ہے جس میں ہلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔"

سر انٹونی مکڈانل

سر انٹونی مکڈانل نے جو ۱۸۹۸ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب دیا تھا اُس میں اُنھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا "ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات لڑائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچا۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی رونق مرورِ زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہوسکتی۔" پھر فرمایا کہ "میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں، جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اسی طرح پر میں اس انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسا رکھتا ہو اور فخریہ طور پر آزاد ہو اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی واجبی طور پر قدر کرتا ہو۔" پھر اسپیچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے "اس بات کی امید کرنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ یہ کالج ترقی پاکر آیندہ مسلمانوں کی بڑی درسگاہ ہوجائے گا اور یہ مقام مشرق کا قرطبہ ہوجائیگا۔"

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۸۹۷ء میں، جبکہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت اینگلو انڈین اخبارات حکمراں گروہ میں بدگمانی پھیلا رہے تھے، محمڈن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جو ایڈریس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کی گئی اُس کے جواب میں اُنھوں نے اُس وقت جبکہ کالج کے تمام طالب علم اُن کے سامنے حاضر تھے یہ فرمایا کہ "صاحبو کوئی وقت ایسا نہیں ہے جبکہ اس قسم کا مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہوسکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اور اس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف اُن قوموں کے ساتھ جو تمھارے ہم مذہب ہیں، علانیہ لڑنے پر مجبور ہوئی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے جنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُس کی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز رو بہ ترقی ہے ... صاحبو ان قابلِ افسوس ہنگاموں میں ہم نے پھر اُس بات کو دیکھا ہے جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں، یعنی حضورِ ملکہ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور بہادری کو اور میں

اس جگہ پر ایک زیادہ تر اس موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم ہونے سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر بر امن صورتوں میں خیر خواہی اور وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہے جیسا کہ میدان جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔"

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مدبرانِ سلطنت انگلشیہ اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن کی عمدگی پر ان لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے سید احمد خاں کی زندگی کا سب سے زیادہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر ابتک کچھ قدر نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبار "ٹائمز آف لندن" نے گذشتہ اپریل میں اسی کارنامہ پر سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پروفٹ کہا جائے تو بجا ہے۔" اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتدائی مشکلات اس مرحوم کی جانفشانی اور استقلال سے تقریباً بالکل حل ہو گئی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرد ہو گیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نوبت پون لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے، عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گو ابھی اُن کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے، یورپین اور نیٹو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان بہم پہنچ گیا ہے۔ یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، بورڈنگ ہوس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لیے قائم ہو گیا ہے مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظمان کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ نے اُس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اُس کا تھامنا اُس کی اصلاح کرنا اور اُس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے۔ اگرچہ سرسید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دگرگوں ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں نے بالکل خلاف توقع

اور خلاف امید کالج کی طرف توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک ظریف کے اگر سرسید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی مرجاتے

ترقی تعلیم کی دیگر تدبیریں سرسید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمڈن کالج قائم کرنے اور اُس میں تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپیچوں میں برابر زور دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کے حق میں غیر مفید خیال کرتے تھے اور جب سے ملک میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے اُن کو سخت اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جو مرکز تعلیم کے وسائل مہیا کیے گئے ہیں کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہو جائیں اور سر منڈاتے ہی اولے نہ پڑ جائیں، اس لیے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی اُن کو گورنمنٹ کے تیور ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے اُنھوں نے فوراً اُس کی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلیری اور بے باکی سے اس پالسی کی تغلیط کی ۔ ۱۸۸۲ء میں اُنھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب دل کھول کر اعتراض کیے اس کے سوا ہمیشہ بذریعہ تحریر اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص دور کرنے پر زور دیتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن کی حمایت اظاہر کرتے رہے۔ ہائی ایجوکیشن کے متعلق اُنھوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی خواہ اُس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں، لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ اُنھوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہو گی۔ اس مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیچیں کیں اُن سے مشرقی علوم کی ترغیب و تحریص کی بو آتی تھی۔ اس کے بعد جو ایڈریس اہل پنجاب نے لارڈ رپن کی حضور میں گذرانے اور جو جواب حضور ممدوح

غمانِ پر دے اُن سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ہزاکسلنسی کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ "ترقی و اشاعت زبانہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت ہی کار احسن ہے۔ . . . اور جہاں میری محدود واقفیت معاملات ہندوستان میں ہے، میں اُن خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین سہولیت سے ہو سکتی ہے" اور جس ایڈریس کے جواب میں ہزاکسلنسی نے یہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ساڑھے تین لاکھ روپیہ جو سرمایۂ یونیورسٹی کالج ہے والیانِ ریاستہا و دیگر رؤسائے پنجاب نے دراصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا سینٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسل سے ترقی دینا تعلیم کی ضروریات کو ملک کے حسبِ حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سینٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی یہی مقصد ہے"۔

جب یہ ایڈریس اور اُس کا جواب شایع ہوا اور سرسید کی نظر سے گذرا تو اُن کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور جیسا کہ اُن کی طرزِ تحریر سے پایا جاتا ہے، عنانِ صبر اُن کے ہاتھ سے جاتی رہی، اُنھوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شایع کیے جن کا تمام پنجاب میں غُل پڑ گیا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو ایجوکیٹڈ شامل تھے تینوں آرٹکلوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں اُن کو عام طور پر شایع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا ورنیکلر یا اورنیٹل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے اُنھوں نے سرسید کے آرٹکلوں کا انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں جواب لکھ کر مشتہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق "قَدْ سَبَقَ السَّیْفُ الْعَذْلَ"[1] سرسید کی تحریریں اپنا کام

[1] یعنی تلوار چل چکی اب ملامت بے فائدہ ہے۔

کر چکی تھیں اور اس لیے اب اُن کا جواب لکھنا اور اُن کی تردید چھاپنی بے سود تھی۔ اگرچہ یہ تینوں آرٹکل بہت لمبے ہیں اور یہاں اُن کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی علمی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اُس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُن تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اس لیے ہم تینوں آرٹکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں :-

پہلے آرٹکل کو جس کا عنوان "مشرقی علوم و فنون" ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں "ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہے، ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو اس وقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا میں ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور اُن کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا اور اُس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ تر بکار آمد ہے"

اس کے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداری سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر اُن میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ مکالے کے اصرار سے اہل ہند کو یوروپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا) بیان کیے ہیں پھر انھوں نے دینیات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی، خوب قلعی کھولی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اُس کو بہشت نصیب کرے کہ اُس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا۔ کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی۔

ہے؟ ایڈریس کے ساتھ (جو لارڈ رپن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دینا ناشی اُسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے ناواقف رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت ایسے امر کی جو فی الحقیقہ کچھ وقعت نہیں رکھتا، وقعت نہیں بڑھا سکتی۔ چند ناعاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے، مگر دور اندیش آدمی ان تمام باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس و مایوسی سے گورنمنٹ کی اور اُن یورپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک ہیں، دیکھتے ہیں۔"

ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دور اندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ نہایت بدخیال اُن کے دل پیدا ہوتا ہے۔ چند سال گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو اعلیٰ تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اُس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لیے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لیے تکلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اُس کا شکر گذار نہ تھا اس لیے کہ اُس کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر"

"کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ بدخیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرنے لگے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالسی بدل دی ہے اور درحقیقت اُس کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انہیں کے فائدہ کے لیے تعلیم دینا مقصود ہے۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض

مدبرانِ سلطنت کی پالسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ اُن کو (یعنی ہندوستانیوں کو) ابتک یقین نہیں ہو کہ یہ پالسی درحقیقت مستحکم ہو گئی ہے اور اُس پر عمل کرنا فی الواقع قرار پاچکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں جیسے کہ حضور عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس کے قواعد قرار پائے[1] اور جیسے کہ جناب ممدوح نے بعض اسپیچوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے کی درخواست کے وقت پیش آیا، دور اندیش ہندوستانیوں کو نہایت تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالسی مستحکم ہو گئی ہو اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی کیجاتی ہے جس کو ہمارے محسن لارڈ میکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست ہاتھوں سے اٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روز بروز ترقی نہ ہوتی ہو۔ ہمارا دلی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال اُن ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ درحقیقت قدر و غور کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری بدن زر و جواہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت دیگر اسباب پر مبنی ہیں، نہ واقعی واقعات پر، دھوکے میں نہ آوے۔"

دوسرے آرٹکل میں جس کا عنوان "ورنیکلر یعنی ہماری زبان" ہے اُنھوں نے اول اُن مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی

---

[1] چونکہ انڈین سول سروس کے قواعد میں امیدواروں کے لیے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی اس لیے یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن کو موقوف کرنا چاہتی ہے۔"

سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسر عہدہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنھوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کا سا تمدن، اُن کا سا اسلوب و لہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم، دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کریں گے بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمراں قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔"

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ ہو تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتحمندوں نے کاملیت حاصل کی ہے، سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کہے اور پولٹکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتحمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فتحمند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتحمند قوم ہم سے دوستانہ برتاؤ کر سکے۔ پھر علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی؟ اور ہم کو کونسی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے اب تک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی ہو کر اور مردہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر پیدا کر کے

ہم کو پہنچا دے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سد راہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائے گا تو ملک کے لیے، قوم کے لیے، ملکی اور قومی ترقی کے لیے آفت عظیم ہوگا۔ ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرایہ میں اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لیے۔"

"گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ، گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے۔ بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجنیری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے، جانے دو مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستانیوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؟ کیا ہماری پرانی شائستگی کو پھر ہمارے لیے مہیا کرنے والی تجویز؟ معمولی عہدے بھی، جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے، بغیر انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے، پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؟ یونیورسٹی کالج لاہور۔ جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں، ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں ہم بنئے کی سی دوکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری

تجارت کی محمڈن اینڈ ہندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، بروسلز میں، سینٹ پیٹرسبرگ میں، برلن میں، وائنا میں، قسطنطنیہ میں، پیکن میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دے گا؟ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے جو لوگ دور اندیش ہیں وہ کبھی ایسی پالیسی کو پسند نہ کریں گے اور اُس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے، بلکہ اپنے حق میں، ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مضر سمجھیں گے۔"

اس کے بعد اُن اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے، اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور انھوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور نامناسب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے، مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چیں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدر دان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو بالغ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجے پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔"

"ہمارے لیے سیدھا رستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں، جب اُس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں

اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب وتعلیم یافتہ جنٹلمین اُس کے اصلی وحقیقی معنوں میں بنائیں اور جو فیض تعلیم وتربیت وتہذیب ہم نے اُن مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہو اُس کو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلادیں بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں، اِدھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت وتعصب سے مقابلہ کرنا ہے اور اُدھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل اور پولٹکل حالت کی ترقی کو اپنی طبیعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں، ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن جنٹلمین کیسے اخلاق، یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیے اور جو تکالیف اور مشکلات ہم کو پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہییں۔ مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ ریفارمر (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور ہونے دیگا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی وخفگی اُس کو روک نہیں سکے گی لیکن بے شک یہ تنگدلی کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح ومفتوح میں ہمدردی ومحبت کو توڑنے والے ہیں۔"

یہ دو آرٹکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاصکر پنجاب یونیورسٹی پر حملہ کیا ہے جب یونیورسٹی کے حامیوں کو شاق گذرے اور اُن کے برخلاف پنجاب سے بعض مضامین شایع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹکل جس کا عنوان "ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم" تھا اور لکھا جس سے صرف یہ جتلانا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا روئے سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیاں یہی اصول نہ اختیار کرلیں۔ اس آرٹکل کو اُنھوں نے اس طرح شروع کیا ہے "ہمارے دو آرٹکلوں نے ہمارے پنجاب کے دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کردیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان آرٹکلوں سے ہم کو بالتخصیص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن سے اس کی بنیاد حسد پر قائم

کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے اگر یہ کینہ خصلت ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف الرائے ہیں اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو اور ایسے وسیع ملک کو جس میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس سے ملک کو برخلاف ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے والا ہے تو چشم ما روشن۔ ہماری عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور ہماری رائے غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقت ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اس کو ہونے دو، اس سے مخالفت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، خود اس میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائے گی۔"

اس کے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ "بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں ان پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے کمر سے پہنے منکنا اور شیوا لگھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے، کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں[1] کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو دی ہو، ہم کو اس کا حال معلوم نہیں، مگر آج تک (ہندوستان میں) اس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں ان لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی روٹی پر گزران کر کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر ان میں پیدا کیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے، ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو . . . . بجز دیسی اور

---

[1] جو آرٹیکل سرسید کے خلاف لاہور سے نکلے تھے اُن میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج میں بلخ و بدخشاں کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

حالی پر پوشیدہ ہے کہ خطاب مرحمت فرمانے میں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو، قوم کو، اُس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اُس کے اخلاق کو، اُس کی روشن ضمیری کو اور اُس کی وسعتِ خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے اس اعتراض کا کہ سائنٹفک سوسائٹی جو انھوں نے علیگڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعہ سے ملک میں شائع کیے جائیں، جواب دیا ہے اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اُس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ "اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو جو سچے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا، مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے۔"

پھر آرٹیکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ "ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کسی اصول پر قائم ہو، صحیح پر یا غلط پر، ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں بلاشبہ ہم کو اُس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی بُرائی نفع نقصان سپرد کیا ہے، مُردہ مشرقی علوم و مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں بلکہ بلحاظ حب قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے، ملک کے لیے، بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ اُن کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہیے اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ کی حکمت کو ترقی دینا اُس کا مقصد ہو۔"

الٰہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت پھر ۱۸۸۷ء میں جب کہ الٰہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر جس پر پنجاب

یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا، قائم ہونے لگی اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اُسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اُن کے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا "افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن اُس کو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی کی ہو گی۔ شاید اُس کی صورت میں کچھ تبدیلی ہو مگر اُس کی پالسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی، یعنی علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں کولھو کے گرد پھرائے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بے شک ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے . . . . . ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی، وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لیے بمنزلہ ایک مادر مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔"

اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور آیا فی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم کی آڑ میں انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جو خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے

تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل گئے تھے اور جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد تھے، آجتک علانیہ طور پر اُن کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونوں یونیورسٹیوں میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سدراہ ہو بے شک پنجاب یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح اورنٹیل کالج کے طلبہ کو بی او ایل اور ایم او ایل یا بالغ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سرسید نے کہا تھا کہ "اس میں ناکامی کا بیج ہے اس لیے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائے گی" اورنٹیل کالج روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ دیا جائے

سرسید نے جو مذکورۂ بالا آرٹیکلوں میں مشرقی علوم (یعنی قدیم منطق فلسفہ طبیعات اور ہیئت وغیرہ جن کا درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے جاری ہے) اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دیسی زبانوں میں مغربی علوم کے شائع کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اس کے بالکل مخالف تھے مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود اپنے پہلے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ "بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی کالج۔ قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے، پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگویج ماڈرن لینگویج کی زیور ہیں" اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیلی و دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے" اس کے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزولیوشن پیش کیا تھا کہ "علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ اُن کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے" پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اس سے اُن کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لینگویج کے ذریعہ سے ہونی چاہیے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لینگویج بطور سکنڈ لینگویج کے برائے

تمام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعۂ دیسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت مذکورۂ بالا آرٹیکلوں کے سوا اُن کی بیشمار تحریریں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹیکل ہے جو علیگڑھ گزٹ مورخہ ۱۹؍ فروری ۱۸۹۸ء میں اُن کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے جو ابتک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو یہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لیے جب کوئی ایسی اسپیچ اُن کی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اُس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر اُنھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزولیوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزولیوشن کی تائید میں ایک طول طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی روئداد میں مندرج ہے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹیکنیکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپشنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم کو اُس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اُس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا لیکن اگر موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کیجائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم میں مخل ہو تو ہم کو علانیہ یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سرسید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن یا بخیال تکمیل تجاویز گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سرسید کے نزدیک علانیہ لٹریری تعلیم کو روکنے والے تھے اور انہیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغربی نے ایک رزولیوشن بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن مشتہر کیا تھا اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سرسید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہ ہوں یہ رزولیوشن کانفرنس کے جلسہ

نام ہیں جن میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اُس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولیوشن جس کی تائید مولوی حشمت اللہ ایم اے اور مسٹر تھیوڈور بک نے بڑے زور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الٰہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

سرسید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے انھیں تدبیروں اور کوششوں پر بس نہیں کی جو اُن کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اُس کو قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قائم کرنا

علاقہ رکھتے ہیں سرسید کا نعم البدل ثابت ہوگی۔ اُنھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے اس قومی انجمن کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام مرحلے جو ابتدأ ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے کر دیے اور آیندہ نسلوں کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ کس طرح اُس کو چلائیں اور کیونکر اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ جو کام قوم کے کرنے کے تھے ایک جم غفیر کے صلاح و مشورے سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے کے باوقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر لیاقت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی روکھی پھیکی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا، چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پانسو اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کر کے ایسے چاؤ اور امنگ کے ساتھ، جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیر یا شالامار کے میلے میں دوڑ دوڑ کے آتے ہیں، اس علمی مجمع میں آآ کر شریک ہونے لگے۔

سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس

ایک اور تدبیر ترقی تعلیم کی جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہ راست پوری نہ ہو سکی، سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جن

کو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لیے تیار کرنا چاہیں اُن کو محمڈن کالج میں ایک خاص طریقہ پر ابتدائی تعلیم دی جائے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں اُن کو چندہ کے ذریعہ سے مدد دی جائے۔ یہ تجویز بھی اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیشنڈ کلاس کے ہندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جبکہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا سفر کیا تو لاہور کے مقام میں برہم سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ "اس ایسوسی ایشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں" اگرچہ اور طریقوں سے ہندو مسلمانوں کے لیے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

کونسل کی ممبری | کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اُس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اُس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے اور آپ جو اُس زمانہ میں جبکہ آپ مجلس مذکور (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے، بے طرفدارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اُس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہموطنوں کی طرف سے دلی احسانمندی کے مستحق ہیں" اسی طرح برہم سماج اور آریہ سماج کے ایک معزز ڈپوٹیشن نے جیسا کہ سفرنامہ پنجاب میں مذکور ہے سرسید کی ممبری کونسل کی نسبت۔۔۔ الفاظ کہے تھے کہ "ہم ممبران آریا سماج اور برہم سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے۔۔۔۔ آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی

کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہیں . . . . ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے لیے خیر خواہ ثابت ہوئے . . . . لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ[1] بل اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔"

---

[1] البرٹ بل سے مراد وہ مشہور مسودۂ قانون ہے جو لارڈ رپن کے عہد میں وائسرےگل کونسل کے لیگل ممبر مسٹر البرٹ نے ۱۸۸۳ء میں اجلاس کونسل پیش کیا تھا اور اسی لیے یہ مسودہ البرٹ بل کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس مسودہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی مثل یوروپین مجسٹریٹوں کے یوروپین اور یوریشین باشندگان ہند کے فوجداری مقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ اس مسودہ کو یوروپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لیے جس قدر کہ لیجسلیٹو کونسل میں اور اخباروں میں اس مسودہ پر بحث اور نکتہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودۂ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سرسید نے اور آنریبل کرسٹوداس پال نے اس مسودہ کی بڑے زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد مثل اکثر یوروپین ممبروں کے اس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں ان پر سخت لتاڑ ہوئی تھی۔ جو اسپیچ سرسید نے اس مسودہ کی تائید میں کی تھی اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا "مائی لارڈ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یوروپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اس کی نسبت بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانون مجوزہ سے ان کی آزادی خطرہ کی حالت میں ہے . . . . اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو رائیں یوروپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کی ہیں ان پر بخوبی غور کیا جائے لیکن مائی لارڈ! میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودۂ قانون کے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اس پر میں دلی افسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک کرنے والوں نے میرے ہموطنوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ کلمات استعمال کیے ہیں . . . مائی لارڈ! اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں میرے ہموطن ان شخصوں کی پیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعانِ قانون کی غور کے واسطے دلیل اور دعوتوں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام طور پر مجمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے . . . میرے نزدیک جو مخالفت اس مسودۂ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے اور جو خفیف تبدیلی قانون مروجہ میں اس بل کی رو سے کرنی تجویز کی گئی ہے اس کے سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی ہے۔ میں کانسٹیٹیوشنل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا

جو کام خاصکر مسلمان معزز خاندانوں کی بھلائی کا سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہی یعنی قانون وقف خاندانی کا مسودہ جو بڑی محنت اور

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۰۹) دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس مسودۂ قانون کے برخلاف جو یہ حجت پیش کی گئی ہو کہ ہندوستان میں حضور قیصر ہند کی یوروپین اور یوریشین رعایا ایسے حقوق رکھتی ہو جن کے سبب سے وہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کے اختیار سے باہر ہو، اُس کی قانونی صحت کی نسبت میں بلا تامل شبہ کرسکتا ہوں۔ میں ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کا ایک ناچیز ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم نے اپنے اختیارات انگلستان کی بڑی پارلیمنٹ سے حاصل کیے ہیں اور جب تک ہم اُن اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اس وقت تک میرے نزدیک ان تمام معاملات میں جو ہندوستان سے متعلق ہیں، اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہ کرنا بیجا معلوم ہوتا ہے . . . جو تحریک بالفعل اس مسودہ کے برخلاف کی گئی ہے اُس میں ہم انھیں دلیلوں اور رایوں کی تکرار پاتے ہیں جو اب سے پہلے خطرہ پیدا کرنے والوں نے اُس وقت پیش کی تھیں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی ججوں کو صیغۂ دیوانی کی اُن نالشات کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جن میں یوروپین اور یوریشین فریق مقدمہ ہوں میں بغیر اندیشۂ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جن مقدمات میں یوریشین شریک ہوتے ہیں اُن میں ہندوستانی ججوں کے اختیارات دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف کی بنا پر کوئی ناانصافی بلکہ شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی ہی بیشک اُس زمانہ کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل تھے اور اُن کی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی اس وقت تمام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہل یوروپ پر اختیارات دیوانی ایک ایسے طریقہ میں استعمال کرتے ہیں جو درحقیقت اس الزام کے لائق نہیں ہو کہ قومی امتیاز کا اُس میں اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار فوجداری کے اختیار سے مختلف ہو، دیوانی کا اختیار صرف جائداد پر موثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصلت اور آزادی پر، پس ہندوستانی ججوں کے دیوانی کے اختیار کی اطاعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی اُن کے اختیار پر رضامندی ظاہر کیجائے ۔

" مائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ امتیاز مبنی ہو۔ عدالت ہائے دیوانی کی ڈگریات ایک شخص کو دولتمند سے مفلس کرسکتی ہیں، دیوانی کے بعض فیصلے صرف ذاتی تعلقات ہی سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ اُن میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے اُن میں اُسی قسم کی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی، دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات میں ہوتا کہ ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں امر حق کی تحقیقات ایک ہی قانون شہادت کے بموجب کیجاتی ہی، عدالتہائے دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیکنامی پر تقریباً اسی طرح دھبا لگ سکتا ہے اور اُن کی عزت

جانفشانی اور اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت سے تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موانعات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا وہ کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۰۹) برباد ہو سکتی ہے۔ جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام ہے۔ پس میرے نزدیک دونوں عدالتوں کے جوڈیشل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لیے کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ اگر راستبازی انصاف اور قومی بے تعصبی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی ججوں میں پائی جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ اُن میں وہی خصلتیں فوجداری کے اُن مقدمات میں نہ پائی جائیں جن میں یورپین اور یوریشین شریک ہوں۔ تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان مقدمات فوجداری میں جن میں اہل یورپ نالشی ہوں اور بطور فریق ضرر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جوئی کریں، اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ میں نے اب تک کبھی یہ نہیں سنا کہ یورپین انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے دادخواہی کرنے میں کوئی عذر کیا ہو، پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر اُن مقدمات میں جن میں یورپین انگریزی رعایا کی نسبت نالشیں پیش کی جائیں، اُس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جو مجسٹریٹ کہ دادرسی کے مجاز ہیں ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی فرقہ کا یہ کہنا ناواجب اور بیجا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی مجسٹریٹوں کے روبرو چارہ جوئی کے واسطے تو جائیں گے لیکن اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ جو نالش ہم پر کی جائے اُس میں وہ ہماری نسبت تجویز کریں۔ . . . میں یقین کرتا ہوں کہ مجھکو یہ صحیح اطلاع دی گئی ہے کہ جزیرہ لنکا میں جو اس ملک سے متصل واقع ہے اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے، ہندوستانی مجسٹریٹ اور جج یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں لاتے ہیں اور وہاں اُس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی ہو کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی اولوالعزمی کو بجائے اس کے کہ وہ اس جزیرہ سے جاتی رہی ہو، نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قہوہ کے کاشتکاروں کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں اُن کا کوئی نہایت مضبوط محب قوم بھی میزان شائستگی میں اُس سے زیادہ تر اعلیٰ رتبہ کا دعویٰ کرے گا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی نسبت قرار دے گا مگر باوجود اس کے یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کے اختیار کے معاملہ میں برٹش انڈیا کا قانون لنکا کے قانون سے پیچھے ہے۔ پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ ناواجب بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی ہے . . . مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسودہ کو سمجھا ہے اُس میں یہ تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف انھیں

جو خیال میں آسکتی تھی عام اس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہ ہو، اس شخص نے اُس کا تعاقب کیے بغیر نہیں چھوڑا۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۰۹) ہندوستانیوں کے معاملہ میں جنھوں نے اپنی مسلم راست بازی اور لیاقت کی بدولت جوڈیشل سروس میں ایسے عہدے حاصل کیے جائیں جو رتبہ میں اعلیٰ درجہ کے انگریزی عہدیداروں کے مساوی ہیں۔ اس مسودہ میں اُن جوڈیشل نااہلیتوں کے دور کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں۔ اس قسم کے ہندوستانی عہدیداروں کی تعداد نہایت محدود ہے اور اسی وجہ سے اس مسودہ کی نسبت یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا اُس کے سبب داد رسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی تبدیلی کا ہونا متصور ہے۔"

"جس بل پر قومی امتیازات کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے نزدیک اُس میں بڑی غلطی ہے جس چیز کی لوگ اُن ملکوں میں جن کو شائستہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے اطاعت کرتے ہیں۔ وہ کچھ خاص خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں جب تک کہ قانون منصفانہ بے طرفدار اور بارحم ہوگا اور جب تک اُس قانون کا عمل درآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جا سکے گا اُس وقت تک اُن شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں، باریک خیال لوگوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہونی چاہیے۔ جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے قانون کے مناسب عمل درآمد کے واسطے انتظام کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو نہایت عمدہ ذریعے جو بہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پوچ اور غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات پر اصرار کرے کہ عہدیداروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقہ پر منحصر رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے اصول کی نسبت کسی جدید فیصلہ کی حاجت نہیں ہے، اس سوال کی نسبت اُس وقت بحث کی گئی تھی اور اُس کا فیصلہ عمدہ طور پر ہو گیا تھا جبکہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے ہندوستان کے باشندوں کو یہ حقوق عطا کیے تھے کہ سلطنت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کو اسی حیثیت پر نوکری دی جائے جیسی کہ خاص انگریزوں کو۔ اس فیصلہ کا پچھلے برسوں میں عملی طور پر نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اُس خفیف تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے جو اس بل میں تجویز کی گئی ہے۔"

"لیکن مائی لارڈ اس مسودہ کی تائید میں انتظامی مصلحت کی بہ نسبت زیادہ اعلیٰ درجہ کی وجوہات موجود ہیں یعنی میں آزادی انصاف اور انسانیت کے اُن عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی جائے قرار کہیں اس قدر نہیں جیسی کہ اُس قوم کی طبیعت میں ہے جس نے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹیٹیوشنل حقوق کے معاملہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیے

نیشنل کانگریس کی مخالفت اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کرنا

نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے جو ۱۸۸۶ء میں سرسید نے مسلمانوں کو باز رکھا اگرچہ افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ اُن کی اس کارروائی

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۰۹) . . . تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حاکم اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے۔ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس بات کا خواہاں نہیں ہو سکتا کہ انگریزی قوم اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اُس کے جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو۔ قدرت نے دونوں قوموں کو ایک پولٹیکل اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل رشتہ میں ملایا ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام ہوتا جاوے گا . . . مجھکو یقین واثق ہے کہ جبتک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اُس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پولٹیکل برابری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانہ قدیم کے مقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شودر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے۔ خیر زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم شائستگی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہرکیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یوروپین ہوں یا یوریشین اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور اُن کے پولٹیکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق اُن کو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اُس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اُس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن و آسایش بخشی ہے اور اس کو تجارتی اولوالعزمی اور زمانہ شائستگی کے ہنر اور فنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب مقام بنا دیا ہے۔"

" مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھکو حاصل ہوگا اس لیے میں اس اخیر گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضور کا عہد حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے کہ اس میں ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور ہو جائیں گے اور آخر کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں، دوستی اور باہمی ادب اور ہمدردی کو ترقی ہوگی "۔

سے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضی مسلمانوں سے پیدا ہوگئی مگر درحقیقت سرسید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خار دار جھاڑی میں، جو شاید اوروں کے لیے درخت باردار ہو، اُن کا دامن اُلجھنے نہیں دیا۔ سرسید کی اس کارروائی کو اول اول تعلیم یافتہ لوگ نہایت تعجب سے دیکھتے تھے مگر پچھلے دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے امید ہے کہ اُن کا تعجب رفع کر دیا ہوگا۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبتہً مرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگرس والوں کے خیالات عام طور پر اُن میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب اُن پر کوئی ایسا بُرا وقت آ کر پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمدردی اہل پونا کے ساتھ ملک نے ظاہر کی اور جس قدر اُن کی طرف سے ڈیفنس میں پیروی کی گئی اس کا سواں حصہ بھی بدنصیب مسلمانوں کے ساتھ، نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی امید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگرس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے۔ اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں مشکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا، کانگریشن گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی خفیف اور نالائق حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہوتے تو اپنے تئیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا مولوی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اُس کو ضمانت تک میسر نہ آئی اور جو سزا عدالت ماتحت نے اُس کے لیے تجویز کی اُس کو بے چون و چرا قضائے مبرم کی طرح بھگتنا پڑا۔

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ اُن کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے اسی لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار رہنا چاہیے

کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایجیٹیشن میں جو دیوانوں کے بے ہو کی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھی، شریک ہونے سے باز رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگرس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلوا خوردن را روئے باید"۔ ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مذہبی تعصبات مادۂ اکّال کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و آبرو کا خواہاں ہے، پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سزائیں دیتے دیتے تھک گئے مگر ہم لڑنے جھگڑنے کے لیے اسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے، اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصلت بن گئی ہے، صدہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں کروڑہا روپیہ کی جائداد قرضہ کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تعلیم کے لحاظ سے اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے تے شروع کی ہے۔ عورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے، اُس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل صفر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں، دولت کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گانو گانو بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اُن کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشراف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے اُن کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔ ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" عجب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا منہ لے کر ہم گورنمنٹ سے اُن حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں، مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے اُن اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اُس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہییں جو خود ہمارے

اختیار میں ہیں۔ ہم کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرنے ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ "اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ" (یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کیجائے گی) اسی لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ "جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، ہم ذلیل رہیں گے، اوروں سے پست رہیں گے اور اُس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کی ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ، میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہدوں اور اپنا فرض ادا کر لوں اور خدا کے سامنے جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے، اپنے ہاتھوں کو دھولوں"

یہ ہے سلسلہ سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے

"متیٰ تَخْلُوْ تَمِیْمٌ مِنْ کَرِیْمٍ وَمُسْلِمَۃُ ابْنُ عَمْرٍو مِنْ تَمِیْمٍ"

(یعنی جب کہ مسلمۃ بن عمرو (یعنی میرا ممدوح) بنی تمیم میں سے ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ بنی تمیم جوانمردوں سے خالی ہیں)

مذہبی خدمات

اس عنوان میں ہم سرسید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں زمانۂ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے اگرچہ ابھی تک اُن کی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی کیونکہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان اُن کی مذہبی تصنیفات کو مخرب اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تضلیل کے خوف سے محض مصلحتہً مخالفین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں، لیکن چونکہ مخالفت کا سبب محض تعصب یا پاس دینداری ہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ناواقفیت اور زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہونا بھی شامل ہے اس لیے امید ہے کہ جس قدر لوگ زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اسی قدر سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

سرسید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے منجملہ اُس کے وہ کتابیں اور اور رسالے جو غدر کے زمانہ سے پہلے لکھے گئے اور جن کا ذکر پہلے حصہ میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں، کیونکہ اُن میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جس کے لحاظ سے اُن کو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لیے اس زمین در کار ہو۔ پس جو کچھ ہم کو اس باب میں دکھانا ہے وہ صرف اُن کی وہ مذہبی خدمات ہیں جو غدر کے بعد اُنھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ اُنھوں نے غدر کے بعد مذہب کے متعلق لکھا وہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے اور ایک فانی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، ملحد، نیچری اور بد مذہب کہا جاتا تھا جو اسلام کی خدمت اُس سے بن آئی وہ نہ اُن مستفتیوں سے ہو سکی جنھوں نے مکہ میں جا کر اُس کے کفر کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں سے جنھوں نے مسجد الحرام میں بیٹھ کر اُس کے کفر کے فتووں پر مہریں کیں۔

ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں گھرا ہوا تھا

ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ پچھلے دَوروں میں اُنکو دُبلا پتلا خشکا رپیٹ بھراؤ ملجاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔

پہلا خطرہ

ہندوستان میں سب سے زیادہ اُن کا دانت مسلمانوں پر تھا اور اس لیے اُن کی منادیوں میں، اُن کے اخباروں میں اور اُن کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے بُرائیاں ظاہر کرتے تھے، بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب اُن کے دام میں آ گئے اس خطرہ سے بلاشبہ بعض علمائے اسلام (شکر اللہ مساعیہم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آل حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ متنبہ ہوئے انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور اُن سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا لیکن اس کا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں وہ بدستور قائم رہیں۔

دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت سے علاقہ رکھتا تھا اول تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے دوسرے بسبب اُن غلط فہمیوں کے جو یوروپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغی و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ

تیسرا خطرہ خاصکر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا اُبھرنا محال ہو گیا تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود اُن میں تعلیم پھیلانی پڑی، حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی

پہنچنے سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

پچھلے دونوں خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عالم کو احساس نہیں ہوا۔ مولویوں سے اس کے سوا کہ چند روز دریا کی روپیٹی انگریزی تعلیم کو روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار کر رہ گئے اور اور کچھ نہیں ہو سکا۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہاں تک کہ اس کی قدرت

سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

میں تھا مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے تمام اعتراضوں کے جواب جن کے ذریعہ مشنری مسلمانوں کو دام میں لا سکتے تھے، خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے، اس نے تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں، اس نے بدلائل قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اسی نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مفر نہیں ہو سکتا تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

بائبل کی تفسیر

انھوں نے ان مقاصد کی طرف پہلی ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جبکہ مراد آباد میں تبیین الکلام یعنی توریت و انجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی اس کتاب کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جب سر ولیم میور کی کتاب

سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری

لائف آف محمد چار جلدوں میں چھپکر ہندوستان میں پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیرآباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے، علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کی ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی مگر چونکہ ہم انھیں کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اُن کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر جیسے ہو رہے

ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔ اُسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہٖ نقل کیے گئے ہیں ایک مولوی سے انتخاب کرا رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا پختہ ارادہ سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار جب اُنھوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرسید کے بعض خطوں سے جو اُنھوں نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب اُنھوں نے یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو اُن کے

سر ولیم میور کا جواب لکھنے سے دوستوں کا منع کرنا

بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے اُن کو سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے مگر سرسید نے اُن کا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے

خطبات احمدیہ کے لیے میٹریل جمع کرنا

اُنھوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعیں حاصل کیں، بہت سی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپتی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسے یعنی خطبے یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اُس کو چھاپ کر مشتہر کیا۔

خطبات کے لکھنے میں سرگرمی جو ولایت کے خطوں سے پائی جاتی ہے

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات اُن کو اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور

جو سخت محنت اُس کے لکھنے میں اُن کو کرنی پڑی اُس کا کسی قدر اندازہ اُن کے خطوں سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرۃ میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب بھی منگانی شروع کر دی ہیں، چٹھیات روانہ ہوگئیں، سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خریدلیں ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلاسکے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچتے ہی میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا . . . . ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجدو . . . کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا ہے خدا مدد کرے "

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ ابھی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتہ سا ہوگیا۔ دن رات کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے، جلد اول خطبات احمدیہ کی تمام ہوگئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا۔ اب جو اندازہ اُس کی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ

سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے ہیں اور جان ہیں جان نہیں میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے، تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجے ہیں۔ میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ بھیجدیا . . . آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھجوا دیجے۔ اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیجدیجے "

جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو اُن کو بے انتہا تقویت ہوئی چنانچہ اُس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ " اگر آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مر جانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا "

مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا تھا اُس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا جس میں سے کچھ کم سوا سو روپیہ سرسید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لے کر ادا کیا۔ اُن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت اُن کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے مراجعت متعسر ہے۔ یہ تردّدات ایسے جانکاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے۔ اُن کے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے کم خرچ نہیں ہونے کے۔ اب زیادہ حال تردّدات کا لکھنا ناحق آپ کو تردّد میں ڈالنا ہے "

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علیخاں نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے اُن کو لکھا کہ " کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی صدمہ میں صدمۂ غم انتقال ہمشیرۂ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں اُن کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف

لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا سب بیباق ہو گیا۔ اب آپ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجیے" مگر خارجاً معلوم ہوا کہ سید مہدی علیخاں اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسب دلخواہ تیار ہو گئی تو اُن کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علیخاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا، خدا قبول کرے" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم مصر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اُس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُس کی لذت میں ہی جانتا ہوں" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈالدو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔"

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں، اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بمقابلہ عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں، غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں، پس تا وقتیکہ

خطبات احمدیہ کی ترجیح پہلی کتابوں پر جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں

خطبات احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اُس کو اگلے علما کی کتابوں پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جن کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی

ایسی خدمت بن نہیں آئی "۔

ترجیح کی پہلی وجہ | اولاً جہانتک ہم کو معلوم ہوا ہے، سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں جاکر اسلام کی حمایت کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے، وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے، یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام برِ اعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو، اُس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اُس کو چھپوا کر شایع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچائے جنھوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

ریورنڈ ہوپر، جواب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈیونٹی کالج میں پرنسپل تھے اور جن سے میں خود بار ہا ملا ہوں، اُنھوں نے میرے ایک دہلوی دوست سے جو اُن کو اُردو پڑھاتے تھے کہا کہ "مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بدمذہب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے اُن پر اسلام کی حقیقت اور اُس کی خوبی ظاہر کرتے، اُن کے ملکوں میں جاکر اُنھیں کی زبان میں وعظ کہتے اور اُنھیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو "۔

" مسٹر آرنلڈ جنھوں نے ابتدائی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اُس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے بخوبی واقفیت حاصل کی ہے ایک نہایت سچے اور پختہ عیسائی ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اُس کا ترجمہ کسی یوروپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یوروپ میں جاکر یوروپ ہی کی کسی زبان میں اس

مضمون پر کتاب لکھ کر شایع کی ہو"

سرسید کہتے تھے کہ "۱۸۷۰ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپکر لندن میں شایع ہوئی تو اُس پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو' چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبّوں سے پاک ہے جو عیسائی اُس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں"

دوسری وجہ | دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اُس مخاصمانہ طریقہ کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے، ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گراہم سرسید کی لائف میں خطباتِ احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا اذعان پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ" جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دینِ محمدی فی زماننا انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت مبہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغایرت اور تنگدلی کی اُس میں خیال کیجاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین

کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے" اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطباتِ احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظر کے متعلق برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کس قدر فریقِ ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری وجہ | تیسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جس میں اُن کو کبھی بمقابلہ اہل اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اُس کی جگہ اپنی کتاب لائف اوف محمد میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاصکر تعلیم یافتہ لوگوں پر، خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی، بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لیے جن روایتوں سے آنحضرتؐ کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے اُن کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی حدیثوں تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرت کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے اور اُس کی تعلیم کو دنیا کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے، مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں، اُس کو زمانۂ حال کی شائستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھیرایا تھا۔ یہ باتیں گو فی نفسہٖ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنے والی تھیں۔ سر سید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دلنشیں دلائل سے رفع کیا ہے، اُنھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن روایتوں کا جو اُن کتابوں میں درج

ہیں مفصل حال بیان کیا ہے جو اُن لوگوں کے لیے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں اور جو معیار اُنھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے اُن کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اُس پر غور کرنے کے بعد اُن روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے سر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ اُنھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانۂ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں اُن کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے اُن کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج آدمی کو گو وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو، اُس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔

چوتھی وجہ | مگر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اُس کو اگلے علما کی کتابوں سے ممتاز ٹھیراتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں برخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم غرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لا مذہب دونوں کو برابر پایا جا سکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں اُن لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سر سید کا طریق استدلال کیا ہے اور جنھوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں اُن کا طریق استدلال کیا تھا؛ مگر ہم باوجود اس کے کہ سر سید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے، مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سر سید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور اُن

سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جن کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

پہلی مثال | عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلعم پر بابت کثرت ازواج اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے ہے اُس کی تردید میں ہمارے علما نے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب اُن کے لیے کافی ووافی ہیں مثلاً ازالۃ الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے دو نکاح، حضرت داؤد کی نوے سے زیادہ بیویاں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض اور انبیا کی کثرتِ ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے، ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جواز طلاق کا حکم دیا ہے کتابِ استفسار میں بھی اول اسی قسم کے الزامی جواب دیے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت وانجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالیٰ کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں، ناسخ ومنسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علما نے دیے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو اُن کے ساکت کرنے کے کافی ہیں مگر عیسائی، باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں، نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں نیز عیسائی انبیا کو مثل اہل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے اُن کی زبان بند نہیں کی جا سکتی اس کے سوا الزامی جوابات اُن لوگوں کے لیے جو توریت وانجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس زمانہ کی مسلمات کے موافق

اُن کا جواب نہ دیا جائے۔

مسئلہ تعددِ ازواج اور جوازِ طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آگئی ہے، اس میں سرسید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ تعددِ ازواج اور طلاق کا حکم عالم اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسنِ معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اس کے جواب میں سرسید نے اول تعدد ازواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے، اول قانونِ قدرت کے لحاظ سے، سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت اُن کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، اُن کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں اُن کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد تناسب نہیں ہوتی اس قانون کے بموجب جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتبہ میں تو اُس بیش بہا قوت کے جو مدرکِ کلیات و جزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیے اُس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اُس کو عطا کیے ہیں اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبیعی اور حسنِ معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانینِ حفظانِ صحت اور ممالک مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔

اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اُس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اُس نے اُس کے واسطے ایک

ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہی جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجانست سے اُس کی خوشی کو بڑھا دے، اپنی محبت بھری ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ " بڑھو اور پھیلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالق زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جورو ئیں رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔"

"اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے، پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں۔"

اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹگیو کی رائے تعدد ازواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعدد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔" پھر مسٹر گبنز کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "علم قوائے انسانی اور علم طبعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے ٹھنڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں، مگر نبی آمیل سے

جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتی ہیں۔" اس کے بعد مسٹر ہگنز نے سر ڈبلیو اوسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو بانی اسلام کے لیے اس بات کی کہ انھوں نے متعدد جوروؤں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی۔"

ان دونوں مذکورۂ بالا رایوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں " افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعددِ ازواج پر صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر مذہب اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی غرضوں کے واسطے اور مقاصدِ تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔"

اس کے بعد سرسید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرت سے پہلے عرب اور اُس کے گرد و نواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق واقع تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " ایران میں قوانین نکاح بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے، یہاں تک کہ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی حلال تھی جیسے باپ کو اُس کی بیٹی اور بھائی کو اُس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشۂ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعددِ ازواج کی رسم بلاکسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی۔ عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعددِ ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے

کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب کے برخلاف تھا، اُن کے ہاں ایک جورو بھی کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجردِ محض کی عام ہدایت تھی اور مرد عورت دونوں کے لیے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانیِ اسلام نے ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقلِ کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اُس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جس خوبی سے اسلام نے تعددِ ازدواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اُس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے۔ یہودیوں کے ہاں کثرت اور بلاتعین حد ازدواج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعددِ ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی۔ چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے، اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی اُن میں انجیلوں میں سے جن کو اُن کے معتقدوں نے اُن کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی، جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعددِ ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن جو تعددِ ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی

ہیں اُس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعدد ازدواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے۔
اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ " یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا، اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا جو قانونِ قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور وہ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً " (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ " اس آیت کے اگر وہی معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بتعمقِ نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ اِن لَمْ تَعْدِلُوا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا " اس کے بعد اُنھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اُس کو متعدد جوروئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے " وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ " (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں

حل کرسکی اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے
بیان کرکے لکھتے ہیں -

" ہاں بلا شبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا منشا
رمشتی کی ادھیل نکار رکھینا ہے ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے - مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بیجا عملدر
کرنے سے وہ لوگ اُس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور
وہ یقیناً اُن کو اس قسم کی سزا دے گا جو اُن کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی "

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ جو تعدد ازواج
اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو - دو - تین - تین اور چار - چار جورویں
کرنے لگے اور ایک بازاری عورت کو داتو پر چڑھایا اور نکاح کر مارا جہاں مقدس بزرگ
مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے سانڈ بنے ، اُس مریدنی کو لے ڈالا ، وہاں وعظ کہنے لگے او
سنتِ نکاح ثانی کو جاری کیا ، قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۂ النکاح کا پڑھانے لگے او
ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کرکے عورتوں کو کھلانا
شروع کر دیا ، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے ، یہ سب ایک قسم کی دنیا
کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام
کا نام بدنام ہوتا ہے - پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا
چمگاڈروں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے "

اس کے بعد سرسید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے ۔ وہ اول حسن معاشرت کی نظر
سے اُس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن
کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور
عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا - اس کے بعد لکھتے ہیں " لیکن اس بات
سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد عورت میں پیدا ہو جائیں

جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو اُن کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ بااینہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ اُن بداخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اُسی حالت میں اُس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اُس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے ترددات و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور روزافزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن طعن وجوتی بیزار میں رکھنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اُس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دیدیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰؑ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے معتقدوں نے اُن سے کہا کہ اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی

مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو سخ وہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اُس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے یوروپ کے مشہور و نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائبل کی جن آیتوں سے اُنھوں نے جواز طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے اُس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں جو اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں" اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔"

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اُس نے طلاق کو بطور ایک مرض لاعلاج کے جائز و مباح بتایا ہے مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اس میں بیماری پیدا ہو سوائے انھیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔"

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور مخلص مسلمانوں کو کی ہے۔"

"بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا کہ "ماخلق اللّٰہ شیئاً علیٰ وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق (یعنی کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو)"

"پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ "ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق" (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے)"

اس کے بعد لکھتے ہیں "کہ یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا "ایما امرأۃ سألت زوجہا طلاقاً فی غیر ما بأس فحرام علیہا رائحۃ الجنۃ" (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اُس پر جنت کی بو تک حرام ہے)"

پھر لکھتے ہیں کہ "پیغمبرِ خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعۃً قطعی طلاق دیدے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ نسائی نے روایت کی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعۃً تین طلاقیں دیدیں یہ سُن کر آنحضرت صلعم غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں؟ یعنی وہ شخص آنحضرت کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے۔"

اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "بانی اسلام نے طلاق کے روکنے میں نہیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور رابطہ قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعۃً تین طلاق

دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے تو بدستور زن و شوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفریق ہو جائے۔"

"علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور اُن کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور اُن کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔"

"اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اُس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اُس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے پس اُن کے افعال کی نفریں انہیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر۔ ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اُسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اُس کے لیے اُس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔"

دوسری مثال | جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاوہام اور استفسار وغیرہ میں عہد عتیق کے بیشمار

حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیا نے اس حکم کی تعمیل کی، اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لیے جو کہ تمام عہد عتیق کو الہامی جانتے ہیں، کافی تھا۔ مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً خواہ وہ کسی مذہب میں ہو، اصولِ تمدن اور حسنِ معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے اُن کے لیے اور اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے، کافی نہ تھا،

سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اُس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس مغالطہ کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو، خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی، اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصل بحث انھوں نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر میں کی ہے، مگر یہاں ہم صرف اُن کی اُس تحریر کا بہت مختصر خلاصہ جو خطبات میں درج ہے، لکھتے ہیں۔

" سر ولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُس نے مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اُس کے جواب میں اول ایک لمبی تحریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ " اگر عیسائیو کے قول کے موافق اسلام میں آزادی رائے نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کے قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر اُن جھوٹے الزامات میں سے ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اُس پر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصولِ اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے۔ جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں

آسکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبلوایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں ہے کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہوگیا ہے)"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جس اصول پر حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں، اُس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار میان سے نہیں نکالی، اُس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اُس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو۔ اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورت وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دلوں میں بٹھائیں جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جاسکے اور موحدوں کو امن میسر نہ ہو، جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا، اُس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے"

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و مشرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اس بیان سے اُن عیسائی مصنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے"۔ پھر لکھتے ہیں کہ "ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتحمندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے

مذہب کی آزادی کو برباد کیا، مگر مذہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا اُنھوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں؛ اُس وقت صاف کھل جائے گا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف تھے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان تحمند اپنے مذہب کے پابند تھے وہ دوسرے مذہب کی آزادی میں اندازنہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلا لحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخشتے تھے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس سے اسلام کی طرفداری کی بالکل توقع نہ تھی، اسپین کے علم تاریخ پر ایک آرٹکل لکھا ہے اُس میں وہ لکھتا ہے کہ "اسپین کے بنی امیہ خلفا کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان ہے کیونکہ اُس سے اسپین کے معصر یعنی عیسائی اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک اُن بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے، یعنی اُن کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔"

اس کے بعد گاڈفری ہگنز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو باین وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلا وطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور اُن سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی[1] امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور اُن کے مذہب اُن کے پادریوں اُن کے بشپ، اُن کے بزرگوں اور اُن کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔

[1] مصنف مذکور کے زمانہ میں یونان ترکوں کے قبضہ میں تھا۔

جو لڑائی بالفعل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اُس لڑائی کے جو حال میں ڈیرا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے "

"ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ" وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب اُن میں خوش و خرم تھے۔ اگرچہ بظاہر مور اس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھکو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آگئے تھے کہ نادان عیسائی مانک (راہب) سمجھتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک اُن کا یہ خیال صحیح تھا "

"خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اُس نے اسلام قبول نہیں کیا "

اس کے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں "خونریزی اور بربادی اُن نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ پھر قتل کرنا اُن شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیرووں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا۔ چالیس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا، فرانسیس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جو اب تک اس لیے قابل نفرین ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا، علاوہ

اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا۔ ۔ ۔ اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا مکروہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا جو دہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔"

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اُس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے۔ پھر ایک آرٹیکل سے جو کسی یوروپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا، مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اُس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اُس کو جبراً جاری نہیں کیا، اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے"

اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لامارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔"

پھر ایک انگریزی سیاح سیلڈن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اُس نے قسطنطنیہ کے مسلمانوں کی نسبت کہا ہے یعنی یہ کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔"

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب رائیں بہت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے"

خطبات احمدیہ کے مضامین کا خلاصہ | ان دو مثالوں کے بعد ہم سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت

جس سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا جو اس کتاب کے لکھنے میں اُس نے کی ہے، کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک دھندلا سا خیال پیدا ہو جائیگا، بیان کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ | پہلے خطبہ میں جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے، عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے اُن بعض مُسلمات کے ثابت کرنے کے لیے جن کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے، بطور بنیاد مباحث آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ آیندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جَبَل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں، آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول سر ولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، آباد ہوئے یا بقول سر ولیم میور کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرت کا اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سر سید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعوے پر سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرا خطبہ | دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقاید اچھے یا بُرے، جہاں تک کہ شعرائے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے، بیان کیے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں اُن کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُن کے اخلاق اور عادات اور عقاید و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ | تیسرے خطبہ میں اُن ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہوئے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت

رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے۔ بت پرست، خدا پرست، لا مذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے۔ (۱) مذہب صابئین (۲) مذہب ابراہیم اور دیگر انبیائے عرب یعنی ہودؑ صالحؑ اسمٰعیلؑ اور شعیبؑ کا (۳) مذہب یہودؑ (۴) مذہب عیسوی۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے تک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتہً اسلام نمودار ہوا اور اُس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا تحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعتہً جزیرہ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھرپور کر دیا" اس کے بعد انھوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں؛ کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی؛ اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت اصول وعقاید متفرقہ ومنتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے، اُس کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ "ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متبدل اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اُس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطے سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنھوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھیرایا، جنھوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے بااِیمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔

چوتھا خطبہ | چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے موسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ "یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اُس کا لکھنا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اُس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفدار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اُس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے۔"

خطبۂ ۴ کا پہلا حصہ | مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں وہ فائدے بیان کیے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اُس کے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سرولیم میور جن کی نسبت سرسید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حصہ | دوسرے حصہ میں اُن عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنھوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مُضر بتایا ہے اور اُس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

تیسرا حصہ | تیسرے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو

بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصے خطبۂ مذکور کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اُس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اس لیے ان کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے مگر تیسرے حصہ کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اُن تحریروں کو الہام ربّانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور اُن نبیوں اور مُقدس لوگوں کو اُن افعال قبیحہ[1] کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے اُن معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو اُن تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے اُن کو تحمندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرادیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیا و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں، توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کردیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو بخوبی دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، اُن کی بیٹیوں حضرت اسحٰق، یہودا، حضرت یعقوب کی بیویوں اور بیٹوں، ہارونؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے۔ وہ تمام دُنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لیے اُن کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے اِن تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پہنچادی جس کے وہ مستحق تھے۔

چوتھا حصہ | پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصہ میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت

---

[1] یہ عہد عتیق کے اُن درسوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ حضرت داؤدؑ وغیرہما کی طرف زنا اور دیگر افعال قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے ۱۲

خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ" دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں عیسائی مذہب کی بنیاد اُس نیک اور حلیم شخص (یعنی حضرت یحییٰ پیغمبر) سے ہے جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اُس عجیب شخص پر ہے جس کو اُنھوں نے اتنا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰؑ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرت یحییٰ) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰؑ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعوےٰ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے "

''جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اُسی نے خدائے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی اسلام ہمیشہ اُس زمانے کے عیسائیوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے، اسلام نے عیسائیوں سے اُسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے" قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا " بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور اُنھوں

نے پھر اسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے اُن کو حاصل تھا یعنی انھوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونٹیرین (یعنی موحدین) سے معزز ہے۔"

"اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے اٹھا لیا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ "اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال[1] پوپ کے محل میں جائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پُراسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ آکسفورڈ یا جنیوا میں جا کر اُن کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جا کر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول[2] مفسروں نے اُن کی تحریرات اور اُن کے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا با اختیار نائب سمجھتے تھے اور اُس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُن کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو پورا اختیار ہے کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اُس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا، کسی طرح حضرت عیسیٰؑ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے

---

[1] سینٹ پیٹر یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲

[2] صادق القول کا لفظ مسٹر گبن نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تحریف کرنے والے مفسر ہیں ۱۲

عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا ہوتی ہیں اُن کو بتلایا اور جابجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور اُن کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچ کی جستجو کریں چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا :۔ "قُلْ یَا اَهْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اور پھر دوسری جگہ فرمایا "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحَانَهٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ"

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدیؓ بن حاتم جو اُس وقت عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُن کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی آنحضرت نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ "ہم تو اُن کی پرستش نہیں کرتے" آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کردیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا ہے تم بھی اُس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھیراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کردیا سو تم بھی اُس کو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا بس یہی اُن کا پوجنا ہے۔"

"ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کیے اور اس کے ہر ایک مسئلے سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اُس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدا یا چھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے اُن کے دل پر اثر کیا

اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور اُن کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہوگئے جس کی بدولت ہم کروروں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

"چوں کہ درحقیقت لوتھ مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لیے اُس کے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۰۴ میں لکھا ہے کہ جیمنی برارڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے ریفارمروں اور خصوصاً لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ مارٹینس الفانسس اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد (صلعم) نے انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔"

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اُس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی، آزاد کردیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلۂ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے

خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی، جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اُس نبی آخر الزماںؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسانمند رہنا چاہیے۔"

پانچواں خطبہ | پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث کتب سیر تفاسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آیندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے ہیں گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہبری کے لیے ایک سیدھا رستہ بن جائے۔

چھٹا خطبہ | چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اس لیے صرف اُس کی سرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس میں اول روایت کی اصلیت اور پھر اُن کے رواج کی ابتدا کیونکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام صرف انہیں صحیح روایتوں پر منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے، بیان کیا ہے۔ پھر جھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اُس کی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجات احادیث بلحاظ ثقہ ہونے رواۃ کے، راویوں کا درجۂ اعتبار بلحاظ ثقہ کے، یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرتؐ نے صحابہ کو دی، اختلاف روایت کے اسباب، احادیث موضوعہ کا بیان، یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کیے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی، دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے معلوم ہو جانے میں کوئی

غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

ساتواں خطبہ | ساتویں خطبہ میں اول قرآن مجید، اُس کا نزول، اُس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، اُس کی مختلف قراتیں، آیات ناسخ و منسوخ کی بحث، اُس کے جمع ہونے کا زمانہ اُس کی نقلوں کی اشاعت اور اُس کا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اُس کے بعد سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو اُنھوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل نشا وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شایع کرتے، یوروپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ اُن ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یوروپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ " اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شایع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل (یعنی محتمل المعنیین) متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا، ایک بے قدر اور خراب شرح اُس کے ساتھ لگی ہوتی، تو اُس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جس کی وساطت سے یوروپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی"۔

اس کے بعد سر سید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض اُنھوں نے غلط فہمی سے قرآن وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ | آٹھواں خطبہ خانۂ کعبہ کے حالات اور اُس کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جس کا ذکر توریت میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اُس

کی اولاد میں ہونا، حضرت اسمٰعیلؑ کا مکہ کے قریب آباد ہونا، خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اُس کی تمام مراسم کا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور موٌرخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا اُن خیالات و اصول سے جو غالباً اُن کی اولاد کو اُن سے پہنچے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں، یا اُن کو بت پرستی کے اُن اصول سے جو جزیرۂ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا" اس دعوے سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو آگے چل کر آنحضرت صلعم کے بنی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کیے ہیں اُن کے لیے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سرسید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یوروپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمٰعیل اور اُن کی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجر اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد سے تعلق ہے۔ انھوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد یعنی حضرت اسحٰق حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجر اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اُس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانۂ کعبہ اور اُس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں اُن سب کا تعلق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً وہ کعبہ اور حجرِ اسود کی نسبت کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ "حجرِ اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰ بناتے تھے . . . یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب نے اُس پر تیل ڈالا جو اُس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایۃ تعظیم پرستش کے قریب تھی یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہوگی . . . . اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمھاری شرمگاہ اُس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے۔ بس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا جس پر سر ولیم میور حجرِ اسود کی اس خفیف تعظیم کو بنی ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کرکے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔"

"ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اُس کا نام رکھنا، جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰؑ) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا . . . . اور وہ کون تھا (یعنی داؤدؑ) جس نے خرمنگاہِ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر و لکڑی و لوہا و پیتل اُس کے بنانے کو جمع کیا . . . . . . اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمنگاہِ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا . . . بس کعبہ کی بنا کو اور اُس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔"

اس کے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ "عرفات جس کو سر ولیم میور بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیمؑ اور اُس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے۔ ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا، خدا اسحاق کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰ کو مرئی ہوا، بس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں۔ جس پہاڑ پر جو قریب مکہ کے ہے، خدا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو مرئی ہوا، اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے۔

معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے جبل عرفات کو کیا سمجھا جو اُس کی نسبت کہا کہ اُس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے "

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی ... عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیمؑ کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا۔ .... یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے، پہاڑ تلے کا میدان ہے، اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں۔ وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بُت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ سے "

اس کے بعد منا کی نسبت لکھتے ہیں کہ "منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے، وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اس لیے قربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیمؑ ویعقوبؑ واسحٰقؑ اور موسیٰؑ اور داؤدؑ وسلیمانؑ کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اُس قربانی میں جانور کو مار کر اُس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غربت و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اُس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔"

یہ خطبہ بہت لمبا ہے۔ اس کی اصل خوبی بغیر اس کے کہ اُس کو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید

کرنے کے بعد خانۂ کعبہ اور مکۂ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نواں خطبہ | نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لکھنے کا منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلعم کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرتؐ) اسمٰعیل کی نسل سے ثابت کیے جائیں اُن کی عین حیات میں پیدا ہوگئی تھی اور اس طرح پر محمد (صلعم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیلؑ اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے" سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ تک جتنی پشتیں اہل سیر نے لکھی ہیں اُن میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبہ کے اول میں سرسید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں اُن میں جبلی تھیں، ایک شاعری، دوسرے علم الانساب۔ چونکہ اُن کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اس لیے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں تابقدر راز بر یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتابت کے کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے لیکن باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ بھول جاتے تھے شاید کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ اُن کے نام اور اُن کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا

بتاسکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامور اور قابل فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مورخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا ان کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام دے دیتے تھے، جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب نامہ عیسیٰؑ مسیح بن داؤد ابن ابراہیمؑ" حالانکہ مسیحؑ سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤدؑ اور ابراہیمؑ نہایت مشہور اشخاص تھے اس لیے مسیحؑ کو داؤدؑ کا اور داؤد کو ابراہیمؑ کا بیٹا بتا دیا۔

"عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آباؤ اجداد کے نام اُن کی یاد کے موافق ختم ہوجاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے مورخوں کو ان کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں۔"

آنحضرتؐ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلہ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قیدار ابن اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر اُن کا جاننا آپ کے بنی اسمٰعیل ہونے کے لیے کافی تھا گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لیے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپ نے فرمایا "ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں۔"

"پس جب لوگوں نے آنحضرتؐ کا نسب نامہ بہ ترتیب لکھنا چاہا تو ان میں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا۔ آنحضرت سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مؤرخ کا اختلاف نہیں ہے، جو کچھ اختلاف ہے وہ معد بن عدنان سے اسمٰعیلؑ تک کی پشتوں میں ہے۔ صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیمؑ تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔"

اس کے بعد سر سید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیوں کہ اُن میں قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیم کے درمیان گزرا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے مسلّمہ قاعدے کے موافق پورا نہیں ہوتا۔ اب دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک برخیا کاتب الوحی ارمیانبی کا، دوسرا الحبرا کا۔ ارمیانبی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں انھوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ اُن کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقدی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں اُن کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرت سے ابراہیم تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الحبرا نے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سر سید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیوں کہ اُس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرت سے اسمٰعیلؑ تک ستر پشتیں ہوتی ہیں جو فی صدی تین پشت کے مسلّمہ قاعدے کے موافق اُس زمانہ پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں جو اسمٰعیل کی ولادت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چار سو چھہتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب

کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے" اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحٰق کی۔ وہ اَن پڑھ جاہل تھے اور پڑھے لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کرلیں یا جس بات کی تفصیل آنحضرتؐ نے نہیں فرمائی اُس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصًا اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"پس جبکہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرتؐ کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ اُنھوں نے اپنے بنی اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا، مدد لی"،

اس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور از راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے۔ ہم نہایت خوشی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ "قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ" ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ

موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحیٰی و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا، نہ مانا اور اُن کی بھی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی"۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے! خدا کے اُس وعدہ کا پورا ہونا جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا تھا کہ "میں تمھارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیلؑ میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا"، پھر اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیل کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لیں؛ وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ بنی ہاشم، قریش، اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ اے آلِ ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے"۔

اس کے بعد ابو الفدا مسلمان مؤرخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ "محمد (صلعم) کو حقیر اور رتبذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے، ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اُس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں اُن کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔ اسمٰعیلؑ سے اُن کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ

کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف و نجیب ہیں۔ وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔ یہی رائے مسلمان مؤرخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر نے دی ہے۔

اس کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتاب عالمتاب کے ذروں میں سے ہوں اس لیے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اُس سردارِ دوجہاں سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اُس سرورِ عالم میں ہے اور جس کے سبب لَحْمُكَ لَحْمِي وَدَمُكَ دَمِي ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے۔"

گرچہ خُردیم نسبتے ست بزرگ ذرّۂ آفتاب تابانیم"

دسواں خطبہ | دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلعم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت و انجیل میں آپ کی نبوت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیائے سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لیے اُنھوں نے توریت و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے۔ پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہایت کوشش اور استقلال سے اُن کی تفتیش کی اور توریت و انجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کیے جہاں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ ان کی نشان دی ہوئی بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور

تفسیروں اور سیر و تواریخ میں مذکور ہیں اُن کی بابت کچھ پتا نہیں دیا گیا کہ وہ بائبل کی کونسی کتاب اور کون سے باب اور کون سے درسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھا اور جن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخہ میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں جو اب مفقود ہیں یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلّمہ کتابوں میں سے، اس لیے سرسید نے صرف چند[1] بشارتیں جو آنحضرتؐ کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلّمہ مجموعۂ عہد عتیق و عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے وہ طریقہ جس طریقہ سے کہ بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا معمے کا بیان ہوتا ہے جب تک کہ اُن کی تشریح نہ کی جائے اور اُن کا حل نہ بتایا جائے اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس لیے پہلے اس سے کہ آنحضرتؐ کی بشارتیں بیان کریں اُنھوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کی جاتی ہے اور نیز حضرت عیسیٰ اور آنحضرتؐ کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کونسی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی۔

اس کے بعد اُنھوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت صلعم کی نسبت بیان کی ہیں۔ از انجملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک توریت کتاب استثنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استثنا باب (۳۳)، و کتاب حبقوق نبی باب (۳)

---

[1] ان میں سے اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانہ کے بعض علما نے مسلّمہ مجموعۂ بائبل سے بحوالہ باب اور درس کے نقل کی ہیں مگر جس عمدگی کے ساتھ خطبات میں ان کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا ۱۲

ہیں اور تیسری کتاب تسبیحات سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت ہے یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآرا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں۔ سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیے اُس سے بھی کچھ بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اُس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسیٰؑ مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارھواں خطبہ | گیارھویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اُن کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لیے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اُسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو رد یا محمول کیا ہے جس کا ایک جز شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لیے اُن دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیے۔

بارھواں خطبہ | بارھویں خطبہ میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بیتا رطب و یابس جس اہل سیر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جابجا تعریضیں کی ہیں اُن کی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ بر تقدیر اُن کی صحت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دیے ہیں۔ مثلاً سر ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات

تعریضاً بیان کیے ہیں۔ جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مدینے سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلعم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے۔ اُنھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ" پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔"

یا مثلاً سر ولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرتؐ کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "زمانۂ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصّوں اور عجیب وغریب بیانوں اور دل انگیز داستانوں نے اور بھی پر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد (صلعم) کے غوض کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پایدار اثر کر دیا تھا۔"

سرسید اول تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ "ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سر ولیم میور نے آنحضرتؐ کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص غوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا، بعد کو انھیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی۔ صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، اُن کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی

بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا"

"لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ درحقیقت مذکورہٗ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اُس کی نظر سے گذرتی تھی، پُرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے، گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور علامات دینِ عیسوی کے دیکھنے سے، ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبودِ غیر حاضر اور بقائے روحِ انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا۔ وہ بلاشبہ مادرزاد پیغمبرِ برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہہ کر بشارت دی ہے کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اُس کو تمہارے پاس بھیجدوں گا"

اس خطبہ میں بمقابلہ سر ولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں سے چلو دو چلو پانی سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہے اُس کی حقیقت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اردو خطبات جو سر سید نے ولایت سے آکر بہت مدت کے بعد لکھی ہیں اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ

لکھی ہے اُس سے مصنف کی محنت لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سرسید کے ارادہ کے موافق پوری نہ ہوسکی۔ اُن کا ارادہ سرولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھیرنا ناممکن ہوگیا اور ہندوستان میں پہنچ کر، کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہوگئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں باسانی میسر آسکتی تھیں اُن کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا، وہ ارادہ پورا نہ ہوسکا مگر جو مباحث سرولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آگیا ہے، کیونکہ جس اصول پر سرولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطبات احمدیہ میں اُس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ قرآن یا اُن حدیثوں کی سند پر جو اصول علم حدیث کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں، مبنی نہ ہو اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات یک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہا یا اقوال علما و آرائے مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر ایراد کیے جاتے ہیں۔

جس وقت سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اُس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق اُن میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اس لیے خطبات احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول اسلام متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ دو ایک جگہ کسی قدر انھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علمائے محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے، رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی رویا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہے۔

لیکن اس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی تعجب ہے کہ سر ولیم میور نے، جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ "میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کیے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کیے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں" یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اُس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اُدھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے تیر اندازوں سے نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک نئے طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے، اس لیے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات اُنھوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کیے تھے اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کیے گئے ہیں جس کی اُن کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ اُن کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔

خطبات پر اخبار اینکوائرر کی رائے | انگلستان کے اخبار "انکوائرر" مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۷۲ء میں جبکہ سرسید کو ولایت سے ہندوستان میں آئے ہوئے دو برس گذر چکے تھے، کسی آزاد خیال انگریز نے خطبات احمدیہ پر ایک مفصل ریویو چھپوایا تھا۔ اُس کے چند دلچسپ فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے لینا چاہیے کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کم از کم پہلے پہل ہیں اُس مبادلۂ خیالات اور فیلنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں، جو باوجود اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں، ہوتا چلا ہے، گو ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانۂ آیندہ میں کہاں تک جاری رہے گا یا اس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے، لیکن بہرحال ہم سید احمد کو

جو اپنے ملک میں رفاہ عام کے سرگرم کارگزار اور اپنے مذہب کی اُڑ کر حمایت کرنے والے ہیں دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مذہبی تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔ مسلمانوں کو بلاشبہ اس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر کے متعلق جو کچھ وہ کہیں اُس کی سماعت کی جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ شاید وہ روایات کے نئے ذریعے ہم پر ظاہر کریں۔ سائنٹفک مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے سننے سے جو اُس کو مل سکے انکار نہ کرے، مگر مصنف کو اس سے زیادہ ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم اُس کے خیالات سے ایک حد تک اتفاق کرینگے۔"

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "محمد (صلعم) جیسے شخص کے کیرکٹر معلوم کرنے کے لیے ایک ایسی سائیکولوجی کا جو تاریخ کے ذریعہ سے منکشف ہوئی ہے ایک سخت دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔ میور اور اسپرنگر نے زمانۂ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ جس کو تشریع عیسائی (اپنے مذہب کی نسبت) ناپسند کرتے ہیں، اسلام کی اصل اور اُس کی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے اور بارتھلمی سینٹ ہیلر نے ہمارے سامنے ایک مفصل تاریخی تصویر پیش کی ہے۔ ہم عام طور پر یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ ہم نے محمد (صلعم) کی تعریف اور عزت دل میں رکھنی سیکھ لی ہے، لیکن ہم میں ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں۔ یہاں تک کہ سیل نے جو ابتدائی بحث اس کتاب (یعنی قرآن) کی نسبت کی ہے اُس کو بھی نہیں پڑھتے اور اُن سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ حالت میں آنے والی صدیوں میں حکم ان طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی۔"

سرسید نے جس خطبہ میں آنحضرت (صلعم) کی نسبت بائبل کی پیشین گوئیاں بیان کی ہیں

لہ یہ اشارہ ہے خطبات احمدیہ کے ان بیانات کی طرف جہاں سرسید نے کہیں عیسائی مفسرین کی سند سے اور کہیں اور دلائل سے انجیل کے معنی جمہور عیسائیوں کے برخلاف بیان کیے ہیں ۱۲

اُس کے متعلق فاران اور فارقلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ "سید احمد بار بار اس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دلائل اسی درجے کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں . . . . اگر وہ ہم کو اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ عیسائیوں کی طرح صرف عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ ترین دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں، اُنھوں نے اپنے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی اُن پر حملہ کر رہا ہے حالانکہ اُس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے مذہب کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے جیسا کہ وہ اور مذہبوں کے ساتھ جن میں کرید کرنی اُس کو منظور ہوتی ہے، کرتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سید احمد مبور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اپنی جگہ پر قائم رہنا بخوبی جانتے ہیں۔"

اس کے بعد چوتھے خطبے کے اُس مدلل بیان پر جو سر سید نے تعدد ازدواج کی بحث میں لکھا ہے لکھتا ہے کہ "فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہے کہ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ پولیگمی (یعنی تعدد ازدواج) مضر نہیں ہے، اپنے اونٹ کو سوئی کے ناکے سے نکال لے گیا ہے، گو اُس نے اس کی جرأت نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فوائد میں سے شمار کرتا۔ بہر حال ایسے مضمون پر اگر ہم کو سید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر نہ کریں گے کیونکہ ہم کو اس موقع پر ایک خوشگوار سکوت[2] ہی کو ترجیح دینی چاہیے۔" پھر اسی خطبے کے متعلق اُس بیان پر جس میں سر سید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لیے رحمت تھا لکھتا ہے کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو

---

[1] چونکہ ریویو نگار ایک آزاد خیال آدمی ہے اس لیے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور اثبات نبوت کے لیے ایسی دلیلوں کو کافی نہیں سمجھتا ۱۲

[2] اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے اپنا عندیہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا ورنہ سر سید کے استدلال کو وہ دل میں مان گیا ہے ۔

اسلام نے کرسچینٹی (یعنی عیسائی مذہب) کو عطا کیے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکر گزار ہوں گی ان فوائد میں سے ہر ایک فائدہ کے لیے اور سب فائدوں کے لیے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فوائد مشکل سے کافی بیان ہیں اُس زبردست تحریک کا جو یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فن تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔

اس کے بعد نویں خطبہ کے متعلق جس میں آنحضرت صلعم کا نسب بیان کیا گیا ہے اول محرر کا یہ قول نقل کر کے ہے کہ "عدنان تک جو کہ پیغمبر خدا صلعم کے نسب نامہ میں اکتالیسواں ہے مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہے اور عدنان سے اوپر یہود کی تاریخ سے لیا گیا ہے ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضایع کیا اور بے فائدہ دماغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہے حالانکہ کسی مسلمان نے اس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے طنز کے ساتھ ہم کو الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز اُن کے ہاں سے چرائی۔ گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جس پر وہ قائم ہو بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذہبوں سے انکار کرنا تو کیسا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ" ہم سچے اور راستباز پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے"

اس پر ریویو نگار لکھتا ہے کہ "اخیر کے جملے کو ہم نے ممتاز حرفوں میں لکھا ہے کیونکہ وہ توجہ کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ یاد رکھا جائے۔ ہم کو یقین ہے کہ اس جملہ کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں شک ہی نہیں کہ وہ مصنف کے نزدیک مسلم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کتھولسٹی[1] کے سچے اصول کی مُہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع صلح مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہوگا شاید ہم سید احمد کو

---

[1] کتھولسٹی ایک لفظ مشترک بہت سے معنوں میں آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی فراخ حوصلگی یا بے تعصبی یا دوسروں کے عقائد سے رواداری کے ہیں

بغیر ناراض کیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کی یا عربی کیتھولک ہی۔ بہر حال اُنھوں نے لٹریچر کا مرد میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے . . . . اور اُن کے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھیں گے جن کو اس سبجکٹ میں دلچسپی حاصل ہو چکی ہے اور جو اس میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں ہیں۔"

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن" کو جو اُنھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی خود اپنے روپیہ سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے اُس کو چھپوا کر شایع کرے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سُنے تو اُنھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپیہ کی تدبیر کرکے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوا دی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شایع ہوگئے۔

گاڈفری ہگنز کی کتاب کا ترجمہ کرنا

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو کسی زمانے میں مصنف مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی ایک جرمن کتاب فروش کی مشہور دکان سے جہاں ہر زبان کی پُرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں، سرسید نے دس گنی قیمت پر لندن میں خریدی۔ اصل مطلب اس کے خریدنے سے یہ تھا کہ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں اُس سے مدد لی جائے مگر اُنھوں نے ہندوستان میں آکر اُن لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کرکے اُس کا اُردو ترجمہ[1] بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شایع کر دیا۔

---

[1] یہ ترجمہ مشہور عالم مولوی محمد احسن مرحوم پروفیسر بریلی کالج نے کیا تھا۔

رسالۂ ابطال غلامی اگرچہ یہ مضمون بقدر ضرورت خطبات احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں شایع کیا اور پھر اُس کو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما جنھوں نے اُن اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر رکھے ہیں جو یوروپ کی قومیں اسلام اور اہل اسلام پر کرتی ہیں اُن کو تو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے اُس میں کیا بُرائی ہے اور وہ اُصول اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں؟ اُن کے نزدیک حمیت اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے اگر قدرت ہو تو اُس کا منہ بند کر دیں ورنہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نئی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے، کیا اثر کرتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معترضین کی غلط فہمیوں کو اس وقت رفع نہ کیا جائے تو ہماری نسلیں، جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونے والی ہیں۔ وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاصکر انگریزوں کی قوم میں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمراں ہیں، مذہب اسلام کس نظر سے دیکھا جائے گا۔

انھیں مطاعن میں سے ایک طعن جوازِ استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قومیں مذہب اسلام پر اس لیے کرتی ہیں کہ نصف صدی سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی تک جو غلاموں کی حالت زار یوروپ اور امریکا میں تھی اُس بے رحمی اور سنگدلی کی نظیر اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی بان نے جیسا کہ احمد شفیق بک نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے اپنی کتاب تمدن عرب میں اُن بے رحمیوں

کا بیان کرنے کے بعد جو عیسائی قومیں غلاموں پر کرتی تھیں۔ صاف اقرار کیا ہے کہ "حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائیوں میں جاری تھی" لیکن اسی بے رحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیک دل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ اُن کی حمایت کے لیے کھڑے ہوگئے یہاں تک کہ غلامی کا نام دفعتاً تمام یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا۔

پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہوسکتی ہے کہ جو قومیں غلاموں پر ایسی تھیں اور جن کے مذہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دنیا میں غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھ کر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھیے تو گویا غلامی کو بالکل معدوم کر دیا وہی تمام دنیا میں بردہ فروشی کے ناجائز و ناشائستہ رواج میں سب سے زیادہ بدنام ہیں اور انھیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے۔

سرسید نے ایک آرٹیکل میں جو رسالہ ابطال غلامی کے علاوہ انھوں نے اسی مضمون پر لکھا ہے لکھتے ہیں "ولیم ہوورڈ رسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ادیب ہیں اپنے روزنامچہ میں اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اس نے اس نیکی کے حاصل کرنے اور رسم بد کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے" اس کے بعد سرسید کہتے ہیں کہ "اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھ کر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس لفظ نے ہمارے دل کو رنجیدہ کیا اس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اسمٰعیل پاشا کے اس نیک کام کی تعریف کی ہے وہاں یہ بھی لکھا کہ اس نے برخلاف اپنے مذہب و ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے۔ اس تحریر پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے انھوں نے ٹھیک لکھا ہے مگر ان کا فر مسلمانوں سے ناراض ہوئے جنھوں

نے اپنے افعال ناشائستہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر قومیں ان افعال کو مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہب اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تہذیب اور شائستگی اور انسانیت مذہب اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔"

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبدالمجید خاں اور اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطور مصلحت ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۸ء تک وہاں بھی کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی جو بردہ فروشی کے نالائق طریقہ کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔ حالانکہ ٹرکی، مصر اور افریقہ کے دیگر ممالک اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے، کیونکہ دنیا میں کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب وسط افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا، جہاں ایک مدت سے سلاطین یوروپ انسداد بردہ فروشی کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور عیسائی مشنری تمام یورپ اور افریقہ میں منادی کرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پنجۂ ظلم سے نکالو۔

بارے ۱۸۸۸ء میں یعنی سرسید کی تصنیف سے انیس برس بعد، مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل احمد شفیق بک کو، جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے، یہ خیال اُس وقت پیدا ہوا جبکہ کارڈنل لاویجری پیرس کے ایک مجمع میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ بردہ فروشی کے مظالم پر لکچر دے رہا تھا اور اُس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر نہیں بلکہ مذہب اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اس رسم بد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد احمد شفیق بک نے دیکھا کہ وہ لکچر یوروپ میں عام طور پر شائع ہوگیا، اس لیے اُنھوں نے ایک رسالہ فرانسیسی زبان میں لکھا، جس کا ترجمہ احمد ذکی افندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالہ کی جس قدر شہرت اور وقعت یوروپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ٹرکی کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب سے تئیس برس

پہلے سرسید لکھ چکے تھے اور جس کا صلہ اُن کو یہ ملا تھا کہ بجائے عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اُن کے رد لکھے، کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار المؤید مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۰۱ء میں اس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ "اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی چنانچہ کبرا و فضلائے اہل اسلام نے جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں، احمد ذکی آفندی سے نہایت التجا کے ساتھ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے عربی میں کرایا۔" اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میسر نے اس رسالہ کو دیکھ کر مصنف کو لکھا "کہ تم نے اپنے حریف (یعنی کارڈنل لاویجری) کو لاجواب کر دیا اور بے شک حق تمہاری جانب ہے۔" اسی طرح فرانس کے آٹھ بڑے بڑے مشاہیر نے رسالہ مذکور کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے پر مبارکباد لکھی خصوصاً موسیو بوکارا انسپکٹر کمپنی نہر سویس نے لکھا کہ "میں نہایت قدر کرتا ہوں تمہارے اس کام کی جو تم نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لیے کیا ہے اور کیا اچھا ہو اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لیے کھڑا ہو۔" رستم پاشا سفیر سلطانی جو اس وقت لندن میں تھے اُنھوں نے رسالہ مذکور کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا کہ "اس رسالہ سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور اُن اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گذرتے ہیں تقسیم کروں گا۔" احمد ذکی آفندی مترجم رسالہ مذکور لکھتے ہیں کہ "بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یوروپ میں مشہور ہو گیا، یوروپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اس پر عمدہ عمدہ ریویو لکھے گئے اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ بجنسہٖ اول سے آخر تک چھاپ دیا گیا۔"

الغرض اسلام کی اس ضروری اور اہم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد خاں کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو فضیلت اور فوقیت مذہب اسلام کو تمام دنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک کا احسان

اُس نے لونڈی غلاموں کے ساتھ کیا ہی اُس کو صاف صاف دنیا پر روشن کریں۔ انھوں نے اول سنہ ۱۸۷۰ء میں جہاں سر ولیم میور کے اور مطاعن و اعتراضات کے جواب خطبات احمدیہ میں دیے ہیں انھیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شافی بحث کی ہی جس کے بعد عیسائیوں کے مقابلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایک دعوے فقہائے اسلام کے خلاف تھا اور جب تک اصول شرع کے موافق اُس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ تھا اس لیے اُنھوں نے ۱۸۹۳ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھ کر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔ اس رسالہ میں اول بطور تمہید کے دلائل عقلیہ غلامی کی بُرائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کیے ہیں اور پھر لکھا ہی کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانتا پسند کرتا ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ وَکُلُّ نِسَائِکُمْ اِمَاءُ اللّٰہِ"[2] اور یہ جو کہا جاتا ہی کہ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی بُرائی نہیں، اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہی اور اُن کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہی اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھا ہی کہ "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا مگر رسول اللہ صلعم نے جو کچھ اُس کی نسبت کہا اُس کو کسی نے نہیں سمجھا" پھر جس جس طریقہ سے زمانۂ جاہلیت میں غلام بنائے جاتے تھے اُس کی تفصیل لکھی ہی اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم کو جو اُس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں

---

[1] چونکہ سرسید نے غلامی پر کوئی علیحدہ مضمون انگریزی میں شائع نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شائع ہوئی تھیں اس لیے اس کی شہرت یورپ میں نہیں ہوئی جیسی امیر علی صاحب کے رسالہ کی ہوئی۔

[2] یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں۔

کی طرح جاری تھی اُس کا دفعۃً موقوف کر دینا صرف مصالح ملکی کے برخلاف ہی نہ تھا بلکہ ایسا کرنا انواع واقسام کے گناہوں کا موجب ہوتا چنانچہ اب بارہ سو برس بعد بھی یورپ کے بڑے بڑے مدبر جنھوں نے غلامی کے معدوم کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکے کہ آیندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی تدبیریں کیں مگر اُن کی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیروں میں یہ فرق تھا کہ اُن کی تدبیریں زیادہ تر مادی چیزوں سے اور بانی اسلام کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خمری کو بتدریج موقوف کیا تھا اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اول طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی یہانتک کہ بردہ آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا، بعض گناہوں کے کفارہ میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں اُن سے یہ اقرار نامہ لے کر چھوڑ دو، جن سے اُن کے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں اُن کی خیرات یا چندہ سے مدد کرو، بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لیے روپیہ دینا تجویز کیا، بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لونڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خود بخود آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح اور طرح طرح کی سبیلیں اُن کے آزاد کرنے کی نکالیں۔ مالک کو اُن کے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ اُن سے زیادہ خدمت نہ لیں، اُنھیں لونڈی غلام کہہ کر نہ پکاریں، اُن کو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، اُن کو اُن کے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ

یہانتک سرسید کا بیان جمہور علمائے اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اس کے بعد اُنھوں نے دو دعوے نہایت شد و مد کے ساتھ کیے ہیں جن میں بظاہر وہ متفرد معلوم ہوتے ہیں پہلا دعویٰ اُن کا یہ ہے کہ لڑائی کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ اس کے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علمائے

استرقاق کا حکم استنباط کیا ہے اُن کو نقل کرکے ثابت کیا ہے کہ ان سے استرقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جو الفاظ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے ما ملکت ایمانکم، فتحریر رقبۃ، عبداللہ، فتیاتکم وغیرہ اُن کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک جبتک آیۂ منّ و فداء نازل نہیں ہوئی اُس وقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے (جن کی تفصیل اُنھوں نے لکھی ہے) برابر لونڈی غلام بنائے جاتے تھے، اور نیز بعد اترنے آیۂ مذکورہ کے گو آیندہ کے لیے استرقاق کی ممانعت ہوگئی مگر جن کے پاس لونڈی غلام پہلے سے موجود تھے اُن کو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ آیۂ مذکورہ میں صرف آیندہ کے لیے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔ پس قرآن و حدیث کے جن الفاظ سے رقیت کا وجود رسول خدا صلعم کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے وہ انھیں لونڈی غلاموں سے متعلق ہیں جو آیۂ مذکورہ کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔

دوسرا دعویٰ اُن کا یہ ہے کہ سورۂ محمد کی اُس آیت سے جس میں یہ حکم ہے کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو یا فدیہ لے کر، اسلام نے رسم استرقاق کو جو کل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا، لونڈی غلام بنانا، فدیہ لیکر یا احسانا چھوڑ دینا، یہ چاروں باتیں رائج تھیں اور اسلام میں بھی، جبتک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا، ایسا ہی ہوتا رہا لیکن جب سے یہ آیۂ منّ و فداء نازل ہوئی پھر آنحضرت نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا، یعنی جاہلیت میں جو اسیرانِ جنگ کے ساتھ چار طرح کے برتاؤ کیے جاتے تھے اُن میں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور

---

[1] یعنی سورۂ محمد کی یہ آیت "فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء"۔

صرف منّ وفدا میں اختیار دیا گیا ہے یا بغیر کسی معاوضے کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لیکر چھوڑ دو۔

اس دوسرے دعوے کے متعلق اُنھوں نے بہت سی موافق و مخالف روایتیں کتب احادیث سے نقل کرکے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہے کہ آیۂ منّ وفدا کے نازل ہونے کے بعد رسول خدا صلعم کے عہد میں پھر کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا۔ اور بعد آنحضرتؐ کے صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ جب قرآن مجید یا حدیث صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیۂ منّ فدا سے صاف پایا جاتا ہے کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدائے اسلام میں لونڈی غلام بنائے جاتے تھے اُس کی صاف ممانعت ہوگئی اور اُس کے بعد آنحضرتؐ نے کسی قیدی کو لونڈی غلام نہیں بنایا اب ہم کو کچھ ضرورت اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہم نے اس باب میں کیا کیا!

اس بیان کی تائید اُنھوں نے اس طرح سے کی ہے کہ شراب کی حرمت نازل ہونے کے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہوگئی یہانتک کہ تین دفعہ اُس کی حرمت نازل ہوئی۔ پھر باوجودیکہ بیع اُمّہاتِ اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرتؐ کے زمانہ میں تسلیم کیا جاتا ہے تاہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اس کے سوا متعہ کی حرمت سے عمر فاروقؓ کی خلافت تک صحابہ ناواقف رہے۔ پس اسی طرح ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں آیۂ منّ وفدا سے جو اصل مقصود تھا اُس کو بھی صحابہ نہ سمجھے ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لے کر چھوڑنے کا دستور برابر جاری تھا، پس اس آیت کے اترنے کے بعد جو تمام قیدی کسی نہ کسی طرح چھوڑ دیے گئے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اُس کو سب نے ایک اتفاقی بات سمجھا ہو اور بعد آنحضرتؐ کے خلافت راشدہ میں اس مسئلہ پر بحث کا موقع اس لیے نہ ملا ہو کہ پہلی خلافت مرتدین کے مطیع کرنے میں ختم ہوگئی دوسری اور تیسری خلافت

میں دارالخلافہ سے دور دور کے فاصلے پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہوگیا اور اس لیے چاروں خلافتوں میں اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ امید نہیں ہو کہ علمائے اسلام اور خاصکر ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف جمہور فقہا و علمائے اسلام کے قائم کی ہے چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جواز استرقاق پر سرسید کے برخلاف انھیں دنوں میں جب کہ پہلی بار ابطال غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تھا، لکھا جاچکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہا و مفسرین اور تعامل اہل اسلام کے برخلاف ہے اسی طرح تعامل اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں۔ بیشک نہ قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں لونڈی غلام بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ آیۂ مَن و فدا کے حصر کی کوئی ایسی معقول دلیل ہوسکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوائے مَن و فدا کے تیسرا سلوک کیا جاسکتا ہے اور نہ اُن لوگوں کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نص قرآنی موجود ہے جس کو آیۂ مذکور کا ناسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہوسکتا کہ آیۂ مذکور نے اُس سلوک کو جو اسیران جنگ کے ساتھ کرنا چاہیے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے، یا احسان رکھ کر چھوڑنا یا کچھ چھڑائی لے کر چھوڑنا۔ ورنہ آیۂ مذکور کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

اس تقدیر پر، اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو، مسئلہ متنازع فیہ کی صورت بعینہٖ ایسی ہوگئی ہے جیسے عبداللہ ابن عباس سے مسح رجلین اور غسل رجلین کے باب میں منقول ہے کہ "لا اجد فی کتاب اللہ الا المسح ولکنھم ابوا الا الغسل" یعنی میں قرآن میں تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن صحابہ نے صرف غسل ہی کو اختیار کیا ہے۔

اگرچہ عام طور پر تمام اہل اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال سرسید کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانہ میں آیۂ مَن و فداء سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اسیران جنگ کے ساتھ مَن و فداء کے سوا اور کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا، یعنی ایک دفعہ، جیسا کہ کتاب عقد الفرید میں مذکور ہے، حجاج کے روبرو کچھ اسیر لائے گئے۔ حجاج نے اُن کے قتل کیے جانے کا حکم دیدیا۔ ایک قیدی نے جب کہ اس کو قتل کرنے لگے، حجاج کو بددعا دی اور کہا کہ خدا تعالیٰ تو اپنی کتاب میں یہ کہتا ہے کہ " فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء"، اور تمہارا شاعر اپنی قوم کے مکارمِ اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے۔

" وَمَا نَقْتُلُ الْاَسْرٰی وَلٰکِنْ نَفُکُّھُمْ إِذَا اَثْقَلَ الْاَعْنَاقَ حَمْلُ الْقَلَائِدِ"

(یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ اُن کو جب کہ اُنکی گردنیں طوقوں کے بوجھ میں دبی جاتی ہیں چھوڑ دیتے ہیں)

یہ سُن کر حجاج نے (گویا مقتول قیدیوں کی طرف مخاطب ہوکر) کہا " تمہارا بُرا ہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافق نے مجھ کو جتائی" اور یہ کہہ کر باقی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

حجاج ہی کا ایک اور قصہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں درج ہے یعنی حجاج کے سامنے ایک اسیر لایا گیا۔ حجاج نے عبداللہ ابن عمر سے، جو اس وقت وہاں موجود تھے، کہا کہ اُٹھو اور اس کو قتل کر ڈالو۔ ابن عمر نے فرمایا " ہم کو یہ حکم نہیں ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے " اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً "

اگرچہ احمد شفیق بک نے آیۂ مَن و فدا پر زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجہ کے لحاظ سے اُن کے اور سرسید کے استدلال میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ احمد شفیق کی تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ عرب پشت ہاپشت سے لونڈی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت ان کی طبیعت ثانی ہو گئی اور اسلام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک و جہالت کا استیصال کرنا تھا اس لیے غلامی کا دفعۃً موقوف کردینا ضرور

اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل انداز ہوتا لیکن جو نصیحتیں بانی اسلام نے غلاموں کے حق میں مسلمانوں کو فرمائیں اور جو بے شمار حقوق اُن کو عنایت کیے اور جس طرح اُن میں اور اُن کے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا درجہ قائم کیا اُس سے صاف ظاہر ہی کہ اسلام نے غلامی کی سوتیں بالکل بند کر دیں۔ اس کے سوا اسلام صرف اُن غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہی جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور اس پر بھی اُن کو ہمیشہ کے لیے مملوک رہنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ جس طرح بادشاہ اسلام اُن کو احساناً چھوڑ سکتا ہی اسی طرح وہ خود فدیہ دے کر چھوٹ سکتے ہیں۔ پس جو حبشی وسط افریقہ سے ناجائز طور پر پکڑے جاتے ہیں وہ عام اس سے کہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اصول اسلام کے موافق لونڈی غلام نہیں ٹھہر سکتے۔

اس بیان میں اور سرسید کے بیان میں، جیسا کہ ظاہر ہے اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرسید کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لونڈی غلام نہیں بن سکتے اسی طرح اسیرانِ جنگ بھی لونڈی غلام نہیں بنائے جا سکتے بلکہ اُن کے قید ہونے کے بعد مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اُن کو احساناً چھوڑ دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اور احمد شفیق بک کے نزدیک وہ قید ہونے کے بعد لونڈی غلام تو بن جاتے ہیں مگر اس کے بعد اگر مسلمان اُن کو احساناً چھوڑ دیں تو وہ فدیہ دیکر چھوٹ سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر ظاہراً ثمرۂ اختلاف صرف یہ نکلے گا کہ احمد شفیق بک کے نزدیک اگر مسلمان اُن کو احساناً نہ چھوڑیں تو جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے بدستور لونڈی غلام رہیں گے اور سرسید کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کر سکیں تو مسلمانوں کو چار و ناچار اُنھیں چھوڑنا پڑے گا کیونکہ اُن کے نزدیک درحقیقت رقیت طاری نہیں ہوئی۔

بہرحال سب سے پہلے سرسید نے اور اُن کے بعد مصر کے اس روشن ضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کر دیا ہی کہ جو سلوک اور احسان لونڈی غلاموں پر اسلام نے کیا ہی وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گو نصف صدی سے بلحاظ حسن معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاصکر انگلش

قوم نے اس باب میں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہو مگر مذہب کی رو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کر سکتے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھیراتی ہے اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تاکید کرتی ہے، تمام عہد جدید میں کوئی صریح نص غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی، بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں، جو دینِ عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف و جوانب میں بھیجے گئے، کوئی حکم غلاموں کی نسبت اس کے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں، اُن کی اطاعت کریں، اُن سے ڈریں، اُن کی ایسی فرماں برداری کریں جیسی عیسیٰ مسیح کی کرتے ہیں، اُن کو ہر تعظیم و تکریم کے لائق سمجھیں اور اگر اُن کے آقا عیسائی ہوں تو اُن کی خدمت گزاری میں اور بھی زیادہ مبالغہ کریں۔ برخلاف اس کے بانی اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ جہاں نصیحت کی ہے وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی کی ہے اور طرح طرح سے اُن کے آزاد کرنے کی ترغیبیں دی ہیں اور مالک و مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کے لیے بالکل موقوف کر دیا ہے۔

تفسیر قرآن سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہے اس کا مختصر ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے، یہاں ہم اُس کی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں ما بہ الامتیاز ہیں اور جن سے سرسید کی نیت کا اور اُس ضرورت کا جس نے اس تفسیر کے لکھنے پر اُن کو مجبور کیا، کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے قدیم مفسروں نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو جو اُن کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں، بخوبی پورا کیا اور اپنی آسمانی کتاب کی خدمت کا حق بحسب ضرورت ادا کرتے رہے سب سے پہلے اُن کو اس بنا پر کہ تفسیر بالرائے کی نسبت حدیث میں وعید وارد

ہوئی تھی، اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتب احادیث میں روایت کیے گئے ہیں اُن سب کو تفسیروں میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو وہ امت تک پہنچنے سے رہ نہ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ قدما کی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے کی گئی تھی بے شمار روایتیں تفاسیر قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں جن کے لحاظ سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ "کتب التفسیر مشحونة بالاحادیث الموضوعة" اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ پچھلوں نے قدما کی تفسیروں میں جو رطب و یابس روایتیں پائیں بغیر اس کے کہ اصول علم حدیث کے مطابق اُن کی تنقید کریں اُن تمام رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا اور مخالفوں کے لیے اعتراض کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور و دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں، جن کی مادری زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے اندازہ نہیں کر سکتے تھے، پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر بموجب قواعد صرف و نحو معانی و بیان کے بحث کی جائے اور وجوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں اس ضرورت کو بھی ہمارے علمائے اُس زمانہ کی حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شایع ہوئی اور مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اپنے عقاید اور اصول کے موافق منطق اور فلسفہ کی رو سے کرنے لگا تو علمائے متکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیروں میں مذہب حق کی تائید دلائل عقلیہ سے کی جائے بعض مفسروں نے اپنی تفسیروں کی بنیاد جزئیات فقہیہ کے استنباط اور اختلافی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے

قدیم مفسروں کو پیش آئی اُس کو باحسن وجوہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو۔ اُن کے مذہب کے متعلق در پیش ہیں ویسی ضرورتیں اگلے زمانہ میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اس لیے ہمارے علما کو تفسیروں میں ان کے پورا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرۂ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا اُن کا رعب و داب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب ہے تو ضرور اُن کا رعب و داب روز بروز بڑھتا جائے گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا رعب و داب قائم ہوا اور فوراً اُن کا مشن اور اُن کی تجارت سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی۔ اگرچہ عیسائی حکومتوں میں عموماً اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں کبھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دی جائے سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ حکمراں قوم کی رسوم و عادات و اوضاع و اطوار و اخلاق یہاں تک کہ اُن کے دین و مذہب کی طرف محکوم قوم کا دل خود بخود کھچتا ہے اور جب کہ سلطنت کے ساتھ دعوت دین بھی شامل ہو اور کروڑوں روپیہ حکمراں قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل و دانش اور شائستگی و تمدن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیل مذہب کی موجود ہوں تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ جائے گی، اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیسا کہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہیں گے، مسلمانوں کے پولٹکل زوال کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور اس لیے اسلام کی حقیقت کا سکہ ابھی اُن کے دل پر بیٹھا ہوا ہے، آباد اجداد کی مذہبی عظمت اُن کو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی اُن کو بالکل

مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ ابھی اُن کی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے۔ تبدیلِ مذہب سے جو ذلت قوم اور خاندان کی نظر میں ہوتی ہے ابھی تک وہ اُس کو گوارا نہیں کرسکتے۔ لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر اُس کا دُھیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ مبادا آخرکار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بزرگوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اور مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ انھیں دنوں میں پنجاب کے ایک دیسی مشنری کی تحریر ہماری نظر سے گذری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصہ میں صرف امرت سر کے گرجا میں ۵۲ مسلمانوں نے بپتسما پایا ہے اور دہلی کے صرف باپٹسٹ مشن میں ۲۰ مسلمانوں نے اصطباغ لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آئی۔ وہ جہاں گئے اور جہاں جاکر رہے اسلام کا رعب و داب اُن کے ساتھ ساتھ رہا، وہ اس عرصہ میں کبھی کسی غیر قوم کے، جو اپنے دین کی اشاعت میں مثل عیسائیوں کے سرگرم ہو، محکوم ہوکر نہیں رہے۔ اور اس لیے ہمارے قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیراندیشوں کو نظر آتی ہیں، کبھی محسوس نہیں ہوئیں۔

دوسری ضرورت، جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے، اسلام کو سائنس کے حملہ سے بچانے کی ہے۔ علوم جدیدہ کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے ویسا ہی تمام دُنیا میں روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے اور جو صدمہ کہ اُس نے یوروپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدمہ دُنیا کے تمام مذاہب کو اُس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے۔ شام و مصر و ٹرکی میں علوم جدیدہ کی اشاعت کو غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا، اس قلیل عرصہ میں اُس سے جو نتائج ممالک مذکورہ میں باوجود اسلامی سلطنت ہونے کے پیدا ہوئے ہیں اُن کو طرابلس کے ایک مشہور

عالم شیخ حسین آفندی نے اپنی کتاب حمیدیہ[1] میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ جو مسلمان نوجوان مدارس میں علوم جدیدہ اور خاصکر فن طبیعات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اُن کو اُس سے کچھ لگاؤ باقی نہیں رہتا وہ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثار موجودات کو مادّہ اور اس کے اجزا کی حرکت اور قوانین طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جب کہ اُن کا حال الوہیت کے اعتقاد میں، جو اصل اصول اسلام ہے، ایسا ہو تو پھر کونسا اعتقاد دین اسلام کی نسبت اُن میں باقی رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد مصنف ممدوح اپنے ہموطن مسلمانوں کو اُس آفت اور بلائے عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو اُن کی اولاد میں پھیلتی جاتی ہے اور اُن کو ہوشیار کرتا ہے کہ پہلے اس سے کہ یہ مصیبت لاعلاج ہو جائے اُس کا تدارک کریں۔

ظاہر ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم جبکہ ممالک اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی ہے تو ہندوستان میں اسلام کیونکر اُس کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ مسلمان اُن نتائج سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کی تعلیم سے دست بردار ہو جائیں وہ پہلے ہی اپنی اُس غفلت اور فروگذاشت پر کف افسوس مل رہے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت اُن سے ظہور میں آئی اور وہ کیونکر اُس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس سے ٹرکی اور شام اور مصر کے مسلمانوں کو بھی کسی طرح مفر نہیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی اولاد کو صرف اس اندیشہ سے مغربی تعلیم نہ دلانا کہ وہ دین اسلام سے بد اعتقاد نہ ہو جائیں گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام فلسفہ جدیدہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا اور اسلام کا اعتقاد سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔

---

[1] یہ کتاب ۱۳۰۵ھ میں اُن شکوک و شبہات کے رفع کرنے کی غرض سے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اصول اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملک شام میں لکھی گئی ہے جس کا نام مصنف نے سلطان عبدالحمید خاں باالقابہ کے نام نامی پر "حمیدیہ" رکھا ہے ۱۲

جو ضرورتیں ہم نے اوپر بیان کیں بے شک اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو محسوس نہیں ہو سکتیں جن کے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے بالکل پاک ہیں یا جو بقائے دین اسلام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتے کہ صرف اُن کے خاندان کا محدود حلقہ الحاد یا ارتداد کے صدمے سے محفوظ رہے گو کہ ساری دنیا ملحد و بد مذہب ہو جائے، لیکن جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیل مذہب سے اُن کو وہی صدمہ پہنچا ہے جو اپنے کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہیے اُن کو یہ ضرورتیں روز روشن کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اُن کو وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہب کا اعتقاد جب تک کہ اس کو زمانۂ حال کے شکوک و شبہات سے منزہ اور مبرا ثابت نہ کیا جائے گا محض آبا و اجداد کی تقلید سے قائم نہ رہے گا۔

۱۸۸۰ء میں ایک مرزا صاحب نے سرسید پر یہ اعتراض لکھ کر شائع کیا تھا کہ "سید صاحب دنیوی ترقی کی کوشش میں مذہبی بحث کو کیوں دخل دیتے ہیں" اس پر لاہور گورنمنٹ کالج کے ایک مسلمان طالب علم نے کچھ لکھ کر علیگڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سرکاری مدارس میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا، خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان جس کا اعتقاد اپنے مسائل مذہبی پر ویسے ہی استحکام سے ہو جیسا کہ پیشتر تعلیم سے تھا۔ ممکن ہی نہیں کہ انگریزی پڑھ کر شرقی قصوں اور کہانیوں اور دیووں اور پریوں کی داستانوں کو جھوٹا نہ سمجھے اور جن کتابوں میں اُن کا ذکر ہو اور پھر اُن کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو اُن کو لغو اور بیہودہ نہ جانے۔ آج کل کے طالب علموں کے اگر دل چیر کر دیکھے جائیں تو معلوم ہو کہ اُن کے مذہبی مسائل اُن کے دل میں کیسے کیسے کھٹکتے ہیں، اور کوئی مُلّا مولوی اُن کی تشفی نہیں کر سکتا۔ بعض جو بہت آزاد طبع ہوتے ہیں اور اپنے کانشنس کو دبا نہیں سکتے اور بغیر کافی دلیل کے اس کو زبردستی جھٹلا نہیں سکتے وہ عیسائی یا لا مذہب ہو جاتے ہیں ..... شکر ہے کہ سید صاحب نے اصلاح مذہبی سے اس آفت کو روکا . . . اسی اصلاح نے پادریوں

کی امید کو توڑا۔ اگر سید صاحب یہ اصلاح نہ کرتے تو نہ معلوم مدرسۃ العلوم ہی کے کتنے مسلمان طالب علم اصطباغ پا چکے ہوتے ۔ ۔ ۔ ہماری رائے میں سید صاحب کے تمام کارہائے نمایاں میں جو نہایت قدر و منزلت کے لائق بات ہے اور آیندہ کی ترقی کی جڑ ہے۔ وہ وہی حصہ ہے جس کو مرزا صاحب قابل تنفر قرار دیتے ہیں۔ کاش اگر مرزا صاحب چندے کالج میں رہے ہوتے تو وہ سید صاحب کے اسی کام کو جس کو وہ اب قابل نفریں قرار دیتے ہیں، نہایت عمدہ بلکہ تمام کارہائے نمایاں کی جان قرار دیتے اور جو تحریریں اب باعث دلشکنی اور موجب ضلالت و گمراہی خیال کی گئی ہیں، ہم مرزا صاحب کے گلے میں بطور حرز جان کے لٹکتی دیکھتے "

یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے جس کی شاید لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو، مگر اس قول کے موافق کہ "اهل البیت ادری بمافی البیت" انگریزی خواں طلبہ کے نزدیک اس نوجوان طالب علم کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادت سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے اور اس کا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ "عید کے روز روئے زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں جس کو تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سنتی ہے اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اے امت محمدیہ اس خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے۔" اس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی وہاں موجود تھے، جب وعظ ہو چکا تو مسجد سے باہر نکل کر ان میں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ عجب تماشا ہے جن کو عیدگاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سن نہیں سکتے اور تمام نباتات و جمادات سنتے ہیں پھر اگر ہم لوگ عیدگاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کے صدہا واقعات ہر روز دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوئی ہیں جو اس قسم کی ضعیف و موضوع روائتیں بیان کر کے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہر گروہ کے ساتھ اس کی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیے، سب کو اسی قدیم دستور کے موافق ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سر سید نے انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد ۱۸۷۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیا تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السموات، ابطال غلامی، ازالۃ الغین فی تصنیف الرحمٰن ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم وغیرہ وغیرہ کے جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیے، سر سید سے یادگار رہ گئے۔

سر سید نے اس تفسیر میں اُن مضامین سے بہت ہی کم تعرض کیا ہے جن کو قدیم مفسرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کر چکے تھے، یا جن کے بیان کرنے کی اس زمانہ میں کچھ ضرورت نہ تھی، بلکہ اُنھوں نے زیادہ تر انھیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور جن سے اگلی تفسیریں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

پہلی خصوصیت | مثلاً ہمارے مفسرین نے اخبار ماضیہ کی تنقیح پر، جو کہ قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں، بہت ہی کم توجہ کی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ اُن کو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اُس زمانہ میں اطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فروگذاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔

اگرچہ قرآن مجید میں امم سابقہ کے قصے ایسی تفصیل کے ساتھ جیسی کہ بائبل میں درج ہیں، بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر اُن قصوں کی طرف ترہیب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کیے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصے کتب سابقہ میں مفصل مذکور ہیں اور قرآن میں اُن کتابوں کی جا بجا تصدیق کی گئی ہے اس لیے ضرور تھا کہ ہمارے مفسرین جہاں تک ممکن ہوتا قرآن مجید کے اُن اجمالی قصوں کی تفصیل کتب سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں بیانوں میں تطبیق یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات علمائے مسیحی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدس کتابیں جن کا ذکر بائبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے اب ناپید ہو گئی ہیں اور اس لیے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ موجودہ مجموعۂ بائبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائبل میں بھی اسی طرح یا کسی قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں ان کی تطبیق کرنی یا عدم مطابقت کی وجوہ بیان کرنی خاص کر اس زمانے میں ایک ایسی بات تھی جس کی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔

سرسید نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصہ یا واقعہ کا، جو قرآن میں مذکور ہوا ہے، تا بمقدور بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائبل کی تطبیق کی ہے یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصہ کا پتہ موجودہ بائبل میں نہیں لگا تا بمقدور اُس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ مثلاً طالوت اور جالوت

مثال ۱ | کی لڑائی کا قصہ جو سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، یہی قصہ شموئیل نبی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اُس میں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے کہ:۔

"إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ" لیکن یہی مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں، جہاں جدعون کی مدیانیوں پر لشکرکشی کا ذکر ہے، مندرج ہے۔ اس لیے عیسائی مؤرخوں نے قرآن کے

بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اُس میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموئیل کے بعض ابواب کے متعدد درس صحیح نہیں ہیں اور جان کیٹو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بالکل درکاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا تھا اُنھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔ اس کے سوا یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے، بعض تین نبیوں کی اور بعض یرمیاہ نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ شموئیل نبی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اُس سے باسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات الٹ پلٹ ہو گئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں۔

مثال ۲ | یا مثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلق طیر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اس لیے عیسائی اُس کو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گو یہ واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے لیکن دو انجیلیں جو اناجیلِ طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جن کو ایک زمانہ میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں، اُن میں یہ واقعہ جس کا قرآن میں اجمالی ذکر ہوا ہے، بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور اُن انجیلوں کا تمام بیان جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

مثال ۳ | یا مثلاً عیسائی قرآن کی اُن آیتوں کے مضمون پر اعتراض کرتے ہیں جن سے قوم

عاد کا قوم نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا اور حضرت ہودؑ کا قوم عاد کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل میں اُس کا کچھ ثبوت موجود نہیں ہے مگر سرسید نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں اُن کتبوں کے بموجب جو اوّل معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمن حاکم یمن کو ملے تھے اور اب ۱۸۳۴ء میں انگریزوں کو یمن کی پیمایش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں، عیسائیوں کے دونوں اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹر نے جو غلط نتیجے اُن کتبوں سے نکالے ہیں اُن کی غلطی ثابت کی ہے۔

غرض کہ تاریخی اور جغرافی تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق ہے اُس کی طرف سرسید سے پہلے ہمارے مفسروں نے بہت ہی کم التفات کیا تھا۔ شاید اگلے زمانے میں اس کی ضرورت نہ ہو اور ہر مسلمان کے یقین کے لیے کسی واقعہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن اس زمانے میں اس کی نہایت ضرورت تھی۔ قطع نظر مخالفین کے اعتراضات کے جن کو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہے، خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تشفی کے لیے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں، زمانۂ حال کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کرنا اور درصورت عدم تطبیق کے تاریخی و جغرافی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہے۔

اگر ہمارے قدیم مفسروں نے بھی اپنی تفسیروں میں امم سابقہ کے حالات کثرت سے قلمبند کیے ہیں لیکن اول تو ان کا ماخذ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض اُن روایتوں کو اصول حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہیں جن کے دل شکوک و شبہات سے بالکل پاک ہیں نہ کہ عیسائیوں کے لیے جو قرآن مجید کے قصوں پر مورخانہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو یوروپین مصنفوں کے اعتراضات اُن کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعضے ایسے قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں جیسے ذوالقرنین کا قصہ یا اصحاب کہف کا قصہ۔ سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات میں بھی کمالِ تعمق کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انہوں نے دو علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور دونوں کا جس قدر بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اُس کے تمام جزئیات کو تاریخ مسلّمہ پر منطبق کرنے میں کوشش کی ہے۔ لیکن ذوالقرنین کے قصہ میں جو انہوں نے چی دانگٹی فغفورِ چین کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھیرایا ہے اُس پر بلاشبہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں اُن میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو عرب یا اُس کے قرب وجوار میں مشہور و مسلّم نہ ہو۔ پس کسی طرح قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسے اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ جس کے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں خاصکر نزولِ قرآن کے زمانہ میں بالکل بے خبر تھیں۔ اُس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے اُمیوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہو۔ اکثر مفسرین نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور ابوریحان بیرونی نے بنی حمیر کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس بن عیبر بن افریقس کو اُس کا مصداق ٹھیرایا ہے مگر یہ دونوں قول سرسید کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں حق یہ ہے کہ اس قصہ کی کوئی تفسیر اب تک ایسی نہیں کی گئی جس میں اُس کے تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو اور باوجود اس کے قرآن کے ظاہر سے ذرہ کے بھی خلاف نہ ہو۔

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراضات زمانۂ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے اُن مسائل و معتقدات پر وارد کرتے ہیں جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے جہاد، حج، صوم رمضان، طلاق، حرمت ربا، معراج، بہشت و دوزخ وغیرہ وغیرہ، اُن اعتراضوں اور اُن مسائل و معتقدات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے مقتضائے وقت کے موافق اُن کو دفع کیا گیا ہے اس کی نظیر قدیم تفسیروں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم اُن میں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار

کے ساتھ بطور نمونے کے ناظرین کی اطلاع کے لیے بیان کرتے ہیں

مثال ۱ | سب سے بڑا معرکۃ الآرا جہاد کا مسئلہ ہے جس پر سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھنے سے پہلے کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکورہ کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جن کو تیرہ سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا ایک زبردست آلہ بنا رکھا تھا اور جن کی بدولت واقعہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اُنھوں نے اول سورۂ بقرہ کی اُن آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکین مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے، اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں "اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اُس میں تحمل اور بردباری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُن کی صبر کے ساتھ برداشت نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لیے نہایت بداخلاقی اور ناانصافی سے برتا اور مفتی در ملّاؤں نے بھی بدتر کام کیے اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لیے ایسے مسئلے بیان کیے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو بُرائی قرار دی جائے وہ انھیں پر محدود ہے جنھوں نے ایسا کیا، نہ اسلام پر"۔

"اسلام میں اگرچہ جا بجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور اُن پر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانونِ قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم

ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں، مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور چونکہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں، کبھی ان پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بُردبار و تحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکا چوند آجاوے نہیں ہے۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان کا لوگوں میں کیا اثر ہوتا تھا؟ انجیل میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے" بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے؟ اور اسی طرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے؟ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ "جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اٹھ جاوے" مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ہوگا؟ یہ سب ایسی شاعرانہ باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔"

"عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا، مگر دیکھو کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا؟ ایک بھی نصیحت اس کی کام نہ آئی اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اس کی جڑ لگائی گئی تھی اس نے کچھ پھل نہیں دیا، کیونکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی، کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی، اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اسی درخت کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلافِ قانون قدرت تھی؟ حاشا و کلا، بلکہ یہ اس کا پھل ہے کہ اس درخت کو

وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اسی قدر اُس میں نقصان ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے، خون کا بہانا آدمی کا ہو یا درندے کا یا ایک پشہ کا خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے۔ مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانونِ قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا؟ قتل خوں ریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ قانونِ قدرت سے ہونی چاہیے، وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہِ عظیم سمجھتے تھے، ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آیند ہو جبکہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور بے اثر ہے۔"

"اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون، قانونِ قدرت کے مطابق اور علدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ، جہاں تک کہ قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے، رحم ہے۔ معافی کی جگہ معافی ہے، بدلے کی جگہ بدلا ہے، لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانونِ قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔"

"اسلام فساد او، دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا جس نے اُن کو (یعنی مسلمانوں کو) امن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر، اُس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے، کافروں کے ساتھ جو عہد و قرار ہوئے ہوں اُن کو نہایت ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خوں ریزی کی اجازت نہیں دیتا، کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اُس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اُس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے، ایک اُس

حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے، کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے، اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جب کہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو، اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، اُن کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو، مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں، گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُن کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی، یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن لیے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، اُن کو مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے۔ یا اُن کے لیے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُس کو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔"

"یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے، یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانونِ قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ 'دوسرا گال پھیر دینا' خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟

"لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے، اس میں بجز اس

کے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کرو یا مارے جاؤ اور کچھ نہیں کہا جاتا، وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اُس موقع اور محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں، چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً خونخواری اور خوں ریزی پر منسوب کرے جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے، تو یہ خود اُس کا قصور ہوگا نہ اسلام کا"

لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اُس میں فروگذاشت نہیں کیا، عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں اُن کو قتل کرنے کی ممانعت کی، عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت نہیں دی، صلح کو اور معاہدۂ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی، باغ کو، کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی، قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا، نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو، عورت ہوں یا مرد، غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کیے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنھوں نے عمرؓ کو، عثمانؓ کو، علیؓ حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا، پس اُن کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے؟"

"مشرکین مکہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے۔ صرف اسلام کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلعم پر بہت سے ظلم کیے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، قتل کے درپے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلعم مکہ کو چھوڑ کر مدینے چلے آئے، پھر اُنھوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا، لڑائی پر آمادہ ہوئے، تب اسلام نے اُن سے لڑنے کا حکم دیا۔ پس جس قدر احکام

قتل مشرکین کے ہیں وہ سب انھیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں، وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جائے، جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ" امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے، یہانتک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے، یہانتک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے اور مشرکین کی غرض ایذا اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ اُن پر غالب ہو جاؤ تاکہ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیرنے کے لیے ایذا نہ دے سکیں اور تم شرک میں نہ پڑو" یکون الدین للہ کا فقرہ بھی اُنھیں آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین عرب کے حملے کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں۔ اس کے یہ معنی سمجھنے کہ اتنا لڑنا چاہیے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے، اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیے کہ اللہ کے دین کے بجالانے میں جو کافر ہرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لیے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لیے اُس کو بے ایذا کے بجالا سکیں۔"

سرسید نے سورۂ بقر کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے، مگر سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے اہتمام کے ساتھ اُٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے۔

اُنھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی حجت کے آنحضرتؐ کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قتل و غارت سے جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی لڑائیاں اُس کے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں اور جو لوگ توریت کو اور حضرت

موسیٰ کو مانتے ہیں اُن کے لیے حضرت مسیح کا یہ قول کافی ہو کہ، تو اُس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہو کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا،، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں "مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف حجت الزامی پر اکتفا کریں بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اُس کی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے اس لیے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں"

اس کے بعد اُنھوں نے اُن تمام اعتراضات کا جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر کرتے چلے آئے ہیں، لب لباب بیان کرکے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں اُن سے صرف امن قائم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں، اسلام منوانا۔ اور اُس کے ثبوت میں اول اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کیے اور کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس بیم و ہراس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور بانی اسلام پر گذرا یہاں تک کہ جب آنحضرتؐ کے شفیق چچا ابوطالب کا انتقال ہوگیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسول خدا صلعم کے قتل کا نہایت پختہ طور سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انھیں سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کرکے حبشہ کو چلے گئے اور آخرکار آنحضرتؐ کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہنچانے میں کمی نہیں کی حبشہ کے مہاجروں کا تعاقب اُنھوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے تحفے اور ہدیے بھیج کر مسلمانوں کو اُس سے مانگا مگر نجاشی نے اُن کے دینے سے انکار کیا اہل مدینہ کے ساتھ بھی جنھوں نے آنحضرتؐ کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کرکے

وہاں آئے تھے۔ قریش نے بُرائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطرہ لگا رہا۔

جب کہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سرسید لکھتے ہیں کہ "ایسی حالت میں آنحضرت صلعم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لیے .... چار امر لازمی تھے کہ بغیر اُن کے کبھی امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ (۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں (۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواح مدینہ میں رہتی تھیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنے کا معاہدہ کرنا، لیکن عہد شکنی کی حالت میں اُن سے مقابلہ کرنا اُس منصوبہ کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا کیونکہ اگر عہد شکنی کی مکافات قائم نہ کیجائے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا (۳) جو مسلمان کہ مکہ میں بہ مجبوری رہ گئے تھے اور موقع پاکر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے اُن کے بھاگ آنے پر جس قدر ہو سکے اُن کی اعانت کرنا چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اُس کے ساتھ بہانہ کرکے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو۔ (۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے اُس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا کیونکہ ایسا کرنا اُسی امن کے قائم رکھنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اٹھانے کا باعث ہوتے ہیں (۱) یہ کہ کفار اُن مسلمانوں کو جو اُن کے قبضہ میں ہوں، تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور اُن کی مخلصی کے لیے ... لڑائی کیجاوے .... کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاق اور انسانی کے برخلاف کہہ سکتا ہے ... اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلوانے کے لیے ہے۔ (۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو اُن کے احکام مذہبی ادا کرنے کے لیے مانع ہوں۔ بشرطیکہ وہ اُن کی عملداری میں رہتے نہ ہوں۔

کیونکہ اس صورت میں اُن کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر پر ہے لیکن اس کا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ... ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا"

پھر لکھتے ہیں کہ "ایک اور امر ہے جو بعض قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے یعنی جس ملک یا قوم سے انہیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشتہر ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا اُن کا اسباب اور اُن کی رسد اور اُن کے ہتھیاروں کو لوٹ لینا۔ اس زمانۂ تہذیب میں بھی کونسی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجائز قرار دے سکتی ہے؟ اور کون ہے جو اُس کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا قبلوانا قرار دے سکتا ہے۔ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انہیں امور پر مبنی تھیں۔ ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے، اول اُن احکام سے جو قرآن مجید میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جن سے ظاہر ہوگا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لیے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لیے۔ دوسرے اُن لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں واقع ہوئیں ... اس کے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائے گا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا؟ یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے تئیں ڈلوا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا؟ سوم اس پر بھی اخیر کو بحث کریں گے"

اس کے بعد انھوں نے نہایت شدومد سے دعوے کیا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے لیے صرف وعظ و نصیحت کرنے

کی ہدایت ہو۔ پھر وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورہ نحل میں آنحضرت کو حکم ہے کہ "دعوت اسلام کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور اُن سے بحث کر پسندیدہ طریقے کے ساتھ" یا سورہ نور میں حکم ہو کہ "خدا اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں کا پہنچا دینا ہو" یا سورہ قاف میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو اُن پر جبر کرنے والا نہیں ہے" اور سورہ غاشیہ میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا ہو تجھ اُن پر کچھ زور نہیں ہے" اور سورہ یونس میں فرمایا "اے پیغمبر کیا تو اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں" اور سورہ بقرہ میں صاف صاف فرمایا کہ "دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہو"

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اُسی وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرتؐ مکہ میں تھے مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اُس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول تو سورہ نور اور سورہ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ اسلام کو بخوبی قوت حاصل ہو گئی تھی، حالانکہ انھیں سورتوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ مدینہ میں تشریف لے گئے تو جنگ کی اجازتی کا حکم ہوا مگر نہ اس لیے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے بلکہ محض امن قائم کرنے کے لیے جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل بیان کیا جائے گا

اس کے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اُس کا مفصل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ

کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کرکے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ اُن سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے (۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں (۲) اُن لوگوں سے جنھوں نے دغابازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو (۳) اُن لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں کو یا اُن کے بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر اُنھوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریّہ کے نام سے مشہور ہیں بالاستیعاب بیان کی ہیں اور سلھ سے سوھ تک ۲۱ غزوات اور ۶۲ سرایا کا مفصل حال حدیث اور سیر اور جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجبر و بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی مدافعت اور ان کا حملہ روکنے کے لیے ہوئے تھے، یا اُن کا ارادۂ فاسد معلوم ہونے کے بعد اُن کو منتشر کرنے کو، یا اُن کی عہدشکنی اور دغابازی ظاہر ہونے کے بعد اور یا اُن لوگوں کی مدد کے لیے جو خبر رسانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ " دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اُس کو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لیے تھیں ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل بجز اُس کے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو تسلیم نہیں کر سکتا "

پھر لکھتے ہیں کہ " جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اُس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ اُس کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ مقولہ کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْأَمَانِ" ہر ایک قوم اور ہر ایک مذہب پر

صادق آتا ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اُسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہنچی . . . . بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح[1] قوم نے فتح کامل حاصل کرنے اور استقلال کامل پانے کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنی مسلمانوں) کا دفعۃً مذہب اختیار کر لیا۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کی بت شکنی میں (جس کو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے قابل الزام سمجھتے ہیں) اور محمود و عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لیے، اس کے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اُس مسجد میں اُنھوں نے بت رکھ دیے جن کا برباد کرنا اور دین ابراہیمؑ کا اُس (مسجد) میں جاری کرنا ابراہیمؑ کے پہلونٹے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا۔ قوم عرب، جس کا غالب حصہ ابراہیمؑ کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرتؐ بھی تھے اُس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیمؑ کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا۔ پس آنحضرتؐ نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے اُس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبدوں کو برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اسی طرح ہزاروں مثالیں اس کے برخلاف موجود ہیں مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی، اُس میں مختلف مذہب کی قومیں رہتی تھیں، تمام سینیگاگ اور تمام گرجے جو زیادہ تر رومن کیتھلک مذہب کے تھے،

---

[1] یہاں فاتح قوم سے مراد خوانین تاتار ہیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے چنانچہ چنگیز خاں کا قول تھا کہ "خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع قمع کے لیے بھیجا ہے" اُن کی حکومت تمام ایران توران خوارزم دشت قپچاق اور روس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برکہ خاں چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد جس کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا۔

بدستور قربانی اور گھنٹے بجاتے تھے، تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی، مندروں میں بت موجود تھے، ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی۔ بس ان تمام حالات کو جو نہایت کثرت سے تھے، بھول جانا اور چند واقعات کو جو اُس کے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے۔ پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض ناانصافی ہے۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کے غزوات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "تمام انبیا جب کہ قوم کی اصلاح اور اُن کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً اُن کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں، اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیحؑ کے اُس کے لیے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اُس کے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزورِ حکومت اُس کو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھادی جاتیں عیسائیوں اور درویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے) پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جس کو قانونِ قدرت مردود ٹھیراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰؑ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیحؑ کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرت مسیحؑ نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اُس وقت سے اُن کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گذرا تھا اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) اُن پر ایمان لائے تھے، اُن کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کرسکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اُس کے (یعنی دینِ مسیحی کے) ایسی حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کرسکے

تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ کو روحانی بادشاہی کے سوا سلیمانؑ کی سی سلطنت کے انتظام میں داخل ہونے میں بہت بڑی مجبوری تھی، عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا، ہر ایک قبیلے کا سردار اُن کا حاکم ہوتا تھا اور جس کو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اُس کو بہ مجبوری افسر بنا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا جبکہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرتؐ کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملات ملکی بجز آنحضرتؐ کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیے نہ تعصب سے۔"

سرسید کی ان تمام تحریروں کا جو کہ انھوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۷۱ء سے لکھنی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہو گیا، یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ دین اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے، چنانچہ سب سے پہلے اواخر ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی داں حاکم نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جہاد (از روئے اصول اسلام) اُن لوگوں کے مقابلہ میں ہونا چاہیے جو صرف کافر ہی نہیں بلکہ تعمیل شرائط اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں الذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ جہاد کی شرط ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکام اسلام کی تعمیل میں مسلمانوں پر جبر و تعدی یا مزاحمت ہوتی ہو . . . . اور جبر و تعدی و مزاحمت جو وجوب جہاد کے لیے شرط ہے وہ بھی معاملات باہمی میں معتبر نہیں بلکہ معاملات مذہبی میں ہونی ضرور ہے . . . . مسلمان جو انگریزی عملداری کے ظل حمایت میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُن کو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پائے جائیں جہاد پر اقدام نہیں کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں اُن میں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی بلکہ فی زماننا مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے جو پیغمبر صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کو نجاشی نصرانی فرمانروائے ابیسینیا کی حمایت میں

حاصل تھا۔ پس جب تک اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت ایک شرعی گناہ سمجھا جائے گا
مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں انھوں نے اپنی
کتاب پریچنگ اوف اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی ہے) اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے
کہ قرآن کی رو سے غیر مذہب والوں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے؟
اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے پروفیسر موصوف
کے دل میں پریچنگ اوف اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اس میں کامیابی کی
امید بندھی اُن میں ایک بڑا محرک سرسید کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔

مثال ۲ معراج کے مسئلہ پر بھی سرسید نے تفسیر میں نہایت مفصل بحث کی ہے جو اُن سے پہلے
کسی مفسر نے نہیں کی۔ معراج جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل کے بالکل خلاف
ہے اُس کے الزامی جواب ازالۃ الاوہام وغیرہ میں عہد عتیق و عہد جدید کے حوالوں سے نہایت
شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مگر یہ جوابات اُن لوگوں کے لیے کافی نہ تھے جو توریت
و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قید مذہب سے آزاد ہیں اس لیے ضرور تھا کہ معراج کے سوال
پر محققانہ بحث کی جائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اُس
کو ظاہر کیا جائے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر کے ۱۰۴ صفحوں میں نہایت بسط کے ساتھ بحث
کی ہے مگر ہم اس موقعہ پر صرف اُس کا لُبِ لباب بیان کریں گے جن کو تفصیل دیکھنی منظور
ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

انھوں نے اُن تمام روایتوں میں سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں
میں قلمبند کی گئی ہیں، غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں میں اس قدر
اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مضمون کی روایت میں ایسا اختلاف ہوگا، اس لیے معراج
کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلافات ہیں اُن سب کو اول جدا جدا بیان کیا ہے مثلاً
اس بات میں اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور اسرا، (جس کا ذکر قرآن مجید میں

ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جداگانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی یا دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری میں ہوئی یا روح کے ساتھ رؤیا میں؟ غرض اسی کے بے شمار اختلافات جو روایات متعلقہ واقعہ معراج میں پائے جاتے ہیں ان سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قرین قیاس تھے، بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور اسرار درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتدا سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوے پر پانچ دلیلیں لکھی ہیں جن میں سے پہلی دلیل گویا اس شبہ کا جواب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جس میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پر دلالت کرتا ہو۔ سو اس کے جواب میں انھوں نے سورۂ یوسف کی یہ آیت کہ "اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا" اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کوئی لفظ خواب پر صراحۃً دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب کے نزدیک ان میں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" (یعنی ہم نے نہیں گردانا اُس خواب کو جو تجھے دکھلایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لیے) قطع نظر اس کے کہ یہ آیت اسی سورۂ بنی اسرائیل میں واقع ہوئی ہے جس میں اسرار کا ذکر ہوا ہے، صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبداللہ ابن عباس کی نقل کی ہیں جن میں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس رؤیا کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہی رؤیا ہے جو رسول خدا صلعم کو لیلۃ الاسرا میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک ابن صعصعہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے۔ چوتھی دلیل یہ لکھی ہے کہ منجملہ صحابہ کے معاویہ، حسن، حذیفہ بن الیمان اور حضرت عائشہ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واقع ہوئی ہے نہ بیداری میں، پانچویں دلیل موافق اصول علم حدیث کے یہ لکھی ہے کہ جب عقل اور نقل میں بظاہر اختلاف پایا جائے

تو نقل کے معنی اس طرح بیان کرنے چاہییں جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علما مثل امام سخاوی، ابن جوزی، ابوبکر بن الطیب وغیرہم کے اقوال اس باب میں نقل کیے ہیں کہ حدیث کے موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس کا مضمون عقل یا حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث اس مضمون پر کی ہے کہ حدیثیں جو کتب احادیث میں جمع کی گئی ہیں اُن کے الفاظ بعینہ رسول خدا صلعم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راویوں کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کیے ہیں اور اس کے ثبوت میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول ہے کہ اگر ہم حدیث اسی طرح بیان کرنی چاہیں جس طرح سنی ہے تو ایک حرف بھی نہ بیان کر سکیں۔ غرض کہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہے کہ اُن کی تاویل عقل کے مطابق کی جائے نہ یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہونا پایا جاتا ہے ان کو تاویلات بعیدہ اور رکیکہ اور دلائل فرضیہ دور از کار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

تیسری خصوصیت | تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ اس میں برخلاف قدیم تفسیروں کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قدیم تفسیریں باتفاق تمام محققین اہل اسلام کے غلط بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس قدر روایتیں تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر اُن سب کو بعد حذف اسناد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدودے صفحات سے زیادہ نہ ہوگا حالانکہ کتب تفاسیر کی روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی بے احتیاطی اور عدم مبالات قدیم زمانہ میں بھی قابل الزام تھی لیکن اس زمانہ میں، جبکہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص

کو آزادی ہی اور الحاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہی، ایسی روایتوں اور قصوں اور سو بر بیل افسانوں کو تفسیروں میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضوں کا نشانا بناتا ہے بلکہ خود مسلمان نوجوانوں کو جو اس زمانہ کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام سے بدگمان بلکہ متنفر کرتا ہے۔

چوتھی خصوصیت | چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیروں کے ہر ایک آیت کی تفسیر کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اُس کو ذکر کیا گیا ہے اور باقی مرجوح اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بشرط ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اُس کو بھی بیان کر دیا ہے۔ آج کل ایسی تفسیریں، جن میں قرآن کے معنی معین نہیں کیے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد احتمالات اور مختلف اقوال نقل کیے جاتے ہیں، اُن لوگوں کے دل میں، جو مذہب کو موروثی چیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں بجائے اس کے کہ مفسر کے تبحر اور احاطۂ علمی کا نقش جمائیں، ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے یہ فرمایا تھا کہ "لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" اُس میں بے شمار اختلافات دیکھ کر طرح طرح کے شکوک و شبہات میں پڑ جائیں پس اس وقت زمانہ کا اقتضا ہرگز یہ نہیں کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائیں بیان کر کے'' کو اُسی طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معین نہ کیے جائیں۔

پانچویں خصوصیت | پانچویں سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت اس تفسیر کی جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اسلام میں جہاں تک کہ معلوم ہے سب سے پہلی کوشش اُن شبہات کو رفع کرنے کے لیے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے اس تفسیر میں کی گئی ہے۔ اس باب میں جو کوشش بلیغ سرسید نے کی ہے، اس کا پورا پورا اندازہ بغیر اس کے کہ اُن کی تفسیر کو

اول سے آخر تک دیکھا جائے، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ اُس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کیے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی بلکہ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کیے گئے ہوں جن کی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے، یقیناً رفع ہوتا ہو تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے نہ لکھے ہوں، بلاشبہ تسلیم کرنے کے قابل ہیں۔

اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے جس کی ایک بائیوگرافی متحمل نہیں ہو سکتی اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں ہوتی اس لیے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھیں گے اُس کو کسی باوقعت میگزین کے متعدد نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا۔

ریفارمیشن اور اُس کا منشا

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریروں اور پبلک اسپیچوں کے ذریعہ سے اور نیز خود مثال بن کر قوم کے پولٹکل اور سوشل خیالات اور خاصکر اُردو لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اس لیے اُن کو قوم کا پولٹکل، سوشل اور لٹریری ریفارمر کہا جا سکتا ہے، لیکن اس مقام پر ریفارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت دشوار کام تھا اور جس کی وجہ سے اُس قوم کے فدائی کو کافر دجال ملحد

اور مرتد سب کچھ کہا گیا۔

اگرچہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی پولٹکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی جب تک کہ اس کا ثبوت مذہب کی رو سے نہ دیا جائے تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو بہت کچھ تعلق ان کے مذہب کے ساتھ تھا، اس لیے سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں جس قدر کہ بانیٔ مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اُسی قدر بہت سی باتیں جن کو اصل مذہب میں چنداں دخل نہیں ہوتا داخل ہوتی جاتی ہیں اسی طرح دین اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے۔ مثلاً اصول عقائد میں صدہا مسائل ایسے داخل کر دیے گئے جن کا صدر اسلام میں کہیں پتا نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے منجملہ علوم دینیہ کے ایک نہایت مہتم بالشان علم، موسوم بہ علم کلام، سمجھا جاتا ہے، یا مثلاً فروع میں بے شمار جزئیات جن کی بنیاد محض قیاس پر ہے، مثل نصوص کتاب و سنت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں یا مفسرین کی رائیں اور اُن کے اقوال جو اُنھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بیان کیے ہیں، وہ بھی مثل آیات قرآنی کے واجب الاذعان مانے جاتے ہیں۔ اصول فقہ جو بڑھتے بڑھتے ایک وسیع علم بن گیا ہے، وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے، جس قدر رطب و یابس روایتیں اور بے سر و پا قصے کتب تفسیر و سلوک و سیر میں درج کیے گئے ہیں وہ سب بغیر اس کے کہ ان کو اصول تنقید کے موافق جانچا جائے رسول خدا صلعم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں صحاح میں جو حدیثیں امت کی اصلاح معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" وہ بھی اُن حدیثوں کی طرح جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں تعلیم دین میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے تو بہت سے

خیالات دور دراز کا راستہ اپنے اپنے مذہب کی طرفداری اور تعصب کی وجہ سے ہر مذہب کے اجزائے غیر منفک بن گئے۔ پھر جہاں اسلام پہنچا اُن ملکوں کی اکثر رسمیں اور رواجات اور اوہام شدہ شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "الدین یسر" ایک دفتر بے پایاں کا نام جو دائرہ حصر و احصاء سے خارج ہے، قرار پاگیا اور ان تمام حشو و زوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا۔ اگرچہ علم کلام، علم اصول فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لیے سرمایۂ افتخار اور قوم کی اعلیٰ درجہ کی دماغی اور ذہنی قابلیت کے نہایت روشن ثبوت ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دین اسلام کو ان سے بے انتہا مدد پہنچی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں اُن کو کتاب و سنت کے برابر درجہ دیا جائے ورنہ ضرور ہے کہ عربی صرف و نحو و معانی و بیان و لغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم مذکورہ بالا کو دیا گیا ہے کیونکہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم مدد نہیں پہنچی۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دورہ میں ایسے آزاد طبع اور روشن ضمیر لوگ ہمیشہ ہوتے رہے ہیں جنھوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدان تحقیق میں قدم رکھا ہے اور بڑے بڑے مہتم بالشان مسائل کے متعلق مذہب جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں لیکن چونکہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور معترضین اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں لہٰذا جو ضرورتیں اسلام کو موجودہ زمانہ میں پیش آئیں اُن سے وہ بزرگ بالکل بے خبر تھے۔ اس کے سوا ممالک اسلامیہ میں علمائے اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہ وقت کے مذہب کے خلاف کوئی بات بیباکانہ زبان سے نکال سکیں اس لیے علمائے سلف میں کسی ایک شخص نے عام اصلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا، کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اُن کے جانچنے کے قواعد مقرر کیے، کسی نے شرائع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور جو حدیثیں شرائع سے متعلق تھیں اُن کے لیے الگ اور جو مصالح سے متعلق تھیں ان کے لیے الگ درجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع اور قیاس

کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیات متشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی، کسی نے مفسرین و محدثین کے بے سروپا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیات منسوخہ کو جن کی تعداد پانسو تک پہنچ گئی تھی بلکہ حصر و احصا سے خارج ہو گئی تھی بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے متکلمین کے منطقیانہ استدلالات و توجیہات کو جو کہ وہ اپنے مذہب کی نصرت و حمایت کے لیے آیات قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصد شارع کے خلاف ثابت کیا، کسی نے تعمق و تشدد پر رد و قدح کی، کسی نے شرک و بدعت کے استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ خالص اسلام کی تعلیم قرآن مجید اور حدیث صحیح میں منحصر ہے باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے نہ اسلام اُس کا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اُس پر اعتقاد رکھنے کے مکلف ہیں۔

سرسید نے، اگر غور کر کے دیکھا جائے، تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہل اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبط تحریر میں آئی تھیں اور اکابر علما کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی، سرسید نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علی الاعلان ظاہر کر دیا، کیونکہ جو ضرورتیں اس وقت خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں۔ مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جا چکی تھی اور قومی تعصبات، جو بعد سلب حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمراں قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور اُن کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوتی تھی وہ اُن کے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ علما کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے، اکثر انھیں قومی تعصب پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان اُن کو وحی منزل کی طرح دل و جان سے قبول کرتے تھے۔ عیسائی

مشنری مسلمانوں کی سِیَر اور تاریخ کی کتابیں اور اُن کی تفسیریں دیکھ دیکھ کر اسلام اور بانیٔ اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُن کا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھ کر اسلام کی خالص تعلیم سے، جو کتاب وسنت میں منحصر ہے بداعتقاد ہونے لگے تھے، اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اُن چیزوں میں جو اسلام میں مل جل کر اُس کی ذات میں داخل ہو گئی ہیں امتیاز قائم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ سرسید نے اپنی تفاسیر میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں، بہت ہی کم تجاوز کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبرِ متواتر اور خبرِ مشہور کے سوا جن کی تعداد کتب احادیث میں نہایت قلیل ہے، جو حدیثیں خبرِ احاد کہلاتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور تمام احادیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں مفید یقین نہیں ہیں بلکہ اُن میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے اور اس اصول سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خبرِ واحد، بشرطیکہ صحت کے درجہ کو پہنچ جائے، اُس پر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اُس پر اعتقاد رکھنا ضرور نہیں اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں سرسید نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے، اُن کی یہ رائے ہے کہ جب خبرِ واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبرِ واحد کی رو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی نخواہی اُس خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور بعد تسلیم کرنے کے اُس اعتراض کے جواب میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ خبرِ واحد مفید یقین نہیں اور اس لیے جو اعتراض اُس کی رو سے وارد ہوتا ہے اسلام اُس کا جوابدہ نہیں ہے۔ یہ رائے صرف سرسید ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علمائے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے۔ امام رازی نے

فرقۂ حشویہ کے ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت کی کہ "ماکذب ابراھیم الا ثلث کذبات"
(یعنی ابراہیم نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا "بہتر ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کی جائیں"
اُس نے بطور تعجب کے کہا "اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئیگی"
امام نے کہا "اے مسکین اگر ہم قبول کرلیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور
اگر اُس کو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ابراہیم کو جھوٹ
سے بچانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ چند مجاہیل کو جھوٹ سے بچایا جائے"

یا مثلاً اول اول سلفِ صالح آیات متشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے مگر جب یونانی فلسفہ کا اسلام میں رواج ہوا اور آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر، جو کہ علمائے اسلام بیان کرتے تھے، ملاحدہ اور مخالفینِ اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علما کو متشابہات کی تاویل کرنی پڑی۔ مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اُس زمانہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے اس لیے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پر محمول کی گئیں۔ اب چونکہ زمانہ علم و حکمت کی ترقی کا ہے اس لیے سرسید نے تاویل کو انھیں آیتوں میں محدود نہیں رکھا بلکہ اور بہت سی آیتوں کو جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے مفصل بیان کیا ہے مجاز و استعارہ و تمثیل پر محمول کیا ہے۔

یا مثلاً آیات منسوخہ کی تعداد پہلے پانسو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی۔ پھر، جیسا شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے، سیوطی وغیرہ نے اُن کو بیسؔ میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسید نے جب دیکھا کہ آیات منسوخہ کی تعداد پانسو سے گھٹتے گھٹتے پانچ تک پہنچ گئی تو اُن کو یقین ہوگیا کہ قرآن مجید میں نسخ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسرین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ ہیں اُس آیت کا سیاق و سباق، جیسا کہ خطبات احمدیہ میں مفصل مذکور ہے، صاف دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد شرائع سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ پس عیسائیوں کا اعتراض

جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ نسخ پر کرتے ہیں، قرآن مجید پر وارد نہیں ہوتا۔

یا مثلاً اگلے محققین نے فروع میں تقلید شخصی کو اس بنا پر ضروری نہیں سمجھا کہ حق چاروں مذہبوں میں دائر ہے مگر سرسید جس طرح تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جس بنا پر حق چاروں مذہبوں میں دائر سمجھا گیا ہے اُسی بنا پر اُس کو اشاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرق اسلامیہ میں بھی دائر سمجھنا ضرور ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس رائے میں بھی سرسید منفرد نہیں بلکہ اگلے محققین اہل سنت نے بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالی پر لے دے ہوئی تو اُنھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ "تفرقہ بین الاسلام والزندقہ" لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ مذہب اشاعرہ سے الگ ہونے کو گو کہ وہ بالشت بھر ہی کیوں نہ ہو، اور اُن کے خلاف کرنے کو، گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی میں کیوں نہ ہو، گمراہی جانتے ہیں۔" مگر چونکہ امام غزالی کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علما کو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اس لیے اُنھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسید بلا قید جس مسئلہ میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کرتے ہیں۔

الغرض سرسید کی اصلاحات کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُن میں بہت ہی کم اصلاحیں ایسی ہوں گی جن کی اصل محققین اہل اسلام کی تصنیفات میں موجود نہ ہو۔ البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اُسی حد تک محدود رہیں جہاں تک کہ اُس زمانہ کی حالت اور ضرورت مقتضی تھی اور سرسید کی اصلاحات میں موجودہ زمانہ کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

سرسید کی ریفارمیشن کا منشا، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قائم کریں اور خود اُس فرقہ کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی اُمتی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوۃ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود

کسی فرقے کا مذہبی پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوۃ سمجھتے تھے چنانچہ لاہور میں جو انھوں نے لکچر دیا تھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص، گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو، میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ ان باتوں میں، جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابدالآباد تک قائم رکھے (اور ضرور قائم رکھے گا۔ کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے) ختم ہو گیا۔" پس اُن کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ اُن کی پیروی کریں اور اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانیں بلکہ اُن کی ریفارمیشن کا اصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے موانع کو دور کرنا اور عیسائی قوموں کے اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ "اسلام ترقی اور شائستگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا"۔ اور چونکہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم کے سوا کوئی ذریعہ دنیوی ترقی کا نہیں ہے اس لیے جو شبہات مغربی تعلیم سے اسلام کی نسبت پیدا ہونے ممکن تھے اُن کا رفع کرنا بھی ضرور تھا۔ پس یہی دو مقصد تھے جن کے لیے سرسید کو مذہبی مباحث میں پڑنا اور بہت سی باتوں میں جمہور سے اختلاف کرنا پڑا۔

سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم نے ایک کونسل علما اور عقلا کی اس امر کی تحقیقات کے لیے منعقد کی تھی کہ دین اسلام دنیوی ترقی کا مانع ہے یا نہیں؟ کونسل نے اپنی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ لکھی اُس کا ماحصل یہ تھا کہ "اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جو دنیوی ترقی کی مانع ہو، مگر مسلمانوں کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہو گئیں چھوڑنا ضرور ہے"۔ ظاہر ہے کہ کونسل نے جو کچھ اسلام کی نسبت کہا وہ بالکل قرآن

لہ خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر، اور رسول خدا صلعم نے فرمایا: انما بعثتم ميسرين ولم تبعثوا معسرين، اور فرمایا الدين يسر، اور ابو موسیٰ اور معاذ بن جبل کو جب یمن میں بھیجا تو نصیحت کی کہ دستور کا خیال

اور حدیث کے مطابق تھا بلکہ ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ باوجود اُس کی سخت پابندی کے انسان دنیوی ترقی اور شائستگی کو کمال کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے بخلاف دیگر مذاہب کے جن سے دست بردار ہوئے بغیر ترقی کے میدان میں ایک قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی اس سے پوچھا جاتا کہ وہ کونسی رسوم و عادات ہیں جن کے چھوڑنے کے بعد مسلمان اپنے موجودہ مذہب کے موافق ترقی کی دوڑ میں شریک ہو سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب دینا نہایت مشکل تھا۔ سرسید نے یہی مشکل کام اپنے ذمہ لیا تھا اور جو مشکلات اُن کو اس کام میں پیش آئیں وہ عنقریب کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدد مذہب ایسا شخص کیونکر ہو سکتا ہے جو علوم مروجۂ اسلام میں متوسط درجہ سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ اعتراض اُس شخص کی نسبت زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو علوم مروجۂ اہل اسلام میں کمال حاصل کرنے کے بعد مصلح یا مجدد مذہب بننے کا دعویٰ کرے۔ انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس مذہب کے ساتھ اُس کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، پھر جب اُسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو اُس مذہب کی تقلید اور اُس کا تعصب اُس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیت باقی نہیں رہتی۔ اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اُس کو ہوئی ہے تو اُس کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہوگی۔ یہ اصول بھی کہ حق چاروں مذہب میں دائر ہے محض تقلیداً مانتا ہے کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے ایک مسئلہ میں بھی غلطی کا ہونا اُس کے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے باوجودیکہ بخاری کو اصح الکتب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر بیسیوں حدیثیں جو اُس میں صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں اُن کو قابل عمل نہیں سمجھتا۔ ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ منصب اُس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا و صواب میں تمیز کر سکتا ہے، ہر ایک امر پر غور کرتا ہے اور جو بات صحیح جانتا ہے پھر جب اُس میں غلطی معلوم ہوتی ہے تو اُسی بات کو غلط

قرار دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو غلط جانے اس کو دنیا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کہہ جائے۔ مصلح یا مجدد کو علوم مروجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے کہ حق بات کے کہنے میں لومۃ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صداقتیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے اُن کی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اُن کو علی الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسید میں ابتدا سے وہ تمام خاصیتیں جو ایک مصلح یا مجدد یا ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں موجود تھیں۔ اُن کی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گذرا۔ کبھی صوفیت کا رنگ چڑھا کبھی وہابیت کا زور شور رہا، کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجہ پر آکر ختم ہوگئی کہ الاسلام ھو الفطرۃ والفطرۃ ھو الاسلام۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید کے مذہبی خیالات میں اس قدر تبدیلیوں کا ہونا اُن کے متلون مزاج ہونے کی دلیل ہے مگر یہ اُن کی نادانی ہے۔ حق بات تک ہمیشہ اسی طرح بتدریج رسائی ہوتی ہے، ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستارے کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا رب سمجھا تب اس نتیجہ پر تک پہنچے کہ "انی وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" محمد مصطفےٰ صلعم کو اگر وہ عقبات پیش نہ آتے جو حق تک پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ "ووجدک ضالا فھدیٰ" جب انبیا علیہم السلام کا یہ حال ہو تو اور لوگ، جو طالب حق ہیں، جب تک کچھ دنوں ادھر اُدھر ڈانواں ڈول نہ پھریں، کیونکر ایک ہی جست میں منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں؟ ہاں جو لوگ تقلید کے دائرہ سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جن کا یہ قول ہے کہ "انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون" اُن کو کچھ دشواری نہیں ہے اُنھوں نے جس لکیر پر اگلوں کو چلتے دیکھا ہے اسی پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اگر سرسید مشرقی تعلیم کی اُس حد سے آگے بڑھ جاتے جس پر اُن کی تعلیم آکر ٹھہری تو تقلید کے پھندے سے تا زیست اُن کا چھٹکارا ہونا دشوار تھا۔ پس علوم مروجہ کی تکمیل

بجائے اس کے کہ اُن کے کام میں کچھ مدد دیتی، وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُن کی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کردیتی اور جس دلیری اور آزادی سے اُنھوں نے ریفارمیشن کا کام انجام دیا اُس کا حوصلہ اُن میں مطلقاً باقی نہ رہتا۔

وہ ایک خط میں جو اُنھوں نے ۱۸۸۲ء میں سید مہدی علی خاں کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں میرے پیارے مہدی! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو خراب اثر مشرقی طریقۂ تعلیم کا انسان کے دل اور طبیعت پر ہوتا ہے، اُس سے آپ کبھی ایمن نہ رہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نبی آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُمّی محض رکھنے میں کیا حکمت تھی؟ یہی حکمت تھی کہ نیچرل فیض جو اندرونی چشموں کا جاری رہتا ہے اُس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر نکلے خالص نکلا ہو۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رہنے پر متوجہ رہا کریں اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہے کہ "العلم حجاب الاکبر" اس کے پیرو ہرگز نہ ہوویں"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعویٰ کرے اُس میں مذہبی تقدس جو علمائے دین کا شعار ہے، ضرور ہونا چاہیے۔ پس سرسید جیسا دنیادار آدمی، جو نماز روزہ تک کا پابند نہ ہو، اس منصب جلیل کے کیونکر لائق ہو سکتا ہے؟ سو اس اعتراض کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکے کہ مذہبی تقدس جو ہمارے علمائے دین کا شعار ہے، اگر سرسید کو یہ درجۂ عالی حاصل ہو جاتا تو مسلمانوں کی خیرخواہی اور اسلام کی حمایت کرنے کی اُن کو فرصت ملنی دشوار تھی، کیونکہ اُن کی تمام عمر کسی مسلمان فرقہ کا رد لکھنے اور کسی کو کافر اور کسی کو فاسق بنانے اور طبقات دوزخ کے تقسیم کرنے میں گذر جاتی اور اگر بالفرض اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی کا سچا جوش بھی اُن کے دل میں ہوتا تو بھی وہ اس قابل نہ ہوتے کہ اسلام کی کچھ حمایت کر سکیں، یا مسلمانوں کے مصائب کا کچھ تدارک کر سکیں یعنی اس بات کا سمجھنا اُن کی طاقت سے باہر ہوتا کہ اسلام اور اہل اسلام کو کن مشکلات کا سامنا ہے اور اُن مشکلات کا کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مذہبی تقدس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دنیا اور اہل دنیا

کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔

بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ و علما کی زی میں رہنا اور زہاد و عباد کی سی زندگی بسر کرنا اُن لوگوں کے لیے ضرور ہے جو مذہبی پیشوا کہلاتے ہیں جیسے واعظین جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں یا مشائخ و اہل اللہ جو تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں کیونکہ اگر وہ خود اُن صفات کا عمدہ نمونہ نہیں جو اوروں میں پیدا کرنی چاہتے ہیں تو اُن سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، برخلاف اُس شخص کے جو محض قوم کی اصلاح معاش کا ارادہ رکھتا ہو، اُن کو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور اُن کے تنزل کے اسباب اور ترقی کے موانع دریافت کرنے چاہتا ہو، حکمراں قوم کو جو اُس کے ہم مذہبوں کی نسبت غلط فہمی ہو اُس کو دفع کرنا چاہتا ہو علمی دنیا میں جو خیالات مذہب کی نسبت پھیل رہے ہوں اُن سے آگاہی حاصل کرنے کی فکر میں ہو، ایسا شخص جب تک گوشۂ عزلت سے نکل کر دنیا کے بیچوں بیچ زندگی بسر نہ کرے اور عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اُس کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کی آزمائش میں نہ گزارے اور حاکم و محکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے؟

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علما جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے سبب دُنیا کے حالات سے بے خبر ہیں، اُن کی تحریریں، جو اس آزادی اور نکتہ چینی کے زمانہ میں اُنھوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا لکھتے ہیں، وہ بجائے اس کے کہ غیر قوموں کے دل میں اسلام کی نسبت حسن ظن پیدا کریں اُلٹی دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہیں۔ پس اس زمانہ میں مذہبی مصلح جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاش اور اسلام کی حقیقت دنیا پر ظاہر کرنا ہو، اُس شخص کے سوا جو دنیاداری کے لباس میں زندگی بسر کرے اور دنیا کے حالات سے باخبر ہو دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب اس مشہور مقولہ کے موافق کہ اُنظُر اِلیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ

من قال" مقتضائے عقل یہ ہے کہ بجائے افعال کے زیادہ تر اس کے اقوال کو دیکھا جائے مع ہذا ہم سرسید کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ و اہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں اور جن کو ہم آگے چل کے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فربہی مفرط اور کبرسن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے لیکن اپنے قصور کا اعتراف کرتے تھے جس کی نسبت کہا گیا ہے "لا اعتراف یهدم الاقتراف" حج اور زکوٰۃ کی ان میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیہ لے کر جس طرح کہ انھوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح سفر حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ بیسیوں عیب، جو بڑے بڑے دینداروں اور پرہیزگاروں میں دیکھے گئے ہیں اُن سے یہ شخص بالکل پاک تھا اور امت کی خیرخواہی جس میں مخبر صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اَلدِّینُ النَّصِیحَۃُ" اُس میں تمام قوم سے سبقت لے گیا تھا۔ اُس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور راستبازی کی ضرورت تھی جس کی نسبت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ: "لَا تَنْظُرُوْا اِلٰی صَلٰوۃِ امْرِیٍٔ وَّلَا صِیَامِہٖ وَلٰکِنِ انْظُرُوْا اِلٰی عَقْلِہٖ وَصِدْقِہٖ" (یعنی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اُس کی عقل اور سچائی کو دیکھو)۔

مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف

سرسید نے جن مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں جمہور علمائے اہل سنت ان کے خلاف ہیں مگر محققین اہل اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جن میں سرسید بظاہر منفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکورۂ بالا اختلافات کا منشا، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ ہرگز نہ تھا کہ سرسید کوئی نیا فرقہ قائم کرنا اور خود اُس فرقہ کا سرگروہ بننا چاہتے تھے بلکہ یہ تمام اختلافات

محض اس بات پر مبنی تھے کہ آج کل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے ۔ اسی لیے ہم اُن تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں اُن کو سرسید کی تصنیفات میں دیکھنا چاہیے ۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انھیں کی رائے صائب ہے لیکن چونکہ انھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اُس کو ہر قسم کے اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں اُن سے امید ہے کہ سرسید کے مندرجۂ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں ناقابل التفات نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سرسید نے قائم کیے ہیں اُن پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کریں گے ۔ اُن کا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہ کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس کو رفع کیا جائے دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کیے بغیر وہ اعتراض یا شبہ رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تیسرے جس طریقے سے سرسید نے اُس کو رفع کرنا چاہا ہے اُس طریقے سے اُس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے ۔

اس وقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا ۔ اس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف

متوجہ ہوتی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائبل کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند ہوتے تو ترقی کے میدان میں اُن کا قدم رکھنا ناممکن تھا، برہم سماج والوں نے ویدوں میں سے فقط دعائی اُبھر پریم کے لے لیے ہیں اور باقی کو بالکل خیرباد کر دیا ہے، آریہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اُس کو نہ سناتن دھرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یورپ کے بڑے بڑے سنسکرت داں اور وید کے محقق صحیح جانتے ہیں، پس درحقیقت انھوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ سرسید کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں اُن میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع۔ پس مسلمان عالموں کا اس بات پر غور کرنا کہ جو کچھ سرسید نے اسلام کی غرض سے لکھا ہے اُس کی اس زمانہ میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی تو سید کی تحریرات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں؟ کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

اب ہم اُن اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جن میں دیگر محققین اہل اسلام بھی سرسید کے ساتھ شریک ہیں۔

(۱) اجماع حجت شرعی نہیں ہے (۲) قیاس حجت شرعی نہیں ہے (۳) تقلید واجب نہیں ہے۔ (۴) قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا۔ اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُس کی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے (۵) قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا، وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اُسی قدر زمانۂ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا تواتر ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و مفتری ہیں (۶) صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب

تمسک اصول علم حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے قابل وثوق نہیں سمجھنا چاہیے (۸) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفس اَمّارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے وہ مراد ہے (۹) طیور منخنقہ جن کو نصاریٰ گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے (۹) چونکہ خبر واحد میں احتمال صدق وکذب باقی رہتا ہے اس لیے جو اعتراض اخبار آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں اسلام ان کا جواب دِہ نہیں ہے (۱۰) سوا اُن کفار ومشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ "انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم"[1] تمام کفار ومشرکین سے دوستی وموالات کرنا جائز ہے۔ (۱۱) عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے۔ (۱۲) ہر شخص اُن مسائل میں، جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا مجتہد ہے (۱۳) حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ، جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رِقیون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا۔ (۱۴) وضع ولباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبّہ شرعاً ممنوع نہیں ہے (۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے، مقصد شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے، ورنہ آنحضرتؐ مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبناک ہوکر یہ نہ فرماتے کہ "ابھٰذا اُمِرتم ام بھٰذا اُرسِلتُ" (۱۶) معراج اور شق صدر دونوں رؤیا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں

---

[1] یعنی خدا تم کو منع نہیں کرتا مگر اُن لوگوں کی دوستی سے جو تم سے دین کی بابت لڑے اور جنھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نکال دیا اور تمھارے نکالنے پر اوروں کی مدد کی ۱۲

کیا مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک (۱۷) اگرچہ ممکن ہو کہ جس طرح
انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہو اسی طرح اُس سے بالاتر مخلوقات جن کا ہم کو علم نہیں موجود
ہو لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہو کہ وہ کوئی
جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قُویٰ اپنی قدرت کاملہ سے اشیاء میں
ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت
جذب و دفع و امثال ذلک، انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸) آدم
اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہو یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہو بلکہ یہ ایک تمثیل ہے
جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوت بہیمہ جو اُس میں ودیعت کی
گئی ہے اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں
موجود ہیں (۱۹) معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا (۲۰) قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے
صادر ہونے کا ذکر نہیں ہو (۲۱) آیۂ الذین اٰتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم"
میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہو وہ، جیسا کہ عام مفسرین کہتے ہیں آنحضرتؐ کی طرف عائد نہیں
ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویل قبلہ کے معاملہ کی طرف
پھرتی ہو جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اُس کے بعد کیا گیا ہو (۲۲) آیۂ میراث سے وصیت
کا حکم، جو آیۂ وصیت میں والدین اور دیگر ورثہ کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت
وارث کے حق میں کیجائے وہ نافذ ہے (۲۳) جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیۂ "وعلی الذین
یطیقونہ فدیہ طعام مسکین" کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر
علما فدیہ کی اجازت کو خاصکر معمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم
عموماً اُن سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڈھے ہوں اور خواہ
جوان لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے (۲۴) جس ربا یعنی سود کی حرمت
قرآن میں بیان ہوئی ہو اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا

اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سود خواروں اور مہاجنوں میں، جن کا پیشہ سود خواری ہو، پائی جاتی ہو۔ مگر اُس سے اُس منافع کی حرمت، جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے، ثابت نہیں ہوتی اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا کسی رفاہ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اُس روپیہ کا سود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہ عام کے کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہو (۲۵) قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہو جس سے حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو (۲۶) شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہو نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں (۲۷) صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہو اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھے یا سنکھ یا ترئی و قرنا کے مراد نہیں ہو بلکہ محض استعارہ ہو کہ جس طرح ترئی کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا۔

(۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسما و افعال متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہو نہ حقیقت پر (۲۹) قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہو بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہو کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ "وَمَا مَسَّنَا مِن لُغُوبٍ"، کیونکہ شارع کا مقصد حقائق اشیا سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہو، بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف ہوں اُن کا زائل کرنا ہو۔

(۳۰) قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلے سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیا کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصد نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انھیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں (۳۱) خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے نہ دل کی آنکھوں سے (۳۲) قرآن مجید میں جو جنگ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا (۳۳) صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات اور نہ لاعین ولاغیر جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے (۳۴) حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا (۳۵) کوئی امر عادتِ الٰہی یا قانونِ طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا (۳۶) قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عنداللہ ہونے میں شک ہو تو اُس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ، اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرانشین، بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمھاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے (۳۷) نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "النبی نبی ولو کان فی بطن امہ" وہ ماں کے پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے

اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں اسی طرح ملکۂ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضا ہوتا ہے اور جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں، اسی لیے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُسی کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے (۲۸)، قرآن سے جنّات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور اُن میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ثابت نہیں ہوتا (۲۹)، انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہلِ اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معنی ایسے بیان کیے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔ (۴۰) طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ (۴۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت کے وقت حضرت سارا کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادۃً اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسید کی تصنیفات کو بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھا جائے تو غالباً مذکورۂ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی بہت سے اختلافات نکلیں گے مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جن میں سرسید متفرد نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلہ میں کم یا زیادہ لوگ اکابر علمائے اسلام میں سے سرسید کے ساتھ متفق الرائے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، امام الحرمین، قاضی ابن رشد شیخ اکبر، شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کو اُن سب بزرگواروں کے نام اور اُن کے اقوال دیکھنے ہوں تو سرسید کی تصنیفات میں اور مولوی سید مہدی علی خاں کے مضامین میں جو زیادہ تر تہذیب الاخلاق کی سب سے پہلی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر زمانہ کی جلدوں میں شائع

ہوسئے ہیں، دیکھ لے۔ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزہ کو دلیلِ نبوت نہیں سمجھتے، خرقِ عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرتؐ کے کسی معجزہ کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیاتِ قرآنی جو بظاہر انبیاے بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں اُن کو تاویل سمجھتے ہیں، عیسیٰؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے قوائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوتِ بہیمیہ و سبعیہ مراد لیتے ہیں، جن کے وجود سے، جیساکہ عموماً سمجھا جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔ نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے، قرآن کو محض باعتبارِ فصاحت و بلاغت کے معجز نہیں مانتے، شہدا کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبدأ و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اُس کو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں، طیورِ منخنقہ اہلِ کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال جانتے ہیں، قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ غرض کہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کیے ہیں اُن میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ لوگ محققینِ اہلِ اسلام میں سے سرسید کے ہمزبان نہ ہوں۔ ہاں چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کیے ہیں جن میں ظاہرا وہ متفرد معلوم ہوتے ہیں لیکن یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ سلف میں سے کوئی اُس طرف نہیں گیا اور وہ اختلاف یہ ہیں۔

(۱) اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کردیا ہے اور آیۂ منّ و فدا جو سورۂ محمدؐ میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے (۲) دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیساکہ حدیث میں آیا ہے "الدعاء ھو العبادۃ" پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس مطلب کا جس کے لیے دعا کیجاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں (۳) آیت یا آیات یا بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جابجا آئے ہیں، اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعۂ وحی کے انبیا پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیساکہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے (۴) حضرت عیسیٰؑ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کرکے قتل کیا

اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا۔ یہ دونوں قول غلط ہیں۔ بلاشبہ
وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں مَا قَتَلُوْہُ
وَمَا صَلَبُوْہُ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود
تھی وہ واقع نہیں ہوئی (۵) اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکیگا
تو اُس کو ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت نہیں ہے (۶) سارق کے لیے قطع ید کی
سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مال مسروقہ
کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر
سارق کو صرف قید کی سزا دی جاتی (۷) قرآن میں جن اور جِنّہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے
یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے
مفہوم ہوتی ہے (۸) سورۂ فیل (الم ترکیف) میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل
کا کنکریاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چیچک سے استعارہ ہے جس کی نسبت
تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چیچک عرب میں اسی سال نمودار ہوا ہے جبکہ ابرہہ نے
مکہ پر چڑھائی کی تھی (۹) حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں
میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے ید بیضا، عصا کا
اژدہا بنجانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰؑ سے کلام کرنا، پہاڑ پر
تجلی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من وسلوے کا اترنا، یا عیسیٰؑ کا گہوارہ
میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ
وغیرہ، اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا (۱۰) قرآن
مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود
ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا مثلاً کفار کے رحمت الٰہی
سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لا تفتح لھم ابواب السماء" چونکہ اصل مقصود

اُن کے حرمان کا بیان ہی اور اُس کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہ ہو سکے گا (۱) شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی، جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں جن میں حکم ایسا نہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہی کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثل وضو اور قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ یہ سب اُس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا ضروری ہی۔

فارمیشن کی مخالفت

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی۔ پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اول تو مذہبی خیالات ایسی چیز ہیں کہ جس طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا، اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہیے کبھی نصیب نہیں ہوئی جس ملک میں جو فرقہ برسرِ حکومت ہوا اُس ملک میں ہمیشہ اُسی فرقہ کے مذہب نے رواج پایا، باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادیِ رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا ہوئے تھے اُس کو مسلمان

کیونکہ بغیر نفرت اور کراہت کے سُن سکتے تھے۔ دوسرے آزادیِ رائے ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعتہً کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلاف آرا جو آزادی کو لازم ہے اُس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے آزادی اُن کو اختلاف کرنا سکھا دیتی ہے مگر بسبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں کچھ فرق نہیں کر سکتے، وہ جس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اُن کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اُس کو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں۔ مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا نیا سبق پڑھا ہے اس لیے جو بات اُن کی رائے یا عقیدے کے خلاف یا اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اُس سے ہمیشہ ایسا اختلاف کرتے ہیں جو آخر کو منجر بہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاصکر مسلمانوں میں قومی تنزل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی بغض حسد جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں، لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالف پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سر سید ریفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونہ پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے۔ جب ندوۃ العلما جو خاصکر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لیے اکثر علمائے اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اُس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ پس سر سید کو مخالفت سے کسی طرح مفر نہ تھا۔

اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کی نسبت اُسی وقت بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا، مگر جب کہ اُنھوں نے "تبیین الکلام" کی پہلی جلد شائع کی تو اُس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی، سید مہدی علیخاں جو آخر کو سر سید کے مخلص

کے سب سے بڑھ کر مددگار ہوئے، اُن کو تبیین الکلام کا دیباچہ دیکھ کر ایسا جوش آیا کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اُسی جوش و خروش میں اُنھوں نے سرسید کے دیباچۂ مذکور کے برخلاف ایک طول طویل خط لکھ کر بھیجا۔ سرسید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ "اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت ہے" اس کے بعد جب سرسید کے پاس علیگڑھ جانا ہوا اور اُن کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جدھر سرسید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبلہ کا رخ نہیں ہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سرسید نے یہ آیت پڑھی "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ" جب اس پر خوب بحث ہو چکی تو سرسید نے کہا میں نے اس کوٹھی کو ٹھیک قبلہ رُخ بنایا ہے۔ پھر کمپاس لگا کر اُن کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کی سچائی کا نقش اُن کے دل میں بیٹھا۔

جب سرسید نے غازیپور میں مدرسہ قایم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر سیشن جج غازیپور اور کرنل گریہم ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرفدار ہو گئے مگر آخرکار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہو گیا۔

جب وہ غازیپور سے بدل کر علیگڑھ میں آئے اور سائنٹفک سوسائٹی اور اُس کا پریس بھی جو اُس وقت تک سرسید کا پرائیویٹ چھاپہ خانہ تھا اُن کے ساتھ علیگڑھ میں منتقل ہو گیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہو گیا اب سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے الفنسٹن ہسٹری اوف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں ہونے لگا اور اُس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے۔ مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلعم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (معاذ اللہ) پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا اُردو میں بھی اُس کا اسی طرح ترجمہ بے کم و کاست کیا گیا، مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور

اُس کے دیباچہ سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید ہو سکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیے تھے مگر اُن لڑاؤں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی جب یہ حصہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا تو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کے ساتھ بالل کیوں ترجمہ کیا گیا سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں (بقول سرسید کے) اُن کے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا، اخباروں میں شایع کرائی۔ اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفا دے دیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمہ میں بالل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسید کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور بانی اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کی جائے اور اُن کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا اُن کے تعصبات کی قلعی کھولی جائے۔ اخیر دم تک اُن کی یہی رائے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور طعنوں اور بدزبانیوں سے بے خبر رہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک نیٹو کرسچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ امہات المومنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے ناگواری کے سبب اُس کو فوراً جلا دیا لیکن سرسید نے اُس کی جلد بندھوا کر اُس کو اول سے آخر تک دیکھا اور فوراً اُس کا جواب لکھنا شروع کیا جس کو مرض الموت نے افسوس ہے کہ ختم نہ ہونے دیا۔

پھر لندن جانے سے پہلے جب اُنھوں نے ایک رسالہ احکام طعام اہل کتاب پر لکھ کر شایع کیا تو عموماً اُن کو کرشان کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اس کے چرچے ہونے لگے جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو انھوں نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقہ پر کھانا کھانے سے بخوبی واقفیت ہو جائے، یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر ساتیہ جو بنارس میں ایک سوداگر

تھا اور سرسید کی کوٹھی سے اُن کی کوٹھی ملی ہوئی تھی، ایک دن شام کا کھانا یہ اُن کے گھر پر جاکر کھاتے تھے اور ایک دن وہ ان کے گھر پر آکر کھاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "اتفاق سے انھیں دنوں میں مولوی سید مہدی علیخاں مرزا پور سے بنارس میں مجھ سے ملنے کو آئے رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔ ہم دونوں میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آپہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا، سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے آخر قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گذر گیا مگر رات کو یہ مشکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر ساتیہ کے ہاں تھا میں نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے اُنھوں نے پھر اسی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں، اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھا لوں گا، چنانچہ رات کو وہیں کھانا کھایا پھر ایک آدھ روز بعد مرزا پور واپس چلے گئے، الٰہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ معلوم ہو گیا اُنھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے؟ مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا اُنھوں نے وہ خط بجنسہٖ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس جو آٹاوہ میں رونق افروز تھے بھیج دیا انھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرشان ہو گئے مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پینٹھ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہربان نے اُس گنوار دل میں جاکر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سنایا اور تمام پینٹھ میں منادی کر دی کہ بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرشان ہو گئے۔ جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے۔"

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کھانا، سقے نے

پانی بھرنا، اور سب نے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا گھر والوں نے اُن کو لکھا کہ تمھاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گذر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ انھوں نے ایک طول طویل خط انھیں بزرگ کو جنھوں نے یہ افواہ اڑائی تھی متعلق طعام اہل کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ میں کرشان نہیں ہوں جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں۔ غرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔

جب سرسید لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جا کر نکسالی کرشان ہو کر آئیں گے۔ غرض جو جس کے دل میں آیا سو کہا مگر سرسید نے جو کچھ دل میں ٹھان لیا تھا اُس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخ معین پر بسم اللہ مجریہا و مرسیٰہا کہہ کر جہاز میں سوار ہو لندن روانہ ہو گئے۔ راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے، اُسی کے ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جہاز میں باورچی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے جیسے بیل، بکری، مینڈھا وغیرہ، اُس کو تو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آر پار چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ اُن کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اُس کے اخراج کا رواج ہے اور پرندوں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ پرندوں میں مثل چوپاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور اُن کی مثال دریائی جانوروں کی سی ہے پس اُن کا ذبیحہ صرف اُن کا مار ڈالنا ہے اس لیے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ توڑ کر مار ڈالتے ہیں، چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جس طرح کہ وہ کرتے ہیں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے اس لیے سرسید نے لکھا تھا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اُن دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے والحمد للہ الذی جعل دیننا یسرا ولا عسرا والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبینا الشریعۃ السہلۃ السمحۃ۔ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے

مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ انھیں کے باورچیوں کے ہاتھ کا صاف یا ذبح کیا ہوا اور انھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر ہندوستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا۔ عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو انھوں نے سید کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا کیونکہ قرآن مجید کی رو سے منخنقہ حرام ہے پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اُس کے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے؟

پھر لندن سے جو تحریر سرسید کی آتی تھی اور سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھی اُس پر عام اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ان کی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ "ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت و شائستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک وحشی بدصورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے" اس پر مدت تک اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اس کا چرچا رہا چنانچہ انھیں دنوں میں ایک جلسہ کی کیفیت جو بتقریب دعوت صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ مولوی سید مہدی علی خاں کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور جس میں صاحبزادۂ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکائے جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا، سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سرسید کے پاس لندن میں پہنچے تو انھوں نے ایک مضمون جس کا عنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" تھا سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اول تمام وطن کے نکتہ چینوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے میرے عیبوں سے مجھے آگاہ کیا اور آخر میں اہل وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ "وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنھیں اب گالیاں سمجھتے ہو سو ہالیاں سمجھو گے . . . اے یاران وطن

"رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت
صلح کیجے بس لڑائی ہو چکی"

شکوہ و شکایت ہو چکے، بس اب گلے مل لیجیے اور اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہو جیے، اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجیے اور جو جو الزام ہمارے ملک پر ہیں اُن کو مٹائیے دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ کر کے دکھلائیے اور جلنے والوں کو اشارہ کیجیے۔

جب اس پر بھی اہل وطن کی مخالفت کم نہ ہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین چھپتے رہے تو اُنھوں نے ایک تحریر جس کا عنوان "عرضداشت بخدمت اہل وطن" تھا، سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس کی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اُس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو اُس وقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہموطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ؎ نیست یاران طریقت غیر ازیں تقصیرما ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہموطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ اُٹھا رکھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو، مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہموطنوں سے یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اُس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لیے میرے ہموطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی، مجھ کو ناگوار نہیں گذری اور خدا نے مجھ کو اپنا ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ پُرانے دوستوں کی باتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے، نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ الٰہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں، نہ مراد آباد اور رامپور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خانقاہ حاجیان حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دُکھاتی ہے، عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی والحمد للہ علیٰ ذالک"

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے اُن پر خاص کر مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا اُن کو کامل یقین تھا اور ولایت سے

وہ اُن مخالفتوں کے جھیلنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو اخبار شملہ ملٹری کانپور کی مخالفانہ تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں "جو مضمون کہ اُس میں لکھا گیا آپ نے پڑھا ہوگا اور امید ہے کہ اور بہت کچھ لکھا جائے گا، اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو ملال ہوتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلی ہوتی ہے۔ اول تو اس خیال سے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہوا ہو۔ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد رسول اللہ، خلفائے اربعہؓ، محی الدین جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ، محمد اسمٰعیل دہلوی، و علیٰ ہذا القیاس۔ پس میں تو اُن کی جوتیوں کی برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے، پس اگر میرا کاروبار و میری نیت بھی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اُس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اُس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضرور ہے کہ نیکی پر ہونگے کامیاب ہونگے اور ایسی حالت میں مجھکو بھی اُن کی کامیابی پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا رنج۔"

اس خط اور نیز اُن کے دیگر خطوط سے، جو ولایت سے اُنھوں نے مولوی صاحب ممدوح کو لکھے، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر اور اُس کی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسا تھا اور لوگوں کی مخالفت کی اُن کو مطلق پروا نہ تھی، ایک خط میں خطبات احمدیہ کی نسبت مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "بعد چھاپہ کے چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ تا دانم کہ مخدومم چہ میگوید؟ خدایا مخدومم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست زیراکہ ایں معاملہ مرا باتست نہ با مخدوم من مہدی۔ لیکن محبت من از دو محبت او از من کم مگردان۔ او خدا دانندۂ رازہائے پوشیدہ درون سینہا تو میدانی کہ من با تو و با دین حقہ اسلام دادہ تو چہ میکنم و چہ

اعتقاد دارم؟ پس اگر مرا محبوب من مہدی لامذہب یا کافر گوید یا سیح اللہ و امداد العلی مرتد واند مرا چہ باک؟ تو بر من مہربان باش "

الغرض جب سر سید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں پہنچے تو اُن کو معلوم ہُوا کہ اضلاع شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی سید احمد خاں سے نہ ملے اور نہ اُن کے ساتھ کھانا کھائے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرۂ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ ہم نے سنا ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس لوہارو کے پاس بھی، جو سر سید کے بڑے گاڑھے دوست تھے، دہلی میں پہنچا تھا۔ اُنھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ "خدا مارے یا چھوڑے، سید احمد کافر ہو یا مسلمان، مجھ سے تو نہ ہو سکے گا کہ میں سید احمد خاں سے نہ ملوں اور اُن کے ساتھ کھانے اور کھلانے سے پرہیز کروں۔" سر سید کی زبانی معلوم ہُوا کہ ولایت سے آنے کے بعد بہت دنوں تک اکثر لوگ اُن کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ بیمار اچھے ہونے لگے، پرہیز ٹوٹتا گیا یہانتک کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا، جیسا کہ ظاہر ہے اب ایک عام بات ہو گئی ہے، وہی لوگ جو میز کرسی اور چھری کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو اپنے گھر بُلا کر اور خود اُن کے ہاں جا کر اُسی طریقہ سے اُن کے ساتھ کھانا فخر سمجھتے ہیں اور کوئی شخص اُن کو کرشان نہیں جانتا۔

لیکن مذکورہ بالا مخالفتوں کو بمقابلہ اُس طوفان عظیم کے، جو آگے چل کر اٹھنے والا تھا، محض ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیے، جو ہیں سر سید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لیے کوشش شروع کی، مخالفت کی گھٹا چاروں طرف سے امنڈ گھمنڈ کر اٹھی۔

مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر مرزا پور

اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور، اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقاید خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا، باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں اُن کا منبع انہیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش اور حمیت اسلامی ہوتی تو اُن کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح اُن کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ اُن کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور اُن میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ اُن کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں سرسید اور اُن کے اعوان و انصار پر اعتراضوں کی بوچھاڑ نہ ہو۔ بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مپرسی حالت میں تھے انھوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ اُن کی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے اُن کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اُن کی کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہوگئیں اور کئی کئی بار اُن کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور اُن کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے۔ رسالہ طعام اہل کتاب کی رد میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحتساب لکھی مولوی محمد علی نے مزیل الاوہام نام ایک رسالہ شائع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر ایک

خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے، کانپور سے نورالآفاق اور نورالانوار اور مرادآباد سے لوح محفوظ نکلا، آگرہ سے تیرھویں صدی شائع ہوا، امدادالآفاق، شہاب ثاقب اور تائیدالاسلام وغیرہ اضلاع شمال مغرب سے اور اشاعۃ السنہ پنجاب سے شائع ہوئے سرسید کو ملحد، لامذہب، کرشان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیے گئے اُن کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے اُن کی بھی تکفیر ہونے لگی، سرسید کے نام گالی اور دشنام کے بھرے ہوئے گمنام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گمنام خطوں کا سلسلہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔ سرسید نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھلایا اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور اُن کے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُس کو نہایت جلی حرفوں میں میری لائف میں درج کر دینا چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے جس میں اول سے آخر تک نہایت مغلظ گالیاں جو رذیل سے رذیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آسکتیں، بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہٖ اُن کی لائف میں درج کیا جائے مگر ہماری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اُس ملعون تحریر کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔

چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افترا اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے اس لیے سرسید جہاں تک ہو سکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اول اول جبکہ مخالفوں نے سرسید اور اُن کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اُڑانی شروع کیں اور لوگوں نے سرسید کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب

دیجیے ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریروں سے چندے کے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لیے کبھی کبھی سرسید اور مولوی سید مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں ان کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ از انجملہ سرسید کا مضمون "دافع البہتان" اور سید مہدی علی کا مضمون "تکفیر مسلمان" اور "سوال و جواب" خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

"دافع البہتان" سرسید کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے مولوی علی بخش خاں مرحوم سب آرڈینیٹ جج گورکھپور کی کتاب "تائید الاسلام" کے جواب میں لکھا تھا اس مضمون کو سرسید نے ذیل کے فقرہ پر ختم کیا ہے

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کیے ہیں؟ ظاہرا اس کا سبب ... یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اُسی زمانہ کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں، حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جاویں گے جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں، جب تک میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج دیگر احمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روزِ جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

ایک اور مضمون سرسید نے اُنھیں مخالفتوں کے ہجوم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان "حالِ خود و یارانِ خود" ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے جس کے چند فقرے

ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ میزیبد لب لعل شکرخا را

پرانے دل بعضے تو ہم کو برا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو برا کہنے پر نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے، ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے اُن کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے، اُن کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں، اُن کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے ... ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمد رسول اللہ صلعم کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے اُن کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی دیا گیا، کوئی آرہ سے چیرا گیا، کوئی جلاوطن کیا گیا، پس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اُس کا کروڑواں حصہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گمنام دشنام کے لکھ بھیجے، ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور اُن کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے اُن کا دوست ہوا یا دو پتھر اور ایک کاٹھ کی کل اُن کے ہاتھ میں ہوئی تو اُنھوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا ہم تو اس پر بھی راضی ہیں، مگر اُس دن کا ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے اور سمجھیں گے جو سمجھینگے۔

ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں مکتاب اللہ

کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں ہمارے جدا مجد ابراہیم اپنے باپ آزر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم اُن کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرشان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بپتسما یعنی اصطباغ لیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم و غیرت و حیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹا دی ہے۔ اُس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا، مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کیے تھے ان میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہے اُس میں چندہ دینا اور اُس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ اور تیسرا اُسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنف نے آنحضرتؐ کی نسبت اپنے عقیدہ

کے موافق سخت اور نا ملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام "امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق" ہے چھاپ کر اُس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گذری ہے، اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سُنی کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد، کیا وہابی کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاصکر سُنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ از انجملہ دلی اور لکھنؤ کے دو سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں "در سنوح ایں سانحۂ ایمان زدا و وقوعِ ایں واقعۂ ہوش ربا و ظہور ایں معاملۂ حیرت افزا و حدوث ایں حادثۂ الحاد افشا کے تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اُس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حال بد مآل اس سوال میں مذکور ہے، بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم وتحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہی اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہی۔ اعاذنا اللہ من الوصول الیہ اگر بل بالکل باطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے بے محل میں ساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم۔۔۔۔۔ الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان و دل کی اور لِلّٰہ سمجھنا اپنے مال کا خیال خام ہے، نے نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں پس مرد دیندار بلکہ تمامی سُنی و شیعی و خارجی و سائر ہنود و تمامی سکنائے اہل زمین پر واجب اور متحتم ہے کہ ایسے کلام واہی اور ایسے عقیدہ واہی پر عقیدہ اپنا نہ جماویں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو بادم بنائے اپنے مذہب کا بوجے اور اس امر پوچ پر دل نہادہ نہ ہووے اور اپنے دل میں

اس کا انجام سوچ کر کیا جال بچھایا ہے "

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی، جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نامآور دہ تھے، مقفّٰے عبارت میں تحریر فرماتے ہیں " وجود شیطان اور اجنّہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اُسکا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں . . . اور وجودِ آسمان منصوص قرآنی ہے، منکر اُس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے، حرمت منخنقہ طیور منصوص کلام رب غفور ہے، اور سلف سے تا خلف اتفاق اس پر ماثور ہے، انکار اس کا موجب گمراہی و فجور ہے . . . مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر متشرع اور متدین کو اس کے قبول سے اِبا ہے . . . ہر مسلمان کو حق جل شانہٗ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے، اور مذہب نیچر اور مشرب بد تر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اُس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرب دین ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسۂ جدیدہ افساد شریعت اُس کی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں کہ اُس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں فالحذرَ الحذرَ یا ایہا المسلمون والھربَ الھربَ یا ایہا المومنون "

ان تمام فتووں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہے اُن کا تجزیہ محققین اہل اسلام کی تصنیفات اور اُن کے کلام سے مولوی سید مہدی علیخاں نے اُن دو مضمونوں میں جو " تکفیر مسلماناں " اور " سوال و جواب " کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اسی زمانہ میں چھپے تھے اور نیز دیگر مضامین میں بوجہ استیفا دیا ہے اور سرسید کی تصنیفات میں بھی اُن کے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں اس لیے اُن تمام استفتاؤں اور فتووں اور اُن کے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہے مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تحریر کی رو میں اُن کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لطیفہ جس زمانہ میں سرسید ولایت میں تھے اُن کے پاس اخبار شعلۂ طور کانپور میں مولوی

سید امداد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا، اُس میں تاریخ الفنسٹن کا وہی مجزو جس پر آخرکار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بعینہٖ نقل کر کے صاحبِ مضمون نے لکھا تھا کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے" سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے، اُسی اخبار (شعلۂ طور) میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشد و مد لکھا ہے کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے"، حالانکہ خود بھی اُسی عبارت کو لکھتے ہیں، پھر مجھ میں اور اُن میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور اُنھوں نے اُردو سے"

یہ نرا لطیفہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہے، مولوی امداد العلی بھی تکفیر کے مستحق ٹھیرتے ہیں، کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شفای قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ اُس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے؟ امام مالک نے حکم دیا کہ ان الفاظ کا بولنے والا کافر ہے اُس کو قتل کر ڈالو۔ اُس نے کہا حضرت میں نے تو دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہم نے تو تجھی سے سنا ہے" لطیفہ یہ ہے کہ جب سرسید ولایت سے واپس آ گئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا اُس وقت مولوی امداد العلی نے سرسید کے پاس ایک اخبار یا رسالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی فتوے کی دھمکی دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ "مفتی سعد اللہ صاحب کا فتوائے تکفیر میں جناب احمد خاں کی، جو ترجمۂ تاریخ پر مرتب ہوا ہے، راقم کے پاس موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ سید احمد خاں کے حواریین اُس فتوے پر بھی ایمان رکھتے ہیں یا نہیں" سرسید تہذیب الاخلاق میں اسی دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب

---

[1] مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے جن کا قدیم وطن مراد آباد تھا جس زمانہ میں سرسید کی آمد و رفت مفتی صدر الدین خاں مرحوم دہلوی کے مکان پر بہت زیادہ تھی غالباً اُسی زمانہ میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلّی میں وارد تھے اور مفتی صدر الدین خاں سے پڑھتے تھے۔ جب یہ تمام علوم دینی

کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلّی میں دیکھا ہے؟ اور یہ وہی مفتی سعداللہ صاحب ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آل رسول ابن علی اولادِ نبی کے کفر اور قتل کا فتویٰ دے کر عشرۂ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑھی سے نیزہ پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آلِ رسول کے قتل و کفر پر فتوے دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے۔

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی تھی، دلی، رام پور، امروہہ، مرادآباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے سا ٹھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کیے تھے، گویا ہندوستان کے تمام اہلِ حل و عقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اُس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی پوری کر دی، انھوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان میں پیش کیے جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان میں ہے اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے اور ابلیس کا استکبار سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا،

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۵۱) عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جب کہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے اُن کو مذہب اہلِ سنت کے افتا کا معزز عہدہ مل گیا تھا اور اُس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ تک یہ اسی عہدہ پر مامور رہے اسی زمانہ میں وہاں ایک بہت بڑا واقعہ مولوی سید امیر علی صاحب کے قتل کا گزرا تھا۔ ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے ایک مسجد کو ڈھا کر مندر بنانا چاہا تھا اور اہلِ دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا سید امیر علی کچھ جمعیت لے کر وہاں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے۔ چونکہ سید امیر علی سنی المذہب تھے اس لیے نائب نے مفتی سعداللہ سے اس بات کا فتویٰ لکھوا لیا کہ فوج بھیج کر سید امیر علی کو اس ارادہ سے روکا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو اُن کو قتل اور اُن کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے چنانچہ سید امیر علی شہید کیے گئے۔

اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہوگیا ہے آیۂ اِمّا منّا بعد وامّا فداءً سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہو فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہو جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہو، اور کہتا ہو کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے سے کرتا ہو اور انکار کرتا ہو شق صدر آنحضرتؐ کا، اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے پرند حلال ہیں، پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے ؟"

اس استفتے کے جواب میں مذاہب اربعہ کے چاروں مفتیوںؐ نے جو مکۂ معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحصل یہ ہو کہ "یہ شخص ضالّ اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہو اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ اس کو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آوے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اُس کی تادیب کرنی چاہیے اگر وُلاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اُس کو سمجھے گا اور اُس کی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا۔" اس کے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرس حرم شریف اور مولانا رحمت اللہ مرحوم ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہو۔

پھر مولانا علی بخش خاں مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہو۔ اُن کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو کچھ درمختار اور اُس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہوگیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اباحی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا

ؐ یعنی شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ عبداللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن زین دحلان مفتی شافعیہ اور محمد بن عبداللہ بن حمید مفتی حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتی مالکیہ ۱۲

مباح بتلاتا ہے ۔ اور اہل مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی ۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کرلی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہوگئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اُس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لیے اور وُلاۃ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں ۔"

دوسرے استفتے کا ملخص یہ ہے کہ" اُس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقاید اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ستہ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفۂ جدید کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدوّن کیے ہیں بے فائدہ ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر ستہ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفۂ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں ۔ اور جب لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا اور اُس کی اعانت سے انکار کیا تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آؤں گا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا ۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور اُن کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں ۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اُس کی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں ؟ بیّنوا توجروا ۔"

اس کا جواب بھی حرمین شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہے جس کا محصل یہ ہے کہ" یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اُس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اُس کے بانی سے اور اُس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیت اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اُس کا مخالف ہو ۔"

حسن اتفاق سے جس زمانہ میں یہ فتویٰ مولوی علی بخش خاں حرمین شریفین میں وہاں کے علما اور مفتیوں سے لکھوا رہے تھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج اور زیارت کے ارادہ سے وہاں گئے تھے۔ اُدھر تو مولوی علی بخش خاں نے عرب سے آکر مذکورۂ بالا فتووں کی ہندوستان میں منادی کرنی شروع کی اور اُدھر اُس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسید سے مطلق شناسائی نہ تھی ایک طول طویل مضمون سرسید کی تکفیر کی تردید میں انھیں دنوں میں اخبار کوہِ نور لاہور میں چھپوایا جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا تھا اور جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں۔

وہ علمائے حرمین شریفین کے فتووں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فتوے لکھنے لکھانے کا جو حال یہاں ہے (یعنی ہندوستان میں) وہی وہاں (یعنی حرمین شریفین میں) ہے، جس مضمون سے چاہا فتوے لکھ لیا جس سے دستخط کرانے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرا لیے۔ جیسے عالم یہاں ہیں ویسے ہی وہاں ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ان کی زبان ہندی ہے اُن کی عربی . . . وہاں جو ہندوستانی اہل سنت وجماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں ایک بدعتی، دوسرے وہابی، جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو بُرا کہتے ہیں۔ جب بدعتیوں کا داؤ چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں، جب وہابی غالب ہو جاتے ہیں بدعتی چُپ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں بدعتیوں کا داؤ چل رہا ہے . . . سید احمد خاں صاحب حرمین شریفین میں بھی مشہور ہیں، اکثر ہندوستانی اور بعض عرب اُن کے نام اور اُن کے خلاف واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہے کہ سید احمد خاں لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کر کے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے گا کرسٹان کریں گے اور دین اسلام سے پھیریں گے۔ اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں کو بہکا کر دین اسلام سے پھیرتے ہیں اور نئے نئے عقاید سکھلاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اُن کا فتنہ بڑھ کر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں

مسلمان رہ کر اور دین اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کرکے عیسائی کرتے ہیں جس کسی
نے سید احمد خاں صاحب کا یہ حال سنا . . . وہ اُن سے نفرت کرنے لگا اور بُرا جاننے لگا...
جب سے واقعی حال کہا گیا کہ سید احمد خاں ایسے آدمی نہیں ہیں، پکے مسلمان ہیں، ظاہر اور
باطن میں یکساں ہیں، مسلمانوں کو مسلمان رکھا چاہتے ہیں، قرآن کے معنی جو ہیں وہی کہتے ہیں
حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اُس کو بے اعتبار سمجھتے ہیں، اہل کتاب کے
ذبیحہ کو قرآن مجید کے موافق حلال کہتے ہیں، سور اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، انسانوں سے
انسانیت کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق دوستی رکھنی اور ہر ایک کی بھلائی چاہنی موجب ثواب
بتاتے ہیں، شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں
نے بیان کی ہے اُن کے ہمزبان ہیں اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں
مانتے، مفسر کو مفسر مانتے ہیں الہامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد کہتے ہیں خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے
ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی دین و دنیا درست ہو، ہزاروں روپے
اپنے خرچ کرتے ہیں، دل و جان سے ہر وقت اسی کے خواستگار ہیں، اپنا جان و مال
مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا ہے، چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں مالدار ہو جائیں
اور دین میں ایماندار۔ یہ سن کر وہ سید احمد خاں کی تعریف کرنے لگا، ہندوستانی نے کہا بہت
اچھے آدمی ہیں اور عرب نے کہا طیب . . . جناب مولانا الٰہی بخش خاں صاحب بہادر جب
تک مکہ معظمہ میں رہے ان کو یہی شغل رہا، جب مدینہ منورہ میں گئے وہاں بھی انہیں فتووں
کی فکر رہتی، حالانکہ مدت قیام مدینہ منورہ کی تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات روز کہ ضروری کام
اور زیارات طیبات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں مولانا صاحب اسی انتظام میں رہے،
سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روضۂ مطہرہ کے روبرو ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر
ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہے اور اسی کی بحث ہوتی رہتی
مولانا صاحب شہاب ثاقب اور ایک اور رسالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے۔ وہ بھی وہاں

تقسیم فرمائیں۔ سید احمد خاں صاحب کا کفر اور اسلام اور اُن کے کفر کے فتووں کا مدار اُن کا حال بیان کرنے والوں پر منحصر ہے، نہ مکہ والے ان کو جانیں، نہ مدینے والے اُن سے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے اُن کے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کر کے لا سکتا ہے . . . سید احمد خاں صاحب کا اسلام مسلمانوں کے دلوں پر نسلاً بعد نسلٍ کندہ ہوتا چلا جائے گا اور تھوڑے عرصہ بعد سید احمد خاں صاحب کے نام کے ساتھ مجتہد و مجدد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائے گا۔ اُن کے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں۔ جو بات کفر کی ہے وہ کفر کی ہے اور جو اسلام کی ہے وہ اسلام کی۔ سید احمد خاں صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمین شریفین کے عالموں نے اُن کے کفر کے فتوے دیدیے۔ کافر نہیں ہو سکتے جیسے یہاں کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے، صرف زبان کا فرق ہے، اُنھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں انھیں سے یہاں ولے۔"

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا، جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں" دو تین مولانا صاحبوں کے سامنے میں نے سید احمد خاں صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال اُن کا بیان کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ فلاں مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا منشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں وہ اس کے خلاف کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خاں کا کہنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ گے میں نے کہا بہت اچھا سید احمد خاں صاحب کا کہنا نہ مانوں گا، اُن کو بُرا جانوں گا مگر پھر کس کا کہا مانوں؟ آپ کا؟ سو آپ کو بھی تو فلاں مولانا کافر کہتے ہیں، اس کا کیا علاج؟ غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال اور لڑائی ہے۔"

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمین شریفین کے فتووں کی حقیقت اپنے مضمون میں اچھی طرح ظاہر کر دی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے ساتھ عالموں کا سرسید کی تکفیر پر اتفاق کرنا اور حرمین شریفین کے مفتیوں اور دیگر عالموں کا ان کے ساتھ ہمزبان ہونا بعض ناواقف

لوگوں کو سرسید کے مسلمان ہونے کی نسبت شبہ میں ڈالے اور ممکن ہے کہ بعض ناظرین کتاب کے دل میں یہ خیال گذرے کہ تیس برس بعد ان دبے دبائے فتووں کا سرسید کی لائف میں ذکر کرنا گویا اُن کی تکفیر میں از سرِنو جان ڈالنی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک سرسید کی لائف ناتمام رہتی اگر اُن فتووں کا ذکر اُس میں نہ کیا جاتا در حقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سرسید کے اعلےٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تمغے ہمیشہ انھیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ "جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اس کو حقیر جان! اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اُس کو ناچیز سمجھ" ابوالائمہ علی مرتضیٰؑ نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے، سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے زمانہ میں اُس کا صحیح مصداق سید احمد خاں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا، وہ فرماتے ہیں الایمان ان توثر الصدق حیث یضرک علی الکذب حیث ینفعک (یعنی ایمان کے یہ معنی ہیں کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید اُس وقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے) سرسید کو اپنی سچائی کی بدولت صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک اور قوم کی خیرخواہی کی بدولت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی جابجا شہادت دیتی ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر افسروں اور حاکموں کی خفگی اور حد سے زیادہ ناراضی برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایمان کی سچائی کا معیار یہ نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُس کے کفر کا فتوے نہ دیا ہو بلکہ اُس کا صحیح معیار آزمائش میں پورا اترنے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (یعنی کیا لوگ یہ سمجھے ہیں کہ صرف اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہ کی جائے گی) اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سید احمد خاں کا ایمان کامل ٹھیرتا ہے یا اُن لوگوں کا جنھوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھیرایا؟ غدر کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا، اور دین اسلام امن اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا، اُس سے زیادہ حمیت اسلامی اور جوش ایمانی

کہ امتحان کا وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اُس وقت اسی کافر واجب القتل کے سوا اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے نہ اُن مستفتیوں میں سے کوئی اٹھا جنھوں نے اُس کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں میں سے جنھوں نے اُس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند کر کے مہریں اور دستخط کیے۔

"در ہند چو او یکے و آں ہم کافر　　پس در ہمہ ہند یک مسلماں نبود"

باوجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے جب کہ وہ کفر اور واجب القتل ہونے کے فتوے تمام ملک میں شایع کر چکے تھے، التجا کی کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اُس کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ میں لیجیے، میں اُس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس پر مولوی امداد العلی نے اُن کو لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور تم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" مگر مولوی علی بخش خاں نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کو اور آپ کی کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اُس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اُس کی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں خرچ کی جائے۔ سرسید نے اُن کی تمام شرطیں منظور کر لیں اور اُن کو قواعد مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خط و کتابت ممبران کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے پاس بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے مگر کثرت رائے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خاں چاہتے تھے منظور ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ اہل سنت کے مشہور دیندار عالموں میں سے بیس بزرگوں کی خدمت میں درخواست کی جائے کہ وہ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں۔ البتہ اتنا گناہ ہو گیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بشمول مولوی علی بخش خاں علمائے اہل سنت کے بہت

سے نام کمیٹی خزنۃ البضاعۃ نے خود تجویز کر دیے اور منجملہ میں بزرگوں کے دو یا تین ممبر خزنۃ البضاعۃ کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لیے نامزد کیے گئے۔ جس وقت مولوی علی بخش خاں کے پاس اس روئداد کی نقل پہنچی وہ سخت ناراض ہوئے۔ آٹھ سو روپیہ کا چندہ جو انھوں نے مدرسۃ العلوم میں دینے کا وعدہ کیا تھا اُس کے دینے سے انکار کیا اور مدرسۃ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ جن دیندار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں اُن میں سے اکثر نے جواب تک نہیں دیا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہرگاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔

ان تمام واقعات کی طرف سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب نے لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں۔" اگرچہ اس امر کو اس بات سے جو بحث کی تھی کچھ تعلق نہ تھا بایں ہمہ میں اُس کو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محب قلبی منشی چراغ علی صاحب (جو شیعہ مذہب رکھتے تھے) مجھ سے کہیں کہ تم ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" تو پھر میں کیا کروں گا؟ بقول شخصے کہ "گوری کا جوبن چنگیوں ہی میں گیا" میرا تو یوں ہی تکا بوٹی ہوئے گا . . . . جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصبانہ جواب دیا اُس سے ہر شخص جس کو خدا نے عقل اور محبت اور حب ایمانی دی ہو گی نفرت کرتا ہو گا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے جس سے اہل سنت و جماعت کو کچھ تعلق نہیں، پس یہ کہنا کیسا بیجا تعصب ہے کہ ہرگاہ اُس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے۔ خدا کرے کہ وہ یہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں، مکہ معظمہ کو سدھاریں مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں۔"

"افسوس ہے کہ شیعہ و سنی میں اس زمانہ میں بہ نسبت اُس زمانہ کے جب کہ امام محمد اسمٰعیل

بخاری شیعوں سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں فرماتے تھے۔ اتفاق اور فرقوں میں جاپڑا؟ ہو گیا ہے۔ مگر حالت زمانہ کی ایسی ہے کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سنیوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں، عہدوں میں کم ہیں، اگر پھر ان میں بھی شیعہ وسنی وخارجی وناصبی اور وہابی و بدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے؟ ارے کمبخت متعصبو! تم آپس میں لڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فائدے کی ہے اُس میں کیوں ایک دل ہو کر شریک نہیں ہوتے؟ عالمگیر نے ایک عامل کی بددیانتی کا ذکر نظیراً کسی دوسرے عامل سے کیا، اُس نے عرض کیا "حضور! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں" عالمگیر نے کہا "بلے، مگر بوقت خوردن ہمہ برابر میشوند" بس اے بندگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہے"

"جناب سید الحاج مولانا حاجی علی بخش خاں صاحب سے جو معاملہ پیش آیا وہ تو الشت ازبام ہے، اُن کی اور ہماری تو وہی مثل ہو گئی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" یعنی وہ ہم کو بدعہد کہتے ہیں ہم اُن کو بدعہد کہتے ہیں۔ بہرحال کسی نے بدعہدی کی ہو، وہ بات جس سے کشیدگی پڑ گئی ہو اس قدر ہے کہ تمام امور تعلیم مذہبی تنہا جناب ممدوح کو کیوں نہ سپرد کیے گئے دیگر بزرگان دین کو کیوں شریک کیا؟ وما ھذا الا افتراق مبین"

سرسید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اُس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اُس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین ومذہب کی کچھ پروا نہیں رہی، چنانچہ اسی خیال سے سرسید اکثر کہا کرتے تھے کہ "جو لوگ میرے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں اور میرے خیالات سے اسلام

سلہ خدا کا شکر ہے کہ سرسید کی چیخ پکار سے ہمارے علما اب اس تفرقہ کو مٹانے کی فکر میں ہیں چنانچہ ندوۃ العلما نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے اگرچہ بعض علما اس کے خلاف ہیں۔"

کو نقصان پہنچا رہی ہیں جو کچھ کہ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اُس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے"۔ مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ تر مخالفتیں محض نفسانیت، خودغرضی یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لیے بجائے اس کے کہ سر سید کے اقوال جو انھوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راست راست بلا کم و کاست بیان کیے جاتے۔ بیسیوں باتیں اُن کی نسبت غلط مشہور کی گئیں، اُن کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لیے ہیں اور بیس نکال ڈالے ہیں، اکثر یہ بھی سنا گیا کہ اُنھوں نے سورۂ الرحمٰن میں "فبأیِّ آلاءِ ربکما تکذبان" صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مکرر سمجھ کر سورت میں سے نکال ڈالا ہے۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سر سید کے خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لے گئے تھے اُس میں بےشمار عقائد سر سید کی طرف ایسے منسوب کیے ہیں جو بالکل خلاف واقع ہیں، مثلاً یہ کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ ازلی ہے، یا ذات باری تعالیٰ خود مادی ہے، یا یہ کہ باوجود قانونِ قدرت کے بعثت انبیا کی ضرورت نہیں، یا یہ کہ جب علوم جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں ضعف پیدا ہوگا تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے، یا یہ کہ نبوتِ انبیائے سابقین یا کتب سماویہ کے انکار سے، یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اُس کے پھینک دینے سے، یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانے سے، یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے، یا بہشت و دوزخ اور قیامت کے انکار سے، یا ضروریات دین کے انکار سے آدمی کافر نہیں ہوتا، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے، یا تھوڑی سی شراب جو نشہ متوالا نہ کر دے یا اتنا جوا کھیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینی ہے اور وہی واسطے ادائے فرض کے کافی ہے باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مخترعہ علما کا اتباع ہے۔

اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کیے گئے ہیں جن کو سرسید نے اپنے مضمون دافع البہتان میں ایک ایک کرکے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ "لعنۃ اللہ علی قائلہ وعلی معتقدہ"

مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اُس خیر خواہ خلائق پر لگائے جاتے تھے۔ اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ اُنھوں نے اپنا سر دس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز اُن کا سر کاٹ کر لندن لیجائیں گے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا، اُس وقت راقم بھی موجود تھا، اُس مرحوم نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں مل کر خاک ہوجانے والی ہے اُس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہوسکتی ہے کہ دانشمند لوگ اُس کو روپیہ دے کر خرید لیں اُس کے ڈیسکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اُس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے دس ہزار چھوڑ دس روپئے بھی اگر اس کی قیمت میں لیں تو میرے نزدیک مفت ہیں"

منجملہ اُن بیشمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو سنہ ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس اُن پر لگایا گیا۔ سرسید پنشن سے کر علیگڈھ آنے سے چند مہینے پہلے، جب کہ حضور پرنس اوف ویلز بنارس میں تشریف لائے، اُن کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی اُس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانہ کے لیے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جس کو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لیے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے خود اُس میدان کو صاف کرا دیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوایا تھا اسی طرح اُس چبوترے کے معاوضہ میں ۲۲ روپئے دینے تجویز ہوئے۔ سرسید نے اس خیال سے کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں

سے کس کام آئے گی، نواب لفٹنٹ گورنر سے جو اُن دنوں بنارس آئے ہوئے تھے، عرض کر کے اُسی میدان کے قریب مسجد کے لیے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوا دی اور شفاخانہ کے چندے میں سے ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں مسجد تعمیر کرا دی۔ بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکرگزار ہوئے اور مسجد کے پیش طاق پر یہ بیت کندہ کرانی تجویز کی۔

"درآوان سعید واز برائے طاعت یزداں   بناکرد ایں مسجد ز سعی سید احمد خاں"

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی

بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخباروں میں یہ لکھا جاتا تھا کہ سید احمد خاں نے شفاخانہ کے واسطے مسجد منہدم کرا دی۔ یہ شور و شغب ایک مدت تک ہندوستان کے نالائق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا۔ آخر سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کر کے اپنے اخبار میں چھاپیں گے۔ سرسید نے اڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اُس کو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنے کے لیے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بکنے دیں۔ چند روز بعد اڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا کیونکہ سرسید سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا۔ آخر علیگڑھ اخبار کے اڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ مئی ۱۸۶۸ء کے پرچہ میں تمام حال اول سے آخر تک بحوالۂ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا۔ اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل سے مطلع کیا اور نہ سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے مدت تک اس واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی۔ تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹیکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال، جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے نقل کر کے ہر ایک پرچہ پر جدا جدا ریمارک کیے ہیں۔ ازاں جملہ اودھ اخبار میں جس کے اڈیٹر اس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے،

یہ فقرہ چھپا تھا "اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا یعنی اُس وقت جبکہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشتہر ہو چکی" اس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ایماء کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اس کے عذر میں نہایت ادب سے اپنے مخقق کے سامنے حافظ کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند — گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے "یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا یعنی اُس وقت جبکہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی" پھر لکھتے ہیں "ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائے گا کہ ہماری قوم بدنامی کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے "

اسی طرح بیسیوں اتہام سرسید پر، مدرسۃ العلوم پر، اُس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جن سے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اُس کے معاونوں کو رنج اور مخالفوں کو خوشی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ننگ اسلام واہل اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کوٹھی میں ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اُس کی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اُس کے نیچے دب گئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر جو مثل مشہور ہے کہ "اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے" ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانہ میں مشہور ہو اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسید کے کفر وارتداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے اطراف ہندوستان میں شایع ہوئے تو اُن کی جان لینے کی دھمکیوں کے گمنام خطوط اُن کے پاس آنے لگے۔ اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ "ہم نے اس بات پر قرآن اٹھایا ہے کہ تم کو مار ڈالیں گے" ایک خط میں لکھا تھا کہ "شیر علی جس نے لارڈ میو کو مارا تھا اُس نے نہایت حماقت کی اگر

وہ تم کو مار ڈالتا تو یقینی بہشت میں پہنچ گیا ہوتا"۔ ۱۸۸۸ء میں جبکہ سرسید کالج کی طرف سے ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے تھے اور حضور نظام (خلد اللہ ملکہ) کے ہاں بشیر باغ میں مہمان تھے ایک مولوی نے ہمارے سامنے سرسید سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کی مجھ کو بھی خبر ہوئی، چونکہ میں علیگڑھ کی طرف آنے والا تھا اُس سے خود جا کر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علیگڑھ جانے والا ہوں اور میرا ارادہ سید احمد خاں سے ملنے کا ہے جب تک کہ میں اُن کے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادہ سے باز رہیں۔ چنانچہ میں علیگڑھ میں آیا اور آپ سے ملا اور بعد دریافت حالات کے اُس کو لکھ بھیجا کہ سید احمد خاں میں کوئی بات میں نے اسلام کے خلاف نہیں پائی تم کو چاہیے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیالِ خام سے نادم ہو۔ معلوم نہیں کہ اُس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا یا غلط مگر سرسید نے جو یہ حال سن کر اُس کو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا، انھوں نے کہا "افسوس ہے کہ آپ نے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادہ سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں، محروم رکھا"۔

ایک دفعہ خاص علیگڑھ میں کسی نے بذریعۂ گمنام تحریر کے سرسید کو یہ دھمکی دی کہ اگر آئندہ تم گاڑی میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو تمھاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر ہرگز نہ رہوں گا مگر سرسید نے اِن دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا، نہ اُن کی کسی عادت میں فرق آیا اور نہ انھوں نے اپنی حفاظت کا کبھی کوئی خاص انتظام کیا۔ سرسید کی وفات سے چند مہینے پہلے ایک مخالف گروہ کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ اُن کا ارادہ سید کے قتل کرنے کا ہے اور فی الحقیقت اُس گروہ کا جوش اُس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ اُن سے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسید کے بعض احباب نے اُن سے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں اور کچھ

نا یہ چوکیدار رات کے پہرے کے لیے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہییں اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیش حال کے کوٹھی کے اندر نہ آنے پائے۔ سرسید یہ باتیں سن کر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کار دوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں، چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے نہ سوار ہونا موقوف ہوا۔

۱۸۸۸ء میں جب پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علیخاں، جن کی تحریک سے لاہور میں اس جلسہ کا ہونا قرار پایا تھا ان کے ایک مخالف کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسید کے نام پہنچی جس میں علاوہ اور نالائق باتوں کے نہایت بُرے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا ورنہ جو حال کل رات کو خان بہادر کا کیا گیا ہے اس سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا۔ سرسید نے جو وقت علیگڑھ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اُس میں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے چلنے سے پہلے اُن کو تار دیا، اور جب اُن کی خیریت معلوم ہوگئی فوراً لاہور کو روانہ ہوگئے۔ لاہور پہنچ کر وہ تحریر اُنھوں نے خان بہادر اور سردار محمد حیات کو دکھائی۔ دونوں صاحب اُن گستاخیوں کو دیکھ کر جو سرسید کی نسبت کی گئی تھیں شدت غیظ و غضب سے از خود رفتہ ہوگئے مکاتب کی نسبت یقین ہوگیا تھا کہ اخبار رفیق ہند کا اڈیٹر ہے اور سرسید نے خود اُس کا خط اچھی طرح پہچان لیا تھا، باایں ہمہ اُس مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ کاتب خط کی اس حرکت سے درگذر کیجائے اور اُس کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دیجائے کیونکہ وہ خود اس تحریر کے لکھنے سے انکار کرتا تھا مگر خان بہادر اور سردار صاحب اور دیگر اہل پنجاب نے سرسید کی سفارش اُس کے باب میں منظور نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اپنا اخبار۔ جو غالباً بند ہوگیا تھا، چند ۔

مدت بعد پھر جاری کیا پہلے ہی اخبار سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار اور مداح وثنا خواں تھا، چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے تو اسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی مدحیہ عبارت چھپی تھی جس کے سرے پر یہ شعر لکھا تھا

"مرحبا سید اولاد نبی مدنی جان جاں باد فدایت کہ عجیذ منی"

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے گوئے سبقت لے گیا - وہی شخص جس کی نسبت پہلے "سید اولاد نبی مدنی" لکھا گیا تھا اس پرچہ میں کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اس کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو اور کوئی آلہ لوگوں کو اس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو اس پرچہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ سرسید کے دوست اس کی زبان درازیاں دیکھ کر بگڑتے تھے اور اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "موسم کی آندھی ہے چند روز میں خود بخود فرو ہو جائے گی"

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت تک بند رہ کر تیسری بار پھر جاری ہوا ہے اور چشم بد دور اب بھی باوجود اس کے کہ سرسید دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اپنی وضعداری نباہے جاتا ہے لیکن اب سرسید کا نام صراحۃً کم لیتا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا اُن کے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اُس کو علیگڈھ مشن پر ڈھال دیتا ہے مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت اب کی بار اُس میں خود بخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے وہ برخلاف اُن اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں دونوں قوموں میں آشتی اور مصالحت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے اُس کی یہ پالیسی جیسا کہ اُس کے مخالف خیال کرتے ہیں کسی غرض پر مبنی کیوں نہ ہو ملک کے حق میں بہرحال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر اُن کے پاس بھیجے جس

میں بہت سی باتیں خلاف واقع درج تھیں اور جابجا اُن کی تنقیص کی گئی تھی مگر مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اُس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا " ایک ہمارے شفیق غائبانہ نے جن سے ہم سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھی بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رباعی حسب حال لکھتے ہیں

اے آنکہ مرا ندیدہ بشناختۂ ۔۔۔ نادیدہ تصورم چساں ساختۂ

با ایزد بے مثال مانندیم ۔۔۔ حقا کہ ندیدہ ونشناختۂ

سب سے زیادہ سرسید کا ذکر خیر پنچ اخباروں میں ہوتا تھا جن کے اڈیٹر اور پروپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازاری صرف اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم کے خیر خواہ اور جان نثار پر پھبتیاں اڑائیں اُس کے کارٹون بنائیں اُس کی ہجو کے اشعار شایع کریں اس کی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی بُرائی بھلائی کا انحصار ہے دنیا میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے توازے سنتے سنتے اُن کے عادی ہو گئے تھے یہاں تک کہ جس اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اُس کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں " ہمارا حال تو اُس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے "

اسی طرح سرسید کی تمام تحریریں، جو اُس مخالفت کے زمانہ میں تہذیب الاخلاق میں چھپی تھیں نہایت لطیف اور دلچسپ ہوتی تھیں انہاں جلد دو تین فقرے مختلف مقامات سے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں " ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارنپور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی ۔۔۔ ایک صاحب نے کہا کہ " ہے تو کرشان مگر ہماری

قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کرشان سے ہوگی" یہ نقل سنکر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو تو اس کرشانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ہے .. .. صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے اس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ "آں قرساق ہمہ خوش میگوید" صائب کہتا ہے کہ "جیسی عزت مجکو قرساق کے لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرشان کا میرے لیے عزت قومی کا باعث ہو"

ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرات ہماری تو وہی مثل ہے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا، از برادران دور و از بیگانگان نفور، ایک گوشہ میں پڑا ہوں، نزدیک و دور یگانہ و بیگانہ سے لعن وطعن سنتا ہوں جس طرح بیگانگان سے نفرت کرتے ہیں برادران وطن بھی الاماشاء اللہ اسی طرح متنفر ہیں قصور یہ کہ اپنی دانست میں بھائیوں کا بھلا چاہتا ہوں، اُن کی عام رائے کی مخالفت سے نہیں ڈرتا بلکہ جو اُن کے بھلے کی ہے وہی کہتا ہوں۔ یہی کمبخت خصلت ہے جس نے مجھ کو اس حال پر پہنچایا ہے"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں "دنیا میں کوئی نہیں رہا، پیر نہ پیغمبر نہ زاہد خدا پرست نہ فاسق نفس پرست، سب کو گذرنا ہے مگر میں سمجھتا ہوں، بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو، کہ حضرت مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ، جن کو بہ لحاظ اُن نسبتوں کے جو مجھے اُس خانوادے سے ہیں نازسے پردادا کہنا زیبا ہے، اُن کا یہ شعر میری خاک مرقد کا کتابہ ہوگا ؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

سرسید نے جو لباس و طعام اور طرز ماند بود اور طرز معاشرت وغیرہ میں تعلیم یافتہ گروہ کا طریقہ اختیار کیا تھا اور جس سے انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنا مقصود تھا مسلمان تو اس طریقہ کو ناپسند کرتے ہی تھے بلکہ اُس کو عیسائی ہوجانے کے برابر سمجھتے تھے مگر تماشا یہ ہے کہ بعض متعصب اور مغرور انگریز بھی اس سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا

اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی اخلاق میں منو کے زمانہ سے آج تک باوجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی اور جو فرق منو نے شُودر اور برہمن میں رکھا تھا وہی فرق اس زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے شائستہ لوگ حاکم و محکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو ہندوستان میں رہ کر انگلستان کے اصلی جوہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسی لباس میں ہوں ناک بھوں نہیں چڑھاتے مگر تنگدل انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ٹرکش کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہن کر ہم سے ملنے کو آئیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات اُن لوگوں کو جو وضع اور لباس میں سرسید کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یورپین افسروں سے، باوجودیکہ برسوں ایک جگہ رہے، کبھی نہ مل سکے۔ مگر جس بات کو انھوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اس کو ترک نہیں کیا، جیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا جب کبھی اُن کو معلوم ہوا کہ کسی افسر یا حاکم اعلیٰ نے ہندوستانیوں کے یورپین ڈریس پر اعتراض کیا ہے فوراً اخبار میں اُس کا جواب لکھا یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیل وضع کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سرسید نے ایک نہایت زبردست آرٹکل اس کے برخلاف لکھ کر اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس طرح کے بے شمار آرٹکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں اُن کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولوی امداد العلی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں "بعض اہالیان ہند نے واسطے دھوکا دینے حکام وقت کے اپنا طریقۂ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر

بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے، اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور اُن کے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ اُن کے خبث طینت کا کر و دغا ہے یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغاباز سمجھنے کے اُن کو اچھا نہیں جانتے اور اُن کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے۔"

باوجود ان مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے جو اُن کے مقابلہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اُس کو ترک نہیں کیا نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے چنانچہ اُن کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے، بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخبار میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسا تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اس سچے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ "مَا ذَلَّ ذُو حَقٍّ وَلَوِ اتَّفَقَ العَالَمُ عَلٰی خِلَافِهٖ"

اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں ولایت سے سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر کو لکھا تھا "ردو قدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانہ میں مثل جھوٹے موتی کے بے آب ہو جاوے گی، خواہ وہ بات خود اُس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ اُس کے مخالف کی۔ پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری بُرائی لکھیں آپ بلاتکلف اپنے اخبار میں نقل کیجیے صرف اس کی صحت اور عدم صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دیجیے امید ہے کہ آپ اپنی عنایت سے میری التماس کو قبول فرمائیں گے۔"

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سرسید کے خیالات یا مدرسۃ العلوم کے خلاف کسی انگریزی

اخبار میں چھپتا تھا تو اُس کا جواب دیے بغیر کبھی نہ رہتے تھے اور اکثر ایسے مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے جس زمانہ میں اُنھوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی ہے کالا کیا اکثر یورپین افسر اُن کے مخالف ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے، کمیٹی نے مدرسہ کے لیے جس قطعۂ زمین کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی تھی ضلع کے حکام اُس کا دینا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علیگڑھ سخت مخالف تھے یہاں تک کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانی مدرسہ کے خلاف چھپتا تھا سرسید کو انھیں دونوں صاحبوں پر اُس کے لکھنے کا گمان ہوتا تھا چنانچہ انڈین آبزرور مطبوعہ ۱۸۷۳ء میں جو ایک سخت آرٹکل مدرسۃ العلوم اور سرسید بلکہ تمام مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا اس پر سرسید کو یہی خیال ہوا کہ ان دونوں افسروں میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر سرسید نے دو آرٹکل تہذیب الاخلاق میں لکھے جن کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی ساتھ چھاپا تھا اُس میں سے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"انڈین آبزرور مطبوعہ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۳ء میں آرٹکل لکھنے والے نے ہم کو (یعنی مسلمانوں کو) سخت متکبر اور متعصب کہا ہے اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے کم فائدہ حاصل کرنیکا قرار دیا ہے۔ اس آرٹکل کو پڑھ کر اول اول تو ہم کو بہت تردد اور خوف معلوم ہوا، تردد تو اس بات کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے؟ مسٹر ڈی پی آئی[1] کا؟ یا مسٹر سی ایس[2] کا؟ اور خوف اس بات کا ہوا کہ اگر پچھلے کا ہو تو ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا لفٹنٹ گورنر ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی اُس کے ہاتھ میں پڑ جاوے۔ مگر چونکہ اُس آرٹکل کے مضمون اکثر وہ ہیں جو مدت ہوئی کہ ہم سُن چکے تھے اس لیے وہ ہمارا تردد اور خوف دونوں جاتے رہے۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) متکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طرز تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پا دیں۔"

---

[1] یعنی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ۱۲ [2] یعنی سول سرجن ۱۲

"انڈین آبزرور کا آرٹکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ "خاص مسلمانوں کے کالج قائم کرنے کے لیے کافروں (یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لیجاتی ہو؟ اور یہ بھی لکھتا ہو کہ "اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش سے قائم ہوگا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہوگا لیکن اگر لارڈ نارتھ بروک صاحب جیسے لوگوں کی سخاوت سے قائم ہوا تو کچھ دلی خواہش کا نشان نہ ہوگا" اگرچہ ایسا لکھنا ایک عیسائی کو خصوصاً اُس قوم والے کو جس سے ہم نے مدد مانگی اور جو اپنے تئیں انسان کی خیر خواہ اور سچی دوست سمجھتی ہے، زیبا نہ تھا مگر ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ جو کچھ اُس نے لکھا ہے بالکل صحیح اور بالکل سچ ہے اور اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ نہایت نالائق بے شرم بے حیا اور تمام دنیا کی قوموں میں ذلیل ہوگی جو اب بھی ایسے طعنے سن کر اس مدرسہ کے قائم ہو جانے میں دل و جان سے روپیہ سے اور کوشش سے مدد نہ کرے گی"

"انڈین آبزرور میں آرٹکل لکھنے والا ہماری ناقص انگریزی کی ہنسی اُڑاتا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ رنج نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہے انڈین ایجوکیشنل سسٹم کی عمدگی کا ثبوت ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہماری یونیورسٹیاں اور ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی ایسی ہی تعلیم ہے اور صرف ہماری ہی ایسی تعلیم نہیں بلکہ ہزاروں در ہزاروں کی ایسی تعلیم ہے اسی لیے اُس سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں"

پھر دوسرے آرٹکل میں اسی انڈین آبزرور والے آرٹکل کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں "سلیکٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان میں یہ سوال بحث میں آیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا ایسا اثر کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؟ سو اس کا جواب انڈین آبزرور کا آرٹکل لکھنے والا یہ دیتا ہے کہ "اُن کو (یعنی مسلمانوں کو) گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سور کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنا دے" پس اب ہم اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ علم کے دیوتانے ہم کو سور کا خطاب دیا ہے، آیا ہم کو اسی خطاب میں خوش رہنا چاہیے یا کوشش کر کے اور اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کو بتلانا چاہیے کہ اس خطاب کا مستحق کون تھا؟

"دوسرا جواب اسی سوال کا اُس آرٹیکل لکھنے والے نے یہ دیا ہے کہ جس شے پر اس کا (یعنی تعلیم کا) اثر ہوتا ہے وہ دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان اور انگلستان) میں مختلف ہے گو آلہ دونوں کا ایک ہی ہو، سنگریزہ یا کنکر سے ایک روشن ہیرا یا لعل نہیں بن سکتا۔ پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ہماری قوم کو سنگریزوں میں اور کنکروں میں پڑا رہنا اور ہر ایک کی ٹھوکریں کھانا اور دشنام سننا ہی پسند ہے یا اپنی حالت میں کچھ ترقی کرنے کا ارادہ ہے؟ یہ سچ ہے کہ جو شخص بدزبانی کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود داؤ اپنے آپ کو اُن سولائزڈ ثابت کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اُس آرٹیکل کا لکھنے والا ہم کو متکبر اور سخت متعصب بتاتا ہے حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، مگر ہم کو اس پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے بھی ہمارے حق میں کہے ہوں اُن سے بھی ہم کو نصیحت پکڑنی چاہیے۔"

"ایک مقام پر اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے۔ کمیٹی کو مناسب ہے کہ ... پہلے امر کی تفتیش کرے کہ آیا اُس قوم (یعنی مسلمانوں) میں کبھی کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا بھی ہوا ہے جو ایمان داری کے ساتھ اپنی نسبت خود یہ باتیں بیان کرے جو کمیٹی نے بیان کی ہیں" اگر اس عبارت کا یہ مطلب ہو کہ ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے وقت میں (یعنی ان کے طریقۂ تعلیم کے اثر سے) کوئی شخص ہماری قوم کا ایسا ہوا ہے یا نہیں؟ تو اس کا تو جواب صاف ہے کہ نہیں۔ اور اگر کبھی کے لفظ سے غیر مفید زمانہ مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آرٹیکل کے لکھنے والے کو دوبارہ کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر ہسٹری اوف فلاسفی اور ہسٹری اوف اورنٹیل لٹریچر پڑھنی چاہیے۔"

انڈین آبزرور کے مذکورہ بالا آرٹیکل میں جو سخت الفاظ مسلمانوں کی نسبت استعمال کیے گئے ہیں اور جن کا جواب سرسید کو بھی کسی قدر سختی کے ساتھ دینا پڑا اُن سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۷۲ء تک اینگلو انڈینز کے خیالات مسلمانوں کی نسبت کیسے تھے اور وہ مسلمانوں کی قوم کو کس قدر ناقابل اور اُن کی تعلیم کے لیے کوشش کرنے کو کس قدر بے سود

اور لاحاصل سمجھتے تھے اور مدرستہ العلوم کی نسبت کیسے مخالفانہ خیالات رکھتے تھے ۔ با اینہمہ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آج اُسی قوم کے تمام اعلیٰ افسر اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور ارکان سلطنت اس مدرسہ کے صرف مداح و ثناخواں ہی نہیں بلکہ دل سے اُس کے مددگار ہیں اور اُس کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی نسبت اُن کے وہ خیالات نہیں رہے جو اب سے ستائیس برس پہلے تھے تو ایک عجیب انقلاب معلوم ہوتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ سرسید کی کوشش حسنِ تدبیر صبر اور استقلال نے اس قلیل عرصہ میں مدرستہ العلوم اور مسلمانوں کی حالت کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔

سرسید کی کامیابی اور اُس کے اسباب

سرسید کو اپنے مقاصد میں جو غیر متوقع کامیابی گزشتہ تیس برس کے اندر اندر ہوئی وہ اس حد سے گزر گئی ہے کہ لوگوں کو باور کرانے کے لیے اُس کا ثبوت دینے کی ضرورت ہو، پس بجائے اس کے کہ اُس کا ثبوت پیش کیا جائے اُس کے اسباب کا سراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم ہوتا تھا اس کا اس قدر جلد وقوع میں آجانا بلاشبہ اُس کے اسباب کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے بہت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت ہے اس لیے امید ہے اُن کی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اُنھوں نے جتنے کام کیے وہ سب زمانہ کے مقتضا کے موافق کیے اور اس لیے زمانہ خود اُن کی تائید کرنے والا تھا پس اُن کی کامیابی اُسی قدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس تیراک کی تیرائی جو دریا کے بہاؤ پر بے تکلف تیرتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ زمانہ کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانہ کا اقتضا اور چیز، بے شک زمانہ کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان اپنی حالت درست

کریں، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خواب غفلت سے بیدار ہوں مگر اُس کا اقتضا بالکل اس کے برخلاف تھا، اُس کا اقتضا وہ تھا جو ملکۂ سبا نے سلیمانؑ کا پیام سن کر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ "إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً" مگر ان قوم جب مفتوح ہوتی ہے خواہ فاتح قوم دانشمند اور منصف ہو اور خواہ وحشی اور ظالم، دونوں صورتوں میں اُس کا میلان پستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اُس کو درحقیقت گورنمنٹ نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے۔ جس چال پر وہ قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف دوسری چال چلنا اُس کے لیے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا اپنی حیّزِ طبعی کے خلاف حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو گو کہ اُس کی اقبال مندی کا زمانہ بالکل ختم ہو گیا ہو، مدت دراز تک اقبال مندی کے خواب برابر نظر آتے رہتے ہیں اور اُس کی امیدوں کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنے حالت کی اصلاح کا کبھی بھول کر بھی اُن کے دل میں خیال نہیں گذرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں تو اُس کو زمانہ کی ناانصافی اور اپنی حق تلفی پر محمول کرتے ہیں، اپنی نالائقی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کرتے اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اُس گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں جہاں سے ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی، وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس سے پست ہوتے چلے ہی آتے تھے اس پر طرّہ یہ ہوا کہ واقعۂ ۵۷ء نے اُن کو اور بھی نیچے گرا دیا اب اُن کے ابھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح ملک میں اُن کا عدم اور وجود برابر ہو جائے۔ پس اگر دنیا فی الواقع عالمِ اسباب ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اب تک جو کچھ اپنی پولیٹکل حالت میں ترقی کی ہے وہ صرف سرسید کی چہل سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "غدر کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی۔ اُس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات اُن کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بیجا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ بظاہر کسی شخص نے اُن کی حمایت کی حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اس کی قدرت میں تھا اُس نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنا دیا"

تھیوڈور ماریسن اپنے اُس آرٹکل میں جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا، لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اُس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر اُن کو ترقی دینے اور اُن کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید ہی کی تلقین کا نتیجہ ہے . . . . اُس نے مسلمانوں کے دل میں جہاں نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں۔"

اکیڈمی نام ایک ولایت کا اخبار مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۸۵ء کرنل گریہم کی لائف آف سید احمد خاں پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے "کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا نہیں چاہیے۔ کروسیڈ کا زمانہ گذر گیا، اب اسلام دوسری جانب جوش ظاہر کر رہا ہے۔ اگرچہ اولڈ فیشن مسلمان سویلزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں مگر اُن میں ایک آزاد خیال گروہ بھی موجود ہے۔ یہ گروہ صرف ٹرکی ہی میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اس ملک (یعنی انگلستان) کے لیے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے، نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی نسبت عمدہ واقفیت حاصل کرے۔ اس سوال کے فیصلہ پر کہ آیا اسلام اور شائستگی باہم موافقت

رکھتے ہیں یا نہیں، پانچ کروڑ آدمیوں کی آیندہ زندگی کا مدار ہے۔ کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان) روز بروز مخالف ہوتی جائے گی؟ کیا اس کے سرگروہ ممبر جہالت کے ساتھ کسی جگہ ہمدردی کریں گے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں جو اور ملکوں میں ہیں، چلے جائیں؟ اگر ایسا ہے تو انگلستان جس قدر جلد مصائب کے مقابلے کے لیے تیار ہو اُسی قدر بہتر ہے مگر اس معاملہ میں کرنل گراہم کی کتاب "سید احمد خاں" نے ایک خفیہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھاتی ہے جو ایک انگریزی زبان سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے۔"

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسید کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُن کی کوششیں زمانہ کے مقتضا کے موافق تھیں، بلکہ اُن کی کامیابی صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو کوششیں استقلال، دانائی اور راستبازی کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ زمانہ کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں۔

سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ زمانہ کا تقاضا جب تک کوئی زبردست ہاتھ اُس کی پشتی پر نہ ہو، کچھ نہیں کرسکتا، یہ ہے کہ مدت دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسواں جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس پچیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اس کا جوش پھیلا ہوا ہے، اخباروں اور میگزینوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور ہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جابجا اسی غرض سے کمیٹیاں قائم ہیں، اس سے زیادہ زمانہ کا تقاضا اور کیا ہوسکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا کوئی زبردست حامی مثل سید احمد خاں کے کھڑا نہیں ہوا۔

ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ اُن کی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک ریفارمر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں۔

ریفارمر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہے کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھے، اگرچہ ایک زمانہ اُس کا مخالف ہو، اُس کے ظاہر کرنے میں کچھ پیش و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ریختہ کی چنائی جو عین برسات کے موسم میں کی جائے۔ راستباز آدمی کو بلاشبہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اس لیے اُس کی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہے۔ مگر جو ردّا ایک دفعہ رکھا گیا پھر اُس کو جنبش نہیں ہوتی۔ سرسید کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا بیان ہوا ہے، سخت خطرات پیش آئے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پائدار نقش دلوں پر بٹھا دیا۔

استقلال جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "الصبر مفتاح الفرج" وہ بھی بغیر راستبازی کے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس کو اپنے کام پر بھروسا نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادہ پر قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ سرسید نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سید مہدی علیخاں کو ولایت سے لکھا تھا کہ "جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے دوں دوں نیکی بڑھتی گئی ہے، پس اگر میرا کاربار سچا اور میری نیت نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔"

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ میں سرسید کا رسوخ و اعتبار سب سے بڑھ کر اُن کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ بلاشبہ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو ایک خاص حد تک صحیح مانا جا سکتا ہے مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اُس کی تائید ہوئی ہے اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی، اسی رسوخ و اعتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لیے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لیے غلط تھا کہ حالتِ موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے

کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

بہرحال سرسید کے رسوخ سے مدرسہ کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے خصوصاً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی نہیں بڑھایا بلکہ اُن کے ارادوں میں جان ڈالی ہے اور جتنے لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب میں اور جتنے وائسرائے کالج کے قیام کے بعد آئے سب نے کالج پر مربیانہ توجہ مبذول رکھی ہے، مگر ریفارمیشن کے عظیم الشان کام میں، بجائے اس کے کہ یہ رسوخ مدد و معاون ہوا ہو، اُس نے اور اُلٹی مزاحمت کی ہے۔ ہر ایک قوم اور خاص کر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کر سکتی ہے تو اُسی شخص کو کر سکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لیے درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جائے بلکہ سرتاسر اُس کی زندگی ایک دنیادار آدمی کیسی زندگی ہو خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ پیدا کرنا عام اس سے کہ مسلمانوں کی ہو یا انگریزوں کی، مذہبی تقدس کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے باوجود اس کے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر اصلاحیں نشین کر دیں پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ میں اُن کا رسوخ اور اعتبار مطلقاً اُن کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب اُن کی راستبازی اور سچائی ٹھہرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا جب تک کہ اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ اُن کے کاموں میں مدد اور اُن کے ارادوں کو تقویت اُن کے دوستوں نے دی ہے اور یہ بھی ایک نتیجہ اُن کی راستبازی اور خلوص کا تھا۔ فی الواقع سرسید کو محض اپنی صداقت اور بے ریا محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعوان و انصار ملے جو اُس زمانہ میں نادر الوجود اور عجائب روزگار سے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعوان و انصار اُن کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھ کر اُن کے کاموں میں مدد دیتے تھے، سوا اس سے

زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہوسکتا، اُن کے دوستوں اور مددگاروں میں جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا اُن کے تمام اقوال اور تمام رایوں کو تسلیم کرتا ہو۔ سرسید کے بہت سے دوست ایسے بھی تھے جن کو قومی معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بعض اُن کی کوششوں پر ہنستے تھے اور اُن کی جدوجہد کو رائگاں سمجھتے تھے مگر ہر کام میں مدد دینے کو دل وجان سے حاضر تھے۔ جب چندہ کی ضرورت ہوتی تھی پہلے دوستوں سے مانگا جاتا تھا پھر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پسارا جاتا تھا۔ اگرچہ مقام اس بات کا مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوں نے جس ذوق وشوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس امنگ اور چاؤ سے مدرسۃ العلوم کے چندوں میں شریک ہوئے ہیں اور جو جو بیہا خدمتیں قوم کی اُن سے بن آئیں اُن کو مفصل بیان کیا جائے خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید کی آخری تمنا جو پوری نہ ہوئی، یہ تھی کہ ایک کتاب بطور تذکرۂ احباب کے اپنے قلم سے لکھ جائیں، مگر امید ہے کہ جو شخص مدرسۃ العلوم کی ہسٹری لکھے گا وہ اس فرض کو فراموش نہ کرے گا کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کی جوڑ تھا، اگر اس موقع پر اُس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا۔ اُس شخص سے ہماری مراد محسن الملک سید مہدی علیخاں ہیں جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے بعد اُن کے جانشین ہوئے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سرسید کو سمجھا، اُن کی سچائی کو پرکھا، اُن کے منصوبوں کی تھاہ دریافت کی اور اُن کے مقاصد کی عظمت کا اندازہ کیا۔ اُن کا اُس وقت ساتھ دیا جب کوئی ساتھی نہ تھا، اور اُس وقت مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی سرسید ولایت میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی ہندوستان سے اُس کے لیے میٹریل بھیجتے تھے وہ ولایت میں اُس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان سے اُس

کی چھپائی کے لیے چندہ وصول کرکر کے روانہ کرتے تھے جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کرنی چاہی اُس وقت اُن پر عجب مایوسی کا عالم تھا، جو منصوبے دل میں باندھ رکھے تھے اُن میں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ سید مہدی علی مرزا پور سے بنارس گئے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی چنانچہ کمیٹی بڑی دھوم دھام سے قائم ہوئی جب کمیٹی نے اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے، انعامی رسالے لکھوانے کا اشتہار دیا میر مہدی علی نے نہایت کوشش سے ایک مبسوط اپنے لکھا جو سب رسالوں میں اول درجہ کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام جس کے وہ مستحق تھے، اپنے سے نیچے درجہ کا رسالہ لکھنے والے کو دلوایا۔ جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا اور سرسید نے ریفارمیشن کا کام علی الاعلان شروع کیا سید مہدی علی پہلے شخص تھے جنھوں نے نہایت دلیری سے سرسید کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی جو معزز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے سید مہدی علی نے بھی اُن کا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتووں کی بوچھاڑ جو اکیلے سید پر پڑ رہی تھی، آدھی اپنے سر پر لی۔

سرسید کی تحریریں اکثر نشتر کا کام کرتی تھیں مگر سید مہدی علی کی تحریروں نے مرہم کا کام کیا، سرسید ہمیشہ مسلمانوں کو نفریں و ملامت کرتے تھے، اگلے علما کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی، اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اُس پر استشہاد کریں، حوالۂ قلم کر دیتے تھے، سید مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کرکے قوم کے دل بڑھائے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے لکھا۔ اُن کے اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اس کے کہ اُن کی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا۔ سنا ہے کہ اُن کے بالادست افسر کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے سرسید کو لکھا کہ

ہدی علی کو سمجھا وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں ورنہ مجبوراً اُن کی نسبت رپورٹ کرنی پڑے گی۔

مدرسۃ العلوم کو جو مالی مدد انھوں نے اپنی جیب سے اور اپنی کوشش سے پہنچائی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سرسید سے کیا مدرسے کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی۔ ہمیشہ سرسید کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسہ کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے۔ اگر سرسید نے اُن کی رائے کے خلاف بھی کسی تجویز پر زور دیا اُس کو بھی طوعاً و کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر اُن کی رائے فی الواقع غلط ہے تو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن اگر مزاحمتوں کے سبب مدرسہ کے کام سے اُن کا جی چھوٹ گیا تو اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔

حیدرآباد سے آکر انھوں نے علیگڑھ ہی میں رہنا اختیار کیا اور بہت سے علمی کام مدرسے کے متعلق انجام دیے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں اور اُس کی طرف مسلمانوں کو خاص توجہ دلائی اور خود ہر ایک اجلاس میں نہایت مفید لکچر اور اسپیچیں دیں۔ پھر بمبئی میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا یہاں تک کہ انھوں نے کانفرنس کو بمبئی میں بلایا مگر سرسید کے کبرسن کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علیگڑھ میں آئے اور اُن کے اخیر دم تک وہیں رہے اور اس آخری رفاقت میں بھی دوستی اور محبت کا حق پورا پورا ادا کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات میں اُن سے ظہور میں آئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اُس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ اُن کی جانشینی کے لیے مناسب نہ تھا۔ انھوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھ کر چندہ جمع کرنے میں کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے تئیں ایک مشین سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا۔ اٹاوہ کے ایڈریس میں جب لوگوں نے اُن

کی تو ان خدمات کی تعریف کی اُنھوں نے اُس کے جواب میں صاف صاف کہہ دیا کہ ان خدمات کو میری طرف منسوب کرنا تہمت ہے، اس تعریف کا سید احمد خاں کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ سرسید کے بعد اُن کا جانشین بننے کی، جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اُن کو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹاف، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام اور افسر جو کالج کے بہی خواہ تھے، تمام ڈلیگیٹ، جو پچھلے سال بمقام لاہور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے، تمام مسلمان اخبار اور عموماً تمام مسلمان جن کو قومی معاملات سے دلچسپی تھی، سب اس بات پر متفق تھے کہ اُن کو کالج ٹرسٹیز کا سکرٹری بنایا جائے اس لیے اُن کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوئے کو اپنے کندھے پر رکھیں۔

الغرض سرسید کو ایسے دوستوں کا ملنا جن کا نواب محسن الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہیے، اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض اُن کی راستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے مرغِ زیرک خود بخود آکر جال میں پھنس جاتے تھے اور اُس زمانہ پر جو آزادی میں گذرا تھا افسوس کرتے تھے جیسا کہ نظیری نے کہا ہے

"نالہ از بہر رہائی نکند مرغِ اسیر خورد افسوسِ زمانے کہ گرفتار نبود"

ایک اور خدا ساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، سرسید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ اُنھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور اُن کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب [illegible]وں نے کی۔ کالج میں اُنھوں نے ہر ایک صوبے سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اُنھوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں اُنھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی

کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی، یہاں تک کہ ان کو زندہ دلانِ پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھیرایا بلکہ اُن کو دنیا و دین دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیے تھی اُس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبہ سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی پنجاب کے عام مسلمانوں نے اُس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی۔

سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہوگی خصوصاً یورپین اسٹاف کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے انتظام اور اُس کو ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے۔ انھوں نے صرف اپنے منصبی فرائض پر جن کے لیے وہ بلائے گئے تھے بس نہیں کی بلکہ سرسید کے خاص مشن میں جس پر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی، معتد بہ حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتمد علیہ بنایا اور اُس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جس کی وجہ سے سرسید کالج اور بورڈنگ ہوس کی طرف سے بالکل نچنت اور فارغ بال ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور اُن کی ترقی کے دل سے آرزومند ہیں۔ مگر درحقیقت یہ سب نتیجے اُسی مرحوم کی راستبازی اور صاف دلی کے تھے اگر وہ یوروپین اسٹاف پر پورا پورا اعتماد نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہوس کی باگ اُن کے حوالہ نہ کر دیتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ یوروپین پروفیسر اپنے معمولی فرائض سے ایک انچ آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے۔

اگر سرسید کی ذات میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اُس کے ساتھ

فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید اُن کی کامیابی میں وہ زیادہ دیر لگتی بلکہ ممکن تھا کہ اُن کو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا مگر خوش قسمتی سے اُن کے ظرف میں زہر و انگبین دونوں موجود تھے گو اُن کی راست گوئی نے بہت سے لوگوں کو بدکایا مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانہ کو اُن کی طرف جھکا دیا۔ اُنھوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لیے چندہ کھولا اُس میں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے مراتب بڑھ کر دیا۔ وہ ایک بانی مدرسہ کی نسبت اپنے ایک دوست کو ولایت سے لکھتے ہیں " افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا کہ خود بانی نے جو فضل الٰہی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں میں زیادہ ذی مقدرہیں، کس قدر روپیہ دیا، اُس وقت البتہ آپ کی لعنت ملامت محتاجانِ شہر پر، جو نانِ شبینہ کو محتاج ہیں، درست و بجا ہوتی۔ میں سوسائٹی کے لیے سب سے بھیک مانگتا ہوں مگر دس ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے، پس ایسی حالت میں اگر میں آپ سے سو روپئے دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں "۔

اس کے سوا عزم جزم اور دلیری جو ہر کامیابی کی جڑ ہے اور دنیا کے تمام کامیاب شخصوں میں ہمیشہ دیکھی گئی ہے، سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت بڑھ کر تھی۔ وہ مشکل سے مشکل کام کو جب ضروری سمجھ لیتے تھے بغیر تردد اور تذبذب کے اُس کو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اُس میں پس و پیش نہ کرتے اس کے سوا اُن میں اور اکثر خصوصیتیں ایسی تھیں جن کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے کام دنیا میں انجام نہیں پا سکتا جیسے مستعدی، جفاکشی، فرائض کی پابندی، حزم و احتیاط وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور خداداد قابلیت اُن کی فصاحتِ بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے جوش نے کشش مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اُس کے لیے ہر ایک میدان صاف

کر دیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی تو سرسید کو اس طرح کھلے بندوں اپنی رائیں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملتا مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہیے کہ جس وقت انھوں نے رسالۂ اسباب بغاوت لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی چنانچہ کسی قدر اُن کو اپنی جرأت اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا، بعض جلیل القدر انگریز ان کے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید یہ چشمہ اُبلے بغیر نہ رہتا۔

سرسید میں مختلف لیاقتوں کا جمع ہونا

ایک شریف اور لائق انگلشمین نے، جب کہ سرسید زندہ تھے، ہمارے سامنے اُن کا ذکر کرتے وقت یہ کہا تھا کہ "یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔" اسی لیے الٰہ آباد میں ایک عام جلسے کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خاں نہیں ہے، بلکہ اگر ہم میں بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے۔"

فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اسکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جس نے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرے کہ علمی دنیا میں اُس کو مسلمانوں کی تعلیم کا پروفٹ

خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں یہ قول نقل کیا ہے

خیال کیا جائے۔ یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو جہاں دو سو برس سے کسی نے پالٹکس کا خواب تک نہ دیکھا تھا، وہ بغیر اس کے کہ کسی پولٹکل خدمت پر مامور رہا ہو انگلش گورنمنٹ میں ایک رکن سلطنت خیال کیا جائے یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسطے بھی کم درجہ رکھتا ہو اور جس نے علوم جدیدہ کا ایک حرف کسی اُستاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصالحت کرانے کا بیڑا اٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال جائے۔ ہی طرح اور مختلف لیاقتیں جو اس شخص کی ذات میں جمع تھیں اُن میں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔

اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج اُن کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر اُس قابلیت کو قوت سے فعل میں لانے والی زمانہ کی ضرورتیں اور اُن ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوم میں ضرورتوں کے رفع کرنے والوں کا قحط تھا جس نے سرسید کو اُس معمار کی طرح جو تعمیر کے لیے آپ ہی اینٹیں بنائے، آپ ہی مصالحہ تیار کرے، آپ ہی پاڑ باندھے آپ ہی ٹوکری ڈھوئے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چُنے، ایک سر و ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا۔ دنیا میں عموماً کام کرنے والے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ۔ ایک مصنف مشکل سے معماری و نگتراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے، عمدہ لکھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے، مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے، مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک کے سوا کوئی اُس ضرورت کا احساس کرنے والا نہ ہو وہاں سب کام اُسی ایک کو کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے، کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ایک زمانہ میں اُنھوں نے اردو ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، پھر اُسی زمانہ میں اُردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لیے میٹریل جمع کیا، اُس سے پہلے وہ صوبۂ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان ترجمہ خانہ کی بنیاد ڈالنے والے تھے، انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں

ترجمہ کرنے کے لیے اُنھوں نے بڑے بڑے سامان کیے تھے، اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں وہاں ایک فردِ واحد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فطرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جس کی نسبت مسٹر آرنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیچ میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ "دنیا میں بڑے آدمی اکثر گذرے ہیں مگر اُن میں ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں۔ وہ (یعنی سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔" اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ بقدرِ ضرورت اُن کی چند نمایاں لیاقتوں کا اس عنوان کی ذیل میں جدا جدا ذکر کریں۔

پالٹکس اگرچہ بظاہر سرسید کے پولٹکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا کہا یا کیا اُس کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے اس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی جس کے بغیر انگریزی طرزِ حکومت کا ذہن نشین ہونا قریب ناممکن کے تھا۔ اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پولیٹیشن کی دیکھی تھی جس کی تقلید کچھ کام آتی اور نہ گورنمنٹ کی کسی ایسی خدمت پر مامور ہوا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل ہوتا، باوجود اس کے اُس نے اپنی مآل اندیش اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس مشکل کو حل کر لیا اور ایک ایسا پولٹکل کورس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا۔

وہ سلطنتِ مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دار الخلافہ کی خاک سے پیدا ہوا اور سلطنتِ مغلیہ کے سایہ میں نشو و نما پائی، اس لیے یہ ایک نیچرل بات تھی کہ فاتح کی حکومت وہ ایک ناگواری کی نظر سے دیکھتا۔ مگر اُس کی عقل اُس کی طبیعت پر غالب تھی،

اس لیے قومی تعصبات اُس کو مغلوب نہیں کر سکے اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اُٹھ جانا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی الحقیقۃ اُن میں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُن کا دفتر پورا ہو چکا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ ہندوستان پر کوئی دوسری قوم حکمراں ہو، اُس نے انگریزی طرز حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے حق میں جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں اور خاصکر مسلمانوں کے حق میں جو بتیس دانتوں میں زبان کی مانند ہیں، کسی قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ پس بجائے اس کے کہ اُس نے برٹش حکومت کو ناگواری کی نظر سے دیکھا ہو، اُس کو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اُس کی خیر خواہی کو ملک اور قوم کی خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا

وہ جس قدر انگلش قوم کی دانشمندی اور شائستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اُس کی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا۔ اس کو غدر کے نازک موقع پر جب کہ فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قائم ہو گا، اگرچہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سر نو قائم ہو جانے کا پورا یقین تھا۔ اُن کے ایک دوست جو اُس وقت بجنور میں تھے، اُن کا بیان ہے کہ ”عین اُس بدامنی کے وقت، جب کہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یورپین یا یوریشین باقی نہ تھا، سید احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائے گا، اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرے سے وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سر سید کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا“ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ سر سید نے جب کہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خاں کی دوہائی پھر رہی تھی، نواب کے منہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ انگریزی عملداری جانے والی نہیں ہے، آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں

اور جب کہ سرسید کا اثاث البیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لٹ چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لیے نہایت اطمینان کے ساتھ مٹیریل جمع کرتے جاتے تھے اور روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے یا جو اُن کے پاس سے وصول ہوتی تھیں، یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب بہم پہنچا کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔ ایسا اطمینان، سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پُرانا تجربہ کار ہو یا جس کی رائے ایسے امور میں فطرۃً سلیم واقع ہوئی ہو، دوسرے کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سرسید کی پولٹکل قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اُس نے غدر کے بعد اینگلو انڈین اخباروں اور اینگلو انڈین افسروں کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب اسباب بغاوت میں نہایت زور شور کے ساتھ اس بات کی تردید کی کہ گزشتہ غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اُس کی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سازش پر تھی اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ اس سرکشی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی۔ جسنے رفتہ رفتہ اُن عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ملکی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس نے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بتائے اُن پر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخر کار اُن میں سے اکثر بالاتفاق تسلیم کیے گئے، یہاں تک کہ گورنمنٹ نے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

سرسید نے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگرس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سرسید کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگرس سے مختلف تھی۔ سرسید نے جو الزامات گورنمنٹ پر عاید کیے تھے اُن کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگرس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے اُن کی تمام ملک میں منادی کی گئی۔ سرسید نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگرس نے غلط فہمیاں پھیلانے

ہیں۔ سرسید نے اُن باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگرس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سرسید کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگرس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں۔ اسی لیے سرسید کی اکثر شکایتوں کا جو کہ انھوں نے بنفسِ واحد اپنی طرف سے پیش کی تھیں، فوراً تدارک کیا گیا اور کانگرس کو۔ باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعویٰ کرتی ہے، آجتک ایک[1] بات کے سوا جس کی بنیاد قانونی کونسل میں محض سرسید کی تحریک سے ۱۸۹۲ء میں پڑ چکی تھی کسی بات میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اخبار سینٹ جیمس بجٹ میں سرسید کی کتاب پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ ہوا ہے بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوش اور اُس کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔"

ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پولٹکل قابلیت کا ۱۸۷۱ء میں اُس وقت دیا جب کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "اور انڈین مسلمانز" نے ہندوستان سے لے کر انگلستان تک تمام حکمراں قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے بدگمانی کا بیج بو دیا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکوک و شبہات حکمراں قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دی جائے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اُن غلط فہمیوں کو اور تقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، سرسید کو اُس وقت کالج کی ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی ادھیڑبن میں مصروف رہتے تھے باوجود اس کے کتاب

---

[1] یعنی لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا بذریعہ الیکشن کے ممبر مقرر ہونا ۱۲

مذکور کو شائع ہونا تھا کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اُس پر ریویو لکھنا اور پایونیر میں اُس کو چھپوانا شروع کیا۔ اس ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے اُن کی ناواقفیت انگریزوں کے دل میں تہ نشین کر دی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان گورنمنٹ کے لیے خطرہ کی چیز ہیں اُن کے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اُس نے اس غلط فہمی ہی کو رفع نہیں کیا بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایسی نازک حالت میں، جیسی کہ اُس وقت ہندوستان کی حالت تھی، ایسی تحریریں شائع کرنا جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی حاکموں کے غصہ کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنے والی ہوں، سراسر مصالح ملکی کے برخلاف ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹر نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں نے بجائے اس کے کہ سرسید کی تردید کرتے، نہایت شد و مد کے ساتھ اُن کی تائید کی اور اُس بےچینی کی حالت میں جو حکمراں گروہ میں عموناً پھیلی ہوئی تھی، سرسید کے ریویو کا نکلنا نہایت غنیمت سمجھا گیا۔

اگرچہ سرسید کی مذکورۂ بالا تحریروں سے ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوئے لیکن اُن کی اعلیٰ درجہ کی پولٹکل قابلیت کا بھید درحقیقت اینگلو اورنٹیل کالج میں چھپا ہوا ہے۔ اگر کوئی اصلی چیز مسلمانوں کو پولٹکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں ان کا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے تو وہ یہی محمدن کالج ہو سکتا ہے۔ اسی لیے پایونیر نے لکھا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید، بارآور اور نہایت زبردست پولٹکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا۔" اور اسی بنا پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے ان کی وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا تھا اور اسی وجہ

سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش پھیلانے والا ہے" اور اسی واسطے سر آکلنڈ کالون نے اپنی اسپیچ میں اُن تدبیروں کی نسبت جو سرسید نے رسالۂ اسباب بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بتائی تھیں، یہ الفاظ کہے تھے کہ "انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علیگڑھ کالج ہے"

سرسید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور جس کے اعادہ کی اب ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم کو اُن کی ایک لطیف تحریر دستیاب ہوئی ہے جو انھوں نے لندن میں ایک بڑے عالی مرتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق اُن کی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے اُس چٹھی کے چند فقرے اس مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جن سے سرسید کا ایک بہت بڑا اسٹیٹسمین ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں انھیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور اُن پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اونٹ چراتے ہیں، جو پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ظیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں"

"ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور سچا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لینڈ لارڈز کی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ

جس کو لوگ منتخب کریں اُس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اُس کی جائداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائداد کیوں نہ ہو وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دونوں طرح کیا بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ خون کے ریڈیکل ہوں "

"لیکن ہمارا مذہب جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے، اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں، ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہے جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے، تو اُس حالت میں ہم کو اُس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جب کہ زمانہ کی حالت اُن کے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جب کہ زمانہ کے حالات اُن کے موافق نہ ہوں، مثلاً جب کہ اُن کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اُس کو کمزور اور ضعیف کر دے میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اس اصول کو قبول کریں گے۔"

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں سرسید نے کانگرس کی مخالفت کرنے سے پانچ برس پہلے ممبری کونسل کے زمانہ میں لارڈ رپن کے سامنے اپنی اسپیچ میں، جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، اُس وقت ظاہر کیے تھے جبکہ کونسل میں سلف گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ریزنٹیٹو اصول کو اُسی حالت میں پسند کرتے تھے جب کہ اُس کے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولٹیکل خطرات کے پیدا ہونے کا

اندیشہ نہ ہو۔ پس جو لوگ اُن کی پہلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے۔ وہاں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ تر اُن کو اُس وقت پیدا ہوا جب کہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس باب میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچہریوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ پھر جس قدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں اُسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں ہے کہ اُس میں ریپرزینٹیشن کے اصول پر عملدرآمد ہو سکے۔

اول اول وہ گورنمنٹ کی خود مختاری کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں جب کہ اُنھوں نے علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی اُس موقع پر اُن کی اسپیچ کے ابتدائی الفاظ یہ تھے "میں تم سے اُس طوائف الملوکی کے زمانہ کا ذکر نہیں کرتا جو اٹھارھویں صدی میں تھا، بلکہ میں آپ کو اُس تاریخانہ زمانہ کو یاد دلاتا ہوں جب کہ ہندوستان ایک سلطنت شخصیہ کی حکومت میں تھا، ایک بادشاہ یا راجہ کروڑہا مخلوق خدا پر حکمراں تھا، اُس کی حکومت، بہ نسبت اس کے کہ کسی قانون عقلی یا نقلی کے تابع ہو، زیادہ تر اُس کی مرضی، خوشی طبیعت اور غیظ و غضب کی تابع ہوتی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اپنے مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں یہ کلمے بہت سنے ہوں گے کہ "مالک رقاب الامم" حالانکہ بادشاہ یا گورنمنٹ کو ایسا کہنا درحقیقت اُس کی نسبت تمام دنیا کی بُرائیوں کا منسوب کرنا ہے ...... کچھ عجب نہیں کہ تم میں سے اکثر ایسے ہوں کہ ابتک اُس پرانے زمانے کو یاد کرتے ہوں مگر جب کبھی تمہارا دل انصاف اور اخلاق کی طرف توجہ کرے گا تو تم خود اُس زمانہ کے نقصانوں اور اُس وقت کی حکومتوں کی بُرائیوں کا اقرار کرو گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانہ کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور نہ ہندوؤں کے دھرم شاستر کے مطابق ..... بڑا اصول اُن وقتوں کی

حکومتوں کا یہی تھا کہ جو زبردست ہو وہ کمزور پر غالب رہے اور جس طرح چاہے زیادتی اور جبر اور غصب سے صرف اپنے عیش و آرام کے لیے زیر دستوں کے حقوق پر تصرف کرے پس ایسی حکومتوں کو بجز اُن غاصب شخصوں کے، جن کا کام اُس وقت میں بنا ہوا تھا، اور کون پسند کر سکتا ہے۔"

سرسید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انھوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظام ملک کا مدار قانون پر نہیں بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر ہے وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ غدر کے بعد جب کہ قسمت دہلی صوبۂ شمال مغرب سے نکال کر صوبۂ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی، انھوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علیگڑھ کو قرار دیا، یہاں تک کہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ سر ڈونلڈ مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر صوبۂ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا جس میں سرسید کو بھی علیگڑھ سے بلایا گیا تھا، تو سرسید سے پرائیوٹ ملاقات کے وقت صاحب ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تم نے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں جا کر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اُس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سرسید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو جیسی کہ وہ اب ہے، ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہوں اور اسی لیے جب کہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل کی گئی میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی کے قریب قریب انھوں نے ۱۸۶۹ء میں ڈی فٹز پیٹرک صاحب سے جو دہلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "ایک دن پنجاب کے انتظام کی بھلائی بُرائی کا ذکر آ گیا، میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے، لیکن شاید پنجاب کے لوگ اُس سے خوش ہوں کیونکہ اُن کو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکال کر دھوپ میں بٹھایا ہے، مگر ہم لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے ... ... جہاں تک مجھ کو

معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سزائیں اہل دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ اُنھیں سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور بے قانونی ملک بنا دیا گیا۔"

اس کے بعد وہ سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ "حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں بُرائیوں کے ساتھ اگلے زمانہ کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے اُن بُرائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ جو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ ست۔ اب اُن کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی کہ قدیم سے تھی، زیادہ تر مفید ہوگی وہ نہایت غلطی میں ہیں۔"

لیکن آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ جب تک مثل انگلستان کے ہندوستان کی تمام قومیں مل کر ایک قوم نہ بن جائیں جو قریب ناممکن کے ہے، اُس وقت تک ایک خاص کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہندوستان کی حالت کے مناسب ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جو اسپیچ اُنھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ پر لارڈ رپن کے عہد میں کی تھی اُس میں اُنھوں نے نہایت مدلل طور پر اس مطلب کو بیان کیا تھا اور اصل مقصد اُس اسپیچ کا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومنیشن سے مقرر کیے جائیں۔ کیونکہ لارڈ رپن اضلاع متوسط کے سوا باقی صوبوں میں کل ممبر الکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی کہ سرسید کی رائے تھی وہی قاعدہ تمام صوبجات کے لیے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسط کے لیے قرار پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر ان کی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکسٹرا اسسٹنٹی اور منصفی کے لیے پنجاب میں مقابلہ کا امتحان نیشنل کانگرس کے

قائم ہونے سے پہلے جاری ہوچکا،[1] اور جس وقت سرسید نے کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں اسپیچ دی اس وقت جو نتائج اس قاعدہ سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سرسید نے اسی وقت اُس نقصان کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا جو اس قاعدے سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ پنجاب میں باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت زیادہ ہے سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] تک اکسٹرا اسسٹنٹی میں منجملہ [illegible] کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور منصفی میں منجملہ [illegible] کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور اگر دونوں عہدوں کا مدار محض مقابلہ کے امتحان پر ہوتا اور کچھ عہدے نومینیشن کے ذریعہ سے مقرر نہ کیے جاتے تو منصفوں میں ابتک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اکسٹرا اسسٹنٹی پر بھی خال خال مسلمان باقی رہ جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس وائسرائے کی قانونی کونسل میں اگر نومینیشن کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے سرسید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لیے اُنھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ کے مسودہ پر اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہوجائے، جہاں عیسائیوں کو یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اس وقت تک انگلستان سے ریپرزینٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول استعمال لینے میں بڑے بڑے مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

پولیٹکل اجیٹیشن کی نسبت سرسید کی یہ رائے تھی کہ اُس کے بد اثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ ریپبلک ہو یا پارلیمنٹری اور یا مارکی، محفوظ نہیں رہ سکتی ریپبلک گورنمنٹ میں اُس کا لازمی نتیجہ بشرطیکہ اجیٹیشن کو پوری قوت حاصل ہوجائے پریزیڈنٹ کی تبدیلی ہے اور پارلیمنٹری گورنمنٹ میں وزرا کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مارکی ہے تو اس کا اثر سیدھا گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اجیٹیشن کرنے والے اس کو تبدیل نہیں کرسکتے تو کم سے کم اس کی تبدیلی کی خواہش اُن کے دل میں ضرور ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ

ظاہر ہے کہ نہ ریپبلک ہے اور نہ پارلیمنٹری اور اس لیے اس کو بجز ایک شائستہ اور مہذب مارکی ہونے کے جو ملک میں امن رکھنا اور رعایا کے حقوق کو انصاف اور نیک دلی سے فیصل کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس ایک ایسی گورنمنٹ کی پالسی کے برخلاف جیسی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ ہے، اگر کوئی ایجیٹیشن پھیلایا جائے اور اُس میں کامیابی نہ ہو تو غور کرنا چاہیے کہ رعایا کا خیال کس طرف مائل ہوگا؟ کیا ان کا خیال اس طرف مائل ہوگا کہ کونسل تبدیل ہو جائے یا موجودہ گورنر جنرل کی جگہ کوئی دوسرا گورنر جنرل بھیجا جائے؟ ہرگز نہیں بلکہ خود گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا اُس کا نتیجہ ہوگا۔ اگرچہ ناراضی پھیلانے والے گورنمنٹ کے تبدیل کرنے پر کچھ قابو نہ رکھتے ہوں مگر گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا خود گورنمنٹ کے لیے ملک کے لیے اور رعایا کے لیے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

سر سید ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہو سکے قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اس کے بعد رعایا کے ذاتی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی وہی کرتی ہے جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے، کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی سلطنت نے کیا ہو۔"

اُن کا قول تھا کہ اُن بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا جو درحقیقت مجنون تھے کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادہ سے ظلم نہیں کیا، بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کیے بغیر اُن کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُن کے اس خیال اور اندازے میں غلطی ہو۔

اُن کی رائے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا یا بُرا ہونا درحقیقت کوئی اصلی چیز نہیں ہے بلکہ اصل

چیز رعایا کا بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شائستہ ہو تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شایستہ بنا پڑتا ہے اور اگر رعایا شائستہ نہیں ہو تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بنا پڑتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو اُن کی بڑی نصیحت یہی تھی کہ اگر انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سویلزیشن میں ترقی کریں اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اُس کا استحقاق پیدا کریں۔

اُن کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ اُنھوں نے یہاں کی حکومت بزور حاصل کی، اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اُس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔"

اُنھوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ "میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔"

اگرچہ سرسید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں اُن کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ سرسید کی ایک آواز پر، باستثنائے معدودے چند، ہندوستان کے تمام مسلمان کیا سنی، کیا شیعہ، کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھ، کیا وہ لوگ جو اُن کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں اُن کی مخالفت کرتے تھے سب نے بالاتفاق نیشنل کانگرس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک اُن کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھوکھا مسلمانوں نے اُن کا عذر دل پر رکھیں

بند کر کے دستخط کر دیے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

تعلیم | سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں کی ہیں اُن کی تفصیل پہلے اور دوسرے حصہ میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف اُن بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے تعلیمی معاملات میں اُن کی عالی دماغی حسن تدبیر اور اصول اشاعت تعلیم سے ایک قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کیجاتی ہے مگر سب سے مقدم اور مہتم بالشان حیثیت جس سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں، یہ ہے کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے؟

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کرلی ہو، اُس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا، جو مضامین تعلیم اور ذریعۂ تعلیم دونوں کے لحاظ سے بالکل اوپری اور غیر مانوس ہو، بعینہٖ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں، جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو، ایک نئے مذہب کو جاری کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۰ء جب گورنمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بذریعۂ عرضداشت کے یہ شکایت پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے، جب کہ گورنمنٹ نے اُن کے لیے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو اُس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی کالج قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ سے اصرار کیا، کیونکہ اول تو اُن کے ہاں مذہبی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد

میں محدود تھی اور باقی تمام ہندو قومیں مسلمانوں کے عہد میں دنیوی ضروریات کے لیے ایک غیر قوم کی زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ دوسرے جیسا کہ سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب انڈیا میں لکھا ہے، نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہشمند تھے اور نہ اُن کا مذہب ایسا تھا جس کی تعلیم ہو سکے۔

بہر حال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب ناممکن کے تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء سے، جبکہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے ایک نامور ممبر چارلس گرانٹ نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی، اُس وقت تک جبکہ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی، گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں، جو ہندوستان میں بغرض اشاعت تعلیم کی گئیں، مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں۔ علاوہ طرح طرح کی ترغیبوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لیے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، خاص مسلمانوں کے چند معقول اوقاف گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھے جن کو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لیے مخصوص کیا تھا، جیسے بنگال میں محسن فنڈ اور اضلاع شمال مغرب میں نواب فنڈ، مگر اُن سے بھی زیادہ غیر قومیں مستفید ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ ۱۸۵۷ء میں ہائی ایجوکیشن کے لیے کلکتہ بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مگر ۱۸۷۰ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوئیٹس کے مشکل سے اتنی ہو گی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

سرسید کو ۱۸۵۹ء میں جبکہ وہ بجنور سے مراد آباد بدل کر گئے، تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اُس زمانہ سے لے کر اُس وقت تک جبکہ کالج نے نمایاں ترقی کر لی، اُن کے تمام کاموں میں جو تعلیم کے متعلق اُنھوں نے انجام دیے ایک خاص ترتیب پائی جاتی ہے جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے ابتدا ہی میں وہ تمام مشکلات، جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی تھیں اور ہر ایک مشکل کے ساتھ اُس کا حل بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اُن کو تعلیمی معاملات پر خود غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ حاصل کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے اول اسی غرض سے دو اسکول پبلک چندوں سے قائم کیے جن سے لوگوں کو اس دلچسپی کا

جو اُن کو بہ نسبت سرکاری مدرسوں کے اپنے پرائیوٹ اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی ہے، بخوبی اندازہ ہوگیا اور اس بات کا یقین ہوگیا کہ اگر مسلمانوں[1] کو کچھ دلچسپی ہوسکتی ہے تو خاص کر اسی کالج سے ہوسکتی ہے جو قومی چندے سے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال کیا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے، کیا ہندو اور کیا مسلمان، انگلش لٹریچر اور مغربی علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں، پس تاوقتیکہ دیسی زبان کے ذریعہ سے اُن میں یوروپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق اُن میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے علاوہ کتابوں کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار نکالا جس میں بے شمار علمی اور لٹریری مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوکر شایع ہوئے اور جس نے فی الواقع اُردو لٹریچر کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش لٹریچر کی عظمت ہزاروں کے دل میں جو سلیم الطبع تھے، نہ نشین کردی۔ پھر زیادہ تجربہ اور زیادہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی اور اُس کے تمام انتظامات کو خود جاکر دیکھا اور اُس کے مقابلہ میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں معلوم ہوئے اُن پر ایک پمفلٹ لکھ کر انگلستان ہی میں شایع کیا، کیونکہ سرسید کا اصل مقصد جو پورا نہ ہوسکا، ہندوستان میں واپس آکر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں جو نقص تھے اُن کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک جُدا یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت ثابت ہو۔ پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی انھوں نے ایک

---

[1] ۱۸۸۴ء میں جبکہ سرسید پہلی ہی بار چندہ کے لیے لاہور گئے ہیں اس وقت اُنھوں نے راقم کے سامنے بابو نوبین چندر سے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ صرف اس خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لیے انھیں کے روپے سے قائم کیا جاتا ہے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف اُنکی ریس سے ہندوؤں میں توقع سے زیادہ جوش پیدا ہوگیا ہے۔" اور پھر خان بہادر برکت علیخاں سے پوچھا کہ کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہ ہوتا تو آپ ہماری مدارت اسی جوش محبت کے ساتھ کرتے۔ اُنھوں نے صاف کہدیا کہ ہرگز نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اپنے کام کے شروع ہی میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے ۱۲

طرف تو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو جگانے کے لیے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جس نے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کر دی۔

جب کالج قائم کرنے کا ارادہ ہوا اُس وقت اُن کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں سے جو قومی چندوں کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر بلکہ اُس کے مخالف تھے، چندہ وصول کرنا تھا۔ پھر جو موقع کالج کے لیے تجویز کیا گیا تھا وہ چند اضلاع کے بارعب مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں سے گھرا ہوا تھا جن میں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے جس کو بہت سے ذی وجاہت مسلمان مل کر کرنا چاہتے تھے اور جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی، گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم تھا۔ جس قطعۂ زمین پر کالج کی نیو رکھنی منظور تھی وہ نزولی زمین تھی جہاں ایک زمانہ میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر حکام اور افسر نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دی جائے۔ مسلمان جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہاں تک ہو سکے جلد پیدا کی جائے، کیونکہ جو بڑا منصوبہ سرسید نے اُس کے لیے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا وہ بظاہر اُن کی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اُس کا اعتبار ایک انچ آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے۔ چندہ توقع بلکہ وہم و گمان سے بھی زیادہ وصول کر لیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اُس کا مربی اور سرپرست بنا دیا۔ کالج کے لیے وہی زمین جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہو گیا تھا، گورنمنٹ سے حاصل کی۔ مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بوتے اور طاقت سے بڑھ کر خرچ کرنا سکھا دیا، یہاں تک کہ

وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کشادہ پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور بورڈنگ ہوس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کردی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پچیس برس کے قلیل عرصہ میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو پچیس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔

ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعتِ تعلیم انگریزی کے کیں خواہ اُن کو اتفاقی سمجھو اور خواہ یہ خیال کرو کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کی گئی تھیں، سب ایسی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ بغیر اُن کے شاید اصل مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یورپین علوم کی اشاعت بذریعہ دیسی زبانوں کے ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس سے بعض لوگ سچ مچ یہ سمجھ گئے ہیں کہ سوسائٹی کا قایم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے مگر یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے، سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں تھا وہی خیال اُن کا اس وقت تھا جب کہ مرادآباد میں اُنھوں نے ورنیکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اُردو میں لکھ کر شائع کی تھی اور وہی خیال اُس وقت تھا جبکہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت دن نہ گذرے تھے اور اُنھوں نے گورنمنٹ کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورنیکلر یونیورسٹی قائم کیجائے۔ اسی طرح ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری اور لابدی سمجھتے تھے اُسی طرح اخیر دم تک اُس کو ضروری اور ملک کی عام تعلیم کو اُس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے مگر اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم کی جگہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو وہ ملک کے حق میں کچھ بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے جب سے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ بجائے انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے شائع کرنا چاہتی ہے اُس وقت سے وہ اپنی ہر ایک تحریر میں ورنیکلر زبانوں

کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں نہایت مضر بتاتے تھے۔

جس زمانہ میں سرسید نے سوسائٹی قائم کی اُس وقت ادھر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور ادھر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کیونکہ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لیے جو اُس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا خاص کر شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گذرے تھے اور ہندوستانیوں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ بھی اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یورپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت جب تک انگریزی سے عمدہ عمدہ علمی اور لٹریری مضامین دیسی زبان میں ترجمہ کر کے شایع نہ کیے جائیں، کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں انگلش ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شایع کرانا بے سود یا غیر ضروری تھا۔

بیشک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلما مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں اسی غلطی کا جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور یہ دعوے کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں[1] جو

---

[1] مولانا نے اس بات پر کہ جس طرح عباسیوں نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کرائے تھے اُس طرح ہم مغربی علوم انگریزی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرا سکتے، پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ لاکھوں روپیہ جو خلفائے عباسیہ نے ترجمہ پر خرچ کیا وہ اب غیر ممکن ہے مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ گذشتہ تیس چالیس برس میں بغیر اس (باقی)

خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں. اگر مولانا کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اُس سے تعرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لیے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل نشا ظاہر کرنا ضرور ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۰۸) کہ سلطنت نے ترجمہ کا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہو جس قدر علمی اور لٹریری مضامین اور کتابیں انگریزی سے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ کسی طرح خلفائے بنی عباسیہ کے عہد کے ترجموں سے کم نہ ہونگے دوسری دلیل اُن کی یہ ہے کہ اُس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کرلی گئیں گویا یونانیوں کے علوم پر احاطہ کر لیا گیا مگر اس زمانہ میں نہ علمی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے یہی دلیل غالباً سرسید نے بھی کسی موقع پر بیان کی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس طرح اب علوم اور کتابیں غیر محدود ہیں اسی طرح ہندوستان میں ترجمہ کے وسائل بھی غیر محدود ہیں۔ عباسیوں نے صرف چند یہودی عیسائی اور مجوسی نوکر رکھ کر ترجمے کرائے تھے کیونکہ یونانی زبان کی تعلیم کا کبھی مسلمانوں میں عام رواج نہیں ہوا بخلاف ہندوستان کے جہاں انگریزی کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور کاپی رائٹ کے قانون نے ہر تعلیم یافتہ کے دل میں ترجمہ کرنے کی امنگ پیدا کر دی ہے۔ پھر ہر ایک علم کی تمام کتابیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر علم کے چند نامور مصنفوں کی کتابوں کا ابتداءً ترجمہ کر لینا کافی ہے۔ یورپ میں جتنی صدیاں یورپ کی علمی ترقیات میں صرف ہوئی ہیں اور جتنی مدت میں انگریزی زبان نے ترقی کی ہے اور جس قدر عرصہ میں مغربی علوم مدوّن ہوئے ہیں کم سے کم اُس نصف مدت کی مہلت ہندوستان میں اُن کے ترجموں کے لیے ملنی چاہیے، نہ یہ کہ جتنے دنوں تک سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ ترجمہ کا کام کرتی رہی ہے اتنی مدت میں تمام مغربی علوم و فنون کے دیسی زبانوں میں منتقل ہونے کی توقع کی جائے۔ تیسری دلیل انھوں نے یہ لکھی ہے کہ جب یونانی سے عربی میں ترجمے ہوئے اُس زمانے میں عربی تمام ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی اور کسی قوم نے اُس زبان میں علوم کو ترقی نہیں دی جو اُن پر حکومت کر رہی ہو نہ تھی۔ یہ دلیل بھی تقریباً اسی تقریر کا اعادہ ہے جو سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں کی تھی۔ بلاشبہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی محکوم قوم نے علوم کو اپنی زبان میں ترقی دی ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیندہ بھی ایسا وقوع میں نہیں آسکتا۔ حکومت کے اصول بدلنے سے دنیا کے تمام حالات بدل گئے ہیں۔ شائستہ سلطنتوں کی رعایا اب وہ کام کر سکتی ہے جو خود سلطنتیں نہیں کر سکتیں۔ پہلے تمام رفاہ عام کے کام خود سلطنتوں کو کرنے پڑتے تھے اور رعایا کو خواہ وہ رعایا بادشاہ کی ہم قوم ہو اور خواہ غیر قوم اُن کاموں سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا مگر اب وہ کام خود رعایا کرتی ہے۔ وہ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اور ہوسپٹل قائم کرتی ہے، ملکوں میں مذہب کی اشاعت کرتی ہے، علمی تحقیقات کے لیے علما کے قافلے اطراف عالم میں بھیجتی ہے، ترجموں کے ذریعہ سے غیر قوموں کے علوم اپنے ملک میں پھیلاتی ہے، ریلیں جاری کرتی ہے، دنیا کی خبریں بہم پہنچا کر ملکوں میں شائع کرتی ہے غرضکہ ملک کے اندرونی انتظام اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے سوا سب ملک کی بھلائی کے کام رعایا کر سکتی ہے۔ بیشک ہندوستان کی رعایا حالت موجودہ میں بہت سے بڑے بڑے رفاہ کے کام مثل انگلستان کی رعایا کے نہیں کر سکتی مگر زمانہ اُن کو آہستہ آہستہ سب باتیں سکھاتی جاتی ہے۔ چنانچہ جس قدر قومی رفاہ کے کام ہندوستان کی رعایا نے اس صدی کے اخیر نصف میں سیکھے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں ہرگز اُن کی مثال نہیں مل سکتی پس اس زمانے کے حالات کو زمانہ گذشتہ کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔"

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریفارمر کی شان اور اُس کی حالت عام آدمیوں کی شان اور اُن کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قوم کے لیے ضروری سمجھتا ہے اُس کی تائید کرتے وقت اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں پہلے کیا کہہ چکا ہوں یا کیا کر چکا ہوں۔ وہ اس بات کو کہ اُس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اُس کے افعال و اقوال کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے بہ نسبت اس کے کہ جو امر اُس کے نزدیک سردست قوم کے حق میں ضروری ہے اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو جو کہ وہ ہندوستان کے پالٹکس کی نسبت رکھتے تھے، اخیر زمانہ میں صرف اس بنا پر بالکل بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پولٹکل حالت کے موافق نہ تھے، یہاں تک کہ نیشنل کانگرس کے بانی مسٹر ہیوم جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں اُنھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ "مجھکو نیشنل کانگرس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسباب بغاوت" کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب اُس کو کیا ہو گیا"۔

سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا اُس وقت مسلمانوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"۔ اُن میں صدہا باتیں اصلاح طلب اور اُن کے متعلق صدہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی اصلاح یا حل کرنیکا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام کے پورا کرنے سے بھی عہدہ برآ نہ ہوتے۔ اُنھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کیجائے مگر قومی تعلیم و تربیت خود ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لیے صدیاں درکار تھیں اس لیے اُنھوں نے خیال کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پولٹکل بے وقعتی سے نکالنا اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصہ لینے کا گورنمنٹ نے اُن کو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے حق دیا ہے اُس کا اُن میں استحقاق پیدا کرنا ہے جو بغیر اس کے، کہ قوم میں ایک مناسب تعداد ہندوستان اور

انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجوٹس کی پیدا ہوجائے، کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دماغی تربیت ہے جس کے لیے انگلش لٹریچر کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے پس جس بات کو انھوں نے ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم میں مخل سمجھا اُس کی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے۔ اسی بنا پر وہ جس طرح اورنٹیل تعلیم اور ورنیکلر تعلیم کے مخالف تھے اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ ٹکنکل ایجوکیشن کے بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریری تعلیم کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لیے ٹکنکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کی حمایت تھی جس کی نسبت اُن کو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُس کو بتدریج موقوف کرنا چاہتی ہے۔

اسی اصول پر کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اُسی پر سر دست اکتفا کرنا چاہیے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اول تو جب سے اُن کو مسلمانوں کی سوشل رفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے۔ غدر سے چند روز بعد اُنکی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا اور دہلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی۔ اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھ کر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی دوسرے اُن کے خاندان کی فیمیل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت عمدہ تھی۔ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور

اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اُس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسواں پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ اُنھوں نے اُس کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور اُن کے نزدیک ابھی وہ وقت بہت دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک باقاعدہ اور قابل اطمینان انتظام کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس[1] کارپنٹر سے اُن کی ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے ایک کتاب جس میں ہندوستانیوں کی رائیں اور چٹھیاں مس صاحبہ کی کوششوں کی نسبت درج تھیں، سرسید کے سامنے اس غرض سے کہ وہ بھی اپنی رائے تعلیم نسواں کے متعلق اُس میں لکھدیں، پیش کی تو سرسید نے اُس میں مندرجۂ ذیل عبارت لکھی تھی جو اُن کے سفرنامہ میں درج ہے:-

"مجھ کو بڑودہ دخانی جہاز میں جبکہ میں لندن کو جاتا تھا، مس کارپنٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب سے میں نے اُن کا نام اور اُن کی کوششوں کا حال بنسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا میں بہت مشتاق اُن کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ اُن کی ملاقات ہوگئی۔"

"اُن کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیتی کا ثبوت خود وہی مضمون ہے جو اُنھوں نے اختیار کیا ہے، یعنی اس گروہ کی تعلیم میں جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے مرد

---

[1] یہ ایک شریف لیڈی برسٹل کی رہنے والی ڈاکٹر کارپنٹر کی بیٹی تھیں جنھوں نے ہندوستان کی عورتوں کی جہالت کا حال سنکر ہندوستان کا ارادہ اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور اب واپس انگلستان کو جاتی تھیں۔

کا مددگار کیا ہے، کوشش کرنا، درحقیقت یہ مضمون اور اُس پر اُن کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی گو وہ کسی طرح پر ہو، نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اُس میں غلطی ہے تو اُس سے امید ہے کہ اوروں کو اُس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجہ تک پہنچے گی۔"

"نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لیے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جن کی بھلائی کے لیے کوشش کی جاتی ہے، قائم کی گئی ہیں، برباد ہوگئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے اور خود اُس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بننا ہے۔ خدا نے یوشع کے لیے سورج کا تھم جانا کہا، حالانکہ شاید وہ غلط تھا کیونکہ اگر وہ واقع بھی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہوتا، مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اُس زمانہ میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے اور خود اپنے لیے نقصان کا سبب ہوں گے۔"

"بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپینٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے، جو دونوں اصل میں ایک ہیں، روشن ضمیری حاصل کریں۔"

سرسید کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مگر ہندوستانیوں کے اور خاصکر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج، اتفاقِ عادت اور مذہبی اوہام و خیالات سے اس کو اس قدر بعید جانتے تھے کہ سردست اُس میں کوشش کرنے کو بے سود اور رائگاں سمجھتے تھے۔ اسی لیے اُنھوں نے بارہا اپنی اسپیچوں میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہ ہوگیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے

بالکل مخالف ہیں۔ یہاں ہم اُن کی خاص کر اُس اسپیچ کا جو اُنھوں نے ۱۸۸۴ء میں بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں لکھ کر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی اسپیچ تھی جس میں شریف ہندو مسلمان اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا، خلاصہ نقل کرتے ہیں،

ایڈریس میں سرسید کی اُن کوششوں کی شکرگزاری کے بعد، جو کہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کر رہے تھے، اشارۃً اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا۔

"[1] اے میری بہنو! آج کی رات میرے لیے شبِ قدر سے کم قدر کی نہیں ہے، جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے وہ میرے لیے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکرگزار ہوں۔"

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔"

"تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اُس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔"

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے اُن کی ترقیِ تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے

---

[1] یہ ایڈریس دراصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جن کی بانی مبانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں دی گئی تھی مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔

جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقہ تمھارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔"

اس کے بعد سرسید نے پرانا طریقہ تعلیم نسواں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور پھر یہ کہا "اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمھارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اُس سے تم یہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت تمھارے لڑکوں کے لیے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔"

"میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمھارے لیے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اُس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی۔"

"تمھارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیکدلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو برتاؤ میں لاؤ۔ گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو، اُس پرنسل شہزادی سے محبت کرو اور مثل ایک لائق وزیرزادی کے منتظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو، اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ، خدا پرستی خداترسی ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو، یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔

جیسی وہ اس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔ پس اس زمانہ کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے؟ ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے مردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کی رو سے تمہارا حق ہے، برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق تم کو پھر واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کیجاوے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جاوینگے وہ مغصوبہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔"

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خاتونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔"

اس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اس وقت تک جب تک کہ لڑکوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے، لڑکیوں کے لیے ضروری مسائل مذہبی کی تعلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر ان کی اسپیچ میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے جو صرف لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس سے عورتوں کے مغصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس مل جائیں گے۔ ان کی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اگر یہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کے حقوق پہچانیں، ان میں تعلیم کی کمی سے جس قدر عقل یا سمجھ یا اخلاق کی کمی ہو اس کو اسی طرح برداشت کریں جس طرح اس کے اسلاف برداشت کرتے آئے ہیں، ان سے جب تک کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے، ان باتوں کی توقع نہ رکھیں جو یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے رکھنی چاہیے مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تربیت سے، بجائے

تحمل و برداشت اور سلوک و درگذر اور قومی حمیت اور رقت جنسیت کے یہ سبق سیکھتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہل یوروپ کو صدیوں اور قرنوں کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے اُن کو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُس کے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا آ. تعلیم یافتہ نوجوان کی یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لنڈن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور اگر یہ امر اُن کی قدرت سے باہر ہو تو غالبًا وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی نیٹو کرسچن عورت کو قوم کی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہ ہو، بہتر اور افضل سمجھینگے۔ پس جب کہ یہ حالت ہے تو اُن سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مغصوبہ حقوق واپس دیں گے، اُن کا بڑا سلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے اُن کے حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمہ نہ لیں بلکہ اُن کو بدستور جاہل اور ناتربیت یافتہ لڑکوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ اُن کے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقینًا بُرے نتائج پیدا کرے گی۔

مذہبی تحقیقات مذہب کے متعلق جو کچھ سر سید کی مذہبی خدمات اور رفارمیشن کے بیان میں لکھا گیا اُس سے یا اُن کوششوں کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور حمایت میں اُن سے ظہور میں آئیں یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا جو انھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی یہاں ہم اُن کی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقدوں کے حل کرنے اور اُن کی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور مذہب کو حقائق محققہ پر منطبق کرنے کی کس قدر قابلیت تھی؟ نہ وہ واعظ تھا نہ مفتی، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی، باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے، اُن کا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی ایک شخص تھا

جن کی تحریریں مجروح دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں۔ اُس کے پاس اطراف ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسیوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ علمائے اسلام اُن کا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں، بعض احباب کے بھیجے ہوئے اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں بعض خطوں کے جواب تہذیب الاخلاق یا انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعہ سے شائع ہوتے ہیں اور بعض[1] اس مرحوم نے ہمارے سامنے لکھ کر لوگوں کو بھیجے ہیں۔ اکثر لوگ[2] دور دور سے قصد کرکے اسی غرض سے سرسید کے پاس آتے تھے اور اپنے شبہات بیان کرتے تھے اور مطمئن ہوکر واپس جاتے تھے۔ اسی طرح اس مرحوم کے پاس بہت سے لوگ تشکریے کے خط[3] بھیجے

---

[1] ایک صاحب نے جن کا نام احمد بابا مخدومی تھا غالباً لاہور سے سنہ ۱۸۹۰ء میں سرسید کے پاس یہ سوال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں یحییٰ کی نسبت "برّاً بوالدیہ" اور عیسیٰ کی نسبت "برّاً بوالدتی" آیا ہے۔ اگر فی الواقع عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو ان کا قول برّاً بوالدتی کی جگہ بوالدیّ نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سرسید نے تفسیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے مگر خاص کر اس شبہ سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ اُنھوں نے جواب میں یہ چند سطریں لکھ بھیجیں "جناب مخدومی! حضرت عیسیٰ تمام لوگوں میں ابن مریم کرکے مشہور تھے اس شہرت کے سبب قرآن مجید میں بھی ان کو ابن مریم سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوتے ہیں پس قرآن مجید میں جس طرح ابن مریم کہا گیا ہے برّاً بوالدتی بھی کہا ہے۔ اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ اُن کا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو جو بنی فاطمہ کرکے مشہور ہیں، آپ بن باپ کا پیدا ہوا خیال کرتے ہیں؟ والسلام ۱۲

[2] مولوی سید ممتاز علی بی۔ اے کے دل میں جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے، اسلام کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوگئے تھے اُنھوں نے سرسید کو جو اس وقت بتقریب ممبری کونسل کلکتہ میں تھے، اپنے شبہات لکھ بھیجے۔ اس وقت سرسید اُن کو نہیں جانتے تھے مگر اُنھوں نے فوراً اُن کو خط لکھا کہ خط کتابت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا تم چند روز کے لیے کلکتہ چلے آؤ اور ریل کے کرایہ کی ضرورت ہو تو میں بھجوا دوں۔ وہ فوراً کلکتہ چلے گئے اور چند صحبتوں میں اُن کے تمام شبہات زائل ہوگئے ۱۲

[3] انھیں خطوں میں سے ایک خط ہمارے سامنے سرسید کے نام سیموگہ علاقۂ مدراس کے اہل اسلام کی جماعت کی طرف جس پر سید احمد قاضی سیموگہ اور شیخ بابن محمدن مشنری سیموگہ اور چار اور معزز مسلمانوں کے دستخط تھے پہنچا تھا جس کو ہم نے سید صاحب سے مانگ لیا تھا۔ اُس میں سے چند فقرے ہم انھیں کی عبارت میں یہاں نقل کرتے ہیں "جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کے دل پر ایسی روشنی ڈالتی ہے جیسی اندھیری رات پر آفتاب کی۔ اس تفسیر (باقی)

تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہم کو یا دریہ فائدے پہنچے ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے کیے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے محض اگلے محققین کی تقلید سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اول تو جس مقصد سے اگلے محققین نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد نہ تھا۔ سرسید کے تمام اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشکلین کے شبہات کا رفع کرنا تھا بخلاف اگلے محققین کے جن کے اختلافات کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کیے جاتے ہیں اُن سے اُن بزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی طرز تصنیف کو بہ نظر غور دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اُس وقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنف کا قول اُن کے موافق نکل آتا تھا تو اُس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لیے لکھ دیتے تھے ورنہ صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب اُن کی تحریر چھپ کر شائع

(نوٹ صفحہ ۲۷۰) سے ہم کو بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک اُردو خواں ہر دو کو برابر سمجھاتی ہے جس کو عقل سے کچھ بھی تعلق ہو وہ بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تفسیر کے پڑھنے و سُننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے اور دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ ہم آج تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دیتے . . . . اور کبھی یہ نہیں خیال میں آیا کہ ان ہوئی بات کیونکر ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ تو ضرور سمجھے تھے نصاروں کے یعنی نصاریٰ کے تین خدایاں مل کر ایک ہونا غیر ممکن ہے، بدستور ہنود کے ایک شخص کو تین منہ اور دو سے زیادہ کئی ہاتھ اور آدمی کو ہاتھی کا سر لگائے جانا یہ سب غلط۔ یعنی عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہاں جو ناممکن باتیں مانی جاتی ہیں اُن کو تو ہم غلط جانتے تھے، مگر ویسی ہی غیر ممکن بلکہ اُس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے علماء واعظین کی گم شدہ ہم کو دکھائی نہ دی۔ الحمدللہ اس حق گو تفسیر کی بدولت اس روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسل صحت ملا . . . . مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبہ میں بتاں۔ اب اُن کا یک بیک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے۔ ہم اس احسان کے بدلے اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرہ کا معاوضہ نہ ہوگا"۔

ہو چکی اُس وقت حسن اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی رائے کا موید اُن کے کسی دوست کو معلوم ہوا اور اُس نے یا تو سرسید کو اُس سے مطلع کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اُس قدر دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے مدد ملنے کی اُن کو توقع نہ تھی اور اس لیے وہ خود کتابوں کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہئیں تھے اُن سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اُن کے لیے اور لوگوں نے تلاش کر کے بہم پہنچائے ہیں۔ اس کے سوا بہت سے مقامات اُن کی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جن میں اگرچہ اُنھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رائے پر استشہاد کیا ہے مگر جب اُن کے اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلے میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے اُن اقوال کو سرسید کی رائے کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے باوجود ان سب باتوں کے ہم بے شمار تحقیقاتیں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پاتے ہیں جن کو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے اچھنبل خیالات اور اچھنبل رائیں دیکھتے ہیں جن کو اُس کی ذات کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا کہ اُس کی تعلیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعوے کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اُترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اُترتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اُس سے معجزات اور پیشین گوئیاں صادر ہوں بلکہ اُس کی تمام عظمت اور تمام بزرگی اس میں ہے کہ جب منکرین اُس سے معجزہ طلب کریں تو اُن کو یہ جواب دے کہ "انما الآیات عند اللہ" اور "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا"۔ اُسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتہ تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا جس کو مخالفین آپ کی نبوت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کی ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کی تعلیم فطرتِ انسانی کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شائستہ سب کی سمجھ کے موافق اور ہر زمانہ کی حالت کے مناسب ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اُس حد تک پہنچا دیا جس سے زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدتِ دراز سے غیر قوموں میں ملعون و متہم چلا آتا ہے اس کے مختلف اسباب ہیں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمان فاتحوں اور کشور کشاؤں کی بے اعتدالیوں کو ایک نتیجہ اسلام کی تعلیم کا قرار دیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے کردار کا جوابدہ تصور کیا ہے حالانکہ اسلام ہر ایک طعنہ اور ہر ایک اعتراض سے اُس وقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اُس کی تعلیم میں کوئی بات قابلِ گرفت کے نہ پائی جائے۔

اُسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قوموں کا یہ الزام رفع کیا کہ وہ شائستگی اور سولیزیشن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں دنیوی ترقیات میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اُسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور کوئی سریہ اس ارادہ پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جس قدر چھوٹی یا بڑی لڑائیاں آپ کے عہد میں کفار کے ساتھ ہوئیں اُن کا اصل مقصد امن کا قائم کرنا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے موانع کو دور کرنا تھا اور اُسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو بلکہ بے شمار آیتیں اس کے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس نکتہ کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کے

پہلے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور اُن کے ظلم و تعدی کا انتقام لینا یہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے جس پر انسان عمل درآمد کر سکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دینا کیونکہ نہ اس پر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے ثابت کیا کہ اُن کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانوں سے محض دین کی بابت لڑیں یا اُن کو جلا وطن کریں اور اُن کے برخلاف لوگوں کی مدد کریں۔ کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، اُن سے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دین اسلام کی رو سے منع نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے فقہا کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ملک مسلمانوں کے لیے یا دار الاسلام ہے یا دار الحرب اور ہر کافر حربی ہے یا ذمی۔ کیونکہ ہجرت اولیٰ میں جب مسلمان نجاشی کی پناہ میں جا کر رہے تو اُس وقت ابی سینیا پر نہ دار الاسلام کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ دار الحرب کا اور ابی سینیا کے عیسائیوں پر نہ اہل حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہل ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکوں میں آج مسلمان عیسائی سلطنتوں کے محکوم ہیں اور مذہبی امور میں اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں اُن ملکوں کو بھی نہ دار الحرب کہہ سکتے ہیں نہ دار الاسلام اور عیسائی حکمرانوں کو نہ اہل حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہل ذمہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نص قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلاف شرائع سابقہ کے اسیران جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ اگر مسلمان کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازدواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اُس کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جورو کرنی جائز نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلہ میں یہودیوں کے ہاں افراط ہے اور عیسائیوں کے ہاں تفریط اور اعتدال صرف اسلام میں ہے اور بس۔

اسی نے سب سے پہلے رسول خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لیکر اسمٰعیل علیہ السلام تک زمانہ حال کے اصول سلسلے کے موافق صحیح کرکے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرت کا بنی اسمٰعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کی اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ مکہ کے قریب اسمٰعیلؑ کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسۂ حجر اسود، طواف کعبہ، اشہر حرم کی تعظیم اور رمی جمار منا و عرفات میں جو مناسک ادا کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی بات کو حضرت ابراہیم کے اصول سے تعلق نہیں ہے بلکہ بت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُن سے تعلق ہے۔ اُس نے نہایت روشن دلیلوں اور تاریخی شہادتوں اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی نظیر بنی اسحٰقؑ یا بنی اسرائیل میں موجود نہ ہو۔

اسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنفوں کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قوم عاد کا قوم نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے، صحیح نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیوں کی شہادت اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰ اور حبقوق نبی کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلعم کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں اُس سے وادی حجاز مراد ہے نہ وہ مقامات جن کو بعض عیسائی مصنفوں نے مسلمانوں کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدوں کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاصکر دین عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اُسی نے سب سے پہلے دین اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی بنیاد ڈالی اور اسی غرض سے کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کیے جن کے بموجب آئندہ نسلیں اُس کے اس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اُس سے تفسیر قرآن میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو انہیں اصول کے موافق اس کی اصلاح کر سکیں۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتوں کے معنی علمائے سلف نے بہ پاس ادب، یا بخوفِ خرقِ اجماع، یا بہ سبب عدم ضرورت، یا اس وجہ سے کہ ممالک اسلامیہ میں علمائے اسلام کو پوری پوری ملائی آزادی نہ تھی، صاف صاف بیان نہیں کیے اور خاص خاص صورتوں کے سوا تمام الفاظِ قرآنی کو اُن کے حقیقی معنوں پر مقصور رکھا ہے، اب بھی اُن کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظ درحقیقت بطور مجاز و استعارہ و تمثیل کے استعمال کیے گئے ہیں اُن کے اصلی معنی بیان کیے جائیں اور جو شبہات اُن کے حقیقی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خداداد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اُس کا ثبوت اُن کی ہر ایک تحریر میں، جو غدر کے بعد اُن کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، مگر تفسیر القرآن جس میں گویا نئے علم کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے، سب سے عمدہ نمونہ اُن کی تصنیفات کا ہے اور اس کا اندازہ اُس سیدھے سادے اور عام فہم طریقہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مصنفین اس زمانہ میں اُس طریقہ پر کاربند ہوتے ہیں اُن کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُن کے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالک عثمانیہ میں رسالۂ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے جو طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے ۱۳۰۶ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور جس پر شام کے بارہ جلیل القدر عالموں نے اور روم و شام و مصر کے بہت سے نامور اخباروں نے لمبی لمبی تقریظیں اور ریویو لکھے ہیں۔ چونکہ ممالک مذکور میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرے سے قدم باہر رکھ سکے اس لیے مصنف موصوف کا

طریقہ استدلال زیادہ تر انہیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اس زمانہ کے نئے اکتشافات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور تمام ثوابت و سیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے تسلیم کیے جاتے تھے درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ سب ایک فضائے ممتد میں جس کی وسعت غیر متناہی ہے، جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور بذریعہ کشش کے جو منجملہ قوانین قدرت کے ایک زبردست قانون ہے، اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اور کبھی اُس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کُرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل آسمان یا عرش و کرسی وغیرہ کے اس فضا میں موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اب تھیوری کی حد سے نکل کر سائنس کے درجہ کو پہنچ گیا ہے جس پر تمام یورپ اور امریکا کے ہیأت دانوں کا اتفاق ہے، اگرچہ علمائے اسلام میں سے ابوبکر بن العربی کی بھی یہی رائے تھی مگر چونکہ اس وقت تک کشش کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اس لیے وہ رائے سائنس کے درجہ کو نہیں پہنچی تھی۔ چونکہ قرآن مجید میں سبع سموات اور عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جن سے بڑے بڑے کُروں کا اور ایسے اجسام عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا سمجھا جاتا ہے اس لیے مصنف رسالۂ حمیدیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ خدا تعالےٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور اُن کے اوپر کرسی اور کرسی کے اوپر عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ کہ ہوا یا آیندہ ہوگا اس کے ثبت کرنے اور لکھنے کے لیے لوح و قلم کا پیدا کرنا اور انسان کے اعمال کی جزا و سزا کے لیے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں وارد ہوا ہے، ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحت قدرت کاملۂ باری تعالیٰ داخل نہ ہو پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا ان کا موجود ہونا محالات سے ہے اُس وقت تک کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کے عدم وجود یا عدم امکان پر کوئی دلیل قاطع عقلی موجود ہو یا نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہو اُن کے دل کا کانٹا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہو کہ ممالک اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون وچرا نہ کیا جائے لیکن جن لوگوں نے علوم جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور تعلیم نے اُن پر اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے ایسے جوابوں سے اُن کے دل کی خلش کا مٹنا دشوار ہو کیونکہ جن باتوں کو وہ مثل بدیہیات اولیہ کے یقینی سمجھے ہوئے ہیں اُن کا یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہو سکتا۔

مگر جو طریقہ سرسید نے ایسے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہو وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے کہ کلموا الناس علی قدر عقولھم کیونکہ اس سے جہاں تک کہ دیکھا گیا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطر خواہ تشفی ہو جاتی ہو اور قرآن کے بیان میں شک و شبہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ سرسید کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کا بلفظہ کلام الٰہی ہونا مسلم ہو اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہؤا ہو۔ پس جس طرح انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں اسی طرح خدا کے کلام معنی لگائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہو اور کبھی مجازی معنوں میں، پس قرآن کے الفاظ سے بھی کہیں حقیقی معنی مراد لیے جائیں گے اور کہیں مجازی معنی۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالموں اور محققوں نے اس بات کی تصریح کی ہو کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق جو علمی ترقی سے پہلے اُس کی اصل خلقت میں ودیعت تھی خطاب کیا گیا ہے، پس جو کچھ مبدا و معاد کے متعلق قرآن میں بیان ہؤا ہے ممکن نہیں کہ اُن الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے کیونکہ جس طرح انسان کی سمجھ خدا کی ذات و صفات و اسما و افعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعد الموت اُس کے فہم کی رسائی سے وراء الورا ہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے اُن حقائق و معارف کو کما ہی ہی تعبیر کیا جا سکے۔ پس عرش و کرسی اور

لوح و قلم اور جنت و جہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبدا و معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کیے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے۔ اسی طرح جو خیال عام انسانوں کا آسمان اور زمین اور ستاروں کی نسبت تھا اُسی کے موافق قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آسمان کو مثل ایک چھت یا سائبان کے زمین پر چھایا ہوا تصور کرتے تھے سو اُنہیں کی سمجھ کے موافق فرمایا "وجعلنا السماء سقفا محفوظا" وہ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا جانتے تھے سو انہیں کے خیال کے مطابق کہا "والارض فرشنٰھا" وہ ستاروں کو آسمان میں جڑا ہوا تصور کرتے تھے سو انہیں کے تصور کے موافق فرمایا "انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب" کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین اور ستاروں کی حقیقت بیان کرنا نہ تھا بلکہ مصنوعات کی عظمت سے جس طرح پر کہ وہ اُس کو تسلیم کیے ہوئے تھے صانع کی عظمت و جلال کا تصور دلانا اور اُس کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔

یہ ایک نہایت مختصر اور ناکافی خلاصہ ہے اُن تحریروں کا جو سرسید نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقامات میں بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہیں مگر کسی کو زیادہ تفصیل دیکھنی منظور ہو تو وہ تفسیر کی جلدوں کو اور اُن کے رسالہ اصول التفسیر کو مطالعہ کرے۔

یا مثلاً مصنف رسالہ حمیدیہ نے آنحضرت صلعم کی نبوت پر خوارق عادات یعنی معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچھ معجزہ کے متعلق علم کلام کی کتابوں میں لکھا ہے اُسی کو زیادہ متانت کے ساتھ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ خرق عادت کو دلیل نبوت گرداننے پر قدیم سے برابر قدح ہوتی چلی آئی ہے یہاں تک کہ خود اہل اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیل نبوت نہیں ہو سکتا، مگر اس میں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے خرق عادت کو دلیل نبوت کہتے چلے آئے ہیں لیکن اس زمانہ میں وہ تمام دلیلیں جو خرق عادت کے ممکن ہونے یا اُس سے نبوت کے

ثابت ہونے پر قائم کی جاتی تھیں سب بے کار ہوگئی ہیں۔ ہر شخص جس نے زمانۂ حال کے علوم طبعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اُن کو اچھی طرح سمجھا ہے، وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب و مسببات میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوتا۔

سب سے بڑا شبہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ مثلاً جو معجزات آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی معجزہ کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے دعوت اسلام کرتے وقت یا اُس وقت جبکہ آپ سے معجزے طلب کیے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکھایا ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ "انما الآیات عند اللہ" یا "سبحان ربی ھل کنتُ الا بشراً رسولا" یا "لو ان عندی ما تستعجلون بہ لقضی الامر بینی و بینکم" یا "ولو کنتُ اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یومنون" غرضکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزہ پر منحصر ہوتا تو کفار کو بہ طلب معجزہ دکھانا ضرور تھا۔ بعینہ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی معجزہ عند الطلب نہیں دکھایا گیا بلکہ برخلاف اس کے متی باب ۴ و ۱۲ و ۱۶ و ۲۷ اور مرقس باب ۸ و ۱۴ و ۱۵ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بار ہا معجزے طلب کیے گئے مگر آپ نے ان کے دکھانے سے انکار کیا۔

نیز مصنف موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرت ؐ کے معجزات کی نسبت یہ بھی لکھا ہے کہ آپ سے خوارق عادات کا وقوع میں آنا تواتر معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تواتر سے ثابت ہو اس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانہ میں تواتر کو اُسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو۔

بہر حال کسی نبی کی نبوت کے ثبوت میں اُس کے خوارق عادات کو پیش کرنا جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تھا۔ اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی کی نسبت یہ ثابت ہونا کہ اُس نے خوارق عادات دکھانے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، یہی بڑی دلیل اس کی سچائی کی سمجھی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلاف جمہور متکلمین کے خرق عادت کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے اور اس دعوے کی تائید میں کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہوسکتا قاضی ابن رشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر اُن کی کتاب "الکشف عن مناہج الادلہ فی عقائد الملۃ" سے نقل کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے کہ خدا موجود، مرید، متکلم، قادر اور مالک عباد ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے اور اُن سے معجزات بھی صادر ہوا کرتے ہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن سے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جہاں آنحضرتؐ کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفہیمات سے اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "شق قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "اقتربت السّاعۃ وانشق القمر" اور خدا تعالیٰ نے اُن معجزات میں سے (یعنی آنحضرت کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے"۔

اس کے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصل اور شافی بحث فطرت انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رو سے ہدایت کرنے والوں کا محتاج ہے اور اسی فطرت کا مقتضا یہ ہے کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُس کو جب تک انسانیت کے درجے سے ورا الورا نہیں ٹھیرا لیتا اس کے دل کو صبر نہیں آتا یہاں تک کہ اُس کو خدا اور خدا کا بیٹا تک کہنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُس میں ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جن سے وہ باوجود انسان ہونے کے نوع

انسان سے بالاتر سمجھا جائے۔ معمولی واقعات جو عادت الٰہی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں جب اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو وہی اُس کی کرامتیں اور معجزے قرار پا جاتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی کسی کو بددعا دے کہ تجھ پر بجلی گرے اور اتفاق سے وہ بجلی ہی سے مارا جائے تو کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بددعا کسی ایسے شخص نے دی ہو جس کے تقدس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہو تو اُس کی کرامت یا معجزہ سمجھا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ انسان میں بعضی ایسی قوتیں ہیں جو خاص طریقہ مجاہدہ سے قوی ہو جاتی ہیں اور کسی میں بمقتضائے خلقت قوی ہوتی ہیں اور اُن سے ایسے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں جو اُن لوگوں سے ظہور میں نہیں آسکتے جن کی قوتیں مجاہدہ سے یا بمقتضائے خلقت ویسی قوی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب امور اُسی طرح واقع ہوتے ہیں جیسے تمام کام بمقتضائے فطرت انسانی وقوع میں آتے ہیں مگر وہ امور بھی اُن مقدس شخصوں کے معجزے یا کرامات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بہت سی عجیب باتیں ان بزرگوں کی نسبت ایسی مشہور ہو جاتی ہیں جن کی درحقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر جن کی طرف وہ منسوب کی جاتی ہیں اُن کی عقیدت کے سبب سے بلا تحقیق اُن پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کے اکثر کاموں کو بطور خوارق عادات کے بیان کیا گیا ہے اور بہت سی باتیں اُن کی طرف ایسی منسوب کی گئی ہیں جن کا کچھ ثبوت نہیں۔ انتہے ملخصاً۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "انہیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود نے انبیاء کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی کہ "ان انتم الا بشر مثلنا" اور انہیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلعم سے معجزوں کے طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں ان کے پاس فرشتے آتے؟ کیوں نہیں ان کے پاس خزانہ آتا رہا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں، یعنی انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے۔ کبھی آسمان سے پتھر برسوانے چاہتے تھے، کبھی آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر

گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اس کے بعد سرسید نے سورۂ کہف، سورۂ اعراف، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علم غیب کے تجربے متوقع ہیں اُن سے کہدے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جس کو وحی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس اور کہدے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے اپنے تئیں نہ نفع پہنچا سکتا ہوں نہ نقصان اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے بھلائیاں حاصل کر لیتا اور برائی مجھ کو چھوتی بھی نہیں، میں کچھ نہیں ہوں سوا اس کے کہ مومنوں کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور بس اور کہدے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا اور کہدے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

ان آیتوں کے نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلعم کے پاس جو کہ افضل الانبیا والرسل ہیں، معجزہ نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین (علیہم السلام) کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے وہ درحقیقت معجزات نہ تھے بلکہ ایسے واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوئے تھے۔ خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپا کر نہیں رکھا اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ بڑا جز و اسلام کا۔ ۔ ۔ جس کی وجہ سے آپ خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل و تلقین توحید ذات باری تھی جو توحیدات ثلاثہ میں منحصر ہے یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی العبادۃ۔ انبیا میں معجزات کا (بمعنی المتعارف) یا اولیا اللہ میں کرامات کا یقین کرنا (گو کہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت اُن میں دی) توحید فی الصفات کو ناکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی بزرگی، کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام اور بانی اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اعد

بغیر کسی دعویٰ کا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ دکھانے کا دعویٰ کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے اُس کی تم کو تلقین کرتا ہوں۔ صلی اللہ علی محمد خاتم النبیین و حبیب رب العالمین۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ خوارق عادات جو عموماً انبیاءؑ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں سر سید اس کی وجہ یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کی نبوت کا یقین لوگوں کو فی الواقع اُن کے خوارق عادات دیکھنے سے ہوا تھا بلکہ اُن کے نزدیک انسان کی فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ انبیا اور اولیا اور تمام مقدس لوگ جن سے اُن کو عقیدت ہوتی ہے، اُن کی معمولی باتیں بھی اُس کو معجزہ اور کرامت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی مطلب کو وہ آگے چل کر دوسری طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”لوگوں کا خیال ہے کہ انبیا پر ایمان لانا بسبب ظہور معجزات باہرہ کے ہوتا ہے مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ انبیاؑ پر یا کسی ہادیٔ برحق پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روئے فطرت کے ایسے سلیم الطبع پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچی بات اُن کے دل میں بیٹھ جاتی ہے، وہ اس پر یقین کرنے کے لیے دلیل کے محتاج نہیں ہوتے باوجودیکہ وہ اُس سے مانوس نہیں ہوتے مگر اُن کا وجدان صحیح اُس کے سچے ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ اُن کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُس بات کے سچ ہونے پر اُن کو یقین دلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انبیائے صادقین پر صرف اُن کا وعظ و نصیحت سن کر ایمان لاتے ہیں، نہ معجزوں اور کرامتوں پر۔ اسی فطرت انسانی کا نام شارع نے ہدایت رکھا ہے۔ مگر جو لوگ معجزوں کے طلبگار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کو دکھانے سے کوئی ایمان لا سکتا ہے۔ خود خدا نے اپنے رسول سے فرمایا کہ اگر تو زمین میں ایک سرنگ ڈھونڈھ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے“ اور ایک جگہ فرمایا کہ ”اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیج دیں اور اُس کو وہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھو لیں تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے۔“ پس ایمان

فہ تا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے، جیسے کہ خدا نے فرمایا "اللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم"
پاگل پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں (یا ہادی برحق کی بات قبول نہیں کرتے) اُن کے دل
میں بھی غالباً اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کا سبب کبھی اُن کی فطرت ہوتی ہے
جو کجی کی طرف مائل ہے اور سیدھی طرف مائل ہی نہیں ہوتی، اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا
ہے جہاں فرمایا ہے "من یشاء اللہ یضللہ ومن یشاء یجعلہ علی صراط مستقیم" اور اکثر یہ ہوتا ہے
کہ دین آبائی کا اور سوسائٹی کا ایسا بوجھ اُن کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کہ سیدھی بات کے دل
میں آنے کی جگہ ہی نہیں رہتی اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ مطلق بالطبع ہو کر اُس بات پر غور نہیں کرتے
اور اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ "فمن یرد اللہ ان یھدیہ
یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء
کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون"

پھر اسی معجزہ کی بحث میں سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معجزہ سے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ
اور بعض دیگر محققین نے لکھا ہے، یہ مراد ہے کہ وہ بغیر موجود ہونے اسباب کے ظہور میں نہیں
آتا تو ہم ایسے امر کے واقع ہونے سے انکار نہیں کرتے مگر نبی کے ساتھ اُس کے مخصوص
ہونے اور غیر نبی سے اُس کے ظہور میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور اگر اُس سے
جیسا کہ جمہور متکلمین قائل ہیں کوئی امر خارق عادت جو قوانین قدرت کے برخلاف ظہور میں آئے
مراد ہے تو ہم اُس کے انکار پر مجبور ہیں، نہ اس لیے کہ حکما و فلاسفہ اُس کو کسی وجہ سے ناممکن
سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ قرآن ہم کو صاف صاف ہدایت کرتا ہے کہ قوانین قدرت
کبھی نہیں بدلتے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ قمر میں فرمایا کہ "انا کل شیء خلقناہ بقدر"
اور رعد میں فرمایا "وکل شیء عندہ بمقدار" اور فرقان میں فرمایا "خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا" اور
روم میں فرمایا "لا تبدیل لخلق اللہ" اور ملائکہ میں فرمایا "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ
تحویلا" اور سورۂ فتح میں فرمایا "سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" اور

بنی اسرائیل میں فرمایا سنت کا لفظ ان مثالوں میں وہی طریقہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے یہ تمام آیتیں
اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی شے اپنے اندازہ سے، جو خدا تعالیٰ نے اس کے لیے
مقرر کیا ہے، نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے اور خدا کی بنائی ہوئی خلقت میں تبدیلی ممکن
نہیں اور خدا کی سنت (یعنی عادت) نہ بدل سکتی ہے اور نہ دگرگوں ہو سکتی ہے اور ہر کام
اسی طریقہ پر چلتا ہے جو اس کی جبلت میں رکھا گیا ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔

بہرحال معجزہ جن معنوں میں کہ وہ عموماً لیا جاتا ہے، سرسید کے نزدیک نہ اس کا
وقوع ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اس پر موقوف ہے۔ ان کے نزدیک نبی کی سچائی کی
سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی تعلیم تمام طبقات انسانی کی سمجھ کے موافق اور جاہل اور حکیم
اور ظاہر پرست اور محقق پرست سب کو ایک نتیجہ پر پہنچانے والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمائے
الٰہی اور انبیائے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ حکما صرف ان چند
لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے، برخلاف اس کے انبیا تمام
عالم کو تربیت کرتے ہیں جن کا بہت بڑا حصہ محض نا تربیت یافتہ، جاہل، وحشی، جنگلی، سیدھا
بے عقل اور بے دماغ ہوتا ہے اور اسی لیے انبیا کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ان حقائق و معارف
کو جن کو تربیت یافتہ عقل ہی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے ایسے الفاظ میں
بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید میں جو
بے مثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اس کا طرز بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے
اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انھیں آیات کی نسبت
(یعنی جن آیتوں میں جنت اور حور و قصور وغیرہ کا بیان ہے) دو مختلف دماغوں کے خیالات
پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ بہشت وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہے
ان سے بعینہٖ وہی اشیا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی و راحت کو تمثیل کے طور پر
تعبیر میں لایا گیا ہے۔ اس خیال سے اس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی نعیم جنت کی اور

ایک ترغیب اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑ مغز ملا یا شہوت پرست زاہد سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پییں گے، میوے کھاویں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہاویں گے اور جو دل چاہے گا مزے اڑائیں گے، وہ بھی اس لغو و بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچتا تھا اُسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے قرآن مجید کی ان حقائق پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کی اس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

اس طریقہ استدلال میں، جو کہ سر سید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ اور شیخ حسین آفندی کے طریقہ میں، جو رسالہ حمیدیہ میں اختیار کیا گیا ہے، یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جن کے دل ہر قسم کے شکوک و شبہات سے خالی ہیں، مگر جس جماعت کی تشفی کے لیے وہ کتاب لکھی گئی ہے اُن پر اُس کا شتر کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جو طریقہ سر سید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے اگرچہ پرانے خیالات کے مسلمان، جن کے لیے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی، اس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن نئے خیالات کے لوگ، جو اس تفسیر کے مخاطب صحیح ہیں، وہ اس سے خاطر خواہ تشفی پاتے ہیں۔

آج کل ہندوستان میں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص جس مذہب پر اور جس مذہبی تصنیف پر چاہے اعتراض کر سکتا ہے۔ باوجود اس کے سر سید کی مذہبی تصنیفات پر جس قدر اعتراضات آج تک کئے گئے ہیں وہ سب قدیم خیالات کے مسلمانوں کی طرف سے کئے گئے ہیں، کسی نئے تعلیم یافتہ مسلمان نے اُن پر نکتہ چینی

نہیں کی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اکثر مذہب کی طرف سے ایسے بے پروا ہیں کہ وہ کسی مذہبی تصنیف کے مخالف یا موافق لکھنے کو ایک فضول بات سمجھتے ہیں اور بہت بڑا حصہ اس گروہ کا وہ لوگ ہیں جو اس بات کے سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسلام کے خالص اصول کے موافق صحیح ہے یا نہیں مگر باایں ہمہ نئے خیالات کے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دین اسلام کے دلدادہ ہیں، قرآن اور حدیث کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو کچھ مذہب کے متعلق آج کل لکھا جاتا ہے اس پر نکتہ چینی کرنے اور رائے دینے کی کافی لیاقت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بھی کسی نے، سوا اس کے کہ بعض جزئیات میں سرسید سے اختلاف کیا ہو، اُن اصول کے تسلیم کرنے سے جن پر تفسیر مذکور کی بنیاد رکھی گئی ہے، انکار نہیں کیا۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کیے ہیں اُن میں ظاہرا کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس پر کچھ گرفت ہو سکے اگر اس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی اُن کو پابندی کرنی چاہیے تھی اُن کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعضے ہم خیال آدمی اُن کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

مثلاً سرسید جس طرح کہ آنحضرت صلعم کے معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اسی طرح اُن کے نزدیک انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اس لیے اُنھوں نے انبیائے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہرا کسی امر خارق عادت پر دلالت کرتا ہے، قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے، مگر اُن کے بعض ہم خیال، باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا، مگر اُن کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیائے سابقین کے اکثر واقعات۔

اگرچہ نفس الامر میں موافق قانون قدرت کے واقع ہوئے ہوں، مگر قرآن مجید میں بطور خوارق عادات کے، جیسا کہ عرب کے اہل کتاب اعتقاد رکھتے تھے، بیان کیے گئے ہیں اور اُن کے نزدیک قرآن کی یہ طرز بیان ہرگز اُس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اور دلائل کے خود سرسید نے متعدد آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں، محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور اُن کے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ اصول درحقیقت اُنھوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے اخذ کیا ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ "شارع نے بعض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، اُن سے خطاب کیا ہے" اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "انبیا کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اُن کی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر، جس پر کہ وہ مجبول ہوئے ہیں، کلام نہ کریں۔"

اسی اصول کے موافق سرسید نے اُس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اور جس پر سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھ دن سے زیادہ عرصہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اُن کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت نفس الامری کی خبر کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی چونکہ اس موقع پر چھ دن کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہل کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھ دن میں بنی ہے، اس لیے شارع نے اسلام کا اصل مقصد یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا، مخاطبین کی سمجھ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ "ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام"

چونکہ سرسید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارق عادات کا منسوب کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے یہاں تک کہ اُن کی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات

یا کرامات تصور کی جاتی ہیں اور خاصکر انبیاے بنی اسرائیل کے قصے جو عرب کے اہل کتاب میں مشہور تھے اُن میں بہت سی باتیں بطور خوارق عادات کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں اِن قصوں کا بیان کرنا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ اُن میں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیب نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف اُن کا مجملاً ذکر کرنا منظور تھا اس لیے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیائے بنی اسرائیل کے قصوں میں جس قدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ انھیں پیرایوں میں بیان کیا جائے جو اہل کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے۔ کیونکہ قرآن کا اصل مقصد ان نصیحتوں کا بیان کرنا تھا جو اُن قصوں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ اُن قصوں کی نسبت اُنیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان کرنا۔ ہاں بلاشبہ قرآن کا جو خاصکر توحید کی تکمیل کے لیے نازل ہوا تھا، یہ کام تھا کہ خرق عادت کا غلط خیال جو توحید فی الصفات کا منافی تھا، اُس کی غلطی ظاہر کردے۔ سو اُس نے نہایت تصریح کے ساتھ مستقل طور پر نہ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں، اُس کی غلطی کو ظاہر کر دیا اور خود خاتم النبیین کی زبان حق ترجمان سے بکرّات ومرّات علی رؤس الاشہاد کہلوا دیا کہ "انما الآیاتُ عند اللهِ وانما انا نذیر مبین"

الغرض باوجود ان جزئی اختلافات کے، جو سرسید کے اسکول کے بعض اشخاص بعض آیتوں کی تفسیر میں اُن کے ساتھ رکھتے ہیں، ظاہراً ان اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں جن پر اس تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً مستثنے مقامات کے سوا جن کو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کریں گے جو کچھ کہ سرسید نے زمانۂ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے، اس کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ کی اسلامی فتوحات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اُس کے نزول کی تحقیق، نبوت کی حقیقت، قرآن کے معجز ہونے کا بیان، جنت و دوزخ اور اُس کے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت سے نکالے جانے کی تحقیق، معجزہ کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، جبریل و میکائیل کی حقیقت، ناسخ و منسوخ کی بحث، سمت قبلہ کی تحقیق، حضرت عیسیٰ کے بن

باپ پیدا ہونے کی تحقیق، شہدا کو زندہ سمجھنے کی تحقیق، قطع ید سارق کے مسئلہ کی تحقیق، نفخ صور اور وزن اعمال کی تحقیق، روح اور اُس کے باقی رہنے کی بحث، آخرت اور قیامت کا بیان، خدا کے ساتھ موسیٰ کے کلام کرنے اور کوہِ طور پر تجلی ہونے کی بحث، دیدارِ الٰہی کی بحث، بدر و حنین کی لڑائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق، طوفانِ نوح کی بحث، حضرت یعقوب کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شقِ صدر کے مسئلہ کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاصکر توجہ کے لائق ہیں۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سر سید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ سربمہر اسرار ظاہر کیے ہیں جن کے اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے مگر اس باب میں انھوں نے جو عذر کیے ہیں وہ بھی لحاظ کے قابل ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد میں علامہ ابن رشد کی ایک لمبی تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسائل غامضہ جو جمہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں اُن کو ایسے لوگوں کے سامنے جو اُن کے اہل نہیں ہیں، بیان کرنے والا کافر ہے اور اُس کی وجہ اُنھوں نے یہ بیان کی ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اُس کا مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور تاویلی معنوں کے ثابت کرنے کا ہوتا ہے۔ پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنے باطل ہو گئے اور تاویلی معنے اُن کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاقہ رکھتی تو ظاہر ہے کہ کفر تک نوبت پہنچ جائے گی۔ پس عام لوگوں کو سمجھا دینا چاہیے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں، خدا ہی ان کی حقیقت خوب جانتا ہے۔ انتہیٰ ملخصاً

اس تقریر پر سر سید لکھتے ہیں کہ نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات بھی شریعت کی جو بیان حقیقت یا تاویلات کی قسم سے ہو، سوائے راسخین فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کی جاتے۔ جس قسم کے لوگوں کو ابن رشد نے راسخین فی العلم میں قرار دیا ہے اس زمانہ میں تو ایسا شخص کوئی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا، پس ضرور تا لازم

آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معما و چیستاں یا مثل راز زمین کے غیر معلوم رہنی چاہییں۔"

"اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اُس کے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو اُن کو سمجھنا چاہتے ہیں، یا اُن لوگوں کی تشفی نہ کر سکیں جن کے دل میں شبہات پیدا ہوتے ہیں بلکہ اُن سب کو اس پر مجبور کریں کہ اُن باتوں کو اسی طرح مان لو تو ہم اپنے مذہب کی صداقت فی نفسہا اور بمقابلہ دیگر مذاہب غیر حق کے کیونکر ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک عیسائی کہتا ہے کہ "تثلیث کا مسئلہ کہ تین تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں، ایک الہی مسئلہ ہے۔ اس پر بے سمجھے یقین کرنا چاہیے" پس اگر ہم مذہب اسلام کے بہت مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اُس کی تکذیب اور اس کی تصدیق کریں۔"

اس کے بعد اُن کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالم اور جاہل سب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر ایک بات کی دلیل طلب کرتے ہیں، عام اس سے کہ وہ جاہل ہوں یا عالم کسی بات کا بغیر دلیل یقین نہیں کرتے۔ اس دوسری قسم کے لوگوں سے (جو اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہیں) یہ کہنا کہ تم راسخین فی العلم میں سے نہیں ہو لہٰذا مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کر لو اور اسی پر یقین رکھو، کس طرح اُن کے دل کو تشفی دے سکتا ہے؟ کیونکہ یقین کوئی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ اضطراری شے ہے کہ جب تک وہ شبہ رفع نہ ہو جس نے یقین میں خلل ڈالا ہے، ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضرور ہے کہ ہر ایک امر قابل بیان کی حقیقت اور قابل تاویل کی تاویل اُن کے سامنے بیان کی جائے اور اس صورت میں جو لوگ اُن باتوں کے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، وہ اُسی دلیل سے کافر قرار پاتے ہیں جس دلیل سے کہ ابن رشد نے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کو کافر بتایا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "فرض کرو اُن متشککین کو اس قدر لیاقت نہیں ہے کہ وہ اُن حقیقتوں اور

تاویلوں کو سمجھیں مگر اتنی بات تو اُن پر ثابت ہوگی کہ اُس کے لیے دلیلیں اور اُس کی صداقت کے ثبوت کے لیے وجوہات ہیں اور اُس کی حقیقت کے لیے بیانات ہیں مگر ہم اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن کے سمجھانے کا جو فرض ہم پر تھا اُس کو تو بلاشبہ ہم ادا کر دیں گے بہت لوگوں نے پیغمبروں کی نصیحتوں کو نہیں سمجھا مگر پیغمبر اس خیال سے کہ وہ اُن کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں نصیحتوں کے سمجھانے سے باز نہیں رہے بلکہ طرح طرح سے سمجھایا اور کوشش کی کہ اُن کو اُن کے سمجھنے کے لائق کریں۔

"اس خوف سے کہ اُن لوگوں کے نزدیک جب ظاہر معنی باطل ہو جائیں گے اور اصل حقیقت یا تاویل کے سمجھنے کے لائق نہ ہونے کے سبب وہ اُس کو نہ سمجھیں گے تو اصول شرع سے منکر ہو جاویں گے اور کفر تک نوبت پہنچا دیں گے، ہم کو حقیقت اور صداقت کے بیان سے باز نہیں رہنا چاہیے۔ اگر یہ الزام صحیح ہو تو قرآن مجید بھی باینہمہ خوبی اس الزام سے بری نہیں رہ سکتا۔ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے "یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا"

ابن رشد نے اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان باتوں کا بیان کرنا خاصکر اُس حالت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہے جب کہ اصول شریعت میں تاویلات فاسدہ ہونے لگیں جیسا کہ ہمارے (یعنی ابن رشد کے) زمانہ میں لوگوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے۔ اس تقریر پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں کہ "تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں، اس لیے کہ جو چیز غلط ہے اُس کی غلطی بہت دیرپا نہیں ہو سکتی، دوسروں کو اُس کی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو تصحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان ہی ترک کی جاویں تو سچ بات کے ظاہر ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں آسکتا"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جب کہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں، علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ

ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے اور اُن کے دل شبہات و تشکیکات سے پاک تھے۔ اور یہی باعث ہوا کہ اُن علما نے ایسی رائے قائم کی تھی۔ مگر وہ زمانہ گیا، علوم و حکمت اب اس قدر عام ہو گئی کہ ایک بہت بڑا حصہ دنیا کا اُس سے واقف ہو گیا، طفلِ دبستاں اپنے مکتب میں ارسطو اور افلاطون کی غلطیوں کا جہاں جہاں اُنھوں نے کی ہیں، ذکر کرتا ہے۔ ہزاروں آدمی ہر شہر و قصبہ میں ایسے موجود ہیں جو خود کچھ نہیں جانتے مگر بہت سے مسائل علوم و حکمت کے سُن سُن کر کان آشنا ہو گئے ہیں اور اکثر الناس وہ ہیں جن کے دل شبہات و تشکیکات سے مملو ہیں۔ اس زمانہ میں جو اہلِ علم ہیں اُن کا ایمان بھی حلق کے نیچے تک نہیں ہے، منہ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و حدیث میں آیا ہے اُس پر یقین کرنا چاہیے مگر دل میں شبہات بھرے پڑے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یقین کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ ہونے سے ہوتا ہے۔ پس اب زمانہ ہے کہ جو کوئی بقدر اپنی طاقت کے اُن تمام حقائق اور تاویلات کو نہ کھولے اور لومۃ لائم سے نڈر ہو کر اگلے علما کی اُن غلطیوں[1] کو جو اُس زمانے کے ناکمل علوم اور ناکمل تحقیقات کے سبب حقائق کے بیان اور قرآن مجید کی تفسیر میں راہ پا گئی ہیں عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے، وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ومن یفعل ذلک فھو یؤدی حق اللہ وحق دینہ وحق اھل دینہ وقومہ واللہ المستعان۔

سوشل ریفارم | اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم آدمی اُٹھتے رہے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر کمر باندھی ہے جیسے راجہ رام موہن رائے، بابو کیشپ چندر سین، ایشر چندر ودیا ساگر، سرلش چندر بھٹا چارج رام تنو لاہیڑی، سوامی دیا نند سرستی وغیرہ وغیرہ، مگر مسلمانوں میں ظاہراً دو شخصوں کے سوا

---

[1] سرسید کے اس بیان میں کسی قدر تسامح ہے، ہمارے نزدیک یہ مطلب اُن کو اس طرح ادا کرنا چاہیے تھا کہ "نڈر ہو کر اُن باتوں کو جن کے بیان کرنے کا اب پہلے کبھی وقت نہیں آیا تھا اور اس سبب ہمارے قدیم مفسرین اُن کے بیان کرنے سے ساکت رہے تھے عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے"۔

کہ دونوں دلی کی خاک سے اُٹھے، کسی نے اس کا پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل اور دوسرے سید احمد خاں۔ گو کہ زمانے کے اقتضاء سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کو قوم کی سوشل خرابیاں محسوس ہونے لگی ہیں مگر اتنی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے برخلاف کسی بڑی رسم یا ریت کو ترک یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جا سکے۔ سر سید نے اپنی تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسموں کو بُرا جانتے ہیں مگر اُن کو چھوڑ نہیں سکتے اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر اُن کو اختیار نہیں کرتے۔ بعضے تو یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ مداخلت کرے تو قرار واقعی اصلاح ہو، مطلب یہ ہے کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو اور بعضے کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔۔۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اُس رسم کو توڑے یا اُس میں اصلاح اور ترقی کرے۔ بےشک تمام قوم اُس کو بُرا کہے گی اور نکو بنائے گی، مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ اوّل وہ ہدف تیر ملامت ہؤا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔"

بلا شبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سر سید میں یہی جوہر تھا جس نے اُن کو اس منصب جلیل کے لائق بنایا تھا۔ ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے حلّتِ طعام اہل کتاب کے باب میں سر سید کی ایک تحریر دیکھ کر یہ لکھا تھا کہ "کاش ہم سید صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوئے بھی دیکھیں"۔ سر سید نے فوراً اُس کے جواب میں لکھا کہ "نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور

پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن وطعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تامل کرتے
جو کام سرسید کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور جن کا کرنا نہ کرنا خود اُن کے اختیار میں
تھا ان میں رسم و رواج کی پابندی کو انھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور تیج تہوار
میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسید کے گھر میں کہیں اُن کا نام و نشان نہ تھا۔ انھوں
نے اُس بیٹے کا نکاح جو ہائی کورٹ کا جج تھا دلی میں جا کر ایسا چپ چپاتے کر دیا کہ چند
عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں بجائے اس کے
کہ ورہ ... ری یا دعوت وغیرہ میں زر خطیر خرچ کیا جاتا ایک مناسب رقم مدرسۃ العلوم کی نذر
کر کے تقریب کو ختم کر دیا۔ پوتے کی بسم اللہ میں علیگڑھ سے دلی جانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی
اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بلایا۔ جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا اسی
قومی مجمع میں بسم اللہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شیرینی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسہ
کی نذر کیا گیا۔

سرسید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اُس منافرت
اور نفرت کا دُور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی۔
حالانکہ دین اسلام اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، اُن کا کھانا اور ذبیحہ کھانے
اور اُن کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالک اسلامیہ میں اُن
کے ساتھ یہی برتاؤ دیکھا اور سُنا جاتا تھا باوجود اس کے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے
اُن کی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے، اُن کے ہاں کی پکی ہوئی چیز کو نجس جانتے تھے اور
اُن کے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہو جانے کے برابر خیال کرتے تھے جس کا سبب کچھ تو ہندوؤں
کی تقلید تھی جن سے صد ہا رسمیں اور عادتیں ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ
قومی تعصبات تھے جو ایک مدت تک مفتوح قوم کو عموماً فاتح قوم کے ساتھ رہتے ہیں
ہیں۔ مسلمانوں کی یہ نفرت اور کراہیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس باب میں جو کچھ شریعت

کا حکم ہے اُس کو علما عوام الناس کے سامنے صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی عالم ایسی جرأت کر بیٹھتا تھا تو اُس کی بات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور اُس کی طرف سے کھٹک جاتا تھا۔ ایک اور وجہ سے بھی علما مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آتے تھے، اُن کو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول، خاصکر اُس صورت میں کہ حکمراں قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو، ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکموں کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

الغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالطت سے اور ہر ایک بات میں اُن کے ساتھ تشبہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی۔ لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کھنچنے لگے اور دونوں قوموں کا جمع کرنا مثل اجتماع نقیضین کے محال ہوگیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی اصلاح

---

[1] معتبر ذریعہ سے سناگیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک شریف مسلمان مولوی نے جو میان دوآب کے کسی ضلع میں منصف یا صدر امین تھے ایک وزکسی یورپین حاکم کے بنگلہ پر اُس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھالیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہوگئی، مولوی صاحب کی برادری نے اُن کو ذات سے خارج کر دیا۔ انھوں نے ہر چند اہل برادری کے سامنے آیتیں اور حدیثیں پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہانتک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دہلی میں شاہ صاحب سے مسئلہ پوچھنے کو آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکلتے تھے اُن لوگوں نے پہلے انھیں سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ جنھوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا اُنھوں نے جھک مارا اس نے کوئی کام شرع کے خلاف نہیں کیا مگر کسی نے اُن کا کہنا نہیں مانا اور بڑے صاحب کے پاس پہنچے اُنھوں نے صورت حال سن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہے۔ جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سن کر خوش ہوگئے مگر اس کے طرفداروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کسی طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اس لیے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوا مگر احتیاطاً اُس کو پانچوں کلمے اور آمنت باللہ پڑھواؤ اور قدم شریف کا پانی پلواؤ اور پھر برادری میں شامل کرلو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز پر تقریر نہ کرتے تو غالباً اُن کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا اور ان کو بھی برادری میں شامل نہ کیا جاتا ۱۲

کے لیے جس طرح اُن میں مغربی تعلیم کا پھیلانا ضروری ہی۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُن کے اور حکمراں قوم کے سوشل تعلقات کو ترقی اور استحکام دینا ضرور ہے جب تک دونوں قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہ ہوگی اُس وقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور اعتبار پیدا نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کی طرف سے بھی بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تھیں سب سے بڑا عذر انگریزوں کو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جن کے ہاں عورتوں کے پردہ کا رواج ہی، کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سرسید اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوموں کے مردوں سے چھپاتے ہیں اُسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور دور کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں مگر اس سے باہمی دوستی اور یگانگت میں کچھ فرق نہیں آتا، پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری اور انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلقات میں فرق آئے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے جن میں سے ایک قوم میں عورتوں کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اُس کے لیے باعث عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں باعث شرم۔ لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسید نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی اگرچہ یہ کہنا مشکل ہی کہ سرسید کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک موانست پیدا کی ہی؟ اور اُن کی دیرینہ آرزو اس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے؟ اور اگر سرسید کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو اُنھوں نے ۱۸۸۴ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوتی" لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل معاشرت اور اُن کا سوشل برتاؤ جو غدر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ تھا اُس میں جس قدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہوا ہے اگر سرسید کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو

اُس کے لیے ایک صدی بھی مشکل سے کافی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہو کہ طریقِ معاشرت میں انگریزوں کی تقلید کرنا کہاں تک ہماری حالت کے مناسب ہی لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت کو قومی تعصبات کی بڑی اور ملکی رسم رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا ہے اور وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ جس بات کو اپنے حق میں قرینِ مصلحت جانیں اس کو اختیار کریں اور جس بات کو مضر سمجھیں اُس کو ترک کریں۔

اگرچہ سرسید نے مسلمانوں کی باہمی معاشرت کی اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ اُن کی سوشل حالت جو انگریزوں کے ساتھ تھی زیادہ تر اُسی کی اصلاح پر توجہ کی ہی لیکن درحقیقت انھوں نے مذہبی خیالات کی اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بو دیا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی سوشل خرابیاں تو ہندوستان میں رہنے اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہیں اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے جڑ پکڑا ہی اور ان تمام خرابیوں کی تعداد اس حد تک پہنچ گئی ہی کہ اُن کی اصلاح کے لیے ایک طول طویل زمانہ اور بہت سے مصلح درکار ہیں۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ جزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے اُنھوں نے جہاں تک کہ ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصلاحوں کی جڑ ہے کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے مذہبی خیالات و اوہام کی اصلاح کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اُن کا چھوٹنا قریب ناممکن کے سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح کا مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یوروپین اقوام کو حسنِ معاشرت میں تمام دنیا پر فائق کر دیا ہی سو اُس کی اشاعت میں جو کار نمایاں اُنھوں نے کیے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

تصنیف و تالیف | اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام اُن کو پیش آتا تھا اُس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے گویا وہی اُن کا خاص کام اور ضروری فرض تھا

کالج کی تعمیر، بجٹ کی تیاری، جلسوں کا اہتمام، مہمانوں کی مدارات، چندے وصول کرنے کی تدبیریں، غرضکہ ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق و شوق اور یکساں دلبستگی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر خود اُن کا یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا اور فی الواقع، جیسا کہ دیکھا گیا ہے، رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس شغل سے اُن کا جی نہیں اُکتا تھا۔ گرمی کی دوپہروں میں، جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے، یہ شخص ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف پایا جاتا تھا۔ بیماری کی حالت میں اُن کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جا کر سیدھی کی ہو۔ بارہا ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اچاٹ ہو گئی اور اُنھوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کر دی۔ جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگا کر، یا قصے کہانیاں سن کر یا ہائے وائے کر کر بسر کرتے ہیں، یہ شخص اس جانکاہ اور دماغ سوز فکر سے دل بہلاتا تھا۔

جس زمانہ میں سرسید نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد سعید خاں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ سرسید نے اس زمانے میں رات کو پلنگ پر سونا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ چونکہ اُس وقت تک میز کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر چاروں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور کتابوں کے بیچ میں اُن کی نشست رہتی تھی۔ کبھی کبھی بات چیت کے لیے مجھے بھی پکڑ بٹھاتے تھے، نہ خود سوتے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے، باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے اور اس غرض سے کہ نیند نہ آئے بار بار خود بھی چائے پیتے تھے اور مجھے بھی پلواتے تھے جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹا آدھ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اُٹھ کر لکھنے لگتے تھے، اسی طرح ساری رات گذر جاتی تھی۔

سرسید کے دماغ میں تصنیف و تالیف کے متعلق دو خاصیتیں عجیب و غریب تھیں ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں اُن کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن

کے دفتر کا بڑا کمرہ، جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے، صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ بار بار آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علما اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی، اُن کے لیے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لیے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا دیا ہو یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگدل ہوئے ہوں یا لوگوں کے اُٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا ملتوی کر دیا ہو۔ بے شک جب کوئی مہمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست سے مدت کے بعد ملاقات ہوتی تھی یا کسی اور خاص وجہ سے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا بند کر دیتے تھے مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہوں اور اس لیے اُنھوں نے مضمون لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی چہل کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے، مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی اُدھیڑ بن میں مستغرق ہے، کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اوروں کے لیے مجمع عام میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو انیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلاف رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سید احمد خاں کے سوا دوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دوسری خاصیت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی جب مصنف کسی ایسے مضمون پر قلم اٹھاتا ہے جس کو اُس سے پہلے کسی نے نہ لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے بالکل عاری ہو (جیسی کہ عموماً سر سید کی مذہبی تحریریں ہوتی ہیں) تو اُس کے ذہن میں خیالات کا ایک

بے ترتیب اور غیر منتظم نبار ہوتا ہے جس کا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اُس کے مناسب موقع پر رکھنا اُس مصنف کا فرض سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک ایسا دشوار کام ہے کہ مصنف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلنی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے سرسید جب کسی مضمون کو خود لکھنا یا کسی پیشدست سے لکھوانا شروع کرتے تھے (اگرچہ کیسا ہی مفصل اطولانی مضمون ہو) یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے تمام پوائنٹس سلسلہ وار اپنے اپنے محل اور موقع پر اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، صرف اُن کو الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے چنانچہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس ترتیب سے اُنھوں نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اُس کو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اُسی چال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اس مطلب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لیے ناظرین مندرجۂ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسید نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۸ صفحہ پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آیندہ اُس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہم کو معلوم ہوئی اُس کو سن کر اور پھر اس مضمون کی وسعت کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ مولوی سید وحیدالدین سلیم جنھوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سرسید کو مدد دی ہے اُن کا بیان ہے کہ جب تفسیر کی نوبت سورۂ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سید صاحب نے معراج کے مسئلہ پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا کہ جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتب حدیث میں معراج اور شق صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل و نقل کی تناقض کی صورت میں جو رائیں اور اقوال علما کے ہیں اُن سب کو آپ اس طرح پر کتابوں میں سے انتخاب کر کے نقل کر لیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کو لکھتے جائیں اور دوسرا صفحہ کورا چھوڑتے جائیں۔ میں نے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور بے شمار روایات و اقوال علما جو کہ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں موافق

ہدایت کے نقل کر کے سید صاحب کے سامنے پیش کیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب میں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لوں گا اُس وقت سید صاحب اُن کو دیکھ کر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ اُنھوں نے اس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے ذہن میں تھی بجائے خود اُسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب کہ مجھ کو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ مسودہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفید ہی چھوڑتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ میں ابھی اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُن کو لکھنا تھا وہ سب لکھ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سو صفحوں پر ختم کر دیا۔ جب میں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لے کر پہنچا تو اُنھوں نے وہ تمام کاغذات لے کر اُن کو قینچی سے کترنا اور اُن ٹکڑوں کو جابجا سفیدیوں پر لئی سے چپکانا شروع کیا یہانتک کہ تمام پرچے جن کا شمار بتانا مشکل ہے جہاں جہاں اُن کا موقع تھا چپکا دیے اور کاتب کو صاف کرنے کے لئے دیدیا۔ جب تمام مسودہ صاف ہو چکا اور میں نے اُس کو اول سے آخر تک پڑھا تو مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوال علما کو اپنے اپنے موقع پر چسپاں دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔" وہ کہتے ہیں کہ سرسید کو مسودہ لکھتے وقت ان روایات کے مضمون سے اس کے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب میں کتابوں میں روایتیں تلاش کر رہا تھا اُس وقت جس قسم کے اختلافات اُن میں پائے جاتے تھے اُن کا ذکر بالاجمال سرسید کے سامنے ہوتا رہتا تھا صرف اس قدر واقفیت پر اُنھوں نے تمام مضمون کا خاکا اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر ایک روایت کا موقع اور محل جہاں کہ ہونا چاہیے تھا قرار دے لیا تھا۔

گرچہ یہ دونوں خاصیتیں جو ہم نے سرسید کی مصنفانہ قابلیت کے متعلق بیان کیں، فی نفسہ عجیب ہیں مگر اُن سے سوا اُس شخص کے جو اُن کی طرز تصنیف کو بنظر غور دیکھتا رہا ہو دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ اب ہم ایک تیسری خاصیت کا ذکر کرتے ہیں جس کو ہر سمجھدار آدمی جو اُن کی تصنیفات کو دیکھے گا یقیناً تسلیم کریگا اور اس سے ہماری مراد **قوت استدلال** ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید کی بعض پولیٹیکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں اُنھوں نے ایک جماعت کثیر یا جمہور اہل اسلام

سے اختلاف کیا ہے۔ باوجود اس کے اُن کو اپنے دعوے کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کامیابی ہوئی ہے جیسی کہ ایک مسلم الثبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیے۔

اسبابِ بغاوت میں جو کچھ انھوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش مین کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لیے اُس کا مارشل لا کے دور دورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑتے سے کہ اُس کا بہت بڑا حصّہ منوایا گیا اور جو کام کہ اُس نے اعیانِ سلطنت کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اُس پر مترتب ہوئے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلّل اور موجّہ لکھا گیا تھا اور اُس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبّران سلطنت کے دل میں جا ہوا تھا اور جس کو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے اور بھی زیادہ پختہ کر دیا تھا۔ لیکن اس ریویو کے شائع ہونے سے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے اُس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔

جس وقت کہ سرسید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے برخلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سید مہدی علیخاں نے اُن سے کہا کہ تم اس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انھوں نے سرسید کا ابطالِ غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو اُن کو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لیے غلامی کا استیصال کر دیا ہے یہاں تک کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھ دیا ہے کہ جن مسائل میں ہم اور سید مہدی علی متفق ہیں انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ "اسلام میں رقیت نہیں ہے"۔

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دنیا میں انگشت نما تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی بے رحمی اور ناخدا ترسی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا، اُس کا مقابلہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، سرسید نے انجیل کے اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا

کال ہی اُس کے سامنے کرتے ہیں اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرت انسانی کے موافق اور قابلِ عملدرآمد جہاد کا حکم ہی جو قرآن میں آیا ہے نہ انجیل کا وہ اخلاقی حکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آجتک کبھی عمل ہوا ہے نہ آیندہ ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح سرسید کی تصنیفات میں بیشمار مقامات ایسے نکلیں گے جو بادی النظر میں ممتنع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب اُن دلائل پر نظر کی جاتی ہے جو سرسید نے اُن کے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی بشرطیکہ تعصب سے خالی ہوں، تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنفوں میں سرسید کا جو درجہ خاصکر مذہبی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے قرار پاسکتا ہی اُس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا، کیونکہ اس وقت کچھ لوگ اُن کے حد سے زیادہ معتقد ہیں جن کو اُن کی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی اور بہت بڑا گروہ اُن کے منکروں اور مخالفوں کا ہی جن کو اُن کی مذہبی تحریروں میں کفر و الحاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونوں گروہ موجود ہیں اُن کی تصانیف کے باب میں بغیر حیف و میل کے رائے دینے کی کسی سے امید نہیں ہوسکتی۔

اس کے سوا اول تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات جمی ہوئی ہی کہ اعلیٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لیے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اُردو زبان میں کیسے ہی محققانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کیے جائیں اُن کے نزدیک وہ اُردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرے سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہی اُن کی تصنیفات ہمیشہ علمائے دین کے حلقوں میں ایک مدت تک مردود و مطرود رہی ہیں۔ لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا اس لیے آخرکار لوگ اُن کے حسن و قبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اُنھوں نے صواب کو خطا سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے اور باوجود اُن کی غلطیاں ظاہر ہونے کے جن سے

کسی محقق کا کلام محفوظ نہیں رہ سکتا جس درجہ کے وہ مستحق تھے وہ درجہ اُن کو دیا گیا ہے۔

طرزِ تحریر | سرسید کی طرزِ تحریر پر کچھ ریمارک کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی وجزئی حیثیات پر بحث نہ کرسکے تو کم از کم اُس کی نمایاں اور مسلّم لیاقتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ پس سرسید کی طرزِ تحریر جس نے تیس بتیس برس کے عرصہ میں اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولیٹکل، سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کردیا، اُس کے بیان سے کیونکر خاموش رہا جاسکتا ہے اور مشکل اس لیے ہے کہ جس تحریر میں یہ تاثیر اور یہ کرشمہ تھا اُس کو ہم اُن متعارف خوبیوں سے جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں، بظاہر معرّا پاتے ہیں۔ پس اس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات و استعارات سے، صنائع لفظی ومعنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاضلانہ ونشیانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے اُس میں وہ کیا چیز تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں ایسے غیر مترقبہ نتائج پیدا کردیے لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی لکھنے کا مشکل کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس لیے چار و ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سیّد الاخبار[1] میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جس کو اُن کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے سنہ ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں اُس وقت جاری کیا تھا جبکہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور اُن میں سے بعض کتابیں (جیسے آثار الصنادید) بدرجۂ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرزِ تحریر میں اُس وقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اُردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کہا جاسکے۔

---

(۱) چونکہ سید احمد کا عرف اُس زمانہ میں سید تھا اور اُن کے بھائی کو اُن سے بہت محبت تھی اس لیے اخبار کا نام اُن کے عرف کے لحاظ سے سید الاخبار رکھا تھا۔

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے، وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی جبکہ تصنع اور تکلف انشا پردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا، برابر پائی جاتی ہے اور آثار الصنادید کا سب سے پہلا اڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے، ان کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تحریر کریں۔ مگر اس اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جس کا فرنچ میں ترجمہ ہو کر فرانس میں چھپا۔

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ "اذا اراد اللّٰہ شیئاً ھیّأ اسبابہٗ" چونکہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کر دی تھیں جو ایک ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں۔ انھیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گرامر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جو اول اول دلّی میں اپنے گرد شعرا کا جمگھٹا دیکھ کر ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا کچھ بہت دن نہ گزرے کہ وہ اُن تکلفاتِ لاطائل سے جو شاعری کے لیے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے سیرت فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ اُن کے نانا نے جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے، اُن کا سبق سُنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے "طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی" انھوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "طمع کے تین حرف تینوں خالی۔" نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر

یہ وہی معنی کہے گئے۔ چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی فصیح تھا اس لیے گریر کا مطلق خیال نہ آیا جو حال اُن کا اُس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رَو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ اُن غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے اُن کی زبان دلّی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی اُن کی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً اُنھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہلِ زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رُو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اُس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ اُن کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں کیا کتابیں کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، برابر لکھتے رہے۔ اس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک اندازِ پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ اُن کی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیونکہ نیچرل قویٰ سے جب اُن

کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو اُن سے اکثر فوق العادہ کرشمے ظہور میں آتے ہیں مگر ابھی وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لیے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے، اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر، مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بے شک کلام کے موثر ہونے کے لیے اُس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو، جب تک کہ متکلم کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح تلوار کا کاٹ درحقیقت اُس کی باڑ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرخت ہاتھ میں ہے اسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی اور اُس کے درد دل اور جذبے کی لاگ دبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر آن میں کچھ بھی اثر باقی رہے۔ سچے ناصح کے لعن و طعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے ہر طرف خواب میں بلکہ عدم و لاوالی میں پڑے ہوئے

رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طرزِ معاشرت میں، غرضکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں، ہرگز سُننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رُکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے گو کہ وہ قوم کے مذاق اور الفِ عادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں، اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سننے کے لیے کیا موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں، پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول کرتا ہے اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے اُن سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسنِ لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصود ہوتی ہے تو اُس کے بیان میں محاسنِ لفظی کی اُسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لیے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظرِ غور نہ دیکھا جائے، عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اُس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں، بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش

اور دلفریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بیساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے جس کے ثبوت کے لیے خود اُن کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ہوتا ہے جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرافی نہیں لکھی جاتی۔ جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلے، یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی۔ اسی لیے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد" مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہر مصنف پر اُس کی طبیعت کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اُٹھاتے جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکر کاٹے بغیر نہیں گذرتے، بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں اگرچہ نفس مضمون اُس سے ابا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اُس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سرسید کی تحریروں کو ہم اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ پاتے ہیں، اُن کی ہر قسم کی بیشمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹکل، کیا افشل اور کیا پرسنل علیگڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں، جلسوں

کی روئدادوں اور پرائیویٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لیے کونسا پیرایۂ بیان موزوں ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد وارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈالدیتی ہے جس پر اُس کو چلنا چاہیے۔ جس طرح پہاڑی رودرستے کے موڑ توڑ اور پیچ وخم کے ساتھ رخ بدلتی چلی جاتی ہے اسی طرح ہر مقام کے مقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیراکی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلہ میں ظرافت وخوش طبعی۔ نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں، غصہ مہربانی سے زیادہ پُرلطف ہے اور نفریں آفریں سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپوٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکرٹری کے ہاتھ میں۔ یہاں ہم ایک نہایت معمولی مثال کے ذریعہ سے ناظرین کو اس بات کا خیال دلانا چاہتے ہیں کہ اس شخص کے قلم میں ہر ایک مطلب کو اُس کے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی کس قدر قابلیت تھی۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹکل میں آدم کی سرگذشت ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے، وہاں اُس موقع پر جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سنّاٹے کے عالم میں حوّا کو اچانک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اُس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے اس بات کا تصور دلانے کے لیے لکھے ہیں کہ آدم کا اُس غیر مترقبہ خوشی اور اُس کے وجد وذوق میں کیا حال ہوا ہوگا؟ اور انسان کی اُس ابتدائی اور نیچرل حالت میں جبکہ زبان میں لفظ موجود نہ تھے، کس قسم کے بول خدا کے شکر میں اُس کی زبان سے نکلے ہونگے؟ اور کیسے سیدھے سادے لفظوں سے اُسنے خدا کو پکارا ہوگا؟

گویا آدم کہتا ہے کہ جب میں نے اپنے ہم جنس (یعنی حوا) کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا تو بہت خوش ہوا اور تالیاں بجا کر خوب اچھلا اور خوب کودا اور اوپر کود کود کر اور دیکھ دیکھ کر ایک بڑی ہستی کا خیال کر کے خوب گیت گائے اور نہایت ذوق و شوق میں یوں چلایا " او! او! ارے او! ارے او! ارے وہ جو ہے! ارے وہ جو ہے! ارے وہ جو رہے گا! ارے وہ جو رہے گا! ارے وہ جو تو ہی ہے! ارے وہ جو تو ہی ہے! میرا شکر لے، اُس انجان جانب کا رستے میرا شکر لیا، آ تم سب اُسی برکت کے پھل پھول ہو" اگرچہ بادی النظر میں یہ مثال بہت کم وقعت اور حقیر معلوم ہوگی مگر موقع کا تصور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اُس کے بیان کرنے کے لیے ان سے بہتر الفاظ ملنے کس قدر مشکل تھے۔

دوسرے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جانا کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا، اس لحاظ سے جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادر الوجود تھی۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات ایسے ہیں کہ سرسید کی تفسیر دیکھنے سے پہلے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات کے معنی اُس اصول کے موافق قرار دیے جا سکیں جس کے مطابق سرسید نے تمام قرآن کی تفسیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے، مگر تفسیر دیکھنے کے بعد مستثنےٰ مقامات کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جس کی تفسیر اُسی اصول کے موافق پوری نہ اتر گئی ہو۔ اگرچہ اس کی مثالیں قرآن کی تفسیر میں جا بجا موجود ہیں مگر ایک نہایت بڑی مثال آدم کے قصہ کا بیان ہے۔ اس قصہ کی نسبت جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اگرچہ علمائے سلف میں سے بھی بعض محققین نے یہی لکھا ہے کہ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور تمثیل کے کیا گیا ہے مگر علمائے سلف اس رمز کی طرف ایک مجمل اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں کسی نے قصہ کی تمام جزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈھال کر نہیں دکھایا۔ سرسید نے اول تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور پھر تفسیر میں بہ حیثیت ایک مفسر کے تمام قصہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت اور اُس کے قویٰ پر ایسی خوبی سے منطبق کیا ہے کہ ان

پہلے کسی یہ کام بن نہیں آیا۔ پس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو بذریعہ تحریر کے مشکل مشکل عقدوں کے سلجھانے پر کس قدر قدرت تھی۔

تیسرے واقعات وحالات کے حسن وقبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو برائیاں بسبب الف وعادت کے دلوں میں کھب گئی ہوں ان کی برائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں ان کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ کمال بھی جو سرسید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور اس کی مثالیں خاص کر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔

مثال ۱ | مثلاً وہ ایک آرٹیکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریق اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مسلمان دستر خوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربے کی پیالیاں سیتلا کے پوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس ایک دستر خوان پر کوئی فیرنی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی دست بھرا چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے، کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ سے لگا کر سڑ سڑ پیا بھر اور یہ کہہ کر کہ واللہ بڑی تیز ہے اوہ۔ اوہ کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں نکلی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور مین سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے۔ اور اور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش

فرماتے ہیں۔ "نہ اُن ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہو کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو اُن لوگوں کی کریہہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوتھو کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاشوں کی طرح اُس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا ہے۔ نعوذ باللہ منہا!! "

مثال ۲ | یا مثلاً ایک اَور محل میں بے تہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ "جب[1] کُتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا اجبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اُس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔"

"ناتہذیب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے، وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں، باچھیں چِر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ ناک بھوں اور ہاتھ عجیب

---

(۱) یہ مضمون اصل میں انگریزی سے لیا گیا ہے مگر سرسید کا اس میں بہت کچھ تصرف ہے جس کے سبب سے وہ بہ نسبت اصل کے بہت زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے ۱۲

عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اُس کی گردن اِس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی ۔"

"جس قدر تہذیب میں ترقی ہوئی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں عرش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔"

مثال ۳ | یا مثلاً ایک آرٹیکل میں، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں کوشش کرنا اُن کی دنیا اور دین دونوں کی خیر خواہی کا کام ہے، ایک موقع پر لکھتے ہیں "اب دوسری طرح پر غور کرو اور ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے، سب مفلس اور نان شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ انشاءاللہ تعالیٰ ان بدعقلیوں اور بدفہمیوں اور بدنصیبیوں کے سبب جو زمانۂ حال میں اُن کے خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں، عنقریب ہونے والا ہے) اور در بدر بھیک مانگتے پھریں اُن کی اولاد جاہل اور نالائق چور اور بدمعاش ہو، واعظین کو جو محض ریاکاری اور مکاری سے دُنیا کماتے پڑے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا لقمہ ترکھلانے والا نہ رہے جناب حضرت پیر جی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کر اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا نذرانہ اُن پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اُس کی تحصیل میں مصروف ہیں، اُن کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدرا و شمس بازغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، اُن کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے (جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے

اچھے مولوی نکمے ننگے کو مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا، تو اس وقت دین کا کیا حال ہوگا۔"

"مگر اس کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہیے کہ پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے، اُس کو بھرنا چاہیے، تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو پیٹ بھرنے کی کچھ تو فکر کرنی چاہیے ہوگی۔ سو اُس کا خیال بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھیتری ڈھو رہے ہیں، کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چُن رہے ہوں گے، کسی کا گھوڑا مل رہے ہوں گے اور جو ایسے پکّے دیندار نہیں ہیں اُن کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کریں گے؟ معلوم نہیں کہ اُن سے جیلخانے اور جزائرِ نوآباد بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ دینِ اسلام کی کیا شان ہوگی؟ اور اُس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ؟ ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب و تربیت و شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ ہمارا امرِ معاش میں(۱) منہمک ہونا اور اُس کی غریب دنیا اور امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا؟ یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سرتاسر معاد کا تھا؟"

"خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کو عین حکمت بنایا ہے، اُس کی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو، نہ مکّار اور دغاباز۔ اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اُس کی دوا کرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امورِ معاش و تمدن و معاشرت و رسم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور واعظ و مولوی اور پیرجی خدا و رسول کے دشمن اُن کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں، پس ایسی حالت میں کہ ہم بخوبی یقین کرتے ہیں کہ مسلمان یقینی اپنے مذہب پر پختہ ہیں، خدا کو

---

(۱) جب کالج قائم کرنے کی تدبیریں شروع ہوئیں اور تہذیب الاخلاق جاری ہوا اُس وقت ایک آرٹیکل علیگڑھ گزٹ میں کسی نے شائع کیا تھا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو قومیں امرِ معاش میں منہمک ہوگئی ہیں وہ دین سے بالکل غافل اور دست بردار ہوگئی ہیں۔ سید صاحب نے یہ آرٹیکل اُسی کے جواب میں لکھا تھا۔

ایک جانتے ہیں، رسول کو برحق سمجھتے ہیں، نماز روزہ حج زکوٰۃ فرض جانتے ہیں، ادنیٰ ادنیٰ آدمی ضروری نماز روزے کے مسئلے جانتا ہے یا ہر طرح پر اُس کے جاننے کا سامان یا موقع موجود ہے، آیا مذہب اسلام کے دستدار کا یہ کام ہے کہ اپنے تئیں پیر جی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانا اور دغا بازی سے دُنیا کمانے کے لیے اُنھیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے، بیٹھا ہوا وعظ کہا کرے؟ یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اُس کی تدبیر و کوشش کرے؟

"افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں، ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لیجاتا اور کہتا او خدا! اور اے جناب رسول خدا! تم مجھ میں اور ان میں محاکمہ کرو اور بتاؤ کہ کون تمہارا دوستدار ہے؟ میں گنہگار؟ یا یہ دیندار؟ اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہونا ہے لیکن بایں ہمہ اگر کوئی مباہلہ پر آمادہ ہو تو میں مباہلہ کو موجود ہوں۔"

مثال ۴ | یا مثلاً شرعی حیلے جو فقہ کے فتاووں میں گناہ سے بچانے یا گناہ پر دلیر کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں اُن کی مذمت پر سرسید نے ایک آرٹیکل ظریفانہ سوال و جواب کے پیرایہ میں تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے جس کا عنوان ہے "انشاء اللہ" ہم اُس آرٹیکل کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں:-

کافر کافر!

کیوں حضرت کافر کیوں؟

تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا "انا مومن انشاء اللہ"

کافر کافر! یوں کہو "انا مومن حقا"، اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے، ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں۔

قسم سے بچنے، وعدہ پورا نہ کرنے، بے گناہ دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔ کیا مسلمانوں کا برتاؤ اسی مسئلہ پر ہے؟

ہاں جو پرہیزگار مولوی، عالم، شرع پر چلنے

۱۔ گویا ایک مولوی یا فقیہ ایک جاہل آدمی سے مخاطب ہے اور اُس نے جو یہ لفظ کہا ہے کہ انا مومن انشاء اللہ اس پر اس کو کافر بتاتا ہے۔

والے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ
ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔
حضرت میں تو نہیں سمجھا۔
فقہ پڑھی ہو، اصول فقہ کو جانا ہو، عالموں کی
صحبت اٹھائی ہو تو جانو جاہل کندۂ ناتراش
نہ پڑھے نہ لکھے جانو تو کیا جانو؟
حضرت آپ ہی سمجھا دیجیے۔
ارے میاں! اِن کے معنی تو اگر، شاءَ کے معنی
چاہا، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی، مگر وہ
فاعل واقع ہوا ہے جس کے معنی نے کے تھے
ہیں اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوے "اگر چاہا اللہ
نے" اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو، اگر کوئی
امر کسی پر مشروط ہو اور بسبب نہ پورے ہونے
شرط کے ادا نہ کیا جائے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا
"اذا فات الشرط فات المشروط" ایک مسئلہ
ہوا؛ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال
عباد کا خدا ہے پس جب ان دونوں مسئلوں
کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ
کہنے کے بعد کچھ گناہ نہیں رہتا۔
حضرت! میں مسئلے تو خوبی سمجھ گیا، مگر اب تک
میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا؟

کیا وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے الٹ جاتا ہے؟
جاہل! اور کیا؟ ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے
ہمارے دوست کو اُس کی ضرورت ہے جب
اُس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں
کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اُس نے کہا قسم تو کھاؤ
ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی
نہیں۔ ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے
ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی ہم
نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں ہے اُس
نے کہا قسم تو کھاؤ، ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے
پاس کوئی اشرفی نہیں۔ کیوں! سچ بات
ہوئی کہ نہیں؟ بات ہی بات میں گناہ اُلٹ گیا
کہ نہیں؟ یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں، روپے
پیسے، سود بٹے کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی
کے الٹ پھیر سے گناہ الٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر
سونا سولہ روپیہ کی قیمت کا ہم سے قرض لو، سود
سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولہ چاندی لیں گے، سولہ
تولہ چاندی میں وہی تولہ بھر سونا آیا اور چار
تولہ چاندی سود میں بچ رہی اور سود نہ ہوا، کھوٹا
سونا جس میں ذرا سا تانبے کا میل ہو، قرض دو
اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو مال

تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا۔ مکان گرو رکھو، راہن سے کہلوا لو کہ سکونت میں نے محل کی کرایہ کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا۔ گاؤں گروی لے مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپیہ سالانہ کا فائدہ ہو، راہن سے اسی روپیہ سال دینے کے اقرار پر پٹا لکھوا لو اور گاؤں پر قبضہ کر لو، کل منافع تحصیل کرو، ایک سو بیس روپیہ سال سود کے۔ پٹے کے نام سے بچے کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا۔

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے؟

خدا کی قسم سب کرتے ہیں، جتنے مقدس، خدا پرست، وہابی، نیم وہابی، مقلد حنفی، زمیندار تعلقہ دار ہیں سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے دیدیے ہیں۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا کہ نہیں کہ؟ اجی ابھی ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ لادے اور ہم مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ آویں کہ ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے کہ نہیں؟ باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ لیں، باتیں ہی تو ہیں، ان باریکیوں کے سمجھنے کے لیے علم درکار ہے۔

بھلا حضرت یہ تو ہوا، انشا ماللہ والی بات رہ گئی اُس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہدیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے انشا ماللہ، ہمارا ارادہ آنے والے کا کچھ نہ تھا یوں ہی کہدیا تھا، جب نہ گئے تو معلوم ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا، اسی وعدے کو مشروط کیا تھا، اذا فات الشرط فات المشروط، بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو؟

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ تھا وہ کہدیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا میں کیا کرتا، وہاں ایک کالی مخمل کی گول جھنڈے دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پر بیٹھا تھا، اُس نے قسم دی کہ سچ کہنا میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا، سچ کہدیا۔

ہاں فقہ نجاننے سے عالموں کی صحبت نہ اٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے، ارے جب اُس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا انشاء اللہ اگر

وہ بیچ نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو بچارہ کہ
انشاء اللہ کہدیا ہوتا اور اگر وہ مولوی تھا اور
ٹھیٹ ٹھیٹ بدلائی آن پڑی تھی تو پکار کر
کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ
دل میں کہہ گیا ہوتا انشاء اللہ، مگر یہ خیال رکھا
ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ انشاء اللہ
کا جوڑ ٹوٹ جاتا، پھر چاہتے وہ کہدیتے، ذرا
بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔

حضرت! باتیں تو آپ نے خوب بتائیں مگر
میں حیرت میں ہو گیا، اب تو رخصت ہوتا
ہوں، اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا
دل دھکڑ پکڑ کر رہا ہے۔

تم جس مولوی سے چاہنا پوچھنا، یہی بتا دیگا۔
کہو میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، دُرِ مختار، بحر الرائق
نہر الفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے
ہر ایک جزئی کی روایت نکالدوں اور تم نے
وہ فتاوی بھی دیکھا ہے؟ جو پرانے خاندانی
مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے،
میں اس وقت اُس کا نام بھول گیا ہوں، یاد
آجاوے گا تو بتا دونگا، اس میں ہر ایک مسئلہ
کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں، ایک میں جائز

حلال یا اور دوسری میں ناجائز حرام لکھا ہے
پھر جس روایت کے مطابق چاہا فتویٰ دے دیا،
بہت ہوا روپیہ دو روپیہ، فتوے کے نام
سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے
کیوں؟ بات کی بات میں گناہ ملٹ گیا کہ نہیں!
مگر اس زمانے میں جو کمبخت مقلدین فلاسفہ
ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہب اسلام کی جڑ
کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا خلل پڑی ہے[1]!!

تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک پیر مرد متبرک صورت
سفید ریش ملے، جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں،
پکار کر کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے،
اُنھوں نے کہا کہ بھائی! کیا کوئی مذہبی مسئلہ ہے؟
بولے حضرت! ہاں مذہب کا مسئلہ ہے، اُنھوں
نے کہا کہ بھائی! نہ میں مولوی نہ مولوی کی دم
مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا
واسطہ؟ کسی مولوی صاحب سے جاکر پوچھو،
اسی شہر میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں

---

(۱) یہاں تک مولوی اور اُس کے جاہل مخاطب کی گفتگو تھی
اس کے بعد گویا آزمل لکھنے والا کہتا ہے کہ اس جاہل کا
مقابلہ راہ میں نیچریوں کے کسی سرگروہ سے ہو گیا پھر ان
دونوں کے سوال و جواب ہیں ۱۲

سے دس پندرہ کوس پر نامی قصبے ہیں، وہاں مولویوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں، وہاں جاکر پوچھو!

نہیں حضرت! میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ کا نام بھی تو مشہور ہے۔

ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور ہے، ایسی ویسی شہرت تو مجھکو ہوئی بھی نہیں، میں نیچری مشہور ہوں، مُلّا مولوی نہیں ہوں، مجھ سے مت پوچھو!

حضرت! اگر مولوی مُلّاؤں سے دل کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے؟ جب دل ہی کو تسکین نہ ہو تو مولوی مُلّاؤں کو کیا کریں؟ پھر آپ نیچری ہوں یا نیچری سے پرے تو دل مانتا نہیں خدا کے واسطے بتا ہی دو!

اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو، مگر میں کسی فتاوے وتاملے کو نہیں جانتا، خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے، جانتا ہوں، جو کہوں گا اسی سے کہوں گا۔

بہت اچھا آپ اُسی سے فرمایئے گا، میں پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جانتے ہیں؟

خوب جانتا ہوں، ہماری دلّی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی اُن کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں، پہلے مصرع میں شاید کچھ لفظ ادل بدل ہو گئے ہیں

"مولوی کہتے ہیں ہم کو تو نے کیوں رسوا کیا
کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر ہم نے کیا کیا
واسطہ باعث سبب موجب جہت کچھ بات بھی
راز وہ کمبخت کیا تھا میں نے جو افشا کیا
کیا کہا کس سے کہا کس نے سُنا کب کس گھڑی

(۱) خدا کے فتاوے سے مراد فطرت انسانی ہے جس میں حسن و قبح اشیا کا علم ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی طرف مخبرِ صادق نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ "اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ" اور جو لوگ اس فتاوے کے موافق عمل کرتے ہیں وہ مفتیوں کے فتووں سے مستغنی ہیں، چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا بہت مدت کے بعد مالک نے اس کو چھڑانا چاہا، ہر چند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مرہونہ کا مرتہن کو معاف و مباح کر دیا گیا تھا، اور فک رہن کے وقت مالک بخوشی کل زرِ رہن ادا کرنا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتویٰ دیدیا تھا مگر اُس مرحوم مغفور نے یہی حدیث پڑھی کہ استفت قلبک ولو افتاک المفتون اور جس قدر محاصل اس موضع سے وصول ہوا تھا سب زرِ رہن میں سے مجرا دے کر باقی روپیہ راہن سے لے لیا۔۱۲

کس جگہ کس وقت کس دم آپ کا پرچا کیا"

حضرت! میں آپ سے انشاء اللہ خاں شاعر کا حال نہیں پوچھتا، انشاء اللہ کے لفظ کی نسبت حکم شرع کا پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس مطلب سے اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے؟

یہ کہو، ذرا مجھکو خدائی فتاوے نیچر دیکھ لینے دو۔ اُس میں تو یہ لکھا ہے کہ تم کو کسی کام کی نسبت یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں کل کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر خدا چاہے تو میں کل کروں گا۔ خدا بسبب علت العلل ہونے کے ہر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس لیے انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق کرے، پس جس بات پر انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے تو انشاء اللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق ہوتی ہے اور وعدہ کو زیادہ استحکام ہوتا ہے، سننے والے کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس وعدہ کی تعلیق کی ہے تو ضرور اُس کو پورا کرے گا۔ اگر تم نے کسی سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا اور نہیں گئے، تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوا اور اگر اُس کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین گناہ ہوئے ایک وعدہ خلافی کا، دوسرا اس بات کا کہ جس سے وعدہ کیا تھا اُس کو وعدہ پورا کرنے کا زیادہ یقین دلایا اور وعدہ پورا نہ کیا تیسرا اس بات کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اُس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کہا ہو تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے، بلکہ دگنا گناہ ہوتا ہے، قسم توڑنے کا، خدا کے ساتھ تعلیق کر کر اُس کا ادب نہ کرنے کا۔ جب قسم کھائی کہ سچ کہوں گا اور ظاہر میں یا دل میں انشاء اللہ کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین گناہ ہوئے، جھوٹ بولنے کا، قسم توڑنے کا، خدا پر تعلیق کر کے اُس کا ادب نہ کرنے کا۔

جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے جب مصمم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اُس کے پورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اُس وقت اُس کے ساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تم نے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو انشاء اللہ دس روپئے دوں گا تو اس کے یہ معنی ہوئے ضرور بیشک تم کو دس روپئے دوں گا۔

حضرت! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ فعلی نہیں رہتا بلا حکم نصوصِ صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہو جاتا ہے، مگر اور جگہ کہتے ہیں کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے اور انشاء اللہ کو ایک سپر بناتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے حضرت! خدا مارے یا چھوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے اگر وہی اسلام ہے تو میرا اسلام اس سے نیچری ہی اچھے جو سچائی کو اسلام بتاتے ہیں۔"

اگرچہ یہ تمام آرٹکل ظرافت کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے مگر اس میں جس قدر مسائل فقہا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو فقہ کے فتاووں میں موجود نہ ہو۔ اسی قسم کے فتووں کی نسبت کہا گیا ہے کہ "استفت قلبك ولو افتاك المفتون" اور ایسے ہی حیلوں کی نسبت جب علی مرتضیٰؓ سے پوچھا گیا کہ مَا الْحِيلَةُ؟ تو آپ نے فرمایا تَرْكُ الْحِيلَةِ"

مثال ۹ یا مثلاً وہ امام غزالی کے ایک رسالہ کے ریویو میں اہل دنیا اور مشائخ و علما کی نسبت ایک[1] مقام پر لکھتے ہیں "اس مقام پر امام صاحب نے دو قسم کے دلوں کا حال لکھا ہے ایک اُن کا جو اسرار ملکوت اور کفر و ایمان کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہیں (یعنی اہل دین) اور دوسرے وہ جو ناقابل ہیں (یعنی اہل دنیا) اور دونوں کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ مگر یہ مقام کسی قدر زیادہ تشریح کے قابل ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس مقام پر امام صاحب نے جو دوسری قسم کے لوگوں کے حال سے بحث کی ہے (یعنی اہل دنیا کے حال سے) اُن میں وہ لوگ جو علانیہ اہل دنیا کہلاتے

---

(۱) یہ وہ مقام ہے کہ امام غزالی نے اپنے رسالہ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ" میں دو قسم کے لوگوں کا حال لکھا ہے ایک اہل دنیا جنہوں نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، سلاطین کو اپنا معبود، درہم و دینار کو اپنا قبلہ، حب جاہ کو اپنی شریعت اور اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دیا ہے اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی میں تمیز نہیں کر سکتے دوسرے اہل دین جن کا دل دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے، اس کا ریاضت سے جِلا ہے، خدا کی یاد سے منور ہے وغیرہ وغیرہ اور اس لیے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو بخوبی تمیز کرتے ہیں۔ سرسید نے امام صاحب کے برخلاف اہل دنیا کے ایک خاص گروہ کو مستثنیٰ کر کے دنیا داروں کی برات کی ہے اور پھر اہل دین کی خبر لی ہے۔"

ہیں داخل نہیں ہیں۔ اہل دنیا سے میری مراد اُن دنیا داروں سے نہیں ہے جن کو اہل دنیا بھی لاالخصام سمجھتے ہیں بلکہ اُن سے مراد ہے جنھوں نے دنیا کو بغیر کسی بے ایمانی اور دغابازی کے اختیار کیا ہے، دنیا میں بحیثیت دنیا داری اپنی عزت، اپنا نام، اپنی شہرت، اپنا آرام، اپنی حشمت چاہتے ہیں زہد و تقویٰ، علم و اتقا، صبر و قناعت کے ذریعہ سے دنیا و آخرت میں تفوق کی خواہش انھوں نے ظاہر نہیں کی، اُنھوں نے ایمان میں سے "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر دل سے یقین کیا ہے، وہ خدا کی ذات کو بے نقص اور رسول کو بے عیب سمجھتے ہیں، وہ کسی ایسی بات کو جس میں ان کی دانست میں خدا پر کوئی نقص آتا ہو اور رسول پر کوئی عیب لگتا ہو، نہیں مانتے۔ گو وہ کسی نے کہی ہو اور کسی نے لکھی ہو اور گو کہنے والے اور لکھنے والے کے نزدیک اُس سے کوئی نقص نہ آتا ہو اور عیب نہ لگتا ہو، اور گو بالفرض درحقیقت وہ بات کوئی نقص یا عیب کی نہ ہو مگر اس وجہ سے کہ وہ اُس کے ناقص اور معیوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں، گو کہ وہ غلطی پر ہوں، خدا اور رسول کی شان سے اس کو بعید سمجھتے ہیں اور اس لیے اُس پر یقین نہیں کرتے۔ غرض کہ اُن کو خدا کے تقدس اور رسول کی منزلت پر ایسا یقین ہے کہ کسی دوسرے کی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

اعمال میں سے فرائض کو حق سمجھنا اور جس طرح پر ہو سکے اُن کو ٹوٹا پھوٹا مسلسل یا گنڈے دار ادا کرنا اور اُس میں کوتاہی کو اپنی شامت اعمال سمجھنا، اور اُس پر تاسف کرنا، دل کو بدی اور بدنیتی، کینہ اور فساد و بغض و حسد سے پاک رکھنا، کسی کے ساتھ دغابازی نہ کرنا، کسی کا مال نہ مارنا، کسی کو ایذا و تکلیف نہ پہنچانی، ہر ایک کے ساتھ محبت سچی دوستی سے پیش آنا، سب کی بھلائی چاہنا، سب کے ساتھ ایمان داری سے معاملہ کرنا اور رکھنا اختیار کیا ہے۔

دنیا تو گویا اُن کا مقصد ہی ہے ان باتوں کے سوا اُنھوں نے دنیا ہی دنیا کو پکڑا ہے، روپیہ کے ایمانداری سے پیدا کرنے میں، اپنی محنت و مشقت سے روٹی کمانے میں بے انتہا کوشش کرتے ہیں، روپیہ کماتے ہیں، عمدہ عمدہ مکانات بناتے ہیں، دنیا میں عزت و

ترقی وحشمت حاصل کرتے ہیں، باغ بناتے ہیں اور اُس کے پھولوں اور بیلوں کی سیر سے خوش ہوتے ہیں، میوے کھاتے ہیں، گھوڑوں پر چڑھتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنتے ہیں اور اچھے سے اچھے کھانے کھاتے ہیں، قالینوں کے فرش کو جوتیوں کے تلے بچھاتے ہیں، تمام عیش وآرام جو کہ انسان عمدہ اخلاق اور شائستگی کے ساتھ کر سکتا ہے، کرتے ہیں، خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو جس لیے اُس نے پیدا کیا ہے، برتتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے ہم کو دیا ہے ہم کیوں نہ برتیں اور کیوں مصیبت بھگتیں، اگر خدا کو ان سے ہماری آسائش وآرام مقصود نہ تھا تو اُن کو پیدا ہی کیوں کیا تھا ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کو برتیں اور عیش اڑادیں، مگر زیادتی نہ کریں کیونکہ جس طرح کے استعمال کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اگر اُس طرح پر استعمال نہ کریں تو نمک حرام اور چور رہوں گے نہ شریف دنیا دار۔ وہ نہ دعویٰ دینداری کرتے ہیں، نہ کسی کے پیشوا بننا چاہتے ہیں، نہ اپنے تئیں تابع سنت کہلوانا پسند کرتے ہیں نہ پیر ومرشد، نہ ممبر پر واعظ بننا چاہتے ہیں، نہ استغنا کے مفتی۔ سیدھی طرح سے خدا کے بندے رسول کی امت ہیں، خدا کے دیئے ہوئے عیش وآرام میں مست رہتے ہیں پس ایسے لوگ تو امام صاحب کی بحث سے خارج ہیں۔

ہاں جو کچھ اس مقام میں امام صاحب نے لکھا ہے، وہ اُن لوگوں کی نسبت لکھا ہے جو جبہ وعمامہ دار ہیں، دنیا چھوڑ دین کی راہ چلتے ہیں، دن رات قال اللہ وقال الرسول میں بسر کرتے ہیں، دین ہی دین پکارتے ہیں، دین ہی کا اوڑھنا دین ہی کا بچھونا بناتے ہیں، دنیا دار دنیا جس قدر مختصر اچھی دین کے اختیار کیے تھے اُن دینداروں نے اُسی قدر مختصر باتیں دنیا کی اختیار کی ہیں اور جس قدر وہ دنیا کے حاصل کرنے میں مشغول تھے، اسی قدر یہ دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں، گو پہلے فرقہ کے بالکل برعکس ہیں اسی مقدس فرقہ کا (خدا ان سے پناہ میں رکھے) امام غزالی صاحب نے ذکر کیا ہے۔ بیشک جب یہ فرقہ کریلا اور نیم چڑھا ہو جاوے یعنی ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور درہم ودنانیر کو اپنا قبلہ اور حُبِ جاہ کو اپنی شریعت اور

اہل دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دے تو وہ کبھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز نہیں کرسکتا **فاقال الغزالی فہو حق لاریب فیہ**۔

مگر وہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خوفناک ہے جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ "اُن کا دل(۱) دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے کامل ریاضت سے مجلّیٰ ہے، خدا کی یاد سے منور ہے، ذکر کی شیرینی سے شیریں ہے، شریعت کی پابندی سے مزیّن ہے، مشکوٰۃ نبوت سے روشنی لیتا ہے، جلا دار آئینہ کی مانند ہے، اُن کا نور ایمان شیشہ کی ہانڈی میں بے آگ کے سلگتا ہے، نور کے چمکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں" ہاں یہ سچ ہے کہ اس فرقہ نے ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور درہم و دنانیر کو اپنا قبلہ نہیں بنایا، مگر خود ہوائے نفس نے اُن کو اپنا خدا اور خود سلاطین نے اپنا معبود اور درہم و دنانیر نے ان کو اپنا قبلہ بنایا ہے، پھر اُن کو بنانے کی کیا حاجت تھی۔

جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُن کے معتقدین کا حلقہ ہوتا ہے اور حجر اسود کی مانند اُن کے دست مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو اُن کا دست مبارک یمین الرحمٰن سے بھی بالا دست ہوجاتا ہے۔ مولوی صاحب حضرت صاحب کی آواز کا چاروں طرف سے اُن کے کان میں آنا جاہ و شانِ کسریٰ و کیقباد کی آواز سے بھی قوی اثر اُن کے دل پر ڈالتا ہے۔ مسکینی اور انکسار اُن کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے، اس لیے وہ اور زیادہ مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دُنیا سے نفرت اُن کو دُنیا دلاتی ہے، اس لیے وہ دُنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی حاجت سے زیادہ بغیر محنت کے درہم و دنانیر دلادیتی ہے، اس لیے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں اُن کی ہر ایک بات پر لوگ آمنا و صدقنا کہتے ہیں، اس لیے اُن کے دل میں دوسرے کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو چھوانے چھوانے

(۱) یہ اقوال امام صاحب کے رسالہ سے لیے گئے ہیں، جو اس جملہ پر ختم ہوتے ہیں کہ "نور کے چمکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں" ۱۲

ہر ایک مسئل کی حل کو دعائیں منگواتے منگواتے ، ہر ایک مسئلہ کا فتویٰ دیتے دیتے ، ایک اور بیاری اُن میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب بُرائی بھلائی ، دوزخ و بہشت ، کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں ۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد ، کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت ، کبھی خازنِ جنت ہیں اور کبھی مالکِ جہنم ۔ خدا کے نور کے دل میں بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول پھلا کر کپّا ہو جاتا ہے ۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سنیں ، نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں ، نہ منہ رہتا ہے جو حق بات کہیں ۔ جو سرور اور دلی آسایش اور دل کے پھولنے سے جو مزا اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہوتا ہے نہ کسی دولتمند کو اور نہ کسی صاحب تخت و سلطنت کو ۔ بس اس فرقے بھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز کرنے کی توقع نہیں ہے ، الا ماشاء اللہ ۔ کوئی آفت انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے جبکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نیک ہوں ۔ کوئی گمراہی انسان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ہے جب وہ جانتا ہے کہ میں پابند شریعت ہوں ۔ وہ زبان سے اپنے تئیں گنہگار کہتا ہے مگر اس کا دل اس کو جھٹلاتا رہتا ہے ۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی اور تعلّی سمجھتا ہے اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے مگر اس کا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے ۔ ازار کے دو انگل نیچے ہونے ، ڈاڑھی کے لمبی یا ایک مشت و دو انگشت ہونے ، کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے ، پانی کے پاک ناپاک ہونے پر دن رات بحث کرتا ہے ۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے ، مگر دل کو نجاستوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا ۔ اکل حلال اور صدق مقال پر لمبے لمبے وعظ کہتا ہے مگر جب کوئی لقمۂ تر آ جاوے تو جھٹ نگل جاتا ہے ۔ اور اگر کبھی اُگل دیتا ہے تو اس اُمید پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمۂ تر بہتر آوے گا ۔ یہی باتیں تھیں جن کے سبب حضرت عیسٰی نے فریسیوں اور صدوقیوں کو یعنی شریعت پر چلنے والے یہودیوں کو ملامت کی ۔ یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ "یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون" عمدہ زندگی وہی ہے جو سیدھی سادی ایک دنیا دار کیسی ہو ۔ پھر خواہ وہ دوزخ میں جائے ، یا بہشت میں ۔ قال رسول اللہ صلعم "ما ادری ما یفعل بی

ڈکلاپسکوز“

اگرچہ سرسید نے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اُردو زبان اور اُردو لٹریچر کو طرح طرح سے مدد پہنچائی ہے مگر جو بے بہا مدد خاص کر اُن کے لٹریری ورکس سے اردو لٹریچر کو پہنچی ہے اُس کے لحاظ سے اُن کو فادر اوف اردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لائق لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اُردو زبان کو سرمایہ دار کر رہے ہیں۔ لیکن ہر شخص کی طرز تحریر میں گو کہ وہ فی نفسہ کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہو، یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے۔ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ اُن کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے، اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُن کی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی اور اس لیے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام لٹریچر پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوتا، سرسید کی طرز تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے اور اُس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگرچہ بیان کی قدرت اور اُس کا زور اور تاثیر جو اس شخص کی خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اُسی کے دل و دماغ کا حصہ تھا، دوسرے کی تحریر میں اُس کا ڈھونڈنا لاحاصل ہے مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے، اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے، اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے اور اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے اُن کا مقابلہ اُن اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اُس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے اُن کا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے

جو اس کے بعد شایع ہوئے، اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اُردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاصکر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے کیونکہ اُن کے مضامین جلد جلد شایع ہوتے تھے اور مہینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گذرتے تھے اور یہ سلسلہ تیس برس تک برابر جاری رہا۔

بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں میں سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لکھنے والے تھے خصوصاً سید مہدی علیخاں قدیم تہذیب الاخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جو لٹریری فوائد ان پرچوں سے مترتب ہوئے اُن کو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور انھیں کے اشائل کی پیروی کرنے والے تھے اس لیے اگر اُن تمام فوائد کو صرف سرسید کی تحریرں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتایج کے ذکر میں مفصل بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُن کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے اگرچہ فارسی زبان میں، جیساکہ وہ خود بیان کرتے تھے، اُنھوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجہ کی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں اُن کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا اُن میں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ مولانا صہبائی سے اُن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر اُن کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں کے ہاں بھی اُن کا ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا جہاں صہبائی اور شیفتہ اور مومن وغیرہم کا مجمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے اور مرزا اُن پر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اُن کے نہایت گاڑھے دوست تھے اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے اس لیے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر اُن کی توجہ مائل ہو۔

مگر باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدل یا ابوالفضل یا جلالائے طباطبا یا اور مشہور نازک خیال نثاروں کی پیروی کرنے والے تھے لیکن ظاہرا سرسید نے فارسی نثر میں بھی مثل اُردو کی سادگی سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ اگرچہ اُن کی ابتدائی تحریریں، ایک رسالہ کے سوا جو مسئلہ تصورِ شیخ کے بیان میں ہے، دستیاب نہیں ہوئیں مگر غدر کے بعد کی جو بعض تحریریں ملی ہیں اُن میں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی ان کی اُردو تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ ازانجملہ ایک وہ فارسی لکچر ہے جو انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے وقت کلکتہ کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھا تھا اور جو اُن کے لکچروں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اس کے سوا اُن کا ایک اور فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں ہم کو ملا ہے جو اُن کو حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا اور جو سرسید نے ۱۲ اگست ۱۸۸۱ء کو حاجی سید محی الدین خاں رضوی کے نام اُن کے خط کے جواب اور پندرہ سو روپیہ چندہ کے شکریہ میں لکھا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں نہیں چھپا ہے اس لیے اُس کے تلف ہو جانے کے خیال سے ہم اُس کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں

"مخدوما و ملاذا! نامہ یافتم و متحیر گشتم۔ خواندم و برخواندم۔ بلند پایگیٔ نویسندہ اش دلخود آں تالہ نشان میداد۔ تحیرؔ و آں بود کہ مخاطبِ آں کیست؛ بغلط خود را دانستم و باز گشتم کہ آنچہ دراں نامہ رقوم است سزاوارِ ہیچو منے دامن آلودۂ، کمترین مخلوقے، ہیچ میرزے، گم کردہ راہے نمیتواند شد بجز آں کہ اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدۂ شما شخصِ خیالی خود را یا خود اوصاف خود را مخاطب ساختہ باشد۔ سخنے دیگر قرار دادن نمی توانم۔ و اگر ازیں فروتر آیم و خود را مخاطبِ آں دانم حاشا کہ بدونِ اختیار مذہب وحدت وجود ایں چنیں توانم دانست، تا کہ من کہ حجاب خودم از میان برخیزم و تفاوت منؔ و توؔ و منؔ از میان برافتد و ہمہ آنچہ نوشتہ اید خود شما مصداق آں باشید و بلّہٖ درّ من قال

تو خود حجابِ خودی احمد از میاں برخیز"

"راست فرمودہ اند کہ "رضویت ذریعۂ یک گوہری ست نہ وسیلۂ یکجہتی"، مگر الحمد للہ کہ ما و شما یک گوہری و یکجہتی ہر دو محقق است، گر ایں نسبت ہائے من باشما باعث ننگ و عار شماست

و مارا بسبب عزت - خدا داند کہ محبت پیشہ ام و بجز محبت در کشت سینہ ام نہ کشتہ اند - الطاف و
عنایتِ شمارا شکرگزارم و بایں مجبہ جاں نثار مبلغ یکہزار پانصد روپیہ سکۂ انگریزی کہ بہمت تعمیر
بورڈنگ ہوس مرحمت فرمودہ اند رسید - قوم را عزت افزود، و دلم را تقویت داد و ساعی ما را
قوت بخشید - بیان آں ازیں قوم ناسپاس دشوار، مگر اجر کم علی اللہ صلۂ آں کافی ست - من شکریۂ
آں عطیہ بجا می آرم، و روزے می آید، و آں دور نیست، کہ تمام قوم و اخلاف شاں نسلاً بعد نسل
بہ شکرگزاری ہمچو شما بزرگاں کہ در صلاح و فلاح قوم از قدم و قلم و درم دریغ نہ فرمودہ اند،
رطب اللسان و عذب البیان خواہد بود۔"

"آنچہ بر حالِ زارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ، مخدوما احسانِ شما، مگر ہیچ جائے
دل سوختن و حسرت نمودن نیست

حسن شہرتِ عشق رسوائی تقاضا میکند جرمِ معشوق و گناہِ عاشقِ بیچارہ نیست

اگر قوم ما را چشم بصیرت بودے و مآلِ کار خود فہمیدے ما و شمارا ایں کوشش و کشاکش ضرور نہ بودے
ہرگاہ حال این ست پس ازاں قوم بجز بدگوئی و افترا پردازی و نافہمی و از ما بجز صبر و تسلیم و رضا دیگر
چہ توقع بود ... ... انصاف را از دست نمیدہم و با کسی بدظنی روا نمیدارم، دوستان و دشمنان ہے
من بد نیستند، حق بجانب شاں ہم ست، چہ آنہا سخنے می شنوند و راہے می بینند کہ گاہے از
خودشاں نشنیدہ و ندیدہ بودند - دیرینہ غلطی ہائے ما رفتہ رفتہ استحکامِ آیاتِ قرآنی بہم رسانیدہ
بلکہ ازاں ہم مستحکم تر گشتہ - پس کسے کہ ایں اغلاط را وانماید چگونہ از غیظ و غضب شاں مصئون و از سب و
شتم شاں مامون تواند شد - آنہا از معارضات مخالفانِ ملل دیگر کہ بر ایں غلط ہائے دیرینہ ما وارد
ساختہ آں را بہ اسلام نسبت میدہند، واقف نیستند، و از آں مشکلات کہ باعتبار علوم جدیدہ و
تحقیقات حدیثہ بر اصول مقررۂ اسلاف ما از فقہا و محدثین و مفسرین واقع میشوند بر اصل اسلام
اطلاع ندارند - بگوش شاں و بگوش اسلاف شاں بمقابل سخن ہائے خود شاں بجز کلمۂ آمنا و صدقنا
صدائے دیگر نہ رسیدہ - یک گونہ خلفشارے در عہد خلفائے عباسیہ بسبب تراجم فلسفۂ یونان بہم رسیدہ

بود، علمائے اسلام بموافقتِ آں برخاستند، تعجب ایں کہ ہم خود معترض بودند وہم خود مجیب، مخالفے بمقابل نہ داشتند، خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یافتند۔ قبول می کنم کہ فتح یافتند مگر حالا نہ آں مدعیان اند و نہ آں دعوی، نہ آں جام ست نہ آں ساقی، نہ آں بادہ ست نہ آں مینا خود آں فلسفہ از پا در افتادہ است و آں جام و مینا شکستہ، بنائے نو بر اساس نو پیا شدہ پس کسے کہ دعوے اسلام دارد و اسلام را حق میداند و غلط را در آں امکان نمی پندارد، چگونہ آں غلط را باور کند و اسلام و اسلامیان را رسوا سازد۔ پس ایں در انکارِ آں و آنہا در تکفیرِ ایں معذور اند، و ایں امر یست کہ فطرتِ انسانی انسان را برآں مجبورے سازد۔ بہ ایں رہبر (یعنی دلیل) ما را واجب و لازم ست کہ ہمہ مکفران و لاعنین خود را معذور دارم، و از سب و شتم شاں رنجیدہ نشیم و صدق و صفا را پیشۂ خود دارم و ہمہ را معاف کنیم از مواخذۂ حقیقی و دا وری دا ور بے ہمتا ہم ایمن باشند۔ اما مخالفت و انفرا نسبت بہ مدرسۃ العلوم کہ کارِ صلاح و فلاحِ قومی ست عفوِ آں بہ اختیار من نیست کہ حقوق عباد بر گردنِ شاں ست۔ او شاں دانند و خدائے شاں۔ قل کفیٰ باللہ بینی و بینکم شہیدا العلیم مافی السموات والارض والذین آمنوا بالباطل و کفروا باللہ اولئک ہم الخاسرون۔
والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ"

العبد المفتقر الی اللہ الصمد

سید احمد

کبھی کبھی وہ اُردو تحریروں میں بھی ایک آدھ فقرہ فارسی کا کہہ دیتے تھے جو لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سید مہدی علیخاں نے اُن کو ولایت سے خط بھیجا ہے جس میں کسی موقع پر سرسید کی طرف خطاب کر کے یہ مصرع لکھا ہے "آئی کہ بدیدارت خلقیست تماشائی" اُس کے جواب میں سرسید جبکہ ہندوستان میں اُن پر لعن و طعن کی بھرمار ہو رہی تھی، اُن کو لکھتے ہیں "در مصرع اول کہ خطاب بمن فرمودہ اند اگر بجائے لفظ دیدارت احوالت بودے نہایت مناسب حالِ من بودے" آئی کہ باحوالت خلقیست تماشائی" اگر غم است ہمیں قدر ست کہ نمی دانم خدائے من تماشائے کدام احوالِ من میکند

انہٗ ہو الغفور الرحیم

گناہ من ار نامدے در شمار　　ترا نام کے بودے آمرزگار

اے خدائے من! اے رحیم و غفور من! اے محبوب و مطلوب من! خلق را بگذار ہر چہ خواہند با من کند تو مرا نیک تماشا کن۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من　　بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

آہ چہ گفتم و کجا رفتم خدائے من از من جدا نیست، مرا گذاشتن نمی تواند، پس چرا پریشاں شوم، چرا اندیشہا کنم، حمد و ثنای او سرایم کہ عین حمد و ثنای خود است، منصور انا الحق گفت پایۂ بلند داشت، من صرف الحق گویم او خدا از من بشنو و مستجاب کن۔"

فارسی میں بھی سرسید کی قلم اسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اُردو میں وہ اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف نہ کہا جائے لیکن اصل مطلب بہت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے تھے مثلاً جس طرح اردو میں اے حرف ندا کی جگہ او کا لفظ خاص خدا کے لیے استعمال کرتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے۔ اُردو میں تو اتنی گنجائش بھی تھی کہ نہایت بے تکلف اور لنگوٹیے یار کو او کہ کر پکار سکتے ہیں مگر فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اے کی جگہ استعمال نہیں کرتے۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ اُن کی فارسی تحریروں میں محاورہ کے خلاف نظر آتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جس طرح اُردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اُسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

پبلک اسپیکنگ | پبلک اسپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لکچر دینا) یہ بھی منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُن کے معاصرین میں مابہ الامتیاز تھے۔ مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں، قوت نظری قوت عملی کے ساتھ، ذہن حافظے کے ساتھ اور تحریر تقریر کے ساتھ۔ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے، اسی طرح ذہین آدمی قوی الحفظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جن کی قلم میں زور ہوتا ہے اُن میں قوت گویائی نہیں ہوتی، مگر

یہ عجیب و غریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی کام کرنے والا تھا، اور جیسا ذہن والا تھا ویسا ہی حافظے والا تھا اور جیسا لکھنے والا تھا ویسا ہی بولنے والا تھا۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ اُن کی قوت تقریر تھی۔ اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ تحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف معدود آدمی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ بخلاف تقریر کے کہ اُس کا اثر آن واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے، تحریر ہر شخص پر جو اُس کو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اس لیے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعۃً واحدۃً پڑتا ہے اور اس لیے تمام حاضرین ایک ہی طرح کی حالت سے متاثر ہوتے ہیں، تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور تقریر میں اُن کے ساتھ سپیکر کا لب و لہجہ، اُس کی طرز ادا، اُس کی آواز کا سوز و گداز اور اُس کے اعضا و جوارح کی حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گذر چکے تھے۔ اُس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔ بلاشبہ جس گرمجوشی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور اُن کے ہمراہیوں کا استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور امنگ اور فیاضی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اُن معزز مہمانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرونجات کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد سن کر لاہور میں آئے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب الاخلاق نے سرسید اور اُن کے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہل پنجاب کے دل پر بٹھا دیا ہے۔ مگر ۲۹ر دسمبر کو جو لکچر کہ سید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوانخانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا اُس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم تھا، کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی لب سالمے

زیادہ چندہ[1] دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تیس برس میں اہل پنجاب پر کیا تھا اُس لکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دو چند کر دیا خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی انھوں نے کہا:۔

"اے بزرگان پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اُس کو اپنا خادم اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں؟ آپ کے سب سے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں جو بڑے چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اُس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھکو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور اُن کی اولاد کو نسلاً بعد نسل ڈبونا اور خراب وخستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اُس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو"۔

یہی الفاظ جو اس وقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اُس موقع پر جب سرسید کے منہ سے نکلے تھے ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

سرسید کے اخیر زمانے میں کسی لائق یورپین نے اُن کے لکچروں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

---

(۱) ایک صاحب جو غالباً نارمل اسکول لاہور میں ہیڈ ماسٹر تھے اور سو ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے تھے اُنھوں نے پانسو روپیہ چندہ کی فہرست میں لکھا تھا۔

"اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ ایجاد ہی ہے جس کا انجام اچھا ہو، تو جو کامیابی سرسید کو بذریعہ اپنی لاثانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اُس سے اُن کی نیکدلی اور اسلامی محبت کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اُن کے لکچروں نے عجیب و غریب اثر کیا ہے اور اُس فصاحت کے بحرِ ذخار نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو قوم کی اس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جب کہ سید کی فصاحت وبلاغت نے ان لکچروں کی صورت میں اپنا مشن شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی سید) ایک پیدائشی اورٹر ہیں جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو اُن کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اُس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں اُن کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں اُن کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

قومی اور ملکی مجمعوں میں سپیچ یا لکچر دینے کا طریقہ قدیم یونان، روما اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانۂ حال میں فرانس، انگلینڈ اور امریکا میں نہایت ترقی پر ہے، لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے کہیں اُس کا سراغ نہیں پایا جاتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائیں ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوتی، کسی ملک میں عمدہ اورٹر یا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جن میں سے بعض بنگالی لیڈروں نے پبلک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن جہاں تک سنا گیا ہے اُن لوگوں کی تمام اورٹری اور فصاحت انگریزی زبان پر منحصر ہے۔ گویا جو سڑک برک، پٹ اور فاکس وغیرہم تیار کر گئے ہیں آنکھیں بند کر کے اُسی سڑک پر پڑ لیے ہیں، اپنی زبان میں کوئی داغ بیل نہیں ڈالی۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ نہ وہ انگریزی جانتا تھا جس میں بڑے بڑے اورٹروں اور فصیحوں کے لکچروں اور اسپیچوں کے نمونے موجود تھے اور نہ

اُن اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں کچھ مدد ملتی جس طرح اُس کے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح سپیکنگ کی لیاقت بھی محض خداداد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی اسپیچ یا لکچر کے لکھنے یا پہلے سے اُس کے تیار ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا۔ ہم پہلے حصہ میں جہاں انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے، لکھ چکے ہیں کہ سمٹونین سوسائٹی اوف سول انجنیئرس کے سالانہ جلسہ میں جہاں انگلستان کے متعدد ڈیوک اور لارڈ اور بڑے بڑے نامور انجنیئر موجود تھے اور جس کا موضوع انجنیئرنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہاں جب انجنیئروں کی تقریریں ہو چکیں تو سرسید نے ایک ایسے فن کے متعلق جس سے وہ محض نا آشنا تھے، ایسی برجستہ تقریر کی کہ تمام اہل جلسہ اس کی داد دیتے دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال اُن کو اُس وقت پیدا ہوا جب جلسہ کے اختتام پر پریسیڈنٹ نے اُن کے آنے کا شکریہ اور خوشی ظاہر کی اور اُس کا جواب دینا ضرور ہوا۔

جو لکچر کہ سرسید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑی شہادت اُن کے پیدائشی اوریٹر ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے سرسید کی منظوری بغیر پروگرام میں لکچر دینے کی تاریخ چھپوا دی تھی اور سرسید چند وجوہ سے جن کا ذکر سفرنامہ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مذہب پر لکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اُن کو مجبوراً ماننا پڑا۔ لیکن نہ اُن کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی کیونکہ ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک برابر تانتا بندھا رہتا تھا۔ باوجود اس کے جب اُس طول طویل لکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح بغیر قلمبند کیے ایسی عمدگی اور حسن ترتیب کے ساتھ ایسے پیچ در پیچ اور نازک مطالب کو یوں سلجھا کر بیان کیا ہوگا؟ کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا بلکہ اُن تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سرسید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھے، یا اُن دلائل کا بیان کرنا تھا جن سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو، یا اُن ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنھوں نے سرسید کو تفسیر قرآن لکھنے پر مجبور کیا۔ اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے

بہت کچھ غور و فکر اور مہلت درکار تھی۔ سفرنامۂ پنجاب کے مؤلف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ مجھکو سید صاحب سے اکثر ملنے اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے، میں نے اس قدر موثر کلام اُن کا بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔"

یہ تو اُس لکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولٹکل لکچر تھا جو نیشنل کانگرس کے خلاف اُنھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا ہم نے سُنا ہی کہ اُس کا خیال اُن کو چند گھنٹے پہلے ہوا تھا باوجود اس کے وہ ایسا جامع اور مُدلّل اور پُر زور تھا کہ اُس کے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اُس کے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس کے آگے سب ہیچ تھیں۔

افسوس ہے کہ سرسید کی بہت سی اسپیچیں اس سبب سے کہ اُردو زبان کے لیے شارٹ ہینڈ رائٹنگ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا، تلف ہوگئیں، ورنہ جس قدر اُن کی اسپیچیں اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں اسی قدر بلکہ شاید ان سے کچھ زیادہ ایسی ہوں گی جو قلمبند نہیں ہوئیں۔ بارہا لوگوں نے اُن سے چاہا کہ آپ اپنی اسپیچ پہلے لکھوا لیا کریں اور جلسے میں اُس کو پڑھ دیا کریں مگر خاص خاص حالتوں کے سوا اُنھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیچ کا جلسہ میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے طبیعت کی آمد رک جاتی ہے اور جوش اور ولولہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ سفرنامہ پنجاب میں اُن کی جس قدر اسپیچیں اور لکچر چھپے ہوئے ہیں اُن میں ایک بھی غالباً ایسا نہیں جو اُنھوں نے لکھ کر پڑھا ہو، سب برجستہ اور برمحل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہوگئیں ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سرسید کی سب سے زیادہ زوردار اور موثر وہ اسپیچیں ہوتی تھیں جو کسی پبلک جلسہ میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سُن کر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلتی تھیں خصوصاً تعلیمی معاملات میں اُن کی رائے یا پالسی کے خلاف کسی جلسہ میں تقریریں ہوتی تھیں خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو، یا ایجوکیشن کمیشن کا، یا سینٹ کی مجلس ہو، یا سنڈیکیٹ کا جلسہ ہو،

اُس وقت عنانِ صبر اُن کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی۔ اُن کی آواز سے تمام ہال گونج اُٹھتا تھا اور ذاتی مخالف اُن کے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر جوش و خروش کے اُن کی تقریر کبھی تہذیب و شائستگی کی حد سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ بے شک اپنے قومی جلسوں میں وہ اکثر مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے مگر اُس میں دلسوزی اور ہمدردی کا پہلو اس قدر غالب ہوتا تھا کہ نفرین و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

وہ فرمائشی لکچر دینا اور فرمائشی اسپیچ کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گا سکتے تھے کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُن کو کسی ایسی تقریر کرنے پر جس کا اُن کی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو، مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُن کی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ بادلِ ناخواستہ صرف اُن کی ہٹ پوری کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اُس میں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جوشیلا پن جیسا اُن کی اسپیچوں سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اسپیچ کرتے وقت جہاں کہیں ایسا موقع آجاتا تھا اُن سے طبیعت کا اُبال ضبط نہ ہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو سب سے آخری دفعہ اُن کا جانا ہوا اور وہاں کسی موقع پر تقریر کرتے وقت اُن کو جوش آیا اُس وقت اُن کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ وہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور اُس روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوئی۔ ہم نے سُنا ہے کہ ڈاکٹر نے اُن کی یہ حالت دیکھ کر سخت ممانعت کر دی تھی کہ آپ پبلک جلسوں میں اب تقریر کرنی بالکل چھوڑ دیں۔ ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اُس کے بعد اُنھوں نے چند مختصر تقریروں کے سوا کہیں کوئی لمبی اسپیچ نہیں دی۔

سرسید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک اڈیٹر میں ہونے ضروری ہیں۔ اُن کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا۔ گو آخر عمر میں بسبب کبرسن کے نسیان پیدا ہو گیا تھا مگر بچپن اور جوانی اور کہولت کے زمانے کے واقعات اور معلومات سب ازبر تھے اور اس لیے اُن کی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی اور چونکہ واقعات سے نتائج استخراج کرنے کا اعلیٰ درجہ کا مادہ خدا نے دیا

اس لیے اُس معلومات میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ ہر ایک معاملہ کی نسبت جو کہ اُن کو پیش آتا تھا، خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم و رواج اور معاشرت و اخلاق سے، خواہ پالٹکس سے اور خواہ تعلیم سے، وہ ایک مستقل اور غیر مذبذب رائے اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اس لیے کسی معاملہ پر اُن کو زیادہ غور کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو اُن کو اپنی اسپیچ میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب مسلسل اور ترتیب وار اُن کے ذہن میں موجود ہوتے تھے۔ اسی لیے ہم نے نہیں دیکھا کہ جس طرح عام سپیکر ایک پرچہ پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اُسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں، سرسید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ اُن کو بہ نسبت ایک کاغذ کے پرچہ کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسا ہوتا تھا۔ اس کے سوا چہرہ کی بناوٹ جو کہ وجاہت اور ہیبت و وقار کی ہوتی تصویر تھی اور آواز کی گونج جس میں جوش کے وقت شیر کی سی گرج محسوس ہوتی تھی، یہ دو بڑے معاون اُن کے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت اور ہر مطلب کے دلنشیں کرنے کا خداداد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب الفاظ کا سوجھ جانا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو اُن کو دیگر سپیکروں سے علانیہ ممتاز ٹھیراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ تھا جس کے سبب جو بات منہ سے نکلتی تھی وہ دل سے اُٹھتی تھی اور دل ہی میں جا کر بیٹھتی تھی۔

سرسید کی سحر بیانی نہ صرف اُن لکچروں اور اسپیچوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جو اُنھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے عموماً ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دینا جب کہ اُس سے ثوابِ اُخروی کی توقع نہ ہو، محض فضول جانتے تھے اور اس لیے انگریزی تعلیم میں جس کو وہ خلاف مذہب سمجھتے تھے، مدد ملنے کی اُن سے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُن کو اس بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی مدد کرنا بعینہٖ اپنی اور اپنے خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ

اس بات سے محض بے خبر تھے کہ انگریزی تعلیم کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے اور سرکاری نوکری کے سوا اُس سے تجارت و صنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُن کو اس بات کا سمجھانا نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن ہے۔ دولتمند اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگ سرکاری مدارس کو اُن کی تعلیم کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اس قدر بعید تھی کہ اب تک بھی مستثنیٰ شخصوں کے سوا لوگ اُس کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے لیے روپے سے کالج قائم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور نا آشنا تھے جن کا لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصکر اُس شخص کو جس کی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ دشوار تھا۔ جن باتوں کو سمجھانے کے لیے آج کل کی اسپیچوں میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُس وقت اُن کو الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تمہیدیں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ باوجود اس کے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی اسپیچوں میں بیان کیا ہے اُس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جو باتیں لوگوں کے ذہن سے اس قدر بعید تھیں اُن کو ایسی خوبی سے سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوئی باتوں کو ایک شخص یاد دلا رہا ہے اور جو نقش دھندلے ہو گئے تھے اُن کو اجال رہا ہے۔ اُن اسپیچوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پنی ریڈنگ کے جلسہ میں اُس نے اس بات کے سمجھانے کو کہ دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے رئیسوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی

دولت وحشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بُری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم کئی اسپیچ پر کر چکے ہیں۔"

ایک دوسری اسپیچ میں اس مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے "نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا نام آپ لوگوں نے سنا ہوگا، اُن کے پوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لیجاتا تھا۔ تغلق آباد کے گانو میں جس قدر گھسیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد میں ہیں ۔۔۔ دُنیا میں گزرے ہوئے زمانے کے واقعات سے ہم کو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہیے۔۔۔ دیکھو ہوشیار رہو، یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے، کوئی آثار بھلائی اور بہتری کے اُن میں نہیں دکھائی دیتے، بلکہ برخلاف اس کے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں۔"

ایک اور موقع پر رئیسوں کو بورڈنگ ہوس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اس طرح سمجھائی ہے "اے صاحبو! تعلیم و تربیت کی مثال کمہار کے آوے کیسی ہے کہ جب تک تمام کچّے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدہ دان کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے وہ کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ جناب ملکہ معظمہ وکٹوریا کو کس قدر دولت وحشمت اور سلطنت اور اختیار حاصل ہے، اُن کے بعد اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت و حکومت اُن کو حاصل ہے، یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور پرنس آف ویلز فرزند ارجمند ملکہ معظمہ اور ولیعہد ہند و انگلینڈ یونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم تھے اور جس زمانے میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شاہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہزادے طالب علمی کے لباس کا اور چوکونیا سلیپٹ ٹوپی کو جو اس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لیے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔"

ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت اس طرح جتائی ہے: "آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا۔ مگر اُس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو جو قبل از وقوع تم نے اُس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم کھیتی کے کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اُس کی درستی کی کچھ فکر نہیں کرتے۔"

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ تمثیل بیان کی ہے: "انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا، پاؤں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں؟ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچاویں؟ آنکھوں نے کہا کہ ہم اُس میں سے بال کنکر کیوں دیکھیں؟ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا بساندا ہونا میں کیوں سونگھوں؟ منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں؟ سب آپ آپ کو لے کر چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے، پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلانے کی طاقت نہ رہی، آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا، تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا؟ اس وقت عقل کے پاس گئے، اُس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے، تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے، حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اُس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اسی طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہم کو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے۔"

ایک اور جگہ گورنمنٹ مدراس نے جو تحقیقات وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی اُس کا ذکر کرتے وقت اُنھوں نے کہا کہ "اس چٹھی میں ترچناپلی کے مسلمانوں کا یہ حال مندرج ہے کہ خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ ترچناپلی اُن کا افلاس ہے جس میں بہت سے مسلمان مبتلا ہیں گو وہ مفلس ہیں مگر مغرور ہیں۔ جب میں نے (یعنی صاحب چٹھی نے) مسلمانوں کے لڑکوں کو بلا فیس

اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اُن کے پاس نہیں ہیں اور بغیر کپڑا پہنے وہ نہیں آسکتے۔ غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکوں کو ویسے آدھے ننگے پن کی حالت میں باہر آنے دے گا جیسے کہ بڑے بڑے دولتمند ہندو اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں "

"اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کونسی بدبختی اور بدنصیبی ہے جس کے مسلمانوں ہونے کی تم راہ دیکھتے ہو؟ - - - اگرچہ ہم اُن غریب محتاج بھائیوں کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جو اپنی عزت اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اُس کی تعریف کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ پاک خون جو مسلمانوں کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے اُن میں بھی ہے، مگر اُن کی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے اور ہم کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے اور تمام عیش و آرام خاک میں ملجاتا ہے اور کون تم میں سے ایسا ہے کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی سُنے اور اُس کا دل نہ بھر آوے؟ اے بھائیو! ان تمام واقعات سے میں اُن لوگوں کو جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچھ پروا نہیں کرتے، خبردار کیے دیتا ہوں کہ دیکھو کیا ہوا!! اور سمجھو کہ آیندہ کیا ہوگا!!"

اسی طرح سرسید نے اپنی ابتدائی اسپیچوں میں طرح طرح سے قومی تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ کہیں یوروپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار دے کر اُس کی ترغیب دی ہے، کہیں تمام ہندوستانیوں کو متفق ہو کر خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے کی تاکید کی ہے، کہیں ہندوستان کے اُمرا کی فیاضی کا یوروپ کے دولتمندوں کی فیاضی سے مقابلہ کر کے اُن کو حقیقی فیاضی کے مفہوم سے خبردار کیا ہے، کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اسلاف کی علمی ترقیات کا ذکر کر کے اُن کو غیرت دلائی ہے اور جہل و بے علمی کی حالت میں سلف کے علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے، کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ کر کے علوم جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے، غرض کہ جو کچھ زمانۂ حال کے پبلیکر تعلیم کے متعلق عام مجموں میں بیان کرتے ہیں اُس میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوگی جن کی بنیاد سرسید نے اپنے مشن کے آغاز کی اسپیچوں میں نہ ڈالی ہو اور گو کہ اب وہ عام اسپیچوں میں معمولی باتیں معلوم ہوتی ہوں مگر سرسید کی ابتدائی اسپیچوں میں وہ عام ہندوستانیوں کے لیے بالکل نئی تھیں

اور ایسی اہم اور ضروری تھیں کہ آجتک تمام سوسائٹی اسی بنیاد پر عمارت چنتے چلے جاتے ہیں۔

شکل و شمائل، اوضاع و عادات، اخلاق و خصائل اور مذہب

شکل و شمائل | سرسید کے چہرہ کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیأت مجموعی ایسی واقع ہوئی تھی کہ صرف اُن کی صورت دیکھنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تھا جس نے کبھی اُن کو نہ دیکھا ہو وہ بھی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلے ہی بار اُن کو دیکھتا ہوگا تو ضرور ایک گریٹ مین تصور کرتا ہوگا۔ یہ بات مشہور ہے کہ خودداری اور تمکنت اور کسی چیز کو دیکھ کر تعجب ظاہر کرنا اور اپنے تئیں سیے دیے رہنا انگریزوں کی قومی خصلت ہے، مگر ایک دوست کا بیان ہے کہ سرسید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا جس وقت اُن کا جہان ہوٹل میں پہنچا اکثر مسافر انگریز جو ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اپنے اپنے کمرے سے اُن کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور جب تک سرسید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے نہایت تعجب سے اُن کو برابر دیکھتے رہے۔

کرنل گریہم نے اُن کے چہرے کو شیر ببر سے مشابہ لکھا ہے۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے۔ بمبئی گزٹ میں کرنل گریہم کی کتاب پر جس کے اول میں سرسید کی تصویر چھاپی گئی ہے، ریویو کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ ”جو کتاب شروع کرنے سے پہلے ہم سید احمد کی طرف ایک لطف انگیز دل کی کشش پاتے ہیں، تصویر کیا ہے؟ گویا ایک شیر کیسی پُر رُعب و باہیبت صورت کا بہادر اور دلیر ہمارے سامنے کھڑا ہے، ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس قدیم جنگجوئی کے زمانہ میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے بجز انسانی ضروریات کے قوم کی تعلیم کی ضرورت کا خیال اُن کے دل میں پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔“ ہم کہتے ہیں کہ اُس کا جب بھی یہی پیشہ ہوتا جو اب تھا۔ وہی بہادری اور اولوالعزمی جو اگلے زمانے میں ملکوں کو فتح کراتی تھی یا لوٹ مار سکھاتی تھی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور جہل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔

سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز باعتبار جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام ہم جنسوں

میں تھا یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پیوند یا ازدواج دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہے اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے تھے جو شاہجہاں یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور اُن کی ننھیال کے لوگ کشمیر سے بعنوان تجارت سلطنت مغلیہ کے اخیر زمانہ میں اس ملک میں وارد ہوئے، پس دونوں خاندانوں میں اوپر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا، صرف دوستی اور ملاقات کے سبب جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی، اُن کے والدین کا ازدواج وقوع میں آیا تھا۔ اب خواہ اس کو حسن اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیرالدولہ کی دانشمندی کا نتیجہ قرار دو کہ اُنھوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایسا بر انتخاب کیا جس کے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا۔

حلیہ — سرسید کا حلیہ یہ تھا۔ رنگ سُرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبۃً چہرے کی شان کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، گلے میں دائیں جانب رسُولی[1] جو ہمیشہ داڑھی میں چھپی رہتی تھی۔ چہرہ کی ہیأت مجموعی باوجود عبوس اور پُر رعب ہونے کے دلکش، جسم بہت فربہ، قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما، ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من، عنفوان شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا، بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔

اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈراونا معلوم ہوتا تھا مگر جب کہ نل کر باہم گفتگو کے وقت اُس سے مسرت اور زندہ دلی اور گرمجوشی ٹپکتی تھی جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب و لہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں

---

(۱) سرسید کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی جس کی نسبت ان کا بیان تھا کہ حضرت شاہ غلام صاحب کی ہمت اور توجہ سے بالکل اچھی ہو گئی تھی۔"

کرتے تھے۔ زبان قینچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورے یا لغت زبان پر آتے تھے۔
جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی فکر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے، اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دیدیتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے بعض اوقات اس برتاؤ سے ناواقف آدمی اُن کو مغرور سمجھتے تھے مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے۔

اوضاع وعادات ولایت جانے سے پہلے اُن کا لباس ہندوستانی وضع کا رہا مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر ہٹن نے جو اُن کے دوست تھے، انگلستان سے اُن کو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہنکر آنا، اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آئے تو یہاں کے لوگ تماشا بنالیں گے۔ بظاہر انھوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر درحقیقت، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ تبدیلِ لباس کا ایک بہانہ تھا، وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کرچکے تھے اور اس مقصد کے لیے اُنھوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔
یوروپین طریقہ پر بودوباش رکھنا، کوٹھی بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا، میز کرسی لگاکر کھانا کھانا اُنھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کرلیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں سے میل جول کا ایک ذریعہ تھا، بڑا فائدہ اُس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہکر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ کرسکتے تھے۔
دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس کی رسموں اور طریقوں سے ایسا مانوس ہوجاتا ہے کہ اُن میں اصلاح کی ضرورت اُس کو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو محسوس ہوتی ہے تو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اُن کو چھوڑدیں یا اُن میں کچھ تبدیلی کرسکیں۔ مگر سرسید کی طبیعت اس قاعدے سے مستثنےٰ تھی اور ایسی طبیعت والوں کی بدولت انسان وحشی چوپایوں کی حالت سے اس درجہ تک پہنچا ہے۔ غدر کے بعد جب سے کہ اُن کا میل جول انگریزوں کے ساتھ زیادہ ہوا وہ اپنے ہاں کے طریق خورونوش کو ناپسند کرنے لگے اور اُس کو بتدریج

بدلنا شروع کیا۔ چنانچہ اول اول وہ عرب کے طریقہ کے موافق فرش پر بیٹھ کر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ اونچی ہوتی ہے، کھانا رکھ کر کھاتے تھے مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔

مہمانداری | دوستوں اور مہمانوں سے اُن کا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بشاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اُس دن اُن کے گھر عید ہوتی تھی۔ اگرچہ مہمانوں کی خاطر و مدارات قدیم سے اُن کی جبلی خصلت تھی مگر جب سے علیگڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اُس وقت سے اُن کا گھر مہمانسرا بن گیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ اُن کے ہاں کوئی مہمان نہ ہو۔ رات کے کھانے پر اُن کے ہاں اکثر پُرلطف صحبت ہوتی تھی۔ مذہبی، علمی، تاریخی اور سوشل ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ ہنسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تعدد اور تلوّن نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا ملتا تھا خوشی سے بغیر ناک منہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلاناغہ پی لیتے تھے پان زردہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی مگر ولایت جاتے وقت پان کھانا یک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگریٹ پینے لگے تھے

مسکرات سے پرہیز | کسی قسم کی مسکرات کا تمام عمر میں اُنھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مرنے سے نو دس برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کوئی ہلکی سی شراب اُن کے لیے تجویز کی، اُن کے ایک دوست نے اُن سے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، اُنھوں نے شراب پینے سے انکار کیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ جب وہ (یعنی سر سید) لندن میں تھے ایک دفعہ ڈیوک آف آرگائل کے ہاں ڈنر

پر بلائے گئے جب شراب سامنے آئی تو انھوں نے کہا۔ میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہوں

صحت جسمانی اگرچہ آخر عمر میں سرسید بتقاضائے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے اُن کی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب اُن کو دوا ٹھنڈائی پینے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ اگر دوا ذرا بدمزہ ہوتی تو وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچوں کی طرح ناک منہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ عفت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں احتیاط ان سب باتوں نے اُن کے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بینائی اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہوگئی تھی مگر دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ البتہ نسیان بڑھ گیا تھا، دانت بھی جھوجھرے ہوگئے تھے چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا، کسی جلسہ میں کھڑے ہو کر اب دو چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے، باوجود اس کے تصنیف اور تحریر کا کام جو بمنزلۂ ستۂ ضروریہ کے ہوگیا تھا، اخیر دم تک برابر جاری رہا۔

میلے تماشوں سے نفرت اگرچہ بچپن اور عنفوان شباب میں اُن کو میلے تماشوں کا بہت شوق تھا مگر جب سے بھائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاتا رہا، صرف علمی تماشوں میں مثل سرکس یا تھیٹر وغیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے، باایں ہمہ تھیٹر کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے۔

ظرافت ظرافت اور خوش طبعی اُن کی جبلت میں داخل تھی مگر جس طرح اُن کی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی اُن کو سوجھ جاتی تھی، اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو، اُن سے ضبط نہ ہو سکتی تھی مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ زیادہ تر اُن کو ظرافت اور شوخی اُن لوگوں کے مقابلہ میں سوجھتی تھی جو اُن کی تکفیر یا تذلیل

کرتے تھے، وہ ان کو کافر یا مرتد کہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اس طرح پر اپنے دل کا بخار نکالتے تھے۔ پادریوں سے بھی اُن کا دل بہت دکھا ہوا تھا اس لیے کبھی کبھی بالمشافہ اُن سے بھی نوک جھونک ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُن کی گاڑی میں آ بیٹھے ایک اُن میں سے پادری تھا، اُس کو کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ سر سید سے کہا "مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا" سر سید نے کہا "میں نہیں بھلا آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے ہیں؟" اُس نے کہا "خدا کی"۔ سر سید نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے میں اُن کو نہیں جانتا"۔ پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے؟" انھوں نے کہا "جی! پر کیا موقوف ہے جس سے ملاقات نہ ہو اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا کہ "آپ اُس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں میں اُس سے کبھی نہیں ملا" سر سید نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھ کو اُس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیونکر جان سکتا ہوں" پادری یہ سن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے۔ پھر سر سید سے اُس نے کوئی بات نہیں کی، اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اُس کو معلوم ہو جاتا کہ خود اُس کے عقیدے کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا لین دین انسان کے مانند ہو سکے۔

ایک دفعہ دلی کے مشنری کالج اور علیگڑھ کالج کا میچ تھا اور دلی سے کالج کے دو پروفیسر جو پادری تھے، میچ کھیلنے کے لیے اپنے طلبہ کو ساتھ لے کر علیگڑھ آئے تھے۔ سر سید نے اُن کو ڈنر پر بلایا جبکہ مسٹر بک بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ کھانے کے بعد پادری صاحب سر سید سے مخاطب ہو کر بولے کہ "یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے، کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسان میں نیکی پیدا کرتا ہے"، پادری صاحب اسلام کو تو جس کی تعلیم علیگڑھ

کالج میں ہوتی ہے، سمجھا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُن کی مراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جس قدر دنیا میں خونریزی ہوئی ہے اُس کی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی، سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سُن کر کہا کہ "دنیا میں مذہب سے زیادہ کوئی بدتر چیز اور تمام برائیوں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم اور بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہے گا" پادری صاحب یہ سن کر چپ ہو گئے اور مسٹر بیک سے مکان پر آ کر کہا کہ میں نے تو اس شخص کو بڑا متعصب سنا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کسی مسئلے کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرایہ میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ اُن کی اصلی رائے اُس مسئلے کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں وہ بنارس میں تھے اُن کا ایک آرٹکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں، حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرٹکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، سرسید سے اُس آرٹکل کا ذکر کر کے کہنے لگے:
"کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفۂ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟" سرسید نے کہا "حضرت! نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا" وہ یہ سُن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے "کیوں جناب! اُس اختلاف کے وقت جبکہ کچھ لوگ خلیفۂ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟" سرسید نے کہا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا؟ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو لبوسے کامیاب ہوتا" یہ سنکر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرایہ میں اُنھوں نے اپنی اصلی رائے مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اُن کے نزدیک جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریرات میں جا بجا ظاہر کیا ہے، کوئی شخص خاتم النبیین صلعم کے بعد من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اس لیے وہ کسی کی خلافت کے ماننے یا نہ ماننے کو ضروریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفا نے اپنے اپنے عہد میں کیا اُس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے، بلکہ خود انھیں کو اُس کا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔

سرسید کے لطیفے خاصکر اُن آرٹکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں معترضین و مخالفین کا ذکر ہے یا اُن کی طرف خطاب ہے اور سب سے زیادہ اُن کے پرائیوٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خاص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ جب کہ راقم بھی علیگڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا، خان بہادر مولوی سید فریدالدین احمد سب آرڈنیٹ جج کا رقعۂ دعوت سرسید کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمہ پر اُنھوں نے اپنا نام اِس طرح لکھا تھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید)۔ سرسید نے جو اُس کا جواب لکھا اس کے عنوان پر وہی الفاظ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے، لکھ دیے یعنی "جانی فرید"۔

اس قسم کے ہزاروں چٹکلے سرسید کی پبلک اور پرایوٹ تحریروں میں ملتے ہیں جن کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لطائف و نوادر کا مرتب ہو سکتا ہے، مگر اس شخص کی زندگی ایسے عظیم الشان واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ انھیں کا سمیٹنا ہو گراف کی طاقت سے باہر ہے چہ جائیکہ اُس کے لطائف و نوادر کو جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا۔

"بخون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں   تو خواہی زیب اسپ و زینت برگستواں بینی"

سرسید کی شوخیِ طبع جیسی جوانی اور کہولت کے زمانہ میں تھی ویسی ہی بڑھاپے میں اخیر عمر تک رہی مرنے سے چار برس پہلے جبکہ اُنھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اُس کے شتہار

کے ساتھ جو اُنھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل بطور تمہید کے لکھا تھا اُس کے آخر میں لکھتے ہیں "گو ہمارا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہو گا تو بُرا بھی نہ ہوگا اور اگر وہ مکاتباتِ دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے جو ہم میں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جن سے قصہ آدم یاد آجاوے گا اور کبھی سید احمد کو حکم ملے گا کہ مہدی علی کو سجدہ کر اور کبھی مہدی علی کو حکم ہوگا کہ سید احمد کو سجدہ کرو، تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جاوے گا اور خدا نہ کرے کہ اُن دونوں میں سے کوئی یہ کہے کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ"

مطالعہ | مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُن کی رفیق تھی۔ جس زمانہ میں وہ فتحپور سیکری میں منصف تھے اُس وقت مولانا نورالحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے، سرسید کی اُن سے نہایت گہری دوستی تھی، مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے، اُن کے سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتحپور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ اُن کا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتحپور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ اُن کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا جو بات کتاب میں اُن کے کام کی ہوتی تھی اس پر پنسل سے نشان کر دیتے تھے، اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا چسپاں کر دیتے تھے جو مہتم بالشان سوالات ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے اگر اُن کے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار میں نظر پڑ جاتا تھا اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اُس پر چھوٹا یا بڑا آرٹیکل لکھ کر

چھپنے کو بھیج دیتے تھے۔ جو مضمون اُن کے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُن کو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کی بعض خبریں یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹیکل کسی انگریزی داں سے پڑھوا کر سن لیتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اُس کا ترجمہ کرا لیتے تھے۔

کتابیں اکثر اُن کے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں۔ تصنیف کی حالت میں صرف بقدر ضرورت یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقام مطلوب نکال کر اُن کو دکھا دیتا تھا اگر کوئی لطیف بات مضمونِ کتاب کے خلاف یا اُس کی موید یا اُس کے متعلق ذہن میں آ جاتی اُسی وقت اُس پر کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیج دیا۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ اُن کے ہاتھ تلے رہا اس لیے یہ عادت اُن کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی کہ مضمون لکھنے کے بعد جب تک کہ وہ شائع نہ ہو جاتا، اُن کو چین نہ پڑتا تھا۔ یہی حال کتاب کی تصنیف کا تھا، ادھر ایک پوائنٹ ختم ہوا اور ادھر چھپنے کے لیے بھیجا گیا۔ مسودہ پر بار بار نظر ڈالنا اور زیادہ کاٹ چھانٹ کرنا اُن کا دستور نہ تھا، البتہ مسودہ صاف کرنے کے لیے وہ کاتب کو دیدیتے تھے اور جب صاف ہو جاتا تو کتابت کی تصحیح کے ارادے سے اُس کو ایک نظر دیکھ لیتے تھے

تصنیف کی حالت | تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آ جاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں، بالکل اُس میں مستغرق ہو جاتے تھے، چہرہ عبوس ہو جاتا تھا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا تھا، لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُن کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کبھی ایسے موقع پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اُسی خیال میں ڈھہک رہتے۔ جب عقدہ حل ہو جاتا فوراً چہرہ پر بشارت آ جاتی۔ اگر اُس وقت کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا سانحہ اُس کے روبرو بیان کرتے، اگر اور لوگ بھی اُس کو پسند کرتے تو خوش ہوتے اگر کوئی اعتراض کرتا تو اس پر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

خطوں کا جواب دینا | خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط کہ پانی پت

سے علیگڑھ کو بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اُس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آجاتا ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو' جبکہ اُن کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیے کہ اپنے خاص دوستوں اور ہمسروں اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا ؛ دوستوں کو معذوری کی حالت کے سوا وہ ہمیشہ پرائیوٹ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھنے ہوتے تھے وہ اکثر پیشکار لکھتا تھا اور وہ خود بتلاتے جاتے تھے لیکن جو فضول تحریریں لوگ اُن کے پاس بھیجتے تھے اُن کا کچھ جواب نہ دیتے تھے۔ جس خط کا جواب لکھ چکتے اُس کو فوراً چاک کر ڈالتے تھے۔ کبھی اُنھوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ اُس کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے، اپنے پاس دستاویز بنا کر نہیں رکھا۔ جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر تار پر تار یا خط پر خط بھیجتے رہتے۔ جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص و مخلص دوستوں کو لکھتے تھے اُن کا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دلنشیں ہوتا تھا کہ اگر اُس کو جادو یا افسوں یا حب کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے اُن کے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اگرچہ امید نہیں ہے کہ اُن کا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو سکے لیکن جس قدر دستیاب ہوں اُن کا جمع کرنا نہایت ضرور ہے، وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور وحشیوں کو رام کرنا سکھائے گا، وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا، وہ آیندہ نسلوں کو یاد دلائے گا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے ؛ کس طرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے ؛ اور کیونکر اُن کے دلوں کا شکار کرتے تھے۔

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں اُنھوں نے مولوی مہدی علیخاں کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے اُس میں لکھتے ہیں کہ "چوتھی یا پانچویں کو الہ آباد پہنچ کر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوں گا اور آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دوں گا۔ اگرچہ

آپ کے قدم میرے ناپاک سلیوں سے ناپاک ہو جاویں گے مگر امید ہے کہ آپ مرمت سے دھولیں گے، خنزیر خود ناپاک ہے مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے"

" افسوس ہے میں نے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہ دی، وہ تو جم سے بہت اعلیٰ ہے خدا نے اس کو یاد کیا ہے، مجھے تو سوائے مہدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا "

اس کے بعد مولوی مہدی علی کی تحریرات جو اخبار میں کچھ سر سید کے موافق اور کچھ مخالف چھپی ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " جو جو مقام مجھکو اُس میں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف ہیں) اُس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا و بے نظیر ہاتھی اُس کی اَدگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں "۔ یہ ایک معمولی مثال ہے اُن محبت آمیز باتوں کی جو سر سید کی دوستانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں اور اس بات کی تصدیق سید مہدی علیخاں سلمہم اللہ خود کریں گے کہ وہ فی الواقع سید کی ادگی میں پھنسے تھے یا نہیں اور پھنسکر اُس میں سے نکلنے کا اُن کو موقع ملا یا نہیں ؟

محنت وجفاکشی | محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سر سید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے اُن کو کام کرنے کی عادت رہی اُن کے قویٰ میں فطرۃً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً اُن کی غیر معمولی ذہانت بھی اُن کی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سر سید کے بیان سے معلوم ہوا ہے، وہ باعتبار ذہانت وجودت کے اپنے بھائیوں میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے، مگر چونکہ اُنھوں نے اپنے تمام قوے سے جو خدائے تعالیٰ نے اُن کے نفس میں ودیعت کیے تھے پورا پورا کام لیا تھا اس لیے اُن کے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جلا ہو گئی تھی کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا، جب اُس سے بڑے بڑے کارنمایاں ظاہر ہوئے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی تیّ باتیں کیونکر نکالیں تو اُس نے یہی جواب دیا کہ " میں استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا"، محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو

شبہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بہر حال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور اُن کو ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اُن کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ "جس زمانہ میں سید صاحب دلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ گیا تھا وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے، سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے، میں بھی اُن کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا مگر اس رفتار سے اُن کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے فارغ ہو کر سو رہتے، کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے، اس کے بعد ہمیشہ بلاناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے۔ جب تک میں رہتک میں رہا برابر اُن کا یہی قاعدہ دیکھا۔"

یہ تو اُس زمانہ کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۲۵ برس کی تھی، اُس سے آٹھ نو برس بعد مرادآباد اور غازیپور میں بھی جبکہ وہ تبیین الکلام لکھتے تھے، اُن کی محنت کا حال، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اسی کے قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطباتِ احمدیہ کے لکھنے میں اُنھوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخرکار اُن کے پانو میں ایک مرض پیدا ہو گیا جو اخیر دم تک نہ اچھا نہیں ہوا، اُن کے پانو اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلووں میں درد ہو جاتا تھا۔ مہینے مہینے دو دو مہینے برابر یہ تکلیف رہتی تھی، چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا، پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی باوجود ان مشکلات کے اُنھوں نے خطباتِ احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانہ میں وہ سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا، شام تک لو چلتی تھی، وہ کچہری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں بیان کرتے تھے

کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لیجاتے تھے، میرا گرمی اور لو کے مارے برا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ اور لو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانہ میں جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا، اُن کی محنت جوانی اور کہولت کے زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اُس پیادہ سیاح کی طرح جو سرد سیر ملک میں سیاحت کے لیے داخل ہو، جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے اُسی قدر اُن کی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اُن کا اس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل تھا کہ "ضاعف فی الکبر ھمتک فان وقتک قد دنی وعما قلیل تُسئل عنی" (یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دوچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آپہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاوہ ہونے والی ہے)

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی پلنگ پر جا کر نہ لیٹتے تھے، اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی تو اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو بھی وہ اپنی نشستگاہ سے نہیں اُٹھتے تھے، جیسا ہی نیند کا خمار ہوا تو وہیں کرسی یا تکیہ کے سہارے سے ذرا کمر سیدھی کر لیتے تھے۔ اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی تو ذرا سی آہٹ سے فوراً کھل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ چونکہ بڑھاپے اور زیادہ فربہی کے سبب وہ اپنے میں پھرتی اور چالاکی کی قابلیت نہیں دیکھتے تھے اس لیے جن کاموں میں پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی اُن کے لیے بہت پہلے سے تیار ہو جاتے تھے۔ ریل پر وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے، کسی ڈنر یا دعوت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقت معین سے بہت پہلے تیار ہو بیٹھتے تھے، کسی حاکم اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی تو دس دس بارہ بارہ روز پہلے سب کام لیس کر رکھتے تھے، غرض کہ ہر ایک کام کی تیاری وہ اُس وقت سے شروع کرتے تھے جب کسی کو اُس کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ جو اُن کا ایک لازمی مشغلہ تھا، مدرسہ کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے پیشدستوں سے لیتے تھے مثلاً

مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُس کا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لیے مرتب کرنا۔
سال تمام کی رپورٹ لکھنی، ہر دوسرے تیسرے مہینے اجنڈا تیار کرنا اور اُس کے تمام کاغذات چھپوا کر
ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُن کو ووٹ بھیجنے کے لیے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے، پھر
ہر ایک جلسہ کی روئداد لکھ کر اور چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنی، گورنمنٹ سے، سررشتہ تعلیم سے،
طالب علموں کے مربیوں سے، بینک سے اور ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً کتابت کرنا، روزانہ
آمدنی اور خرچ کو روزنامچہ میں درج کرنا، عمارتوں کے نقشے تجویز کرنے اور اُن کے موافق ہر ایک
عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا، اُن کے لیے ہر قسم کا سامان اور مصالح اپنی رائے اور تجویز سے
منگوانا، ہر ایک عمارت کے لیے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کر لی اور اُس کو اپنے اہتمام میں کندہ
کرانا، تیار شدہ عمارتوں کی تابمقدور خبر رکھنی اور اُن کے نقصانات کا تدارک
کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کرنے کی نت نئی تدبیریں سوچنی اور اُن تدبیروں
کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعہ سے چندہ کی تحریک کرنا اگر روپیہ بہم نہ پہنچے تو قرض
سے مدرسہ کا کام چلانا، کالج یا بورڈنگ ہوس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گزرے
تابمقدور اُس کے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب یا ضروری تجویز منظور ہو یا ہوئے اس کے
پورا کرنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا، اُردو اخبارات جو اطراف و جوانب سے آتے تھے
اُن سب پر ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے پیشدست سے پڑھوا کر سننا، خصوصاً
قوم کے اہم معاملات سے جو اخباروں میں درج ہوتے تھے، نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں اُن
پر بحث کرنا اور بعض ضروری کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر کبھی اپنے اخبار اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار
میں شائع کرانا، ہفتہ میں دو بار اخبار کے پروفوں کا خود تصحیح کرنا، اپنی یا دوستوں کی کتابیں جو
فروخت کی غرض سے مدرسہ کے فائدہ کے لیے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور
لکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سال تمام یا ٹرسٹیوں کے اجلاس کی روئدادیں غرض کہ جو کچھ اُن کے
اہتمام میں چھپتا تھا سب کی کاپیوں یا پروفوں کا اصل سے خود مقابلہ کرنا اور آپ اُن کی تصحیح کرنا

اور اپنے سامنے اُن کے پیکٹ بنوا کر مطبع میں بھیجنا، مدرسہ کی تجارتی کتابوں کے خود اشتہار چھپوا کر
اُن کو آپ فروخت کرنا اور اُن کا حساب کتاب رکھنا، کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹروں
بجٹوں، رپورٹوں اور روئدادوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اورنٹیل زبانوں کی کتابوں
کی جلدیں بندھوا کر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھوانا، یوروپین حاکم اور افسر اور
ارکان سلطنت جو اکثر کالج کے ملاحظہ کو آتے رہتے تھے اُن کی مدارات اور استقبال و ضیافت
کا خود انتظام کرنا، اُن کے دربار کے لیے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرانا، اُن کے واسطے
ایڈریس تیار کرنا اور اُس کو انگریزی میں ترجمہ کرانا اور چھپوانا اور پھر ایڈریس اور اُس کا جواب
اور تمام جلسہ کی کارروائی کو اخبار کے ذریعہ سے شائع کرنا، محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر
خواہ اُس کا اجلاس علیگڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں، سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز
تک برابر اُس کی کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مصروف رہنا، یہ اور اسی قسم کے بےشمار چھوٹے
بڑے کام یہ شخص اس ضعیفی کے زمانہ میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کی جائے
اور صرف چندہ جمع کرنے اور اُس کی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کی جائے تو بھی ایک
ایسا کام تھا کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔
تعمیرات کا کام بھی آسان کام نہ تھا جس کے لیے کم سے کم ایک لائق اوورسیر رکھنے کی ضرورت تھی
مگر سرسید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھر لیا تھا یہاں تک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز اور
اپنے اہتمام سے بنوا ڈالی

باوجود ان تمام بکھیڑوں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ
بھی انہیں مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کے جواب اپنے ہاتھ سے
لکھتے تھے، مہمانوں کی حالت کے موافق اُن کی آسائش کا انتظام کرتے تھے، اُن کے لانے کے
لیے مختلف اوقات میں ریلوے سٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جب تک اُن کا قیام رہتا تھا ہر وقت
اُن کا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور ہمت اور ہر ایک بات کی خبرداری اور ہر

ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھاپے میں دیکھی گئی ہو وہ کسی توانا اور تندرست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہو کہ ایک محض ناواقف شخص بھی صرف اُس کے روزمرہ کے کام دیکھ کر اس قدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہو ؎

وَاِذَا کَانَتِ النُّفُوْسُ کِبَارًا   تَعِبَتْ فِیْ مُرَادِھَا الْاَجْسَامُ

(یعنی جب نفوسِ انسانی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں تو اعضائے انسانی اُن کے ارادے پورے کرتے کرتے تھک جاتے ہیں)

باوجود اس قدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے اُن کی زندہ دلی نہایت تعجب خیز تھی وہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکھیڑوں اور خرخشوں سے تابمقدور الگ تھلگ رہتے تھے جس طرح اُن کے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے اسی طرح سرسید اپنے پرائیوٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُن کی اولاد میں پایا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کرتا اور مکروہات خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُن کی فرمائش پوری نہ کی جاتی تھی وہ کسی عذر کو قابل سماعت نہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں سے، بوڑھوں سے جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغایرت نہ ہو، ہنسی اور چہل کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو اُن سے ایسی سخت محنت کراتی تھی اور تھکان اور ماندگی اور ملال وکلال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی۔ اگرچہ جس زمانہ میں ہم نے اُن کو دیکھا ہو اُن کی ہنسی اور چہل صرف باتوں میں رہ گئی تھی مگر جیسا کہ سُنا گیا ہے ابتدا میں اُن کی شوخیاں صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں۔ کرنل گراہم جو اُن کے قدیم دوست تھے لکھتے ہیں کہ "وہ اس قدر خوش طبعی اور تمسخر کرتا ہے جس قدر کہ کوئی آدمی کر سکتا ہو" کبھی رات کے وقت ایک رسّی سے سانپ سانپ کہہ کر حاضرین کو ڈرا دینا کبھی نہایت بھیانک

اور ذرا دنی آواز سے اونگھتوں کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہوئے کی چھاتی پر چڑھ کر اُس پر اپنا سارا بوجھ ڈال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جن میں سے بعض بیان نہیں کی جاسکتیں اُن کے دوستوں سے سُنی گئی ہیں۔

بعض اوقات اُن کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی اُن کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انہیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی بُرا نہ مانتے تھے بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی۔ وہ کہتے تھے کہ "حافظ عبدالرحمن جو ۴ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی اُن کے ساتھ تھے، اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلتِ تنخواہ کے سبب اُن کو اپنے پاس رکھتے تھے اُن سے اکثر ہنسی چُہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حافظ جی اپنی ترقی کے لیے اکثر کہا کرتے تھے۔ چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوش نویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں، آپ کا خط کیوں اچھا نہیں؟ سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں پس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے۔"

"ایک دن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُن کے ساتھ کرتے تھے، بیان کیے کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں، دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں، رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھواؤں اور چناں کروں اور چنیں کروں، سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دو؟ حافظ جی نے ذرا رونی صورت بنا کر کہا حضرت! میں مجبور ہوں چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اس لیے کوئی عہدہ نہ دے سکوں گا۔ سید صاحب اور ہم سب لوگ یہ گرم فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔" غرض کہ سرسید نے تابمقدور

کبھی غم اور رنج کو پاس نہیں آنے دیا۔ شہر میں، بیرونجات میں، آبادی میں، جنگل میں جہاں کہیں ہوئے انھوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ اُن میں باقی نہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ مائیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں، اُن کا برتاؤ ان سب کے ساتھ بالکل ایسا رہا جیسا یار دوستوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اُن کے بھتیجے کو کنکوّے لڑانے کا شوق حد سے زیادہ بڑھ گیا سر سید چاہتے تھے کہ یہ دھت جاتی رہے مگر اُس پر جبر کرنا گوارا نہ تھا۔ آخر لاچار ہو کر ایک دن کہا کہ بھئی آج تمھاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھیں گے، شام کو جب کہ پیچ پڑ رہا تھا اور دونوں طرف سے ڈھیل دی جا رہی تھی، آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی ڈور کو تھام لیا اور جب پیچ کٹ گیا تو پکار پکار کے کئی دفعہ کہا "ہم ہارے ہم ہارے" یہ دیکھ کر فریق ثانی کا جوش کم ہو گیا دوسرے دن کوئی اُدھر سے پتنگ اڑانے کو نہ اٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سر سید کی ذہانت بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اُن کی لگاتار محنت اور مسلسل دماغی ریاضت کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک یوروپین مصنف نے لکھا ہے کہ "میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بڑے محنتی تھے" سر سید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سید محمود سے کہا کہ "تمھارے باپ کا دماغ کیا ہے گویا ٹائپ کے حرفوں کی الماری ہے، جس طرح اُس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتا ہے اسی طرح ہر سوال کا جواب اُس کے دماغ میں ہر وقت موجود رہتا ہے" فی الواقع سر سید کے اشتغال ذہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے بجائے خود غور کر کے اُس کی نسبت ایک پختہ رائے قائم کر لیتے تھے اور اس لیے جب وہ سوال معرض بحث میں آتا تو اُن کو اُس کا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا اور یا یہ کہ دماغی ریاضت اور

برابر غور و فکر کرنے کی عادت نے اُن میں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت ادنے تامل سے ایک سنجیدہ اور معقول رائے ظاہر کر سکتے تھے۔

بہر حال یہ تمام نتیجے دائمی غور و فکر اور نور فطرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت، خواہ امور مذہبی میں ہو، خواہ مسائل علمی میں اور خواہ معاملات دنیوی میں، انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی۔ وہ ہمیشہ بچوں کی طرح جو چلنے میں اوروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، ہر معاملہ میں دوسروں کا منہ تکتا رہتا ہے۔ سرسید کو زمانہ کی ضرورتوں نے اول مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے اُن کو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رائے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت ہوئی، پھر رفتہ رفتہ یہ عادت اُن کی طبیعت ثانی ہو گئی اور ہر قسم کے سوالات پر غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قائم کرنا اُن کا وتیرہ ہو گیا اور اس طرح اُن کے قوائے عقلیہ بتدریج جلا پاتے رہے۔

سرسید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جینیس کا سب سے بڑا ثبوت اُن کی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو اُن سے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کو ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جن کا ذکر اس کتاب میں بقدر ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے، اور اگر کسی کو اُن کی عالی دماغی کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے جن کی نسبت مسٹر وائٹلی سٹوکس(1) لیجل ممبر لیجسلیٹو کونسل وائسرائے کشور ہند نے کونسل میں یہ الفاظ کہے تھے "نہایت نامور باپ کا نامور بیٹا" ہم

---

(1) یہ وہ مشہور اور نامور لیجل ممبر کونسل قانونی وائسرائے کشور ہند ہے جو ۲۰ برس کونسل ہند میں اول سکرٹری اور پھر قانونی ممبر رہا۔ اینگلو انڈین کوڈ ۱۸۸۸ء میں اُن کا یہ فقرہ درج ہے کہ "مجھ کو استعانت سے زیادہ ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے ہوئے ہیں جو انڈین لا رپورٹ میں ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک چھپے ہیں، یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہل ہند کے رسوم و خیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ عموماً (اگر میرا یہ کہنا گستاخی نہ ہو) اپنے کامل استدلال اور علمیت کے لحاظ قابل تعریف ہیں۔ اور ان میں سے کسی فیصلہ کے پڑھنے سے بہ نسبت اُن فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مونو سامی ایاد ہندو اور سید محمود مسلمان کے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوئے ہوں اُن کے لیے کوئی قانونی اصول ایسا باریک اور دقیق نہیں ہو سکتا جو اُن کو دشوار معلوم ہو اور کوئی طریقہ عمل درآمد کا قانونی ایسا پیچیدہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کے فہم سے باہر ہو" ۱۲

یہاں صرف اُن کے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت میں ایک خاص مناسبت فنون لطیفہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منجملہ اُن بے شمار تدبیروں کے جو چندہ وصول کرنے کے لیے انھوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیں، ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی خدمت میں اُس تصویر کا بھیجنا تھا جس میں مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ جہاز کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدرسۃ العلوم کو ایک کشتی کی شکل میں دکھایا تھا جو جہاز والوں کو اُس تباہی سے نکالنے کے لیے جہاز کی طرف آرہی تھی۔ اس تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصّہ میں بیان ہو چکی ہے، یہاں صرف یہ جتانا ہے کہ سرسید کا ذہن کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا؟ انھیں دنوں میں مدرسۃ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی تھی جس میں ایک یہ شعر بھی تھا۔

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

ظاہراً سرسید کو اس تصویر کے بنوانے کا خیال اسی شعر کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا کیونکہ یہ نظم اُس تصویر کے بھیجنے سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال تھا جس میں اس سے زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینۂ نجات) کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی لیکن جو مضمون سرسید نے اُس سے استنباط کیا اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، نواب مختار الملک کے دل میں جن کو اُس وقت تک قومی معاملات سے چنداں دلچسپی نہ تھی، کالج کی محبت کا بیج بویا گیا جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور سایہ دار درخت بن گیا۔

اسی قسم کی دوسری مثال وہ بکس تھا جس میں سرجان اسٹریچی کو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جس کو سرسید نے خاص اپنی تجویز سے بنوایا تھا۔ اس بکس پر اُن جانوروں کی تصویریں کھدوائی گئی تھیں جن کے نام پر زمانۂ جاہلیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اس لیے عرب کے بہت سے قبیلے انھیں ناموں سے مشہور تھے جیسے قریش یا قُرَیش (وہیل مچھلی)، ثعلب (لومڑی)، کلب (کتا)، جمل (اونٹ) اسد (شیر)، ذئب

(بیئریا) وغیرہ وغیرہ۔ پھران سب تصویروں کے منہ سے بجائے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جاکر منتہی ہوئے تھے جہاں انگریزی الفاظ میں یہ مطلب ادا کیا گیا تھا کہ "ہم سب قبیلے متفق اللفظ سرجان اسٹریچی کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں" اور اس سے گویا تمام مسلمانوں کی شکرگزاری کا اظہار مقصود تھا۔

اسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ کے ہر ایک خطبہ کے سرے پر ولایت میں چھپوائی تھی اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے کے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی گئی تھی۔ اس میں سے کھجور کی علامت ہم نے پچھلے دنوں میں ایک چینی کی تشتری پر بنی ہوئی دیکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھ کر ولایت کے کسی کارخانہ دار نے یہ مارک ان ظروف کے لیے اختیار کیا ہے جو ممالک عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اسی قبیل کا وہ نشان ہے جس میں ہلال اور صلیب کو جو تاج قیصری میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جمع کر کے مدرسۃ العلوم کے کتبوں اور اس کے کتب خانہ کی کتابوں پر ثبت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کرسچینٹی کی مصالحت اور تاج قیصری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے۔

ایک اور مثال سرسید کے انتقال ذہنی کی سنہ نبوی کا بجائے سنہ ہجری کے قرار دینا اور تہذیب الاخلاق کا سال ماہ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہراً سرسید سے پہلے سنہ نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گزرا۔ جس زمانہ میں کہ سرسید آئین اکبری کی تصحیح کرتے تھے اس میں ایک جگہ سنہ ہجری کی نسبت ابوالفضل کا یہ قول ان کی نظر سے گزرا تھا کہ "ازیں سنہ بوئے ناکامی مے آید" یعنی یہ سنہ آنحضرت صلعم اور تمام مہاجرین کی ان مصائب کو یاد دلاتا ہے جن کے سبب ان کو وطن مالوف چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں سرسید نے ابوالفضل کے ان الفاظ سے بہت برا مانا تھا اور اس کے حاشیہ پر قائل کی نسبت لعنت یا اس کا کوئی مرادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابوالفضل کے اسی بے ادب جملہ سے ان کے دل میں یہ

خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخ بعثت سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلعم کی بعثت سراپا برکت کے برابر عظیم الشان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ امید نہیں ہے کہ جو سنہ تیرہ سو برس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اُس کی جگہ کوئی دوسرا سنہ قائم ہو سکے مگر اس نظر سے کہ سنہ نبوی تاریخ بعثت ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہے اگر مسلمان کم سے کم سیر اور اسماء الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سب سے پہلے سرسید ہی نے اُس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصہ باب ۲ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخ بجنور میں اُنھوں نے اُن مشکلات کو گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا جو اس غلطی سے لازم آتی تھیں۔ اگرچہ وہ تاریخ سنہ ۵۷ کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی مگر سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۶۱ء میں جو سرکلر گورنمنٹ نے اُس غلطی کے تدارک کے لیے جاری کیے اُن سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ بجنور میں درج کی تھی۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے اُن کے ذہن کی جودت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر یہاں بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اخلاق اور خصائل

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں بولے جا سکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے، یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اُس کو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے، یہاں تک کہ اُس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اُس کی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اُس کے اخلاق رذائل سے بالکل پاک

معلوم ہوتے تھے۔ اسی لیے مسٹر بک نے اُس کے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ "اُس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اُس کے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے۔"

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا سچا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، بخشی ہو، صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے۔" اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق میں جامع و مانع ہوگی۔ جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جس قدر اُس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اُس کے مدّاح اور ثناخواں تھے، سب اُس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اُس پر اعتبار تھا اور سب کو اُس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گزرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مربّی اور سرپرست کا مرجانا شاق گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حسنِ اخلاق کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اُس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُس کو اپنے مقاصد میں ہوئی، کیونکہ لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پبلک لائف میں بسر کیے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اُس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے ادنےٰ ادنےٰ کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہوجائے باوجود اس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا سوا اس کے کہ اُس کو کافر و ملحد و نیچری و کرشان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُس پر وہ الزام لگائے گئے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا کسی سے کچھ بن نہ آیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظوں نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کیے بغیر نہیں رہتے اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُس کو پربت بنا دیتے مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اُس کا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک رہا۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے ٹھیک کہا تھا کہ "علم بالانساب اگرچہ علم مظنون ہے مگر اس شخص کے بارے میں تو اُس کے افعال اُس کے نسب کی تصدیق کرتے ہیں"

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں انھیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خساست اور دنارت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُس کے اخلاق کا اُس کے ہمنشینوں اور جلیسوں پر اثر پڑتا تھا، اس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی، اُس کی سچائی اور ہمت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اُس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہی کیرکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں، اُن کے اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر یہاں ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کو اُن کی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو اُن کے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن سے شاید ہی اُن کا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

راستبازی | اوّلاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں جیسے صدق، مودت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے

سے تھے کسی حکیم کا قول ہے کہ " اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی " اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُس نے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اُس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا جس بات پر دل سے یقین کر لیا اُسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اُس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ اُن کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُن کو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اس کو متنبہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُن کا ایک دوست جو اخبار کا اڈیٹر تھا، اُس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے، جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اُس کو لکھا کہ " کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کانشنس کے خلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو؟ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اُس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھکو معاف کیجیے گا، بہ سبب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔"

جب اُن کے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اس کا جواب انھوں نے اس طرح لکھا ہے " میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں، خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا بنائیں

اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے، ایسی ہی پرائیویٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے"

اُن کے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانہ میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع اُنھوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اُن کو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں" بھائی ... کل میں سارے دن متردد رہا۔ کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو اکٹھی بھی ملاکر پڑھ لیتا ہوں، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا، نہایت بُرا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر بلبلانا، اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا نڑاق سانی استعنا دے دینا تھا، صاف کہدینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مرجاتے نہایت اچھا ہوتا والسلام"

سرسید نے ایک موقع پر دلی کے ایک نہایت مقدس عالم سے جو اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو رفع یدین کی تاکید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، کہا کہ "حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود مقتدائے دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو ول سے حق جانتے ہیں اُس کے موافق کبھی عمل نہیں کرتے۔ ہم ہزاروں گناہ کرتے

ہیں اور دنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں، مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اُس کے کرنے میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے" سرسید کے کہنے کا اُن کو ایسا اثر ہوا کہ اُنھوں نے اسی روز جامع مسجد میں جاکر علی الاعلان رفع یدین کیا، لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اُس پر قائم رہے یا نہیں۔

اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اُردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی۔ اُس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کی طعن و ملامت سے نہ ڈریں۔ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے تھے اُس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے۔ اُس نے تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے اُن کا کوئی مضمون اُس میں درج نہ ہوگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک نکلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا اور بڑے بڑے لائق اور ذی علم اور دین دار لوگ صدہا مضمون عام رائے کے برخلاف اپنے نام سے شائع کرنے لگے۔

بعضے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے معنی جمہور کے خلاف بیان کیے ہیں اس پر اُن کو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا، اُنھوں نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ "اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا" وہ سید مہدی علیخاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں، اگر خدا مجھکو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

اُس نے اپنی راستی اور صاف گوئی سے صرف اُن مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پرانے خیالات رکھتے تھے اور جن سے کسی طرح موافقت کی امید نہ تھی بلکہ جو بات اُس کو حق

معلوم ہوتی اُس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ نیشنل کانگرس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیر خواہ جانتے تھے، اُن کی نہایت تعریف کرتے تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ اُن کی قدر کرتے تھے، اخباروں میں اُن کی نسبت مدحیہ آرٹکل چھاپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے اُن کے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے پبلک اسپیچوں میں اُن کا ذکر خیر کرتے تھے، سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ ہندو قاطبۃً مخالف ہو جائیں گے۔ مگر جب اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگرس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاصکر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں کا اُس میں شریک ہونا پولٹکل خطرات کا باعث ہوگا، اُنھوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اُس کی شرکت سے روکا اور کانگرس نشین گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے اُن کو خودغرض اور اینگلو انڈینز کا خوشامدی اور تائم سرور سب کچھ کہا، صدہا آرٹکل بنگالی اخباروں میں اُن کے برخلاف چھپ گئے، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند نے اُن کو عنایت فرمایا اُس کو بنگالیوں نے کانگرس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا، مسٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ اُن سے سخت بدگمان ہو گئے، بعضے ایجوکیٹیڈ مسلمان بھی اُن کی طرف سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پروا نہیں اور جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے نہیں دیا۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ اُن پر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستبازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔ جس زمانہ میں وہ ولایت میں تھے اُنھوں نے ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر جو اُس وقت یہاں جاری تھا، ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی، ازانجملہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت جس کا اُنھوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا،

یہ لکھا تھا کہ مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے۔ وہ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور جو اُس وقت شمالی مغربی اضلاع میں لفٹنٹ گورنر تھے، اُن کی نظر سے بھی گزرا۔ چند روز بعد اُنھوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ "میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں جو سید احمد خاں کے نتائج کے مخالف ہے"

یہ اسپیچ معہ اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولایت پہنچی اور سر سید کی بھی نظر سے گزری۔ ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھے کہ سر ولیم میور نے مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے۔ اُن کو نہایت رنج ہوا اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو الہ آباد میں ہز آنر سے مل کر نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے۔ ہز آنر کے پرائیوٹ سکرٹری کی چٹھی سر سید کے نام بنارس میں پہنچی جس میں لکھا تھا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔"

سر سید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی، سر ولیم نے نویں نومبر کو اُس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھکو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج[1] سے جو

---

(۱) سر سید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسہ کے معائنہ سے جہاں گائے بندھی ہوئی اور مدرس اور طلبہ غیر حاضر تھے، یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدارس کی یہ حالت ہے مگر سر ولیم میور اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے نہ یہ کہ جس گاؤں کے مدرسہ کا اُنھوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا اُن کا وہ بیان غلط تھا ۱۲

آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا ۔"

" مجھکو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھکو براہ راست کیوں نہ لکھا ، آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھکو اور بھی رنج ہوتا ہے ، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ مجھ پر نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا ۔"

" مسٹر بریلی نے اُردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو ، استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی ۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔

مکپیٹن لنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجۂ بالا خط کتابت کے حوالہ سے لکھیں گے ۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا ۔"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ " آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا ۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کرکے لکھتے ہیں کہ " سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں ۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اُس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجکو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی ۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے ۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رُتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہ پر صوبے کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریر دل

کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی، نہایت سبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گزرا۔ جب سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اُس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علیگڑھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے، اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا: "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جائے۔" اُنھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں رحم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر ہوبلی نے جو علیگڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک صاف جانتے تھے۔

جن یوروپین افسروں نے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اُس کے لیے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے، سرسید نے اُن سے پرائیوٹ طور پر ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی اُن کے ساتھ ظاہرداری کا برتاؤ نہیں کیا، یہاں تک کہ ہم نے سنا ہے کہ جب حضور سر جان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کالج کمیٹی علیگڑھ کی طرف سے اُن کو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو مسودہ ایڈریس کا انعقاد جلسہ سے پہلے سرسید نے لکھ کر جناب ممدوح کے ملاحظہ کے لیے بھیجا تھا اُس میں جہاں کالج کے محسنوں کا شکریہ لکھا تھا اُن افسروں کی شکایت بھی صراحۃً یا کنایۃً لکھی تھی جو اُس میں خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب ممدوح کے ایما سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودہ

میں سے نکالنے پڑے مگر سرسید نے ہزآنر سے صاف صاف کہدیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔

سرسید نے یوروپین ڈریس جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہی محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس اُن کی ہم وطن قوموں سے مختلف ہونا چاہیے، اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ و ایران اور اکثر ممالک اسلامیہ میں مسلمان ٹرکش ڈریس یا اُس کے قریب قریب پہنتے ہیں اس لیے اُنھوں نے خود ترکی لباس اختیار کرکے اپنی قوم کے لیے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اس کے کہ اُن کو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر اُنھوں نے جو وضع مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھ کر اختیار کی تھی اُس سے کبھی سر مو تجاوز نہیں کیا۔ دِلّی میں دربار قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاس نامہ دیا گیا، سرسید اُس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہاں جوتا اُتار کر جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے اور ممبروں نے سپاس نامہ پیش کیا اور سرسید اُن کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارمیکل سے وہ جوتا پہنکر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اُتروائے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واٹسن جب تک علیگڈھ میں کلکٹر رہے ہم نے سنا ہی کہ سرسید کبھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اُتار کر اُن کے کمرے میں جائیں، مگر اُنھوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور کے ہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اُس وقت گئے تھے جبکہ مدرسہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود ایک پلنگڑی پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُس کو فرش پر دو زانو بیٹھنا پڑتا تھا ہم نے سنا ہی کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جوتا پہننے کی اجازت حاصل نہیں کرلی وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سرسید جیسے خود راستباز تھے اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے جن زمانہ

میں وہ سررشتہ دار کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت خان بہادر منشی غلام نبی خاں رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے امیدوار تھے پھر چند روز بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے اُس وقت حسن اتفاق سے رہتک میں چند لائق اور ذی علم اہلکار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جن کی سرسید کے ہاں آمد و رفت تھی۔ خان بہادر نے اُن سے یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب سے ملوا دو، اُنھوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لامذہب ہیں۔ یہ فقہا کی اصطلاح[1] سے ناواقف تھے انھوں نے یہ سمجھا کہ سید صاحب قیدِ اسلام سے آزاد ہیں۔ ایک دن سید صاحب اور دیگر اہلکار ایک جگہ جمع تھے نماز کا وقت آگیا، سب نے سید صاحب کو امام بنایا، منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے اُن کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لامذہب (یعنی غیر مسلم) کو کس طرح امامت پر کھڑا کر دیا۔ جونہی سرسید نے نیت باندھی اُنھوں نے الگ جا در بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ سرسید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ اُنھوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا، لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں، اُس وقت اگر میرا دل ٹھکیگا تو میں خود آپ کا مقتدی بنوں گا ورنہ مجھے معاف فرمائیے گا۔ سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھوں گا۔ آخر سرسید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ "اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ میں اُس وقت اُن کے ایک ادنیٰ ماتحت اہلکار کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس روز میں اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا وہ بلاتکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے، حالانکہ اُن کی عادت کسی کی سفارش کرنے کی

---

(۱) مذہب کا لفظ جو آج کل دین کے معنوں میں بولا جاتا ہے فقہا کی اصطلاح میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے طریقہ کو مذہب کہتے ہیں اور اسی لیے وہ لامذہب اُس کو کہتے ہیں جو کسی خاص امام کے طریقہ کا پابند نہ ہو ۱۲

نہ تھی باوجود اس کے اُنھوں نے گنگری صاحب جنٹ مجسٹریٹ رہتک سے ایک نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی، دوسری دفعہ جو دہ ایک مہینے کے لیے رہتک بدل کر گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو، میرے ہی غریب خانہ پر آکر اُترے اور مہینے بھر تک وہیں قیام کیا۔ پہلی دفعہ جب وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا تھا جس سے پیشاب اور پاخانہ بند ہو گیا۔ مجھے نوکر ہوئے چند روز گذرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپیہ ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا غرض کہ عجب بے کسی کی حالت تھی، صدر امینی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا، میرے حال کی اطلاع پاکر سید صاحب کو رات کے نو بجے جا خبر کی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لیے چلے آتے ہیں اور ہوسپٹل اسسٹنٹ کو بلانے کے لیے آدمی بھیج کر آئے ہیں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آگیا مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر ان کے علاج سے فائدہ نہ ہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہہ کر چلا گیا، اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہ ہوا، سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُس نے آکر جلاب دیا، یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جاکر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی، سید صاحب تمام رات میرے غریب خانہ پر جاگتے رہے اور جب مجھے افاقہ ہو لیا تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ اُنھوں نے میری تیمارداری میں وہ رات بسر کی اُس کو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔"

منشی صاحب کہتے تھے کہ "دلّی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب سے پوچھا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو اُس پر اس قدر مہربان ہو، سید صاحب نے کہا "کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں بڑا[1] ہوں ایسا ہی وہ بڑا ہے۔

---

(۱) چونکہ سچا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کھرے پن سے لوگوں کو اپنا مخالف بنا لیتا ہے اس لیے اُنھوں نے آپ کو اور منشی صاحب کو بڑا یعنی دیوانہ قرار دیا ہے

جس زمانہ میں کہ سرسید انگلستان میں تھے اور اُن کی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر علیگڑھ سوسائٹی اخبار کے شائع ہوتی تھیں اُن پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی اُن دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں اُن کو برابر ممانعت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں یہاں بھیجنی چاہییں۔ ایک دفعہ انھوں نے گردن مروڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھا جس پر یہاں بہت لے دے ہوئی اور مولوی صاحب ممدوح نے اپنے خط میں اُس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں سرسید نے اُن کو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جن سے آپ کو افسوس ہوا اُس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں، ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ کہنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجیے، جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے، میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کروگے بھائی! کیا تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں بُرا کروں اور اُس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ بُرا نہ کہیں؟ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہوسکتا، جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو، نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا؟ میں اُس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں، نہ روایت شاذہ سے۔ والیِ مصر کے ساتھ بعض علمائے مصر بھی تھے سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔ بہر حال میں اس میں گفتگو نہیں کرتا شاید میں غلطی پر ہوں۔ صرف معافی چاہتا ہوں۔"

محبت و صداقت | دوسرے محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ

تھا اور اسی سبب سے اُن کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بہ درجہ غایت پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہو گئی ہے، لکھتے ہیں "وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ کبھی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے انھوں نے دل نہیں لگایا، اُن کو مزا دوستی اور محبت کا مطلق معلوم نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا نہ وہ نہ خدا کی دوستی کا مزا جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا اور نہ محبت کے لائق ہے۔"

ایک اور خط میں جو سید مہدی علی کا مضمون گردن مروڑی مرغی کے برخلاف اخبار میں دیکھ کر اُن کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں "آپ نے جو کچھ میرے مردار مرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجیے کہ اس نے عجب لطف مجھ کو دیا ہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی دولتِ عشقِ مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بغیر اُس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔"

کنبے کی محبت انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک نیچرل تعلق ہے کسی کا قول ہے کہ "جس کے دل میں اپنے کنبے کی محبت نہیں اُس کو کسی سے بھی محبت نہیں۔" سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ اُن کو بیس برس تک نہیں بھولا۔ سنا ہے کہ اُن کے عزیز اُن کے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اُن کا داغ تازہ ہو جائے گا۔ بہت مدت کے بعد اُن کی بھتیجی کے منہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا، سرسید کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔

بھائی کے مرنے کے بعد انھوں نے صغیر سن بھتیجے کو اس طرح پرورش کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بھاوج زندہ تھیں بھتیجے کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا، سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا، مدتوں اپنے ساتھ ایک پلنگ پر سلایا اور ہر طرح سے اُس کی دل داری اور دلجوئی کی۔ غدر میں جب سارا کنبا دلّی میں تھا اور آپ بجنور میں تھے اُس وقت بھی بھتیجا اُن کی جان کے ساتھ تھا۔

جب سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا اُس وقت اُن کی عمر کچھ اوپر چالیس برس کی تھی اور تین صغیر سن بچے جن کی پرورش اور رکھ رکھاؤ اکیلے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا، موجود تھے ہر چند دوستوں نے سمجھایا کہ دوسری شادی کرلو تاکہ اپنی زندگی بھی آسایش سے گزرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو، مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے کہ "میں اُن کو ہمیشہ دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا، وہ سُن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے، ایک دن وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا، انھوں نے درد کے لہجہ میں کہا کہ "محمود کی ماں کہاں سے آوے گی" پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا"

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا تار پہنچا، اُنھوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اُس کے بچنے کی امید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں مگر دوسرا تار اُس کے مرنے کا پہنچا جس سے اُن کو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے غمگین اور افسردہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلی جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا۔ باوجودیکہ اُن دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی، صرف ایک دو روز دلی میں ٹھیرے اور ساری تعطیل علیگڑھ، مرزاپور اور بنارس میں بسر کی۔

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی اُن کو دلبستگی تھی ایسی بہت ہی کم سُنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں ماں کی اطاعت کرتے تھے اور اُن کے غصہ اور خفگی کی برداشت کرتے تھے اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھکو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا، کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو

---

(۱) سرسید کی بی بی جیسا کہ معتبر ذریعوں سے سنا گیا ہے، فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لائق بیوی تھی جس کے بعد سرسید کا دوسرا نکاح کرنا بہ نسبت نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ وہ بھی اسی ناتا کی نواسی تھی جس کے سرسید نواسے تھے اور اس لیے نیک دلی اور رحمدلی جو نسلی ورثہ میاں بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی، سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں ان کے مکان پر جانا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارات ہوئی ہے جیسی اُن کی موجودگی میں ہوتی تھی، ہم کو اصل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سید صاحب خود مکان پر موجود ہیں"

میں پہلے مرجاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور رنج میں گزرے۔ انھوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرٹھ میں جہاں اُن کی والدہ مدفون ہیں، ایک پبلک اسپیچ میں اپنی ماں کا ذکر کیا، معاً اُن کا دل بھر آیا اور اس بڑھاپے میں اُن کو ماں کے ذکر پر روتا دیکھ کر لوگ متعجب ہوگئے۔ بھائی کے نواسوں کی نہایت شفقت کے ساتھ انھوں نے سرپرستی کی اور اُن کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے اُن کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

وطن کی محبت | اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلی ہے جہاں پردیسی بھی آکر زمین پکڑ لیتے ہیں، مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی، ایک زمانہ تو وہ تھا کہ اُن کو دلی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے اور ہر قسم کے اہل کمال اور اہل ہنر زمانہ کی بساط کے موافق وہاں موجود تھے۔ قلعہ کا چراغ اگرچہ ٹمٹا رہا تھا مگر گل نہ ہوا تھا، سرسید کو جو زندہ دل سوسائٹی وہاں میسر تھی دوسری جگہ اُس کے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح رہ گئی اب اُسی حبّ وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن آنکھوں سے اُس کی بہار دیکھی تھی اُنھیں آنکھوں سے اُس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہوگا جتنا کہ سرسید کو دلی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ اُن کے آرٹیکلوں میں یا اسپیچوں اور لکچروں میں یا پرائیوٹ خطوں میں جہاں کہیں دلی کا ذکر آگیا ہے اُن کا دل اُمڈے بغیر نہیں رہا۔

وہ اپنی کتاب راہ سنت پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں، کجا وہ صحبتیں، کجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہ، کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما و صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے۔"

ایک اور آرٹکل میں جہاں اُردو اخباروں کا ذکر کیا ہے وہ یوں لکھتے ہیں "اس اُجڑے شہر کے اخباروں کا بھی جس کا نام لیتے دل بھر آتا ہے ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں .... ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لیے ناراض ہیں کہ مدرستہ العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہوا؟ بھائی! کہاں ہے وہ دلی اور کہاں ہیں وہ دلی والے؛ جو نقش کہ مٹ گیا اُس کا اب کیا نام لینا ہے، مرثیہ پڑھا کرو اور دلی والوں کو رویا کرو۔"

جس زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دلی میں تجویز ہو رہا تھا اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ "آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سود ثابت ہوں گے، نہ دہلی میں کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اس لائق رہی ہے، وہاں کے مسلمانوں پر، مسلمانوں کے گھروں پر، مسلمانوں کے محلوں پر اب تک نحوست برستی ہے، ان کی طبیعت، اُن کے اخلاق، راہ و رسم، سوشل حالت ایسی تبدیل ہوگئی ہے کہ جب کبھی دلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کی باتیں سُن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں، خدا نے دلی سے سب کچھ چھین لیا، ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔"

سرسید کی طبیعت میں ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ اُٹھانے والوں میں ہونی نہایت ضرور ہے۔ وہ دل بجھانے والی اور ہمت توڑنے والی تقریبوں سے ہمیشہ دُور دُور اور الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو جس قدر قومی اور ملکی اور مذہبی خدمات اُنھوں نے انجام دی ہیں اُس کا عشر عشیر بھی اُن سے سرانجام نہ ہو سکتا۔ سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ اُن پر نہایت سخت ہوا تھا، دو وقت اُنھوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک اُن کی حالت نہایت نازک رہی، مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور گھر میں کہرام مچا وہ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ کے . . چلے گئے اور جب تک لوگ اُن کو دفن کرکے نہ آئے وہیں چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر اس روز سے علیگڑھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جاکر گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے دلی کا غم بھلانے کے لیے دلی کی بود و باش ہی ہمیشہ کے

لیے ترک کر دی تھی۔ اُن کے بعض ہم وطن کہتے ہیں کہ اگر دلّی سے کچھ اُنس ہوتا تو وہ دلّی چھوڑ کر علیگڈھ میں مدرستہ العلوم قائم نہ کرتے، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر بنی اُمیّہ کو بغداد سے اُنس ہوتا تو وہ اُندلس میں جا کر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے۔ دلّی جو سیکڑوں برس مسلمانوں کا دارالحکومت رہا اور اس لیے پُرانے خیالات اور قومی و مذہبی تعصبات کا مرکز تھا وہاں سرسید کے منصوبوں کا پورا ہونا بلاتشبیہ ایسا ہی مشکل تھا جیسا مکہ میں اسلام کا نشو و نما پانا۔

اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلّی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا، فتح دہلی کے بعد جب وقت وہ میرٹھ سے اپنی ماں اور خالہ کی خبر لینے کو دلّی میں پہنچے اُنھوں نے تمام شہر کو بالکل ویران پایا، یہاں تک کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، پیاسوں کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی تو ایک صراحی پانی کے لیے اُن کو خود قلعہ میں جانا پڑا، جس دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اُس کو مقتول سنا یا مفقود، جس قلعہ میں سلاطین کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے اُس کے در و دیوار سے اُن کے خون کی بو آتے دیکھی۔ اگرچہ اُس وقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جشن سمجھتے تھے مگر سرسید جیسے ذکی الحس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا۔ دلّی کا وہ سناٹا دیکھ کر ایک ایسی چوٹ اُن کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخرکار ناسور بن گئی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر سچ پوچھیے تو دلّی ہی کی حالت دیکھ کر اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ غدر سے پہلے جیسے دلّی کے لوگ دنیا کے حالات سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں۔ سرسید کہتے تھے کہ "ایک دفعہ جو میں رہتک سے کسی تعطیل میں دلّی آیا تو وہاں کے ایک معزز آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے؟ اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے؟" وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "دلّی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو مٹکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مٹکاف تھا۔"

دوستوں کے ساتھ برتاؤ | جو برتاؤ سرسید کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانہ کے دستور

سے بالکل نرالا تھا۔ جہاں تک اُن کا حال دیکھا گیا اُن کی خوشی بلکہ اُن کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا، کام اور دوستوں کی ملاقات، اُن کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خالص و مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی وہ فی الواقع دوستوں کو زندگانی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔ اُن کا اس مقولہ پر پورا پورا عمل تھا کہ "اگر ساری دنیا قبضہ میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے" باوجودیکہ دن بھر میں اُن کا کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہ ہوتا تھا اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہیے، بایں ہمہ دوستوں سے کبھی اُن کا جی نہ اکتاتا تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے، ناواقف آدمی اُن کو پہلی ہی بار دیکھ کر نہایت عبوس اور خشک مزاج سمجھتا تھا مگر جس قدر اُن سے زیادہ ربط بڑھتا جاتا تھا اسی قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ "اَلرَّغْبَۃُ اِلَی الْکَرِیْمِ تُخَالِطُکَ وَتُقَرِّبُکَ مِنْہُ وَتَرْفَعُ سُجُوْفَ الْحِشْمَۃِ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ"۔(1)
کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "میں اُس کو (یعنی سرسید کو) ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں، میرا اور اُن کا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے، جتنی زیادہ اُن کی میری واقفیت بڑھتی گئی اسی قدر اُن کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی۔"

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جن کو وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیرخواہی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کے دل میں اُن کی جگہ کر دی تھی۔ انہیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دوستی یارانہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی اور اُن کی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔ سرسید کا گھر اُن کا ہوٹل یا سرائے تھا اور اُن کا دل ان کی مٹھی میں تھا۔ وہ جب اور جس قدر چاہتے اُن کے نام بغیر پوچھے چندہ لکھ دیتے تھے اور اُن کو طوعاً یا کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ "ایک روز امام محمد باقرؒ نے اصحاب سے

(1) یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر جھکو گے اُس سے زیادہ میل جول ہوگا اور مغائرت دور ہوتی جائے گی ۱۲

کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہی کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جس قدر نقدی کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لے؟ سب نے عرض کیا "لا واللہ یا ابن رسول اللہ" آپ نے فرمایا "بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہی" مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُن کے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں سے اُن کے ایک نہایت عزیز دوست خرچ میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُن سے چندہ مانگا ہو اور اُنھوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جبلی عادت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں ہاں مگر سید احمد خاں کی زبان میں ضرور جادو تھا کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا وہاں اُن کے ایک اشارے پر آنکھ بند کر کے سیکڑوں پو جاتے تھے۔

سرسید ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس طرح پر متواتر امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہی مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہی کہ "خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہی دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہی کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؟ لیکن اُن کا شکر یہ ہم پر واجب ہی۔ ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا ہم نے اُن سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہی اس کو بیباق کر دو اُنھوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجیے، جب تک زندگی ہی بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندہ کی باقی ہی کل دوسرے چندہ کی، اسی طرح باقی دار مر جاؤں گا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہی نہ ہوگی، مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو۔"

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ "درحقیقت یہی حال ہی، کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لیے چندہ نہ مانگتے ہوں۔ مگر ہمارے دوست بھی ہمارے

اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں ؎

"گر مکرر زلبت بوسہ گرفتیم مرنج سرخی لعل لبت بیں کہ چہ زیبا بودست"

انہیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی وہ جو کچھ چاہتے تھے سرسید کو کہہ بیٹھتے تھے، اُن پر ردّ در ردّ اعتراض کرتے تھے، اُن کے مذہبی خیالات اور رایوں پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، اُن سے ہر قسم کی ہنسی اور چہل کی باتیں ہوتی تھیں، وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیاں سہتے تھے مگر نہ کبھی سرسید کو اُن سے ملال ہوتا تھا اور نہ اُن کی خفگی یا جھڑکی کا بُرا مانتے تھے۔ اُن کے حسب حال یہ شعر تھا ؎

"تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب! بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد"

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت کا خیال پیدا ہوتا ہو تو اُن کو یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کا بیان ہے کہ "میں جنک سے میرٹھ جاتا تھا، جب دلّی پہنچا تو ایک دوست کے مکان پر ٹھیرنا ہُوا، وہاں میں نے سنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے ہیں۔ میں اُن کی خدمت میں پہنچا، اُنھوں نے فوراً میرا اسباب فرودگاہ سے منگوا لیا اور فرمایا کہ پانچ چار روز تم کو یہاں ٹھیرنا پڑے گا، پھر ہم تم یہاں سے ساتھ چلیں گے، میں ٹھیر گیا، اُنھوں نے شہر کے مشاہیر سے مجھ کو ملوایا۔ اتفاق سے محمد بخش خاں صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا، سید صاحب نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں اس لیے آپ کی گنجایش نہیں، مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گزرا کہ نصف کرایہ گاڑی کا مجھے دینا پڑے گا۔ غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلّی سے میرٹھ کو روانہ ہُوا راہ میں اپنی نالایقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، اُنھوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے اپنی اس کمینہ حرکت سے ایسا انفعال ہُوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ آخر مجھ کو معافی مانگنی پڑی اور پھر

کرایہ کے باب میں اُن کے سامنے دم نہیں مارا " اسی طرح اُنھوں نے ایک دوست کو کسی قدر روپیہ کا چک بھیجا مگر اُس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپے نہ لوں گا اس کے لیے مجھ سے بہتر مصرف موجود ہیں۔ سرسید نے اُس کا جواب لکھا کہ " آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس میں چک مرسلہ کا ذکر تھا اُس کو پڑھ کر میں تم پر نہایت خفا ہوا، جو محبت و یگانگی مجکو تم سے ہے وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات لکھتے جو ایک غیر شخص کو لکھنے زیبا ہیں۔ خبردار اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو۔ اگر تم رقعہ مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آزردگی ہوگی اور یقین ہوگا کہ تم یگانگی نہیں سمجھتے، اب دو بارہ اس باب میں نہ لکھنا "

جس دوست کے ساتھ سرسید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر موردِ عتاب رہتا تھا مگر اُس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اُس کے مورد ہوتے تھے۔ خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں جن پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی وہی آج سب سے زیادہ سرسید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخواہ اور غمگسار نہیں پاتے۔ سرسید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو اُنھوں نے علالت کی حالت میں اپنے پیشدست سے لکھوا کر خان بہادر کو رامپور بھیجا تھا، نہ اُس میں عرفی شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے مگر اُس کے ہر ہر لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں " مکرمی زینو! ابھی تمھارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اُس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھکو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اُس کو بُرا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح[1] کو اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو کہ

(۱) خان بہادر ہمیشہ بلاناغہ صبح کے چار بجے سرسید کی کوٹھی پر آتے تھے اور گھنٹا آدھ گھنٹا وہاں ٹھیر کر پھر ہوا خوری کو جاتے تھے یہ اُس صبح کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۲

ہرگز فراموش نکند، کا نقشہ ہو گیا ہے۔

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ " میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں، میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی اُس وقت سے آج تک ایک بات بھی اُن میں ایسی نہیں دیکھی جس کو بُرا کہہ سکوں۔ اس شخص کیسی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے"

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدرآباد سے آکر وطن مالوف کی طرف رُخ نہیں کیا بلکہ علیگڈھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ اٹاوہ میں جاکر قیام نہیں کیا، اور اگر حفظِ صحت کا خیال اُن کو مجبور نہ کرتا تو غالباً وہ سرسید کی زندگی میں علیگڈھ کو چھوڑ کر کبھی بھی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے

" درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتے   جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را "

سرسید کی خفگی اور غصہ میں جو کشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ سید مہدی علی کو ہمیشہ اُن کے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " مہدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا" باوجود اس کے سید مہدی علی کا معاملہ اُن کے ساتھ شمع و پروانہ کا سا تھا۔ الہ آباد کے جلسہ کانفرنس میں جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں انھوں نے اپنا لکچر دیتے وقت تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا خصوصاً اُس وقت کا سماں کبھی دل سے فراموش نہ ہوگا جب کہ اُنھوں نے سرسید سے مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے تھے ؎

دلبرانِ ماہ پیکر دیدہ ام   در جمالت چیز دیگر دیدہ ام
ایں چہ نورست اینکہ تاباں از توہست   ہفت کوکب نور افشاں از توہست
تو کمالِ از کمال کیتی   مظہرِ نورِ جمالِ کیتی

سر سید نے ایک آرٹکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہی مسٹر ہٹلی کا یہ قول نقل کیا ہی کہ "انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیے کہ اُس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے۔" اس قول کو نقل کرکے وہ خود لکھتے ہیں کہ "اس کا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہی وہ نہایت عمدہ ہی، مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ برتنے کی ہی اُس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ نری مکّاری ہی۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہی، اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ سچ ہی کہ بعضے دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انھیں کو دغاباز اور بُرا کہتی ہی، دوست پر بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتے۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیے۔"

سر سید نے جو کچھ لکھا ہی یہ خاص اُن کے دلی خیالات تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہی اُن کا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد رہا۔ وہ بے شک زود آمیز اور زود پیوند نہ تھے بلکہ اس شعر کے حقیقی مصداق تھے ؎

"نہ عیب تست کہ بیگانہ وار مے گزری کہ ہر کہ زود گسل نیست دیر پیوند ست"

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا پھر خواہ وہ شخص ہندو ہو یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان، اُس سے کسی طرح کی مغایرت اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بمقام علیگڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے یہاں نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا "اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہی مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہی۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہی اس لیے اُسی کا گیت گایا جاتا ہی ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر راس

سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے، جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور اُن کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔ اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے اُن کا نام اُس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اُس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔"

"دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ ڈاڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ اُن کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

سرسید جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اُس کی طرف سے فی الواقع اُن کا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا کہ اُس کی نسبت برائی کا کبھی تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعایت یا دراندازی اُن کو دوست سے جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں، بدگمان نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُن کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہرداری کا ملنا فی الحقیقت اس شخص کو نہ آتا تھا۔ اُن کے حال پر بعینہ یہ شعر منطبق ہوتا تھا ؎

مرغان دلم را کہ ایں مرغ وحشی ز بامے کہ برخاست مشکل نشیند

وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " میں تو اُس شخص کو کافر بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہو گی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور برا کہنے کو بھی دوستی پر محمول کرتا ہوں اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے، مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر رشتۂ محبت جو نہایت نازک ہے، کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی اور محبت ایسی سخت چیز ہے کہ ہتوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی، مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ

باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنےٰ سی خلافِ محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے اُس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔"

سرسید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کیجیے۔ اُس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ "جو ملال اُن کی طرف سے میرے دل میں ہوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔"

اُن کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ وقرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خاں کی نسبت لکھتے ہیں "جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے درحقیقت وہ بہت کم ہے، اُس کافر غارت کن ایمان کو جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہوگیا، میں رشتے وناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔"

اگرچہ سرسید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر دوستی کے معاملات میں بڑے کنسرو ٹو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص ومخلص دوستوں سے اُسی قسم کی توقعات رکھتے تھے جیسے اگلے زمانہ کے وضع دار اور باوفا دوستوں کے حالات سُننے میں آئے ہیں۔ قطع نظر پرائیوٹ باتوں کے پبلک معاملات میں بھی جو زیادہ مہتم بالشان ہوں، اُن کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی کہ دوست اُن کی رائے کے مؤید ہوں اور اگر کوئی دوست اُن کی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو اُن کو حد سے زیادہ ملال ہوتا تھا۔

جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہوا وہ اپنے ہر ایک دوست سے اس بات کے متوقع تھے کہ اُن کے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں اُن کو مدد نہیں دی اُن کے ساتھ وہ ربط وضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں اُن کے مددگار تھے اُن کو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں

سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے ۔ خان بہادر برکت علی خاں کی نسبت اُن کی اخیر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان اُن کی یادگار میں تیار کرائیں ۔ سردار محمد حیات خاں کو اپنا قوت بازو سمجھتے تھے ۔ قاضی رضا حسین رئیس پٹنہ، خلیفہ سید محمود حسن خاں وزیر پٹیالہ، مولوی چراغ علی اور میر ظہور حسین کے مرنے کا اُن کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا ۔ نواب انتصار جنگ سے اگرچہ وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزردہ ہو گئے تھے مگر چونکہ مدرسہ کی امداد اُن کی برابر ایک آدھ کے سوا کسی نے نہیں کی اس لیے وہ ملال چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور اُن کی ویسی ہی جگہ دل میں ہو گئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی ۔ نواب عماد الملک کو اُن کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور مدرسۃ العلوم کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور اُن کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نورِ مجسم ہے ۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نسبت ایک ناواقف آدمی نے اُن کے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے انھوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی ۔ سرسید نے بدمزہ ہو کر اُن کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسہ میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق ان کے لکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اُس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے باعث فخر ہے اُس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا ۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ جنھوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی ۔ اور سید زین العابدین، میر تراب علی، سید مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، راجہ جے کشن داس، حاجی اسمٰعیل خاں اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ مثل اپنے اعضا و جوارح کے سمجھتے تھے ۔ الغرض یہ شخص دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا ۔

واذا رأیت صدیقہ وشقیقہ ۔ لم تدر اَیُّھُمَا ذوُو الارحام

(یعنی تو اُس کے دوست اور سگے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کونسا ہے اور دوست کونسا)

نوکروں کے ساتھ تعلق | اسی جبلی مہر و محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور

گے بندھوں کو تا بقدور عمر بھر اپنے ساتھ نباہنا چاہتے تھے جس شخص کے قدم اُن کے ہاں جم گئے پھر وہ اُس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُن کے دل سے نہ اُترا، ہمیشہ اُن کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں اُن کے ہمراہ رہا اور آخر انھیں کی رفاقت میں مر گیا۔ اُس کے بعد چھوٹے بھائی کو داروغگی ملی جس کی آوارگی اور بدچلنی حد سے گزر گئی تھی مگر وہ بھی اخیر دم تک اُن سے نہ چھوٹ سکا۔

حافظ عبدالرحمٰن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے اُستاد تھے، ۵۴ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت اُنھوں نے سید محمود اور سرسید کو بلایا جب دونوں کو دیکھ لیا فوراً روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو اُن کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج و الم رہا۔ منشی ذوالفقار جو اُن کے بنج کا حساب کتاب لکھتا تھا اُس کے مرنے کا بھی اُن کو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا خمیر مہر و محبت سے ہوا تھا۔

فراخ حوصلگی | سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اُس کو یا اپنی ضروری آسایش اور سچی عزت اور نیکنامی کے ذرائع میں صرف کیا، یا کُنبے کی خبرگیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اُٹھایا۔ وہ ۲۶ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصہ میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے۔ جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد اخیر دم تک چھ سو روپیہ ماہوار پنشن کی آمدنی رہی مگر کبھی اُن کی آمدنی خرچ کو مکتفی نہیں ہوئی۔ اُن کے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ جب دلّی کی

منصفی سے اُن کو ترقی کے ساتھ باہر بھیجے گئے تو اُن کی والدہ نے جو اُن کی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں، صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اُسی قدر خرچ بڑھ جائے گا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ۔"

ابتدا سے اُن کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی اُس پر روپیہ صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے، کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی اُن کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گُنی قیمت پر بھی ملی تو اُس کو لیے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا اُن کو شوق ہوا، صدہا روپیہ اُس میں صرف کر ڈالا۔ کسی تصنیف کے لیے میٹریل جمع کرنے میں، کسی کتاب کے چھپوانے کے اہتمام میں، کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ زیادہ خرچ کرتے رہے، ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری مگر کبھی حق تصنیف سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی۔ اُن کی کتابیں اور مضامین جس کا جی چاہتا تھا چھاپ لیتا تھا، انھوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ "بجنور میں غدر سے پہلے تین مسجدوں کے بننے میں انھوں نے کافی مدد دی، موضع بینسوبہ جو بجنور اور دلّی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرائے تھی جس میں سر سید آتے جاتے کھانا کھانے کے لیے ٹھیرا کرتے تھے اُس سرائے میں بھٹیاروں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی، اُس مسجد کی ابھی بنیادیں ہی بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاروں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اس لیے مسجد کی تعمیر بند ہوگئی۔ سر سید نے اُس کی تعمیر ناتمام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلّی سے اپنے رشتہ داروں مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اُس کو پورا کر دیا۔ پھر خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی، اُس کے بنوانے میں بھی انھوں نے بہت مدد دی، مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہوگیا، غدر

کے بعد سرسید نے فوراً اس کی تعمیر جاری کرائی اور اُس کو مکمل کرا دیا۔ اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنواتے تھے، سرسید نے روپیہ بھیجنا چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا، سرسید نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا"۔ مگر جب وہ خیالات بدل گئے تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے جب اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ "میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے"۔

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُن کی نسبت بے شمار مثالیں سننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صدہا خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں کہتے تھے کہ "مرادآباد میں جو شکستہ حال اشراف صورت مسلمان اُن کے مکان کے برابر سے گزرتا اُس کو خود بلا لیتے تھے اور علیحدہ لے جا کر اُس کا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو"۔ اُن کے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت ہے کہ "مدت تک غدر کے بعد اُن کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدر اخراجات ضروری لے کر باقی کل روپیہ دلی میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسید کا یہ برتاؤ دیکھ کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک اور مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسید اُن کے اصل حال سے واقف ہونے کے بعد بھی اُن کے ساتھ اُسی طرح سلوک کرتے تھے"۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ "مرادآباد میں جب کہ نواب لفٹنٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوانب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے، ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سید صاحب کے مکان پر آئے اور اُن کو الگ لیجا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا۔ مگر میرا آدمی اسباب لے کر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سر و سامان رہ گیا ہوں۔ سرسید نے اُن کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو چھل دے کر

تنگ کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ پھر تشریف لائے اور کچھ اور طلب کیا، سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ اُن کے پاس آیا اور ہر دفعہ اُس کو کچھ دیا اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا۔"

اُس زمانہ میں سرسید کو یہ خیال تھا کہ سیکڑوں شریف[۱] و رخاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس حیلے سے روٹی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے اُنھوں نے مدرستہ العلوم قائم کیا اُن کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا۔ وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کار خیر سمجھتے ہوں، اُس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُن کو ہمیشہ کے لیے دریوزہ گر بنانا ہے۔ اسی لیے اُن کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہوگئی تھی۔ جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اُس پر دوڑ دبک کرتے تھے اُس کو دیکھ کر ناواقف آدمی اُن کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا۔ مگر وہ اُن کا غصہ اور دوڑ دبک کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا، اُن کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لیے بداخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سرسید کی جوانمردی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُن کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے اپنے سایہ سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد اُنھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی جن کی نسبت حکام کو اشتباہ ہوگیا تھا، صفائی کرائی، بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے باغیوں کی فوج میں شامل ہوگئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے، اُن کو بطور خود وہاں سے بلاکر اُن کی تحقیقات کرائی اور اُن کی بریت پر خود گواہی دے کر اُن کو بری کرایا۔ مرادآباد کے مسلمانوں کو بعض ناخداترس ہندوستانیوں کے شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب اُن کو پھانسیاں دلوانے پر کمربستہ تھے، بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے اُن کے درماندہ وارثوں کی پنشنیں مقرر کرائیں۔ مولانا عالم علی مرحوم

(۱) نوٹ بر صفحہ آئندہ

مراد آبادی کی صفائی کرانے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد فایدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاو اس شخص کا تھا اُس کا ایک ادنےٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علیگڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہوگیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کی توقع اور حوصلہ سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں ان کا رہنا ہوا یہ لوگ اُن کے نہایت شکرگزار اور ثناخواں رہے۔ اِن کے ایک دوست کا بیان ہے "میں بنارس میں اُن سے ملنے گیا تھا، دریا پر پہنچا تو شام ہوگئی تھی اور کشتی کی آمدورفت بند ہوگئی تھی، ہر چند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر اُنھوں نے نہ مانا لیکن جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگا دی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینا چاہا مگر اُنھوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں ہم اُن کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے" ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدو . دل . کا سنا ہے جو سرسید کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعای یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لیے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگے؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے، سرسید نے کہا میں تم کو پچیس روپیہ مہینا دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اُس نے خوشی کے مارے

---

(۱) (نوٹ صفحہ ۶۴۴) مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمیدالدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھا جو سرسید کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ "مولانا امام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے ایام غدر میں اُن کے بے گناہ قتل ہونے پر عالی حضرت نے خاک نانی صاحبہ و دیگر پسماندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کرا دیا تھا جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندہ نے والدین سے سنا تھا کہ جو احسانات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں"

بڑھ کر سرسید کی داڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اُس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لیے اس کو بقدرِ ضرورت دیتے رہے اور اُس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اُس کا چڑھا ہؤا تھا حساب کرکے اُس کے حوالے کر دیا۔

جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلّی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُن کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو اُنھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلیے مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں؟ انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہؤا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا تو فکر کیجیے نہیں۔ خدا رازق ہے، لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا اور اس سے میری آیندہ ترقی رُک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے اُن کے ساتھ ہو لیے اور جب تک رہتک رہنا ہؤا سب خرچ سید صاحب کے ذمہ رہا۔

سرسید کی اس قسم کی فراخ حوصلگی کی مثالیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجایش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں اُن کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحۂ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے، مگر سرسید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنیٰ تھی

درحقِ او مدح و درحقِ تو ذم　　　　درحقِ او شہد و درحقِ تو سم

سرسید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو اُنھوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام کیں وہ کون کرتا؟

انھوں نے ایسے کاموں کے لیے جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی اُن کو بالکل عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اگر وہ اپنے گھر کو مہمانسرا نہ بناتے تو علیگڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا، اگر وہ ہزارہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لیے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے تھے، کیونکر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے، اگر وہ یورپین طریقہ پر ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں، گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں، اُن کے ہم نوالہ ہیں۔ جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اُس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سید کو چار و ناچار فیلبانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھاٹک بغیر نبھ نہیں سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو کوئی اعلیٰ درجے کا انگریز یا اعلیٰ درجے کا نیٹو اُن کی طرف رُخ نہ کرے اور ایسی موٹی اسامیاں دام میں نہ آئیں تو چندہ کی بھاری بھاری رقمیں کن سے ہاتھ لگیں۔"

بہرحال اس باب میں سرسید کی ایک خاص حالت تھی، اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو اسی طرح فایدہ پہنچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے اور بے شک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اُس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مسٹر سموئل اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ "جو شخص اپنے روپیے سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ بہت ہی ذلیل آدمی ہے۔ جوانوں کو خیال رکھنا چاہیے کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جا کر خست نہ بن جائے اور جو کام (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرض اعظم تھا وہی گناہ عظیم نہ بن جائے۔"

اگرچہ سرسید کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری اور اُن کی حیثیت ایک متوسط الحال

شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی مگر خدا تعالیٰ نے اُن کا حوصلہ بمقابلہ اُن کی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا، اس لیے اُن کی آمدنی کبھی اُن کے اخراجات کو مکتفی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو جو مقروض ہوگئے تھے، اس طرح لکھتے ہیں "قرضہ کی پریشانی بلاشبہ بہت رنج دہ ہے جس کے مزے سے میں خوب واقف ہوں، بہت کم مسلمان ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا نہ ہوں، مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دے لیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے۔ میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ "صاحبُ المالِ کافر" جس پر حضرت ابوذر غفاری کا یقین اور عمل تھا کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے اس بحث کو چھوڑ دو، جو اُس کی مراد ہو وہ ہو۔ لیکن ہم ابوذر تو بن نہیں سکتے مگر خدا کی رحمت ہے جو اُس نے ہم کو مقروض رکھ کر کفر سے بچایا ہے۔ پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی ہے" معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ ہوسکا تب اس حدیث پر یقین ہوا؟ درحقیقت یہ اُن کا حسن بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ روپیہ پیسے کی محبت سرے سے اُن کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر اُن کی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقروض اور تہیدست رہے۔

سرسید کے ایک دوست ایک زمانہ میں اُن کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جب مہینا ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر اُن کے دکھانے کو لے گیا، سرسید نے کہا "بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں، یونہیں چلنے دو۔ میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا" حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے؟ ولیم پٹ جو اُن لوگوں میں سے تھا جنوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا ہے، اُس کی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ "نہ اُس کے بیوی تھی نہ بچے، نہ محتاج رشتہ دار تھے اور نہ اسراف کی عادت تھی، باوجود اس کے جب

وہ مرا تو ہؤس اوف کامنس کو اُس کا قرضہ ادا کرنے کے لیے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا پڑا۔ اگر وہ ہفتہ میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لیے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہو جاتا۔ اُس کے نوکروں کی لوٹ نہایت حیرت انگیز تھی، ایک ہفتہ میں صرف گوشت کا بل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب مُرغ مچھلی اور چائے کا۔

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیر اعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے مگر خانگی انتظام کے متعلق اُن کی بے اعتنائی نسبتہً ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لیے وہ اخیر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اُس کا قرضہ ادا کرنے کی متکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ چھوڑ چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا اور اسی لیے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، جس طرح کہ اُس نے وارثوں کے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی اسی طرح قرضہ کا بوجھ کسی پر نہیں ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ قدر قلیل کسی کا دینا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پولیٹیکل پنشن جو اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے، اس قرضے کے لیے کافی سے بہت زیادہ ہے۔

ایک دوست نے سرسید کے ایک رشتہ دار کا یہ مقولہ بیان کیا کہ سید احمد خاں نے اگرچہ ناجائز طور پر کبھی ایک خرمہرہ نہیں لیا مگر اُن کی تنخواہ اور رجسٹری اور پولٹیکل پنشن کی اس قدر آمدنی تھی کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتے اور فضول خرچ میں روپیہ برباد نہ کرتے تو آج اُن کی اولاد کے برابر دلّی میں بہت ہی کم صاحب جائداد نظر آتے۔ میں یہ سن کر چپ ہو رہا اور سعدی شیرازی کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔

اے کہ آگاہ نہ حالِ درویشاں را ۔۔۔ تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرست ایشاں را

انتقام کا خیال نہ ہونا | مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی اُن سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہر شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اُس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ برائی کا بدلا

لینا تو درکنار اُس کو کسی کی بُرائی یاد بھی نہیں رہتی تھی - بلاشبہ محمڈن کالج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے اُس کو قایم کیا تھا اُن میں رخنہ ڈالنا اُس کو حد سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا مگر جن لوگوں کی بُرائیاں اُس کی ذات تک محدود تھیں اور کالج تک اُن کا علانیہ طور پر کچھ اثر نہ پہنچتا تھا اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی بُرائیاں اُس کو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں؟

حکایات لقمان میں ایک حکایت لکھی ہی کہ " ایک مچھر بیل کے سینگ پر آ بیٹھا اور یہ سمجھ کر کہ بیل پر میرا بوجھ پڑا ہوگا اُس سے کہا کہ اگر میرا بوجھ تجھ پر شاق گزرا ہو تو کہہ دے تاکہ میں اڑ جاؤں بیل نے کہا اے نادان مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو مجھ پر بیٹھا بھی ہی یا نہیں چہ جائیکہ تیرے بیٹھنے سے مجھ کو کچھ تکلیف ہوئی ہو " بعینہٖ یہی حال لوگوں کی بُرائی کے مقابلہ میں اس شخص کے تحمل اور حوصلہ کا تھا -

اُن کے ایک دوست راوی ہیں کہ " مراد آباد میں جبکہ سرسید وہاں صدر الصدور تھے محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سرسید سے کچھ رنجش تھی وہ اکثر گمنام عرضیاں ان کی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا - ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہُوا تھا، اُس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہی اور اُن کے گھر میں اُس کی لاش موجود ہی، فوراً تلاشی لی جائے - اُسی وقت پولیس کا عملہ اُن کے مکان پر چڑھ آیا - سرسید نے مکان میں پردہ کرا دیا اور تلاشی لی گئی - مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی - سرسید کو اس کا نہایت رنج ہوا، مراد آباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی برخاست کیا گیا - سرسید اور اُن کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہوگیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی - جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہوگیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسید کے ایک معزز یورپین دوست کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پاکر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھیرے تھے، اُن کو ایک لائق انگریزی داں کی ضرورت ہوئی - چونکہ سرسید اُس کلرک کی انگریزی لیاقت سے

واقف تھے اُنھوں نے اُسی کی سفارش کی اور اُس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اُس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھوکر لے گئے۔" جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں یہ کہتے تھے کہ "مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اُس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ بُرائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، مگر اُس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دو سو کا نوکر رکھوا کر بھیج دیا۔ اُس نے کہا کہ حقیقت میں سید احمد خاں ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اُس کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے اُس کی نجات ہو جائے۔"

جب رفیق ہند میں سرسید کے خلاف نہایت سخت سخت آرٹکل شائع ہونے لگے اور منشی سراج الدین اڈیٹر سرمور گزٹ نے اُس کا جواب لکھنے پر قلم اٹھایا تو سرسید اُن کو لکھتے ہیں:

"میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۰ جنوری پڑھا، بلاشبہ میں آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے، ممنون اور احسانمند ہوں اور آپ کو اُس تحریر کی نسبت جو اُس پرچہ میں ہے، بوجہ جوش محبت معذور سمجھتا ہوں، مگر جانے دو، جو جس کا دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُن کا دل خوش ہوتا ہے خوش کر لینے دو، تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط[1] جناب خان بہادر برکت علی خاں صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اگر اُن کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا ..... تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو اور اس کا بھی تم کو یقین ہے کہ جو لوگ میری نسبت عیب لگاتے ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں، تو تمھارے خوش رہنے کے لیے اور مجھکو خدا کا شکر کرنے کے لیے کہ وہ عیب اُس شخص میں جس کو تم دوست رکھتے ہو نہیں ہے، کافی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے بس بُرا کہنے والوں کی بُری بات کا بھی نیک پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

---

(۱) یہ اُس گمنام خط کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے جلسۂ کانفرنس واقع ۱۸۸۸ء میں جانے سے ایک دن پہلے سرسید کے نام علیگڑھ میں آیا تھا اور جس میں یہ سخت الفاظ لکھے تھے کہ "اگر تم لاہور میں آئے تو تمھاری داڑھی جوتے سے مونڈی جائے گی اور جو حال کل سر بازار تمھارے دوست (یعنی خان بہادر) کا کیا گیا ہے اُس سے بدتر تمھارا حال کیا جائے گا" ۱۲

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو پھر سرسید نے اُن کو اسی مضمون سے متعلق دوسرا خط لکھا ہی۔ اُس میں کہتے ہیں "ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہی کہ سب کی بھلائی چاہیں برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام ہی؟ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے برائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہی۔ جو لوگ برا کہنے والے ہیں اُس کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہی اُس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہی، اگر نہیں ہی تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہی۔ برا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہیے کہ کون ہی؟ دنیا میں ہی بھی یا نہیں؟ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہی۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ . . . . . صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہی کہ اُن سے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں، کچھ ہی کرو آزار ہی پہنچے گا۔ پس گلہ کیا ہی؟ کیا تم دنیا کے بچھوؤں سے گلہ کرتے ہو؟ اور کیا وہ کسی کی دشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؟ پس اُن کے حال سے بحث مت کرو، لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا اُن کے ساتھ برتاؤ کریں۔ اگر ہم سے معافی چاہتے ہیں ہمارا اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا میری داڑھی مُنڈ گئی؟ آپ اگر دیکھ لیں بدستور ہی، بلکہ جو دو چار بڑھ ہی گئی ہوگی مجھے تمام عمر افسوس رہے گا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خاں صاحب کے پاس بھیج دیا؟ اگر خاں صاحب ممدوح کی نسبت اُس میں متوحش بات نہ لکھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ خیر! جو ہوگیا اُس پر افسوس سے کیا فائدہ ہی؟

"میرے نزدیک منشی . . . . کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیے۔ خدا کی دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہی، ہر ایک اپنا کام کرتا ہی، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ تمہارا کیا کام ہی؟ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب، دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل رکا ہوا ہو اس سے مت ملو کیونکہ اُس سے مل کر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑے گی، نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہی، اسی طرح اُن کی باتوں کی پروا نہ کرنے میں بالکل آرام ہی۔"

اگرچہ سرسید فطرۃً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض اُن کی سرشت میں داخل تھا مگر اُن کی ابتدائی روک ٹوک اور حُسن تربیت سے یہ تمام ملکات اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہوگئے تھے۔ اُسی نیک اور عاقل ماں نے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بُروں کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلا ہی لینے کا خیال ہو تو اُس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے، اُسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اُسی تعلیم و تلقین کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اُس کے واجب القتل ہونے کے فتوے حرمین میں جاکر لکھوائے، جنھوں نے اُس کو کافر و ملحد و کرسٹان اور دجّال ٹھیرایا، جنھوں نے گمنام خطوں میں اُس کو گالیاں لکھ کر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں، اُن کی نسبت اُس نے علیٰ رؤس الاشہاد یہ کہا کہ "میں اپنے کسی بھائی سے کسی ہم جنس سے نہ دنیا میں بدلا لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں، میں نہایت ناچیز ہوں مگر اُس رسول کی ذرّیت میں ہوں جو رحمۃٌ للعالمین ہے، میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھ کو بُرا کہا، جنھوں نے مجھ پر اتہام کیا یا آیندہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔"

فی الحقیقۃ اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے اور بُرائیوں کا رُخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سرسید کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت غیظ و غضب پر مجبول ہوئی تھی مگر ماں کے حسن تربیت نے گویا اُن کی ماہیت بالکل بدل دی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں نے بیٹے کو کبھی کسی ماماں یا نوکر پر بھی سختی یا بدزبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی کوئی ایسی حرکت اُن سے صادر ہوگئی تو اُن کو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر فراموش نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ایک نوکر پر زیادتی کرنے کے جرم میں اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب اُنھوں نے نوکر سے قصور معاف کرالیا، تب گھر میں آنے کی اجازت ملی۔ اگرچہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا

ہے مگر جبلت نہیں بدل سکتی۔ لیکن عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی توسنی اور سرکشی کو چالاکی سے بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کے غیظ و غضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصلت معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن کا جبلی غیظ و غضب فی الواقع بیجنسوں کی حمایت اور جوش ہمدردی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کو پرائیوٹ معاملات میں سوا اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آجاتا تھا، بہت ہی کم غصّے ہوتے دیکھا ہے جو کچھ اُن کو غصّہ اور افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالائقی پر تھا، یا اُن کی تباہی و بربادی پر، یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بے جا تعصبات اور اُن کی پولٹکل بے وقعتی پر۔

ممکن ہے کہ بمقتضائے بشریت کسی کی طرف سے اُن کے دل میں کچھ رنج ہو مگر اُن کے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اُن کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے اُن کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اُس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اُس کا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی اُس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھیڑ چھاڑ اور ہزل اور حرف گیری و کج بحثی سے پاک رکھتا تھا اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے اڈیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور پنچ اخبار وں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا " کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائق اخباروں کے نامہذب ہونے کو ہے ؟ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ . . . . آپ کے اخبار ۲۰ اپریل میں چھپا ہے، آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع تھا کیا اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھو دے۔"

اُسی اڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں " میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لگ

کیا کیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؟ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؟ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں غنیمت ہیں ہمیشہ اُن کے ساتھ دوستانہ برتاؤ چاہیے۔"

ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد اڈیٹر سرمور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بہاول پور کی شکایت لکھدی کہ وہاں سے علیگڑھ کالج کے لیے کچھ چندہ نہیں پہنچا۔ سرسید نے فوراً اُن کو متنبہ کیا اور لکھا کہ "سرکار بہاول پور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لیے اور چند روز ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے مرحمت کیا ہے۔ چونکہ اس کی اطلاع آپ کو ضروری تھی اس لیے فی الفور یہ مختصر نیاز نامہ روانہ کرتا ہوں۔"

الغرض اُس کے تمام جذبات اور تمام ہیجان ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے، اُس کا غصہ تھا تو قوم کے لیے شکایت تھی تو قوم کے لیے، حرص و طمع تھی تو قوم کے لیے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لیے، اپنے لیے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

خود غرضی کا الزام سرسید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے۔ بے شک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع معنوں میں لیا جائے تو ایک لحاظ سے اُن کو خود غرض کہا جا سکتا ہے۔ جو عظیم الشان کام انھوں نے قوم کی ترقی کے لیے اختیار کیا تھا اور جس کے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست ہونا غیر ممکن سمجھتے تھے بلاشبہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان یک دل و یک جان ہو کر اپنی تمام ہمت، طاقت اور استطاعت اُس کام کے پورا کرنے میں صرف کر دیں اور جب تک اُس کو منتہائے ترقی تک نہ پہنچا لیں دوسرے کام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں؟ اور آیا فی الواقع جیسا کہ وہ سمجھتے تھے مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک رستہ تھا کہ سب مل کر اُن کے کام میں مدد کریں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی ہے تو ہم کو اپنی قوم کی بہبودی کے لیے ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اور پیدا ہو جائیں تو ساری قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔

دنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو ہر ایک کے کام میں مدد دینے اور ہر ایک گاڑی میں کندھا لگانے کو موجود ہیں لیکن ایسے افراد صدیوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اُن کو اپنے کام کی بڑائی کا ایسا یقین ہوتا ہے کہ اُس کو تمام دنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چونکہ اور لوگ بھی جوں جوں اُن کے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہے۔ اُس کو ویسا ہی یقین کرتے جاتے ہیں اس لیے اُن کے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

حُبِّ جاہ کا الزام | بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سید احمد خاں نے جو کچھ قوم کی خیر خواہی کے پردہ میں کیا اُس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل ہو جائے مگر چونکہ اُس کا استحقاق نہیں رکھتے اس لیے کبھی اپنی مراد کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزت کے لائق کام کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی آڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں نہ اُن سے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود اُن کو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو یا نہ ہو، وہ قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ "(۱) فَوِّضْ مَدْحَكَ وَذَمَّكَ إِلَى أَفْعَالِكَ فَإِنَّهَا تَمْدَحُكَ بِصِدْقٍ إِنْ أَحْسَنْتَ وَتَذُمُّكَ بِحَقٍّ إِنْ أَسَأْتَ"

جو لوگ سرسید کی نسبت ایسے پست خیالات رکھتے ہیں اُن کے جواب میں اُس سے زیادہ کہنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسید کی دعوت کے جلسہ میں، جو نظام کلب حیدرآباد میں سنہ ۱۸۸۴ء میں منعقد ہوا تھا، کہا تھا کہ "کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا

---

(۱) یعنی اپنی تعریف اور مذمت اپنے کاموں کو سونپ دو کیونکہ وہی تمہاری بھلائی کے سچے مداح اور تمہاری بُرائی کے سچے مذمت کرنے والے ہیں ۱۲

ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے مفید کام کرکے دکھائے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔"

اپنی رائے پر وثوق | منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف جس کو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اُن میں یہ تھا کہ اُن کو اپنی ہر ایک رائے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کسی اور معاملہ سے ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا بُرہان یا مخالف پارٹی کی مخالفت سے اُس میں تزلزل آنے والا نہیں۔ اسی لیے اُن کو عموماً خودرائے اور ہٹیلا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُن کی ہر ایک رائے جس پر اُن کو اصرار ہوتا تھا ہمیشہ صائب اور غلطی کے پاک نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر اُن کو اپنی رایوں پر ایسا وثوق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، نہ ہوتا تو جو بڑے بڑے کام اُن سے بن آئے اُن میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ اُنھوں نے قوم کی بھلائی کے لیے جتنے کام اٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور اُن کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ ولایت میں جیسا کہ اُن کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے منصوبوں سے سید مہدی علی خاں کے سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے، کیونکہ کسی سے یہ امید نہ تھی کہ اُن کی رائے سے اتفاق کرے گا اور اُن کی ہمت بندھوائے گا۔ پھر جب ہندوستان میں آکر اُنھوں نے اپنے منصوبے علی الاعلان پورے کرنے کا ارادہ کیا تو جیسا اُن کو خیال تھا، ہزاروں مخالف کھڑے ہو گئے اور جہاں تک ہو سکا اُن کے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اس کے ہر ایک کام میں اُن کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مخالفتیں روز بروز کم ہوتی گئیں اور آخر کار اُن کے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اگر اُن کی رائیں متزلزل ہوتیں اور اُن کو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی تھی جن کا سارا زمانہ مخالف ہو، اور کیونکر اُن کی کوششیں اس درجہ تک کامیاب ہو سکتی تھیں۔ پھر جس قدر اُن کی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے گئے اور جس قدر لوگوں کی مخالفت بیجا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی اسی قدر اُن کو اپنی

رایوں پر زیادہ وثوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک رائے پر اُن کا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ لب جاہو اس خصلت کو اُن کی خودرائی اور ہٹیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہو یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فایدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اُس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اُس کو پورا کرکے چھوڑتے تھے۔ اُن کی رائیں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں، وہ اپنی غلط رایوں پر بھی ویسا ہی اصرار کرتے تھے جیسا صحیح رایوں پر، کیونکہ وہ اُنھیں رایوں کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

باایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خودرائی یا جو وثوق کہ اُن کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سُن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہر چند کہ اُن کے دوست اُن تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ میں اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے، مگر درحقیقت ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کامیابی باوجود سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے سرسید کو اپنے مقاصد میں ہوئی اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں جو کہ قوا کے انحطاط اور فتور کا زمانہ تھا، اُن کو اپنی اصابت رائے پر جتنا کہ چاہیے تھا اُس سے زیادہ اعتماد ہو جائے اور وہ اپنی عقل اور سمجھ کو خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں اس کے سوا اخیر عمر کے صدمات نے بھی اُن کے دل دماغ پر کچھ کم اثر نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اس کے انسان کا انتہائے کمال یہی ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا بجائے اس کے کہ اُن کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو، اُن کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

" شخصٌ الأنامُ إلى کمالِکَ ۔ فاستعِذْ   مِنْ شرِّ أعیُنِهِمْ بِعَیبٍ واحِدٍ "

(یعنی تیرے کمالات دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں سو ان کی نظر بد سے بچنے کے لیے کسی عیب کی پناہ لے)

مذہب سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق جو کچھ اُن کی تصنیفات سے ثابت ہوا، بقدر ضرورت بیان ہو چکا ہے یہاں ہم اُن کے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو اُنھوں نے اپنے پرائیوٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کیے ہیں اور جن سے ان کے دل کی اصلی کیفیت اور اصلی واردات منکشف ہوتے ہیں، کیونکہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھ کر لکھا جاتا ہے، اور جہاں تک مصنف کے امکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جن کو وہ اپنے نزدیک مخاطب صحیح جانتا ہے۔ برخلاف اس کے پرائیوٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمراز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جن میں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اُن سے اُس کے دل کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے دلی خیالات روز روشن کی طرح سب پر ظاہر ہوتے ہیں پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات جو کھلے ڈُلے طور پر اُنھوں نے اپنے رازدار دوستوں کو لکھے ہیں یا کسی پبلک جلسہ میں بے ساختہ اور بداہتہً ظاہر کیے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

حقیقت اسلام کا یقین جہاں تک کہ سرسید کے اقوال اور افعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے اُن کو دین اسلام کی حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے کسی خاص فرقہ کے خیالات و عقائد کے تابع نہ تھے مگر اُن کا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقہ کے عقیدہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اُن کو اہل سنت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ مبتدع کہا جا سکتا ہے جیسا کہ اکثر اکابر اسلام کو کہا گیا ہے۔ لیکن اُن کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری یعنی نیچرلسٹ کہنا اُسی قسم کا بہتان ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر مذہب میں محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔

اُنھوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا اُس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کیے تھے۔ اس لیے اوّل ہم اُس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایک عقیدے کے ساتھ جو کچھ اُنھوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اُس کو اُن کے لکچر میں دیکھنا چاہیے۔

اول اُنھوں نے کہا کہ ”میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں، نہ مفتی، نہ قاضی اور نہ واعظ، نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو، وہ میرے خیالات کی پیروی کرے، میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسول خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابداً لآباد تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے، ختم ہو گیا۔“

توحید پھر کہا کہ ”وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اُس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اُس کے تحت میں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کسی خاص دوا کی معجون ہو اور اُسی کے ساتھ اُس کے اجزا بھی ملے ہوتے ہوں۔ خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا نہ صرف جاننا و سمجھنا بلکہ اُس پر یقین کرنا اسلام ہے اور جو اُس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔“

پھر کہا کہ ”خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اُس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اُس کی ذات اور صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اُسی کے استحقاق عبادت پر جو اُس کو لازم ہے، پورا پورا یقین ہو۔ اُس کی ذات کا یقین تو اُس کے موجود بالذات ازلی و ابدی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اُس کی صفات کا یقین اُس کے مانند صفات کا کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں، عالم، رحیم، حی اور مثل ان کے اور جو

اُن کا مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جن میں اوروں کا اشتراک بھی بوجہ تما متصور ہوتا ہے اُس مفہوم سے اور اُس اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو مُبرّا اور منزّہ ماننا اُس کی صفات پر یقین ہونا ہے۔ اُس کے استحقاقِ عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شے سوا خدا کے مستحق عبادت نہیں جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے ..... ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدائے

رسالت | واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں .... محمدی ہونے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اُس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی ... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور اُس کی صفات کو پہچانا، یقین کریں۔ خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو ہدایت ہوئی کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں اسلام جس کو میں نے ایسے استحکام سے سچا بتایا اُس کی ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ پس اس کی تصدیق بالضرور دوسرا رکن اسلام کا ہے جو پہلے رکن سے منفک نہیں ہو سکتا۔"

"اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہٗ لا شریک جانتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اُس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی نہیں یا مرادف معنی لے کر یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں، بالکل صحیح ہے مگر اُس کو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کے اصول کی رو سے درست نہیں .... موحدینِ محض کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے پر قدیم سے علما میں بحث چلی آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مخلد فی النار ہوں گے، کوئی کہتا ہے کہ بعد عذاب کے نجات پاویں گے۔ اس بحث کو انھیں عالموں کے لیے چھوڑ دو اور ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ "علی رغم انفِ ابی ذرٍ"[۱]"

فرائض منصوصہ | پھر کہا کہ" وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے

---

(۱) یہ اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے ابوذر غفاری سے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرت نے ابوذر سے فرمایا "ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ" انھوں نے یہ سن کر تین بار از راہ تعجب یہ الفاظ عرض کیے کہ "وان زنیٰ وان سرق" اور آپ نے فرمایا کہ وان زنیٰ وان سرق اور تیسری دفعہ اُس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ علی رغم انف ابی ذرٍ ۱۲

ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور اُن کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہے کہ وہ محمدی نہیں یا بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔ اُس کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے کی وہی بحث ہے جو موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی۔"

شرک فی النبوۃ | پھر کہا کہ "شرک کی بحث جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہے اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہو سکتا، بہت بڑی ہے، مگر میں اس وقت ایک شمہ اُس کا بیان کروں گا جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اُس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اُس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اُسی کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات پر ملزم ٹھیرا کر فرمایا "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"، پس اس طرح کی پیروی ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیتی ہے میری

ائمہ مجتہدین | اس تقریر سے آپ یہ تصور نہ کریں کہ میں ائمہ مجتہدین کے برخلاف رائے رکھتا ہوں۔ نہیں، میں اُن کو امت کا سرتاج اور اُن کے اجتہادوں اور اختلافوں کو باعث رحمت سمجھتا ہوں

مقلدین | یہ بھی آپ خیال نہ کریں کہ میں اُن کے پیرو مقلدین کو بُرا کہتا ہوں یا تقلید کو بُرا جانتا ہوں مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غلطی سے ائمہ کی تقلید سے اُن کو ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف

غیر مقلدین | ہیں اور عدم تقلید کے مسئلہ کی پیروی کرتے ہیں اور اُس کے اجرا میں کوشش کرنی چاہتے ہیں اُن کی بھی میں عزت کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوئی ہے۔ یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو کہ دھ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو

ضعیف کرنے کی فکر میں ہی۔ حقیقت میں اسلام لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اُس پر دل سے یقین رکھنا اور سب کلمہ گویوں کو بھائی سمجھنا ہی۔ باہمی اختلاف کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اصول اسلام کے برخلاف ہی اور اُس برکت کی ناشکری ہی جو خدا نے دی ہی اور جس کو فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہی"

نبوت پر استدلال | پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجۂ ذیل تقریر کی "ایک ایسے شخص سے جو ریتیلے کنکریلے ملک میں پیدا ہُوا جو چھوٹی عمر میں یتیم ہوگیا جس نے نہ کسی دارالعلم میں تعلیم پائی، نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا، نہ کسی اُستاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا، نہ حکما اور فلاسفروں اور پولٹکل دمارل سائنس کے عالموں کی صحبت اٹھائی، بلکہ چالیس برس اپنی زندگی کے نا تربیت یافتہ اور بداخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کیے، چالیس برس تک بجز ایسی قوم کے جو بت پرستی اور باہمی جنگ وجدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زناکاری پر عورت و مرد کو فخر تھا اور کسی کو نہیں دیکھا، وہ دفعۃً اپنی تمام قوم کے برخلاف اٹھا چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہُوا تھا مگر اُس نے کہا تو یہ کہا کہ لا الٰہ الا اللہ اُس نے صرف یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سیکڑوں برس سے لات ومنات وعُزّیٰ کو پوجتی آتی تھی، یہی کہوا دیا، اُن تمام بداخلاقیوں اور اِمورل عادتوں کو تمام قوم سے مٹوا دیا، بتوں کو زمین پر گروایا، اُن کو تڑوایا اور خدا کے نام اور خدا کی پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ نما میں بلند کیا، وہ جزیرہ جو ابراہیم اور اسمٰعیل کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہوگیا تھا پھر اُس کو اُس کی اصلی پاکی اور دین ابراہیم کی بزرگی تک پہنچا دیا، چالیس برس بعد کس نے یہ نور اُس کے دل میں ڈالا؟ جس نے نہ صرف جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا۔"

"اُس نے لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے زیادہ بتا سکتا تھا جو اُس اُمّی نے بتائے؟ صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاک دل، اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دیے۔ یہ کام وہ تھا جو

نہ کسی فلاسفر سے ہو سکتا تھا نہ کسی سلطان مقتدر سے۔

پھر کیا چیز اُس بچہ میں تھی جس نے جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا کرشمہ دکھلا دیا؟ کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لامذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذ اللہ نبی نہ مانے گا تو اس کو ماننا مجبوراً پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص بزرگ ہی تو یہی ہی۔ روحی فداک یا رسول اللہ۔ پس جو شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھے گا تو امکان سے خارج ہی کہ محمد رسول اللہ کی تصدیق نہ کرے۔"

اعجاز قرآن | پھر قرآن کے معجز ہونے پر مندرجۂ ذیل تقریر کی "قرآن مجید جو تیرہ سو برس سے معجز یقین کیا جاتا ہی میں بھی معجز مانتا ہوں مگر ہمارے قدما نے صرف ایک ویری دلیل اُس کے معجز ہونے کی قرار دی تھی، یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے کسی فصیح و بلیغ سے اُس کی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا۔ باوجودیکہ اُن سے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ لیکن یہ دلیل ۔ ۔ ۔ ایسی نہیں ہی جو غیر معتقد لوگوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہو اور اُن کے دل کو تسلی دے سکتی ہو۔ میں ایک اور دلیل رکھتا ہوں جس کو میں اس دلیل سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں۔ وہ دلیل کیا ہی؟ وہ ہدایتیں انسان کے لیے ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی اور ہدایت اُس کے مثل بے شک نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو بھی معجزہ بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں۔"

"قرآن مجید اُس زمانے میں نازل ہوا جو جاہلوں اور ناواقفوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا، وہ اُس زمانے کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی تھا اور اُن اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی تھا جو اُس وقت کی دنیا میں تھے اور جو آئندہ دنیا میں ہونے والے تھے، منظور تھا کہ اُس کی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اُس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہی جس میں یہ صفت موجود ہی اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں

ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو، ایک مقدس مولوی اس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے ایسا ہی ایک فلاسفر انہیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ سے خلاف نہیں پاتا۔ کسی زبان میں، فرنچ، لیٹن، عربی فارسی، سنسکرت وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھ دو یا اگلے زمانے کی لکھی ہوئی بتادو جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں اور پھر اس سے جاہل اور عالم عامی اور فلسفی سب کو یکساں فایدہ حاصل ہو اور سب کے دل پر یکساں اثر ڈالے، نہایت ناممکن ہے، مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی اس کا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اس کے مسائل جیسے اس زمانہ میں سچے تھے جب کہ زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے۔ اور یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانے میں سچی مانی جاتی ہے اگر آیندہ غلط ثابت ہو، جیسے یونانی حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے، اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ویسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔"

فرائض منصوصہ | پھر نماز روزہ وغیرہ کی نسبت اس طرح بیان کیا "غیر مشتبہ منصوص مسائل جیسے نماز روزہ حج اور زکوٰۃ ہیں اور جو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرض بتائے ہیں، ان کو میں بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان یقین کرتا ہے۔ لیکن جب ان پر مخالف کا حملہ ہوتا ہے تو ان کی لمیت اور اصلیت بتانی ضرور پڑتی ہے اگر یہ بحث پیش ہو کہ ہاتھ منہ دھونے کو (یعنی وضو کو) عبادت سے، جس کا تعلق دل سے ہے، کیا تعلق ہے؟ حدث کے بعد بے محل منہ میں کلی کرنے سے کیا تعلق ہے؟ نماز کو جو ایک روحانی فعل ہے اٹھنے بیٹھنے سر نیچا اور سرین اونچے کرنے سے کیا علاقہ ہے؟ تو بہ مجبوری ہم کو اس کی اصلیت اور نماز کے ارکان کی لمیت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں فرض کیا گیا ہے؟ اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں۔"

دین اسلام | پھر دین اسلام کی نسبت اس طرح بیان کیا " میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب ہے - مجھ کو خدا کے اس قول پر یقین کامل ہے کہ " الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا " مگر جب مفسرین (خدا اُن پر رحمت کرے) اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا نے فلاں جانور کو حلال اور فلاں جانور کو حرام بتا کر دین کو کامل کر دیا ہے تو میں اُن سے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ فخر الدین رازی ہوں، یا ملا علی نیشا پوری، یا اُن سے بڑھ کر اور کوئی - اور اُن بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام! میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے - دین اسلام خدا کی توحید کے کامل طور پر بتلانے سے اُس کے ہر ایک فروع و اصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہے اور اسی تکمیل کے سبب وہ آخری دین ہے اور اسی تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی بغیر تبدیل کے قائم رہے گا "

حمایت اسلام کی وجہ | پھر لکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ " جو تائید اسلام کی میں نے اپنی دانست میں اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ نخواہ مجھ کو اسلام کی تائید کرنی چاہیے - میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا - جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اُس میں چلے جانا دوسری بات ہے اور اُس کی تائید پر مستعد ہونا دوسری بات ہے - پچھلی بات اُس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا یقین اُس پر خود نہ کر لیا ہو - میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور میں اس دلی یقین پر اُس کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں "

یہاں تک سرسید کی اُس تقریر کا خلاصہ تھا جس میں اُنھوں نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کیے تھے - اب ہم اُن کے بعض پرائیویٹ خطوط سے چند مقالات التقاط کرتے ہیں جو اُنھوں نے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے دوستوں کو لکھے ہیں - اِن خطوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ہم کو منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھ ہم نے اور ذریعوں سے بہم پہنچائے

ہیں۔

حقیقت اسلام کا یقین | اگرچہ سرسید عام لوگوں کے کافر و ملحد کہنے سے کچھ ناراض نہ ہوتے تھے مگر جو لوگ اُن کے حالات سے بخوبی واقف تھے اگر وہ اُن کی نسبت ایسا خیال ہی کرتے تھے تو اُن کو سخت ناگوار گزرتا تھا جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خاں مرحوم نے جن کے ساتھ اُن کی اور اُن کے بڑے بھائی کی دوستی اخوت کے درجہ تک پہنچ گئی تھی اُن کے پاس بھیجا تھا جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جا کر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بن جانا۔ انھوں نے ولایت پہنچ کر اس کا یہ جواب بھیجا۔

"حامد نے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جب میں ولایت سے پھر کر آؤں گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ ملوں گا اُسی وقت جواب دوں گا حقیقت میں وہ عنایت نامہ محبت آمیز ہنسی کی بات تھی، نہ جواب لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پرانے دقیانوسی ہندوستانیوں کے سے ہیں، حال کے زمانے کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں، مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا اُس کا نہایت تعجب ہے اس لیے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی البتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجایش ہو سکتی ہے یا دشمن و حاسد جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں ہوا؟ شاید بمقتضائے محبت ایسا خیال ہوا ہو اس لیے کہ دوست کو ہمیشہ بُرے بُرے خیالات گزرتے ہیں۔ جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اُس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی داڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والوں کو اور جو کہ مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں اُن کو بھی نہیں ہے۔ والسلام"

تقلید کی مخالفت | ایک خط میں سید مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا، اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں ہر کسی مسئلہ یا عقیدہ میں

غلطی میں پڑوں، چنداں نقصان نہیں، مسلمان تو رہوں گا . . . . جناب مذہب اسلام آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی معما اور بدر جاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معمائی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے "ھو الذی بعث فی الاُمّیّین رسولاً منھم" ذرا مہربانی سے قرآن کھول کر ملاحظہ فرمائیے اس میں یہی لفظ ہیں یا بجائے اُن کے یہ الفاظ ہیں "ھو الذی بعث فی الفلسفیین رسولاً"۔

تقلید کی مخالفت ایک اور خط میں لکھتے ہیں "بھائی جان سنو! اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنے مکنونات ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید(۱) نہ چھوڑیں گے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا، ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے ائمہ کبار تو درکنار ہوا جنتو کی بھی تقلید کافی ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ بدلائل و مباحثہ مجھ کو قائل کر دیا جائے کہ میری یہ رائے صحیح ہے یا غلط؟ اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دوست اسلام ہوں؟ آیا میں جو اسلام کو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ سے زیادہ دوست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابوحنیفہ اور شافعی تو درکنار، ابوبکر اور عمر بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا، اور ہر کہ اگر تمام عالم کافر ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادتی یا نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصل اسلام کی جو روشنی ہے اُس میں کچھ نقص نہیں ہے بس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط؟"

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں "لوگوں نے جو اخباروں میں مجھ کو بُرا بھلا لکھا اس سے آپ کو

(۱) یہاں تقلید سے مراد ہر امر میں سلف کی پیروی کرنا ہے نہ کہ تقلید مصطلح فقہا۔

غصہ آگیا۔ معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے؟ میں تو ہدفِ تیرہائے ملامت ہوگیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں " میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ تشخص اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علما کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے آمین! اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے۔ آمین ثم آمین ثم آمین۔"

تعصب | ایک اور خط میں لکھتے ہیں " تعصب خود برخلاف شریعت ہے، ہندوستان کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں، خدا کی نامہربانی اُن کی طرف رجوع ہے . . . . پھر اس کا علاج کیا ہے؟ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور ہر روز چھپتی ہیں اور بکتی ہیں اُن میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں اُن کو دیکھ کر مرجانے کو دل چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں اُن میں بلاشبہ سچ ہیں اور درحقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بدنامی ہے . . . . میرے صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ "حیوان ہیں" نالائقوں کو اس قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو اوصاف چھپ رہے ہیں اُن سے کسی کمبخت کو غیرت نہیں آتی۔"

اسلام کی حمایت | ایک اور خط میں خطبات احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں " افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اُس کی تحقیقات اور اُس پر غور کیا جائے تو اُس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں۔"

" آیۂ یاتی من بعدی اسمہ احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر گیگنز نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور

بخوبی بجنسہ اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہ وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے مگر جس طرح پر کہ اس کو مسٹر ہگنز نے ثابت کیا ہے اُس کو پڑھ کر مسلمان متعصب مولویوں کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام اُن کے کرنے کا تھا اُس کو ایک غیر مذہب کے منصف شخص نے کیا ہے۔ میں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا بعینہ مسٹر ہگنز کی تحریر نقل کر دی ہے"

"مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرت کا محمد توریت میں موجود ہے چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشان شمائل آنحضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس کہ اس پر بھی میں کافروں اور یاران بادفروش وعظ گو مسلمان !! کیا اُنھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سا نابینا یقین کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ مجھ کو برا کہتے ہیں اگر خدا مجھے اُس پر صبر کامل عطا کرے تو میرے لیے ایک نہایت عمدہ زادِ راہ دوسری دنیا کے لیے ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ایسا کس کا نصیب جس کو نہایت عمدہ زادِ راہ وہاں کے لیے ہاتھ آ وے"

طیور مخنقۂ اہل کتاب ایک اور خط میں در باب طیور مخنقۂ اہل کتاب کے لکھتے ہیں "جو کچھ غصہ آپ کو مجھ پر در باب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علمائے ترکستان (یعنی ٹرکی) نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے۔ تمام ترک جن کی خاک پا ہونے کی بھی ہم کو لیاقت نہیں ہے، سب بے تامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے جو ترکستان (یعنی ٹرکی) سے آیا تھا اور ایسا سخت مذہب میں تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹوگراف کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا، در باب گردن مروڑی مرغی کے مجھ سے کہا کہ "هذا قصور النصاری لا بأس لنا فی کله قد احل الله لنا طعام اهل الکتاب" علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو نہایت عمدہ بات ہے۔ مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھیرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پانو پر بدست خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرے کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے، انشاءاللہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر اس کی تفسیر عرض کروں گا۔"

ایک شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی جیسے کہ بعض لوگ کہتے

ہیں، مہذب ہوسکتا ہی یا نہیں؟ اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں "سوائے توحید ذات باری تعالیٰ کے ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شایستگی حاصل نہیں ہوسکتی"

فضول مذہبی بحثوں سے اجتناب | سرسید مذہبی مسائل میں اُس میدان سے جس کو اُنھوں نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لیے لازم پکڑ لیا تھا، سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا بھی دعوے کرتا تو اُن کو اُس کا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو فضول بحثوں سے جن سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو، ہمیشہ روکتے رہتے تھے اور کبھی کسی ایسے مسئلے سے تعرض نہ کرتے تھے جو اُن کے دائرہ کی حد سے باہر ہو۔

ایک شخص نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نسبت جن کو صاحب الہام اور مثیل مسیح ہونے کا دعوے ہی، ایک طول طویل خط سرسید کو لکھا۔ اُس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں: "مخدومی! ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہی مگر اُس کا نتیجہ کیا؟ اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فایدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہی؟ نادان ہیں وہ جو اُن سے جھگڑا کرتے ہیں والسلام۔"

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا اُس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں "آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مالیخولیا ہو گیا ہی؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہی کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے جو محض غلط روایات پر مبنی ہی، کچھ لکھوں۔"

منشی سراج الدین نے اُن سے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہی؟ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "ان چیزوں کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اور اُن کو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہی۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جن کی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑے گا۔ پس اُس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے۔ پہلے امور معظم اور اصول

کو رائج کرنا چاہیے، تصاویر و تماثیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں، اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی و جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے بیچ بیل کر چل رہا ہے اس کو آرمانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔"

کسی نے سرسید کو بذریعۂ تحریر کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے چھین کر آگ میں جلا دیا۔ سرسید اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "اُس کو (یعنی مولوی کو) اس عمل سے کیا فایدہ ہوا؟ اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فایدہ ہوتا اور اُس کا بھی دل ٹھنڈا ہوتا۔"

مستورات کے پردہ کی نسبت اُن کی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُن کی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں۔ ایک دفعہ شاید مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے اخبار میں اُن کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں۔ اس پر منشی سراج الدین نے اُن سے اس باب میں اُن کی رائے دریافت کی۔ سرسید اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا، مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منہ کو بھی پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے، شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردہ میں داخل نہیں ہیں، اُن کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔"

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھ دیا کہ اُن کی رائے ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے متعہ کیا ہے۔ انھوں نے فوراً اخبار نویس کو لکھا کہ "میرا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام یا ائمۂ اطہار میں سے کسی ایک نے بھی متعہ کیا ہے۔"

سرسید سے جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں، اکثر لوگ اُن مسائل مذہبی کی نسبت جو

پوچھتے تھے جن پر آج کل نئے خیالات کے لوگوں کی توجہ مبذول ہے اور سرسید سب کام چھوڑ کر ایسے سوالات کا جواب فوراً لکھتے تھے۔

وبا سے بھاگنا کسی نے اُن سے پوچھا کہ جہاں وبا ہو وہاں سے دوسری جگہ چلا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "جس شہر میں وبا ہو وہاں سے چلا جانا وبا سے بچنے کو مع اس اعتقاد کے کہ اگر خدا نے اس فعل سے ہمارا وبا سے بچنا مقدر کیا ہے تو بچیں گے اور مقدر نہیں کیا تو باوجود چلے جانے کے نہیں بچنے کے خلاف شرع و احکام رسول خدا صلعم نہیں ہے۔ مذہب اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لیے جو اسباب ہوں اُن اسباب کو فاعل حقیقی نہ سمجھے بلکہ فاعل حقیقی خدا کو سمجھے جو علۃ العلل تمام افعال و واقعات کا ہے ۔ ۔ ۔ جس طرح کہ آدمی امراض میں دوا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوا مرض کے لیے مفید ہے مگر اس کے ساتھ ہی یقین کرتا ہے کہ اگر خدا نے صحت مقدر کی ہے تو صحت ہوگی، اسی طرح جہاں وبا ہے وہاں سے چلا جانا مثل دوا ہے۔ اگر خدا نے بچنا مقدر کیا ہے تو اس دوائے فعلی سے فایدہ ہوگا، نہیں تو نہیں۔ بخاری میں جو حدیثیں ہیں اُن کا بھی یہی مطلب ہے۔ ایک حدیث میں ہے "فلا تخرجوا منها" مگر اس حدیث کے الفاظ پورے نہیں، اس کے بعد جو حدیثیں ہیں اُن کے الفاظ پورے ہیں "فلا تخرجوا فرارًا منه" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ کر چلا جانا کہ ہم اس سے بھاگ کے بچ جاویں گے ممنوع ہے، کیونکہ اگر اللہ نے مقدر نہیں کیا (یعنی بچنا) تو بھاگ کر نہیں بچ سکتے۔"

"جہاں وبا ہے وہاں داخل ہونا اور وبا کے مقام سے چلا جانا دونوں کی یکساں حالت ہے۔ اگر اسباب کی طرف توجہ ممنوع ہو تو جہاں وبا ہے وہاں جانے کا امتناع غلط ہو جاتا ہے اسی دلیل سے جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلا جانا ممنوع ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام کو جا رہے تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وبا ہے تو صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ۔ اس وقت ابو عبیدہ نے کہا "أفرارًا من قدر الله" اس کے جواب میں حضرت عمر نے کہا "نعم نفرّ من قدر الله الی قدر الله" پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام سے جہاں وبا ہے، چلا جائے اور کوئی شخص اُس کو کہے کہ افرارًا من قدر اللہ

تو اُس کا جواب یہی ہوگا کہ لَمْ نَفِرَّ مِنْ قَدَرِ اللہِ اِلیٰ قَدَرِ اللہِ۔ پس جب ان تمام حدیثوں اور اُن کے الفاظ و مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب و حکم پایا جاتا ہے جو ہم نے بطور خلاصہ کے اول لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہ جو عزیز اقربا جن کی تیمارداری اُس کے ذمہ ہے اور وہ مبتلا ہوں اور وہ شخص وبا کے ڈر سے اُن کو چھوڑ جاوے، یہ ایک دوسرا گناہ ہے، عام بحث سے اس کو تعلق نہیں۔ اُس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو بخاری "اجر الصابر فی الطاعون" میں مذکور ہے۔"

اسلام کا ادب

اسلام اور شعائر اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں چند شہادتیں بطور نمونہ کے ذکر کی جاتی ہیں۔

بمبئی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اُردو تحریروں میں علامات وقف وہی مقرر کرنے چاہییں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں۔ سرسید نے اُن کو لکھا "ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہو گئی ہیں وہ اُردو تحریر میں مروّج کی جائیں اور آیت و مطلق وغیرہ جو خاص اصطلاحات قرآن مجید کی ہیں اور تحریروں پر بولی جائیں۔ گو شرعاً و عقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو الا تعظیماً للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔"

خطوں پر جو اکثر لوگ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حامداً و مصلیاً لکھ دیا کرتے ہیں اُس کی نسبت وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقاء اور ٹھیٹ سنت پر چلنے کا کام ہے، حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اُس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اس قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت اُن کے دل میں نہیں رہی۔ بعوض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے اُن کے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہو سختی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبوی کا بھی جس میں خدا کے نام سے کام شروع کرنے کا حکم ہے، یہی منشا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اُس کے الفاظ یہ ہیں "کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللہِ

"تقوی القلوب" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امر ذی بال یعنی عظمت اور شان والا نہ ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔
ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقع پر بجائے تالی بجانے کے سبحان اللہ یا مرحبا یا جزاک اللہ کہا جایا کرے اور اجلاس کے موقع پر ایک منبر رکھا جایا کرے جس پر کھڑے ہو کر لوگ اسپیچ کیا کریں، سر سید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی اور کہا "ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دنیوی اغراض کے لیے ہوتے ہیں اُن الفاظ کو استعمال کرنا جو شعائر اللہ میں سے ہیں ان کی ہتک حرمت کرنا ہے اور لاتحلوا شعائر اللہ میں داخل ہے کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک عاشقانہ شعر پڑھیں اور مے ناب کی خوبی کسی شعر میں باندھیں یا ایک معشوق کے ہجر و وصل اور اُس کے خط و خال اور عشوہ و ناز توبہ شکن کو دلچسپ نظم میں ادا کریں اور سننے والے اُس کی تحسین میں اُن کلمات کو استعمال کریں جو خاص رب واحد معبود و غیور نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لیے بطور شعائر اللہ مقرر کیے ہیں۔ افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہم کو نصیحت کرتے ہیں، اُس وقت اُن کو اُن الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی خِسّت کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے خسیس اور ذلیل کاموں میں خدا کی عظمت اور اُس کے شعائر کی حرمت کو بھول جاویں اور انھیں ذلیل دنیاوی کاموں میں شعائر اللہ کو گڈمڈ کر کے اُس کی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھو دیں۔ کیا ہم کو زیبا ہے؟ کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اُس منبر کی جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (بابی انت و امی یا رسول اللہ) کھڑے ہو کر وعظ فرمایا، قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطبات روحانی ارشاد فرمائے، صحابہ اور ائمہ علیہم السلام نے اُس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لیے مخصوص ہے جس پر وہی سنت ادا کی جاتی ہے، نقل بنا کر کھڑے ہوں . . . . یہی خیالات ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) منشور محمدی رکھا جاتا ہے۔ کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اُس نے ان لفظوں کو لکھا۔ ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہ استعمال کرتا ہے

اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھلاتا ہے؟ ایک اخبار نکلتا ہے اور مخبرِ صادق (ہائے افسوس کس دل سے) اُس کا نام رکھا جاتا ہے۔ کوئی اخبار التصدیق کے نام سے مشہور ہے۔“

ایک دفعہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو (یا اور کسی غرض کے لیے) ایک شخص امینِ قوم مقرر ہونا چاہیے۔ سرسید نے یہ مضمون سن کر اور آبدیدہ ہو کر دردناک آواز سے کہا: ”امینِ قوم تو صرف ایک شخص تھا جو گزر گیا اب کوئی امینِ قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہدہ کا نام امانت دارِ قوم ہو سکتا ہے“ چونکہ آنحضرتؐ ابتدائے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اس لیے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا انھوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا تھا کہ اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جاوے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں اس کے جواب میں اُنھوں نے یہ لکھ بھیجا ”مخدومی نماز میں قرآن مجید بہ لفظہ نہ پڑھنے اور اُس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔“

ایک اور شخص نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ جو آپ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے اگر قرآن سے علیحدہ چھاپ لیا جاوے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا ”اوّل تو یہ بتلاؤ کہ ایسے مردود ترجمہ کو خریدے گا کون؟ دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت سرسری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جاوے تو نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ اس کا اہتمام اس طرح پر کہ صرف اردو بغیر متنِ قرآن کے چھاپا ہو ہرگز پسند نہیں ہے، نہ میں اُس کی اجازت اپنی زندگی میں دوں گا۔ میں اس کو نہایت عظیم گناہ سمجھتا ہوں، لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جاوے تو میں نظرِ ثانی کرنے کی محنت گوارا کروں گا۔ والسلام۔“

تفسیرِ قرآن لکھنے کی غایت قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے یہ ہرگز نہ تھا کہ اُس کے مضامین عام طور پر تمام اہلِ اسلام کی نظر سے گزریں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد اُن کے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کی تفسیر دیکھنے کا

مشتاق ہوں، اگر آپ مستعار دیں تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے اُن سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسولِ خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا؟ انھوں نے کہا "الحمدللہ"۔ پھر کہا کہ آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوں گے؟ انھوں نے کہا "الحمدللہ"۔ سرسید نے کہا بس تو میری تفسیر آپ کے لیے نہیں ہے، وہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو مذکورۂ بالا عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا اُن پر معترض یا اُن میں متردد ہیں۔

سرسید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ "اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آوے اُس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اُس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اُس کو دیکھ سکیں، سردست عام لوگوں میں اُس کا شایع ہونا اچھا نہیں۔"

نبی کی محبت | رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق اور غایت درجہ کی ارادت اور سچی محبت معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلعم کی جلالتِ شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی موضوع و مفتریٰ ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔ بعض روایتوں پر جن کے ذریعے سے مخالفوں کو آنحضرت پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے، وہ بعض اوقات نہایت غیظ و غضب میں آکر یہ کہہ اُٹھتے تھے کہ اگر اس کا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اُس پر مفتری کی حد جاری کرتا۔

منشی سراج الدین نواب انتصار جنگ سے روایت کرتے ہیں کہ "سید صاحب کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد العلی نے علما کے پاس مہر و دستخط کے لیے بھیجا تھا جب وہ مولوی سراج احمد مرحوم سنبھلی کے پاس پہنچا تو انھوں نے اُس کو پڑھ کر یہ کہا کہ "میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کیونکر دستخط کر سکتا ہوں جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلعم کے ذکر پر چشم پُرآب اور زار زار

روتے دیکھا ہے؟

سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فارسی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُن کے دل کا لگاؤ جو آنحضرت کے ساتھ تھا ظاہر ہوتا ہے ؎

خدا دارم، دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم — ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتارِ معشوق ست قرآنے کہ من دارم

جس زمانے میں کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب 'لائف اوف محمدؐ' کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے انھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے "مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اُس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو، ما را ہمیں نعرۂ شاہنشاہی بس ست"

اسبابِ دنیوی سے بے تعلقی

سرسید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے، اُمرا سے ملتے تھے، حاکمانِ وقت سے میل جول رکھتے تھے اور خود دنیاداروں کیسی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جا سکتا تھا کہ وہ دنیا دار ہیں لیکن اُن کی حالت پر نظر کرنے سے بمشکل اُن کو عرفی معنوں میں دنیا دار کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر دل کو کسی چیز سے تعلق نہ تھا، لکھا ہے کہ وہ اپنے اصطبل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے، کسی نے طنز کے طور پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اُس میں گھوڑے نہیں سما سکتے۔ اُنھوں نے کہا "ایں میخہا در گل زدہ ام نہ در دل" سرسید کا حال دیکھ کر اس مقولے کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرتِ تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں اور جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

پاک ہیں آلائشوں میں۔ بندشوں میں بے لگاؤ — رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

سیکڑوں بندوں میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند — پر ٹٹولے کوئی دل اُن کا تو وہاں سب سے الگ

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا باوجود قطعی مایوسی کے جو اس کو مسلمانوں کی طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیوٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا، اُس کی کوششیں اخیر دم تک برابر جاری رہیں حالانکہ اُس کو یقین تھا کہ مسلمانوں پر مردنی چھاگئی ہے اور قومی زندگی کی رمق اُن میں باقی نہیں رہی باوجود اس کے وہ دن رات اُن کی ترقی کی تدبیروں میں مصروف تھا اور جن کاموں کو وہ بے سود لاحاصل سمجھتا تھا اُن میں اس کی سرگرمی و دلچسپی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ایک کام میں اُس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ یہ اسی کی ہمت اور اسی کا حوصلہ تھا جو اُس کی ذات پر ختم ہوگیا۔

وہ اپنے نہایت عزیز اور خالص دوست اور مددگار رنیاز محمد خاں رئیس جالندھر کو اُن کے تعزیتی تار کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا تار ہمدردی کا پہنچا، جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اس کا میں صرف شکرگزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اُس کو نہایت محبت و قدر سے دیکھتا ہوں اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو، کیونکہ وقت موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے، پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کر۔ والسلام"

وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے، اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کرگیا۔ اُس نے اپنے بڑے فرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جس کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اپنی ہزاروں روپیہ کی جائداد اور اثاث البیت اور ہزاروں روپیہ کی کتابیں ٹکے دھڑے کے بھاؤ فروخت کردیں اور اس کے دل پر ذرا میل نہ آیا اس نے غدر کے بعد لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تعلقہ لینے سے ایسی بے پروائی کے ساتھ انکار کردیا کہ کوئی دو چار بیگہ زمین کے لینے سے بھی اس طرح انکار نہیں کرسکتا، وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ پہنچنے

کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا اپنی ساری تنخواہ خزانہ سے منگاکر مدرسہ کی ضرورتوں میں اٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسہ کا روپیہ وصول نہ ہوتا آپ قرض دام کرکے گزارہ کرتا تھا۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہُوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، اور جب وہ مرا تو اُس کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک پیسا گھر میں نہ نکلا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی زاہد کوئی صوفی کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہم کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہے؟ وللہ درّ من قال ـ

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو ـــ کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اگرچہ سرسید کی تمام زندگی دنیا داروں کی زی میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا رنگ جو ابتدائے عمر میں اُن پر چڑھ گیا تھا وہ نفس واپسیں تک بدستور چڑھا رہا۔ اُن کے بعض خوابوں سے جو ضمیمہ کتاب میں نقل کیے گئے ہیں اُن کی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقہ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ نیز انھوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشائخ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طور پر کیا ہے جس سے اُس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ اُن کے چہرہ سے ایک رقت آمیز بشاشت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھُٹ گیا تھا وہ مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادہ سے دلی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوں۔ اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لیے سرہند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خاں صاحب کو لکھتے ہیں " مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ بعد برسات پٹیالہ جانا ہوگا۔ آپ کی ملازمت کو بھی جی چاہتا ہے اور سرہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے، کیا عجب ہے کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے۔ اُن سے اجازت لے لیجیے اور یہ بھی دریافت فرمایئے کہ کیا عنایت ہوگا "

تصور شیخ کے مسئلہ کے متعلق جس پر طریقہ نقشبندیہ میں سالک کی ترقی کا دارومدار ہے جو خیالات سرسید نے ۱۲۶۸ھ میں اپنے رسالہ موسومہ بہ نمیقہ میں ظاہر کیے تھے وہی خیالات وہ

اُس کی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُن کے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قوے خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کیے ہیں اُن کو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے یہی اُن کا قول تھا اور اسی کے موافق اُن کا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُس کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "سب سے بڑا کام انسان کے لیے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو مولانا روم فرماتے ہیں" چیست دنیا از خدا غافل بدن" مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر غلطی ہے خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوٹتا اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود چاہے تو ہم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج تو کر دے، خدا کی قدرت سے خارج ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پس از خدا غافل بدن چہ معنی دارد؟ دنیا ہمارے برتنے کے لیے ہے ہم خوب چین سے اُس کو برتیں مگر دل کو اُس سے تعلق نہ ہو بس یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے جس کی نسبت رسول مقبول نے فرمایا "صاحب المال کافر"

ایک اور دوست کو جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے، اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں

" آپ کا عنایت نامہ درد انگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے لیکن امر لاعلاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان اُسی میں غلطاں و پیچاں رہے اور سب کاموں کو جن کے لیے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے۔ رضا بقضا جو اہل اللہ کا مقولہ ہے نہایت عمدہ اور فلسفیانہ ہے حتی المقدر انسان کو اُس پر عمل کرنا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جن کا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے، آپ اُن کی صلاح کو مان لیں اور شادی کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آیندہ درست ہو جانے گی ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے

برخلاف نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کو حضرت خدیجہ کبریٰ سے نہایت محبت تھی، اُن کے بعد آپ نے نکاح فرمایا، کون شخص ہے جو کانشنس یا اخلاق میں آنحضرت صلعم سے زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے؟ تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی تھیں وہ سب واردات حالیہ ہیں جو کبھی قائم نہیں رہتیں۔ انسان کو چاہیے کہ ان واردات حالیہ کو دل سے علیحدہ کر کے سوچے کہ اُس کو کیا کرنا ہے۔ میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور اُن کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق اور عبادتوں اور نفسانی کے جذبوں سے افضل ہے۔ والسلام"

بے تعصبی | سرسید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی باوجود اس کے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے جس بے تعصبی سے انھوں نے فصل خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ بحیثیت ایک جج ہونے کے یکساں اور بے طرفدارانہ رہا اس کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُن کے برتاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سُنّی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ اُن کے نہایت گاڑھے دوست جن کی دوستی اخوت کے درجہ کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقے کے لوگوں میں موجود تھے جن کے ساتھ اخیر دم تک اُن کی یکجہتی و یک رنگی کا یکساں حال رہا۔ گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اُس کی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔ اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "بہت سے شیعہ ہیں جن سے ہم سے نہایت دوستی ہے، وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر تبرا کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے۔"

ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے کی قربانی

کے لیے خریدلی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہو گئے، فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگادی یہاں تک کردہ گائے طالب علموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آیندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطے میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اُن سے اس باب میں اُن کے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا "میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اُس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو، مگر اس اختلاف طبایع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اُس پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کا یقین اُس کے جی میں ہے اُسی کو وہ اختیار کرے گا وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اُس کے لیے اور بُرا ہے تو اُس کے لیے لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جز ہے، اُس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔"

یہی وجہ تھی کہ سرسید ہمیشہ پبلک جلسوں میں جہاں ہندو مسلمان جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔ ایک موقع پر اُنھوں نے اپنی اسپیچ میں کہا: "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں، پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ

رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

پھر آگے چل کر انھوں نے کہا کہ " قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

ایک اور موقع پر اسی باب میں اُنھوں نے مندرجہ ذیل تقریر کی " میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ اُن کا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے؛ کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ " ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"

ایک اور اسپیچ میں اُن کے یہ الفاظ تھے " اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کرلیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔"

"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلھن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلھن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اُس دلھن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔"

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُنھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کیے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا، سوسائٹی کے اخبار میں جو ۳۰ برس اُن کے ہاتھ تلے رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو۔ کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے، کبھی کسی ہندو عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں ہمیشہ ہندو لیڈروں اور رفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں اور پبلک اسپیچوں میں کیا اور ہمیشہ اُن کے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال اُن کی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ۔

اسلامی حمیت | باوجود اس کے اسلامی حمیت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ صوفیوں اور درویشوں میں۔ جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا اُس نے فوراً اُس کی مدافعت کی نہ اس معاملہ میں اُس کو اپنی صلح کل کی پالیسی کا پاس و لحاظ تھا اور نہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریق ثانی کس رتبہ اور درجہ کا آدمی ہے حالانکہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ ہندو اُردو زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے تو [illegible] سے خلاف اُن کی مخالفت کی اور ولایت جانے سے پہلے

دو برس تک برابر اُن تمام سبھاؤں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آرٹکل لکھتا رہا جو بنارس اور الہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لیے قائم ہوئی تھیں۔ پھر جب ایسے ہی تنگدلی اور تعصب کے خیالات سے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دی جائے تو اُس نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بمقام الہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پرجوش اور زبردست اسپیچ میں اُن تمام دلائل کی تردید کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں۔

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا اور اُن میں اور مسلمانوں میں خلوص اور دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں اُن کا مقابلہ اُس نے نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ کیا۔ اُسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنریوں کا وعظ سنوانے کے لیے اپنا رعب و داب کام میں لاتے ہیں جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ضلع مرادآباد میں انتظامِ قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث بچوں کی بابت جو کشاکشی سرسید اور مشنریوں اور کلکٹر مرادآباد کے درمیان رہی وہ پہلے حصے میں مفصل بیان ہو چکی ہے۔ اُس نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے پس اگر کہیں کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو اُس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ اس نے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ "جہاں مشنری اسکول ہیں اگر وہاں کے لوگ اپنی اولاد کو اُن اسکولوں میں بھیجنا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں تو گورنمنٹ اُن کو گرینٹ ان ایڈ عطا فرما دے اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے اپنی حکومت اور رعب داب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لاویں"۔

اُس سے بڑھ کر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے

مشنری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں، نہ اس لیے کہ اُن کو عیسائی مذہب سے کچھ تعصب تھا بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو غیرت آئے اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ اُس نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لدھیانہ دیا تھا اُس میں وہاں کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ لدھیانہ سے شہر میں جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں مشنری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں اُن کو کچھ جوش پیدا نہیں ہوتا اُن کو کچھ غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھ بندوبست کریں۔ وہ کتّے کی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی پر چلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کے واسطے بھیجتے ہیں اور خود کوئی بندوبست اپنے بچوں کی تعلیم کا نہیں کرتے"۔

اسی لدھیانہ کے جلسہ میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے سرسید کی تعریف میں کچھ تقریر کی تو اُس کے جواب میں جو کچھ انھوں نے کہا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور شبہات رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا "تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو، ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اُس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اُس کو قائم رکھو گے اور اُس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آیندہ تمہاری نسلیں بھی اُس سے فائدہ اٹھا دیں گی"۔

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے اور ہونی چاہیے مگر اس بات

میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مخالف تھے جو اعتراض عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطاعن رسول خدا صلعم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں بعضے مسلمان تو اسی کو کمال دین داری سمجھتے ہیں کہ اُس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ بعضے غیظ و غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعضے گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے اُس کو گورنمنٹ تلف کرا دے اور آیندہ اس کے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر درحقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت سے کچھ علاقہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارے پاس اس کے سوا کچھ علاج نہیں کہ اُن اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور اُن کی اشاعت بند کرا دیں برخلاف اس کے سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں کے اعتراضوں کو لغو و پوچ سمجھ کر اُن کی طرف التفات نہ کیا جائے، یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ مسلمان اُن کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اسلامی حمیت کا مقتضا یہ ہے کہ اُن کے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دیکھیں اور اُن پر غور کریں، پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں اُن کا جواب دیں اور جن میں بدزبانی و بے تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو اُن کا فیصلہ پبلک کی رائے پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو اُن کا جج قرار دیں اور مذہبی مباحثوں میں حکومت کی پناہ ڈھونڈیں تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اُس کے محکوم و مغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اُس وقت تھیں جب کہ اسپین(۱) کے عیسائی مسلمانوں کے زوال کے بعد ان کو اس لیے جلا وطن کرتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا

(۱) سرسید نے خطبات احمدیہ میں ایک آزاد خیال یوروپین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اگرچہ بظاہر مُور (یعنی اسپین کے مسلمان) اس وجہ سے جلا وطن کیے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان منک (راہب) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔"

جواب دینے سے عاجز آ گئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقین واثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا۔ غرض کہ اس کی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو۔ اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اُس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راستباز ہو اور بُرائی کی عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خاں جیسا مسلمان زمانے میں مشکل سے ملے گا، لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دین اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعت اسلام کا پراگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جن کو ائمۂ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکام ظاہری پر لمبے لمبے وعظ کہتے ہیں، آمین اور رفع یدین کی بحث میں عمریں گزار دیتے ہیں، وضع و لباس میں غیر قوموں کے تشبہ کو محاربۂ خدا و رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، مگر قوم کے اخلاق کی درستی کا جس کی نسبت نبی نے کہا تھا کہ "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے سوا اس کے کہ مسلمانوں میں افلاس، نا اتفاقی، بُغض، اور کینہ کو ترقی ہو، اہل قبلہ میں ہمیشہ کھٹا پٹی رہے، اسلام مطعون ہو اور قوم کو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے، کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان معنوں میں سید احمد خاں کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہوگی جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این ست
ہزار خندۂ کفر ست بر مسلمانی

ضمیمجات

جو سرسید کی لائف سے متعلق ہیں

ضمیمہ نمبر ۱

سرسید کا نسب نامہ

منقول از خطبات احمدیہ مندرجہ جلد دوم تصانیف احمدیہ صفحہ ۱۴۵

محمد رسول اللہ صلعم
۲ فاطمہ زہرہ — امیر المومنین علی ع ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب
۳ امام حسین ع
۴ امام زین العابدین ع
۵ امام محمد باقر ع
۶ امام جعفر صادق ع
۷ امام موسیٰ کاظم ع
۸ امام علی موسیٰ رضا ع
۹ امام محمد التقی ع
۱۰ سید موسیٰ مبرقع
۱۱ سید ابی عبداللہ احمد
۱۲ سید محمد اعرج
۱۳ سید محمد احمد
۱۴ سید احمد
۱۵ سید موسیٰ
۱۶ سید احمد

۱۷ سید محمد
۱۸ سید علی
۱۹ سید جعفر
۲۰ سید محمد
۲۱ سید عیسیٰ
۲۲ سید ابوالفتح
۲۳ سید علی
۲۴ سید یار حسین
۲۵ سید کاظم الدین حسین
۲۶ سید جعفر
۲۷ سید باقر
۲۸ سید موسیٰ
۲۹ سید شرف الدین حسین
۳۰ سید ابراہیم
۳۱ سید حافظ احمد
۳۲ سید عزیز
۳۳ سید دوست محمد

۳۴ سید برہان
۳۵ سید محمد عماد
۳۶ سید محمد ہادی — سید محمد مہدی
۳۷ سید محمد متقی
۳۸ سید محمد — سید احمد
سید محمد احمد — ولادت ۵ ذی الحجہ
ولادت ۸ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ مطابق
۱۲۵۹ھ مطابق — ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء
۹ مئی ۱۸۴۳ء
۳۹ سید حامد — سید محمود
ولادت ۲۴ صفر ۱۲۶۵ھ — ولادت ۱۱ رجب ۱۲۶۶ھ
مطابق ۲۰ جنوری ۱۸۴۹ء — مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء
۴۰ سید راس مسعود
ولادت ۱۴ جمادی الثانی
۱۳۰۶ھ مطابق
۱۵ فروری ۱۸۸۹ء
روز جمعہ

ضمیمہ نمبر ۲

سرسید کی تصنیفات کی فہرست

سرسید کی تصنیفات جو کتاب یا رسالہ کی صورت میں شائع ہوئی ہیں تین حصوں پر منقسم ہو سکتی ہیں ۱۔ مذہبی (اور یہ حصہ باقی دو حصوں سے بہت بڑا ہے) ۲۔ تاریخی ۳۔ علمی (اور یہ حصہ بہت چھوٹا ہے)

پہلے حصے میں مندرجۂ ذیل کتابیں ہیں

۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ سنہ ۱۲۵۷ھ

اس رسالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کا بیان ہے۔

۲۔ تحفۂ حسن مؤلفہ سنہ ۱۲۶۰ھ

یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا۔

۳۔ کلمۃ الحق مؤلفہ سنہ ۱۲۶۶ھ

یہ رسالہ پیری مریدی کے طریقہ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے

۴۔ راہ سنت در ردّ بدعت سنہ ۱۲۶۶ھ

یہ رسالہ اہل بدعت کے برخلاف تبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔

۵۔ نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ سنہ ۱۲۶۹ھ

یہ ایک مضمون فارسی زبان میں بطور ایک فرضی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصور شیخ جو معتاد مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبت خدا و رسول و موجب رحمت الٰہی بتایا ہے۔

۶۔ آغاز کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ سنہ ۱۲۶۹ھ

۷۔ تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام مرتبہ سنہ ۱۲۷۹ھ

اس تفسیر کے لکھنے کا منشا سرسید کی لائف کے پہلے حصہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔

۸۔ رسالہ طعام اہل کتاب مرتبہ سنہ ۱۲۸۵ھ

اس کے لکھنے کی غرض جو کچھ تھی وہ پہلے حصہ میں مفصل مذکور ہے۔

۹۔ خطبات احمدیہ مرتبہ سنہ ۱۲۸۷ھ

اس کا حال پہلے اور دوسرے حصہ میں مفصل مذکور ہے۔

۱۰۔ تفسیر القرآن مطبوعہ سنہ ۱۲۹۶ھ تا سنہ ۱۳۰۹ھ

۱۱۔ النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی سنہ ۱۳۰۹ھ

اس میں امام غزالی کی کتاب مضنون بہ علی اہلہ اور مضنون بہ علی غیر اہلہ اور منقذ من الضلال اور الاقتصاد فی الاعتقاد کے بعض مسائل پر بحث کی ہے جس میں کہیں امام صاحب سے اتفاق اور کہیں اختلاف کیا ہے اور نیز امام صاحب کی کتاب التفرقہ بین الاسلام والزندقہ کا ریو بھی اس میں شامل ہے جو تہذیب الاخلاق میں پہلے چھپ چکا تھا۔

۱۲۔ ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم سنہ ۱۳۰۷ھ

یہ رسالہ گویا تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے اس میں اصحاب کہف کے قصہ کی تفسیر اُسی اصول کے موافق کی ہے جس پر تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔

۱۳۔ ازالۃ الغین عن ذی القرنین سنہ ۱۳۰۷ھ

یہ رسالہ بھی درحقیقت تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے اور اس میں بھی وہی اصول ملحوظ رکھا گیا ہے جس پر تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔

۱۴۔ رسالہ ابطال غلامی مطبوعہ سنہ ۱۳۱۰ھ

یہ رسالہ اول تہذیب الاخلاق کے کئی پرچوں میں شائع ہوا تھا اُس کے بعد اُس کو سرسید نے بطور رسالہ کے علیحدہ چھپوا دیا۔ اس کا مفصل حال لائف کے دوسرے حصہ میں درج ہے۔

۱۵۔ الدعاء والاستجابۃ مطبوعہ سنہ ۱۸۹۲ء

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں اجابت دعا کے معنی اُنہی اصول کے موافق بیان کیے ہیں جس پر تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔

۱۶۔ تحریر فی اصول التفسیر مطبوعہ سنہ ۱۸۹۲ء

اس رسالہ میں وہ تمام اصول بیان کیے ہیں جو تفسیر القرآن میں ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

۱۷۔ تفسیر السموات مطبوعہ سنہ ۱۳۰۵ھ

یہ رسالہ اول تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں بطور ایک آرٹکل کے چھپ چکا تھا مگر سنہ ۱۳۰۵ھ میں سرسید نے اس کو علیحدہ بطور ایک رسالہ کے چھپوا دیا۔ یہ بھی گویا تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے اس میں اُن آیات کی تفسیر جو بظاہر نظام بطلیموسی کے موافق معلوم ہوتی ہیں آج کل کی تحقیقات کے مطابق کی ہے۔

ان سترہ کتابوں اور رسالوں کے علاوہ مذہب کے متعلق بے شمار آرٹکل اور مضامین ہیں جو

سرسید نے علیگڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں خصوصاً سب سے اخیر دفعہ کے تہذیب الاخلاق کی تینوں جلدیں زیادہ تر انہی مضامین سے بھری ہوئی ہیں جن کا مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے اُن شکوک و شبہات کا زائل کرنا ہے جو انگریزی تعلیم سے اسلام کی نسبت اُن کے دل میں پیدا ہونے ممکن ہیں۔

دوسرا حصہ

تاریخی کتابوں اور رسالوں کا ہے۔ اس حصہ میں مندرجۂ ذیل کتابیں شامل ہیں:-

۱۸ - جام جم مطبوعہ ۱۸۴۰ء

یہ ایک نقشہ ہے جس میں امیر تیمور صاحبقران سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال جن کو سلطنت ہند سے تعلق تھا، مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں بزبان فارسی قلم بند کیا ہے۔

۱۹ - آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء

اس کتاب کا مفصل حال لائف کے پہلے حصہ میں مذکور ہے۔

۲۰ - سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء

اس کا مفصل حال بھی پہلے حصے میں مذکور ہے۔

۲۱ - تاریخ سرکشی ضلع بجنور مطبوعہ ۱۸۵۸ء

۲۲ - اسباب بغاوت ہندوستان مطبوعہ ۱۸۵۸ء

۲۳ - ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو مطبوعہ ۱۸۷۲ء واقع لندن۔

۲۴ - ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر اعتراضات بزبان انگریزی مطبوعہ ۱۸۶۹ء واقع لندن۔

ان کتابوں کے سوا سرسید نے ایک تاریخ ضلع بجنور کی غدر سے پہلے نہایت تحقیقات سے لکھی تھی جو گم ہوگئی اور جس کا مفصل حال پہلے حصے میں بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ

علمی تصنیفات کا ہے جس میں مندرجہ ذیل رسالے شامل ہیں:-

۲۵ - تسہیل فی جر الثقیل مؤلفہ ۱۸۴۴ء

۲۶ - فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مؤلفہ ۱۸۴۶ء

۲۷ - قول متین در ابطال حرکت زمین ۱۸۴۸ء

اس رسالے میں قدیم خیالات کے موافق زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کیا ہے لیکن اس کے لکھنے کے بعد سرسید نے

اپنی تحریرات میں جا بجا زمین کی حرکت کو تسلیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں اور رسالوں کے علاوہ اُن کی دو کتابیں قانون میں بھی معدوم ہوئی ہیں۔ ایک انتخاب الاخوین جس کا ذکر پہلے حصہ میں کیا گیا ہے۔ دوسرے ایک اشتہار ہے جو سرسید نے سنہ ۱۸۴۲ء میں بعہد منصفی دہلی چھاپ کر شائع کیا تھا معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ابتدائے سنہ ۱۷۹۲ء سے لغایت آخر سنہ ۱۸۴۲ء تمام فیصلجات صدر شرقی و صدر غربی کا جو اس وقت تک ترجمہ نہیں ہوئے تھے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کراکے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا چنانچہ سنہ ۱۷۹۲ء سے سنہ ۱۸۱۶ء تک کے تمام فیصلجات اردو میں تین جلدوں میں مرتب ہو چکے تھے جن کی قیمت کا اعلان اس اشتہار کے ذریعے سے کیا گیا تھا پھر معلوم نہیں کہ اور فیصلے ترجمہ ہوئے یا نہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ اُن کے بے شمار پولٹکل اور اخلاقی مضامین علیگڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے شائع ہوئے ہیں جن سے کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۳
سرسیّد کے چند خواب

جس زمانہ میں سرسید سورہ یوسف کی تفسیر لکھتے تھے تو خواب پر اپنی رائے قایم کرنے کے لیے لوگوں سے اُن کے خوابوں کا حال پوچھتے تھے اور اُن پر غور کرتے تھے۔ انھیں دنوں میں انھوں نے اپنے گزشتہ زمانے کے خواب جہاں تک کہ اُن کو یاد آئے جمع کیے تھے اور ان کو کاتب سے صاف کرا لیا تھا۔ وہ اوراق سرسید کی لائف لکھتے وقت ہم کو بجنسہٖ دستیاب ہوگئے۔ لائف میں تو ہم کو ان خوابوں کے درج کرنے کا کہیں عمدہ موقع نہیں ملا لیکن اس خیال سے کہ خواب سے صاحب خواب کے نفس کی حالت کا کچھ سراغ لگتا ہے، ہم نے اُن خوابوں کو بطور ضمیمہ کے لائف کے آخر میں لاحق کر دیا ہے تاکہ جو لوگ خواب سے انسان کے اصلی خیالات کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ شاید ان خوابوں سے سرسید کی لائف کے متعلق کوئی عمدہ نتیجہ استخراج کر سکیں۔ چونکہ سرسید نے خواب ایسے طور پر لکھوائے ہیں کہ گویا دوسرا شخص اُن کے خواب لکھ رہا ہے اس لیے ہم اُن کا بیان اسی طرح جس طرح کہ انھوں نے لکھوایا ہے قلم بند کرتے ہیں۔

خواب ۱: انھوں نے اپنے نہایت بچپن کے زمانہ میں پہلے ہی پہل حالت بیداری میں قیدیوں کو دیکھا جو جیلخانہ کے کپڑے پہنے ہوئے اور بیڑیاں پانوں میں پڑی ہوئی پریشان سر کے بال سڑک بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ باہر سے محلسرا کے اندر آتے ہیں جب وہ ڈیوڑھی کے چھتے میں پہنچے تو ایک نہایت سیاہ رنگ کا دیو بڑے بڑے اور سر پر کھڑے کھڑے بال پانوں میں بیڑیاں پڑی ہوئیں ایک کونے میں سے نکلا اور اُن کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اور سر سے اونچا کر کے زمین پر پٹک دیا۔ اُن کی آنکھ کھل گئی اُن کو ایسا خوف چڑھا کہ جاگنے کے بعد بھی کئی گھنٹے تک اُن کا دل کانپا کیا اور مدت تک یہ حال رہا کہ جب رات کو اُس چھتے میں جاتے تو اُن کو خوف معلوم ہوتا اور دم

آدمی ساتھ سے کر جاتے"

خواب:" ان کی دس بارہ برس کی یا کچھ زیادہ عمر ہوگی کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے رہنے کی حویلی میں سے اپنے نانا کی حویلی میں جس میں صرف ایک سڑک بیچ میں تھی جاتے ہیں۔ سامنے سے ایک بہت بڑا ہاتھی جس پر گدی کسی ہوئی ہے اُن کے مارنے کو دوڑا وہ بھاگے اور اپنے نانا کی حویلی میں گھس گئے تھوڑی دیر بعد وہ ایک بارہ دری میں جس کی ایک طرف بازار یا سڑک پر شرف تھی گئے تاکہ دیکھیں کہ اگر وہ ہاتھی چلا گیا ہو تو اپنے گھر جاویں۔ اتفاق سے وہ ہاتھی عین اُسی بارہ دری کے نیچے کھڑا تھا اُس نے جھٹ سونڈ میں لپیٹ گدی پر جو اُس کی پیٹھ پر کسی ہوئی تھی ڈال دیا گدی پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اُس نے اُن کو چیت لٹا کر چھری سے گلا کاٹنا شروع کیا مگر نہ کٹا فیل بان نے کہا یہ سید ہیں سیدھی طرف سے گلا نہیں کٹنے کا گردن کی طرف سے کاٹو۔ اُس نے اُن کو پلٹ کر گردن پر چھری رکھی۔ سید نے اس وقت پورا کلمہ پڑھا وہ ظالم چھری چلانے نہ پایا تھا کہ قبلہ کی طرف سے ایک شخص سبز پوش سبز جریب ہاتھ میں لیے نمودار ہوئے اور زور سے اُس ظالم کو جریب ماری وہ مع ہاتھی کے معدوم ہوگیا اور سید گویا اُس کی پیٹھ پر سے زمین پر گر پڑے اور آنکھ کھل گئی اگر سچ مچ وہ ظالم مار ڈالتا تو کیا اچھی موت ہوتی۔"

خواب۔" ان کی چودہ پندرہ برس کی عمر ہوگی یا کم و بیش مگر اُس زمانہ میں تیر اندازی کا چرچا تھا اور بعض رشتہ دار حج سے واپس آئے تھے اُنھوں نے دیکھا کہ وہ بازار میں چلے جاتے ہیں لوگوں نے اُن سے کہا کہ تم تو حج کو جانے والے تھے گئے نہیں؟ اُنھوں نے کہا کہ ابھی تو حج کے بہت دن باقی ہیں لوگوں نے کہا کہ تین چار دن ہی تو رہ گئے ہیں اُنھوں نے کہا تو میں جاتا ہوں اور وہ اُڑے اور زمین سے بلند ہو کر مکہ کی طرف اُڑتے ہوئے جانے لگے۔ شہر کوٹی کیا میدان ہلا۔ اُس کوٹی کیا سمندر ملا۔ اُس کوٹی کیا اور ایک مسجد کے دروازہ پر اترے مسجد کے اندر گئے ایک چھوٹا سا مسجد کا دالان تھا اور اُس کے آگے لکڑی کے ستونوں کا سائبان تھا اور بوریہ کا فرش بچھا ہوا تھا وہاں کوئی سر جھکائے سیاہ داڑھی سفید چادر اوڑھے بیٹھے تھے سید اُن کے پاس جا کر بیٹھے اُنھوں نے کچھ بات نہیں کی مگر تین چیزیں اُن کو دیں ایک تو سُرخ عقیق کی سُستی تہ لگانے کی تھی جو انگوٹھے میں پہن کر تیر چلانے کے لیے تھی اور

دو چیزیں اور دیں جو سید کو یاد نہیں رہیں وہ اُن چیزوں کو لے کر چلے نصف صحن مسجد میں ایک اور شخص دراز قد چھریرا بدن کھڑے ہوئے تھے اُن سے سید نے پوچھا کہ مسجد میں جو بیٹھے ہیں وہ کون ہیں اُنھوں نے کہا کہ ہیں تم نہیں جانتے کہ یہ حضرت علیؓ ہیں! سید پھرے اور دوڑے کہ جاکر اُن کے پانو کو بوسہ دوں مگر دوڑنے میں آنکھ کھل گئی اور خواب ہی میں از خود ان کو یہ خیال ہؤا کہ جن سے میں نے پوچھا تھا وہ حضرت عمرؓ تھے ۔"

خواب :- "جس زمانہ میں کہ اُن کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور تنخواہ قلعہ کی بند ہوگئی تھی سید کو یہ خیال ہؤا کہ جس قدر روپیہ اُن کی والدہ کے پاس ہے وہ سے کر سود میں لگایا جائے تو آمدنی معقول ہو سکتی ہے بعض مکانات اور کٹرے جن سے آمدنی کم ہے اگر فروخت کرکے اُن کا روپیہ بھی سود میں لگایا جائے تو کثیر آمدنی ہو سکتی ہے۔ اُنھوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ جامع مسجد کے حوض میں تیر رہے ہیں مگر نصف حوض جس میں وہ تیر رہے ہیں اُس کا پانی نہایت صاف اور ٹھنڈا ہے مگر کم گہرا ہے جس میں اچھی طرح تیرا نہیں جاتا دوسرا نصف پانی کسی قدر گرم اور میلا ہے مگر بہت گہرا ہے جس میں بخوبی تیرا جاسکتا ہے سید نے ارادہ کیا کہ اُس نصف پانی میں جاکر تیروں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ کنارہ پر سفید لباس پہنے ہوئے سیاہ داڑھی ایک شخص کھڑے ہیں اور اُنھوں سے خواب ہی میں جانا کہ یہ علی مرتضیٰ ہیں اُنھوں نے کہا کہ اس نصف میں مت آؤ یہ پانی خراب ہے جہاں ہو وہی پانی اچھا ہے اور زیادہ ہو جائے گا۔ اُس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور جو خیال اُن کے دل میں پیدا ہؤا تھا اُس سے باز آئے۔"

خواب "سید بجنور میں تھے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص سفید پوش آئے اور اُن کو ایک قلمدان کشمیر کا بنا ہؤا نہایت نفیس دے کر چلے گئے اور خواب ہی میں اُن کو یقین ہؤا کہ وہ علی مرتضیٰ تھے ۔"

خواب :- بجنور ہی میں اُنھوں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ چاندنی رات ہے اور چاند نکلا ہؤا ہے اور وہ اپنے مکان کے سامنے صحن چبوترہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سید کی نگاہ اپنے بائیں پانو پر پڑی تو دیکھا کہ اُن کی پانو کی اُنگلیوں کی ایک ایک پور کٹ گئی ہے مگر کچھ درد نہیں ہے اور نہ اُس سے لہو بہتا ہے مگر کٹی ہوئی پوروں کے سرے جہاں سے کٹے ہیں نہایت سرخ لہو کے مانند ہو رہے ہیں۔ سید نہایت حیران ہوئے

کہ اب کیا کروں اتنے میں ایک بزرگ آئے اور انھوں نے اُن کٹی ہوئی انگلیوں کے سروں پر اپنا لب مبارک لگا دیا اُسی وقت اُن انگلیوں میں نمو شروع ہوا اور سب انگلیاں درست ہوگئیں اور ان میں چاند سے زیادہ روشنی تھی سید چاند کو دیکھتے اور اُن نئی انگلیوں کو دیکھتے اور اُن میں چاند سے زیادہ روشنی پاتے تھے خواب ہی میں اُن کو کسی طرح یقین ہوا کہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جنھوں نے لب مبارک لگایا تھا۔"

خواب ۳: مراد آباد میں اُن کی بیوی کا انتقال ہوا چند روز بعد انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ ایک نہایت عمدہ مکان میں بیٹھی ہیں اور نہایت عمدہ سبز لباس پہنے ہوئے ہیں اور اُن کا بدن اور چہرہ چاند کے مانند روشن ہے سید نے اُن کو ہاتھ سے چھونا چاہا انھوں نے کہا یہ جسم ہاتھ میں نہیں آسکتا یہ نورانی جسم اور لباس ہے دنیا میں جو جسم اور لباس تھا وہ نہیں ہے۔"

خواب ۴: "جب سید دہلی میں منصف تھے انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب اُن کے کمرے میں موجود ہیں اور جس طرح وہ خانقاہ میں بیٹھتے تھے اُسی طرح ایک سوزنی پر جو صدر مقام پر بچھی ہوئی تھی بیٹھے ہیں سید اُن کے پاس بیٹھے ہیں شاہ صاحب اُن پر اُسی طرح جیسی کہ اُن کی عادت تھی مہربانی فرماتے ہیں اور یہ کہا کہ اب تم بھی بیعت کرلو۔"

خواب ۵: دہلی میں انھوں نے دیکھا کہ وہ خانقاہ میں گئے ہیں وہاں اُن کے والد اور شاہ ابوسعید صاحب جو بعد حضرت شاہ غلام علی صاحب کے اُن کے سجادہ نشیں ہوئے اور جن کا اُس زمانہ میں انتقال ہوچکا تھا اور اور لوگ جو خانقاہ میں رہتے تھے موجود ہیں اور شاہ احمد سعید صاحب جو بعد شاہ ابوسعید صاحب کے سجادہ نشین ہوئے علیحدہ ایک طرف بیٹھے ہوئے ہاشم علی خاں کو جو سید کے ماموں کے بیٹے تھے حدیث کی کسی کتاب کا سبق پڑھا رہے ہیں سید کے والد نے یا شاہ ابوسعید صاحب نے سید سے کہا کہ تم بھی ہاشم علی خاں کے ساتھ سبق میں شریک ہوجاؤ۔"

خواب ۶: "سید دہلی میں منصف تھے اور ان کو کچھ تردّدات درپیش تھے انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم تین رکعتیں نماز کی تین دن تک بطور تراویح کے پڑھو اور پہلی رکعت میں فلاں سورہ اور دوسری میں فلاں سورہ پڑھو اور رکعتوں کے بعد سے جلسہ میں یہ آیت پڑھو کوئی رنج و تردد کی بات نہیں ہے مگر

جب اُٹھے تو بھول گئے کہ کونسی سورتیں اور کونسی آیت پڑھنے کو بتلائی تھی۔ اُنھوں نے شاہ احمد سعید صاحب کو ایک رقعہ لکھا کہ میں وہ سورتیں اور آیت بھول گیا ہوں۔ چار پانچ روز تک شاہ احمد سعید صاحب نے کچھ جواب نہیں بھیجا اُس کے بعد ایک پرچہ پر اُن سورتوں کے نام اور ایک آیت لکھ بھیجی اُس وقت سید کے خیال میں یہ بات آئی کہ یہی سورتیں اور آیت بتلائی تھی۔ سید نے جس طرح خواب میں دیکھا تھا نماز پڑھی چند روز بعد جب سید شاہ احمد سعید صاحب سے ملے تو پوچھا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ وہ سورتیں اور آیت بتلائی تھی اُنھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کی روح سے پوچھا اور اُن کی روح نے بتلایا کہ یہ سورتیں اور آیت بتائی تھی۔"

خواب :- "وہ دلی میں منصف ہی تھے کہ اُنھوں نے (خواب میں) دیکھا کہ وہ گویا بیعت کے ارادے سے خانقاہ جانے کو اپنے گھر سے اُترے ہیں تھوڑی دور چلے تھے کہ اُن کو خیال ہوا کہ نذر کے لیے کچھ لے لینا چاہیے اس وقت اُنھوں نے دیکھا کہ ایک ہندو دوست اُن کے پاس کھڑا ہے سید نے پندرہ روپیہ اُس سے قرض لیے اور خانقاہ میں گئے۔ وہاں دیکھا کہ شاہ ابو سعید صاحب اور اُن کے پاس شاہ احمد سعید صاحب اور اُن کے پاس شاہ عبد الغنی صاحب اور سب کے پیچھے میاں محمد مظہر بیٹھے ہیں۔ شاہ ابو سعید صاحب نے بیعت کر لینے کو فرمایا سید نے کہا میں تو اسی ارادے سے آیا ہوں لیکن بالکل جو طریقہ مسنون ہے اُسی طرح پر بیعت کرنی چاہتا ہوں فرض کرو کہ اُس قسم کے زہد و مجاہدہ میں جو مسنون نہیں ہیں صفائی قلب جلد حاصل ہوتی ہو اور جو طریقہ مسنون ہے اس میں بہ دیر حاصل ہوتی ہے تو مجھے وہ جلدی نہیں بلکہ وہ دیر پسند ہے۔"

"ہنوز شاہ صاحب نے جواب نہیں دیا تھا کہ میاں مظہر بولے کہ دیکھیے حضرت یہ کیسی وہابیوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ شاہ ابو سعید صاحب نے ناراضی سے جواب دیا کہ ایک شخص اتباع سنت چاہتا ہے اور تم اُس کی نسبت کہتے ہو کہ وہابیوں کی سی باتیں کرتا ہے۔"

"اس کے بعد وہ سید کی طرف متوجہ ہوئے اور سید سے کہا کہ نقشبندی طریقے میں کوئی امر بھی خلاف سنت نہیں ہے۔ سید نے کہا کہ بہت اچھا۔ اُس وقت سید نے اپنے دل میں سوچا کہ

مگر بعد بیعت کے نذر دی جائے گی تو گویا اُس کا معاوضہ ہوگا بہتر ہے کہ پہلے نذر دی جائے اور اس کے بعد بیعت ہو۔ پس سید نے پانچ روپیہ نکال کر شاہ ابو سعید صاحب کے نذر کیے اور پانچ روپیہ شاہ احمد سعید صاحب کے۔ دونوں صاحبوں نے نذریں لے لیں جب شاہ عبدالغنی صاحب کو نذر دی تو اُنھوں نے کہا کہ تم انگریزوں کے نوکر ہو میں نہیں لیتا۔ سید نے کہا میری تنخواہ کا روپیہ نہیں ہے میں تو ایک ہندو سے قرض لے کر لایا ہوں اُس پر بھی اُنھوں نے لینے سے انکار کیا شاہ ابو سعید صاحب نے فرمایا کہ یہ نہیں لیتے تو ان کی والدہ کے پاس بھیج دو۔ اس گفتگو کے بعد نوبت بیعت نہیں پہنچی کہ آنکھ کھل گئی۔"

"دہلی میں جو لوگ مقدس تھے وہ انگریزوں کی ایسی نوکری کو جس میں انفصال مقدمات کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ بطور عملہ کے کام کرنا ہوتا تھا اور نیز پولس کی نوکری کو جائز سمجھتے تھے اور جن عہدوں میں انفصال مقدمات کا کام ہوتا تھا جیسے منصفی اور صدر الصدوری اُس نوکری کو ناجائز سمجھتے تھے کیونکہ خلاف شرع بموجب انگریزی قانون کے مقدمات فیصل کرنے پڑتے تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحب کا بھی یہی حال تھا اور اسی سبب سے اُنھوں نے نذر لینے سے انکار کیا تھا

خواب "چند بینے ہوئے کہ علیگڑھ میں سید نے دیکھا کہ وہ دہلی میں کسی مقام پر ہیں اور شاہ غلام علی صاحب کی نسبت جو کہ بیمار ہیں لوگ کہتے ہیں کہ اب اخیر وقت ہے۔ سید نہایت بے قرار ہوئے اور اس خیال سے کہ اُن کی اخیر زیارت کر لیں اُس جگہ گئے جہاں شاہ غلام علی صاحب تھے۔ دیکھا کہ پلنگ پر لیٹے ہیں منہ اور پانو کھلے ہوئے ہیں اور سارا بدن کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے سید کہتے تھے کہ میں نے بعینہ وہی حالت دیکھی اور ویسا ہی پلنگ اور تمام چیزیں دیکھیں جیسے کہ حضرت کے انتقال کے دو ایک روز پہلے میں نے دیکھا تھا غرض کہ سید مضطرب ہو کر اُن کے پانو کی انگلیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم سید ہو ایسا مت کرو۔"

"ایک عجیب بات سید نے یہ کی کہ اُس خواب کے چند روز بعد جب وہ دہلی گئے تو شاہ غلام علی صاحب کے مزار پر گئے اور کہا کہ دادا حضرت اب آپ تو زندہ نہیں ہیں ورنہ میں

آپ کے پائوں سے آنکھیں ملتا مگر میں آپ کی قبر سے آنکھیں ملتا ہوں۔ یہ کہہ کر قبر کی پائنتی سے آنکھیں ملیں۔ سیا کی اس حرکت کو بن کر لوگ نہایت متعجب ہوں گے مگر اُن کی یہ حرکت صرف نسبت کی وجہ سے تھی نہ کسی اور خیال سے۔"

سرسید نے ایک دفعہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے یہ کہا تھا کہ "گو اس قسم کی عقیدت جیسی مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے مجکو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور رابطۂ اخلاص میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس بات کی تصریح کی جائے۔" اس کے سوا سرسید کی تصنیفات کی فہرست میں جو ایک رسالہ موسوم بہ نمیقہ بزبان فارسی تصورِ شیخ کے بیان میں ہے اُس کی نسبت سرسید کہتے تھے کہ میں نے اسے شاہ احمد سعید صاحب کو دکھایا تھا۔ انھوں نے اُس کو دیکھ کر یہ فرمایا کہ جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں وہ اہلِ حال کے سوا کوئی نہیں لکھ سکتا۔ پس یہ اُس توجہ کی برکت ہے جو شاہ صاحب کو تمھارے ساتھ تھی اور اب تک ہے۔

ضمیمہ نمبر ۱

رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان

یہ رسالہ صرف ایک دفعہ سرسید نے ۱۸۵۸ء میں چھپوایا تھا اور چند نسخوں کے سوا اس کی تمام جلدیں انگلستان میں پارلیمنٹ کے ممبروں کے پاس بھیج دی تھیں اس لیے ہندوستان میں اس کی اشاعت نہیں ہوئی۔ چونکہ اس رسالہ کا لکھنا جیسا کہ سرسید کی لائف میں مفصل بیان کیا گیا ہے اُن کی کثیر التعداد ملکی اور قومی خدمات میں سے ایک عمدہ ترین خدمت تھی اس نظر سے مناسب معلوم ہوا کہ یہ رسالہ تمام و کمال سرسید کی لائف کے آخر میں بطور ضمیمہ کے چھاپ دیا جائے تاکہ اُس مرحوم کی اس خدمت جلیلہ کا لوگ پورا پورا اندازہ کر سکیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از بندہ خضوع و التجاے زیبد   بخشایش بندہ از خداے زیبد
گر من نکنم آنکہ آں مرا نا زیباست   تو کن ہمہ آنکہ ترا سے زیبد

سرکشی ہندوستان کے جواب مضمون میں جو میں نے اصلی اسباب بغاوت ہندوستان کے بیان کیے تھے اگرچہ دل چاہتا تھا کہ اب اُن کو صفحۂ روزگار سے مٹا دوں بلکہ اپنے دل سے بھی بھلا دوں کیونکہ جو اشتہار جناب ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ دام سلطنتہا نے جاری کیا ہے درحقیقت وہ بغاوت کے ہر ایک اصلی سبب کا پورا علاج ہے حق یہ ہے کہ اشتہار کا مضمون دیکھ کر بغاوت کے سبب لکھنے والوں کے ہاتھ سے قلم گر پڑے کسی کو ضرورت نہ رہی کہ اب اُن کی تشخیص کریں اس لیے کہ اب اُن کا علاج پورا ہو گیا۔

مگر اِس فساد کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ گو اُن کا علاج بخوبی ہو گیا ہو پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں اُن کو بھی ظاہر کر دوں سچ ہے کہ بہت بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار

لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو بہتر ہے کہ ایسے شخص کی بھی ایک رائے رہے۔

مضمون

کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا

جواب

سرکشی کے معنی اور اس کی مثالیں

اس کا جواب دینے سے پہلے ہم کو بتانا چاہیے کہ سرکشی کے کیا معنی ہیں جان لو کہ اپنی گورمنٹ کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کے شریک ہونا یا مخالفانہ ارادے سے حکم نہ ماننا اور نہ بجالانا یا نڈر ہو کر گورمنٹ کے حقوق اور حدود کو توڑنا سرکشی ہے مثلاً:-

۱- نوکر کا یا رعیت کا اپنی گورمنٹ سے لڑنا اور مقابلہ کرنا۔

۲- یا مخالفانہ ارادے سے حکم کا نہ ماننا اور نہ بجالانا۔

۳- یا مخالفوں کی مدد کرنا اور اُن کے شریک ہونا۔

۴- یا رعیت کا نڈر ہو کر آپس میں لڑنا اور حد معینہ گورمنٹ سے تجاوز کرنا۔

۵- یا اپنی گورمنٹ کی محبت اور خیر خواہی دل میں نہ رکھنا اور مصیبت کے وقت طرفداری نہ کرنا۔

اِس نازک وقت میں جو ۱۸۵۷ء میں گزرا ان اقسام کی سرکشیوں میں سے کوئی بھی سرکشی ایسی نہیں ہے جو نہ ہوئی ہو بلکہ بہت تھوڑے دانا آدمی ایسے نکلیں گے جو پچھلی بات سے خالی ہوں حالانکہ یہ پچھلی بات جیسی ظاہر میں کم ہے ویسی ہی قدر میں بہت زیادہ ہے۔

سرکشی کا ارادہ دل میں کیوں آتا ہے

سرکشی کا ارادہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اُس کا سبب ایک ہی ہوتا ہے یعنی پیش آنا اُن باتوں کا جو مخالف ہوں اُن لوگوں کی طبیعت اور طینت اور ارادہ اور عزم اور رسم و رواج اور خصلت اور جبلت کے جنھوں نے سرکشی کی۔

۱۸۵۷ء کی سرکشی کسی ایک بات سے نہیں ہوئی بلکہ بہت سی باتوں کا مجموعہ تھا

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات عام سرکشی کا باعث نہیں ہو سکتی ہاں عام سرکشی کا باعث یا کوئی ایسی عام بات ہو سکتی

ہے کہ جو سب کی طبیعوں کے مخالف ہو یا متعدد باتیں ہوں کہ کسی نے کسی گروہ کی اور کسی نے کسی گروہ کی طبیعتوں کو پھیر دیا ہوا اور رفتہ رفتہ عام سرکشی ہوگئی ہو۔

۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا صرف اُس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اُس میں آگ لگا دی۔

چپاتی بٹنا کوئی سازش کی بات نہ تھی

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اکثر ضلعوں میں دیہ بدیہ چپاتی بٹی اور اُسی کے قریب زمانہ میں سرکشی ہوئی اگرچہ اُس زمانہ میں تمام ہندوستان میں وبا کی بیماری تھی اور خیال میں آتا ہے کہ اُس کے دفع کرنے کو بطور ٹوٹکہ یہ کام ہوا ہو کیونکہ جاہل ہندوستانی اس قسم کے ٹوٹکہ بہت کیا کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ اُس کا اصلی سبب اب تک نہیں کھلا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چپاتی کسی سازش کی بنیاد نہیں ہوسکتی یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کی چیز البتہ ایک نشانی ہوتی ہے واسطے تصدیق زبانی پیغام کے اور ظاہر ہے کہ اُس چپاتی کے ساتھ کوئی زبانی پیغام نہ تھا اگر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ باوجود منتشر ہونے کے اور ہر قوم اور ہر طبیعت کے آدمیوں میں پھیلنے کے مخفی رہتا جس طرح پر کہ ہندوستان میں سرکشی پھیلی اور یہاں سے وہاں اور وہاں سے وہاں دوڑی صاف دلیل ہے کہ پہلے سے کچھ سازش نہ تھی۔

روس اور ایران کی سازش کچھ نہ تھی

روس اور ایران کی سازش سے ہندوستان میں سرکشی کا خیال کرنا نہایت بے بنیاد بات ہے۔ ہندوستانیوں پر جو معلوم نہیں کہ روسیوں کو کیا سمجھتے ہونگے کیونکر اُن سے سازش کا احتمال ہوسکتا ہے ایرانیوں سے ہندو کسی طرح سازش نہیں کرسکتے ہندوستان کے مسلمانوں میں اور ایرانیوں میں موافقت ہونی ایسی غیر ممکن ہے جیسے پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھلک میں اگر دن اور رات کا ایک وقت میں جمع ہونا ممکن ہے تو البتہ سازش کا ہونا بھی ممکن ہے تعجب ہے کہ جب روس اور ایران میں محاربات درپیش تھے تب ہندوستان میں کچھ نہ تھا اور جب ہندوستان میں فساد ہوا تو وہاں کچھ نہ تھا اور پھر سازش کا خیال کیا جائے۔

اشتہار کا ذکر جو شاہزادہ ایران کے خیمہ میں سے نکلا

اشتہار جو ذکر ہی کہ ایران کے شاہزادے کے خیمہ میں سے نکلا اُس کا کوئی لفظ ہندوستان کی سازش پر دلالت نہیں کرتا اُس کا مضمون صاف اپنے ملک کے لوگوں کی ترغیب کا ہی ہندوستان کی خرابی کا ذکر اس بنیاد پر ہی کہ ایرانیوں کو زیادہ تر آمادگی لڑائی پر ہو نہ اس مطلب سے کہ ہندوستان سے سازش ہو چکی ہی

دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا عجب نہیں مگر بنیاد سرکشی نہیں۔

دلی کے بادشاہ معزول کا ایران کو فرمان لکھنا ہم کچھ تعجب نہیں سمجھتے دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اُس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہی تو وہ اُس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کیا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے سے کوئی فرمان لکھا ہو تو تعجب نہیں مگر جانتا کہ وہ کسی طرح بھی سازش کی بنیاد ہو۔ کیا تعجب نہیں آتا کہ اتنی بڑی سازش اور اتنی مدت سے ہو رہی ہو اور ہمارے حکام بالکل بے خبر رہیں۔ سرکشی کے بعد بھی کیا فوجی اور کیا ملکی کسی باغی نے بھی آپس میں کسی قسم کی سازش کا کبھی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ سرکشی کے بعد اُن کو کس کا ڈر تھا۔

اودھ کی ضبطی اس عام فساد کا باعث نہیں

اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے اس میں کچھ شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یقین کیا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اور اقرار کے کیا عموماً رعایا کو ضبطی اودھ سے اسی قدر ناراضی ہوئی تھی جتنی کہ ہمیشہ ہوا کرتی تھی جب کمپنی کسی ملک کو فتح کرتی تھی جس کا بیان آگے آوے گا زیادہ تر ڈر اور خوف اور ناراضی دلی والیان اور رئیسان خود مختار ہندوستان کو ہوتی تھی سب کو یقین تھا کہ اسی طرح سب کے ملک اور سب کی ریاستیں اور حکومتیں چھینی جاویں گی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب ملک رئیسوں میں سے کوئی باغی نہیں ہوا اس فساد میں اکثر وہی لوگ ہیں جن کے ملک اُن کے ہاتھ میں نہیں ہیں اس

کے جواب میں یہ مت کہو کہ جھجر کا نواب اور بلب گڑھ کا راجہ اور فلاں فلاں باغی ہوگیا۔

قوم کی سازش واسطے اٹھا دینے غیر قوم کی حکومت کے نہیں۔

اس فساد کو یہ بھی خیال کرنا نہیں چاہیے کہ اس حسرت اور افسوس کے باعث سے کہ ہندوستانیوں کے قدیم ملک پر غیر قوم قابض ہوگئی تھی تمام قوم نے اتفاق کرکر سرکشی کی۔ سمجھنے کی بات ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی عملداری دفعۃً ہندوستان میں نہیں آئی تھی بلکہ رفتہ رفتہ ہوئی تھی جس کی ابتدا ۱۷۵۷ء وقت شکست کھانے سراج الدولہ کے پلاسی پر سے شمار ہوتی ہے۔ اس زمانے سے چند روز پیشتر تک تمام رعایا اور رئیسوں کے دل ہماری گورنمنٹ کی طرف کھنچتے تھے اور ہماری گورنمنٹ اور اُس کے حکام متعہد کے اخلاق اور اوصاف اور رحم اور استحکام عہود اور رعایا پروری اور امن و آسایش سن سن کر جو عملداریاں ہندو اور مسلمانوں کی ہماری گورنمنٹ کے ہمسایہ میں تھیں وہ خواہش رکھتی تھیں اس بات کی کہ ہماری گورنمنٹ کی حکومت کے سایہ میں ہوں۔ بادشاہان ملک غیر بھی کمال اعتماد رکھتے تھے ہماری گورنمنٹ پر۔ اور جو عہد و میثاق ہماری گورنمنٹ سے باندھتے تھے اُس کو بہت ہی پکا اور پتھر کی لکیر سمجھتے تھے۔ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ کو پہلے کی بہ نسبت اب بہت بڑا اقتدار ہے برعکس ہندوستانیوں کے کہ ہندوستان کے رئیسوں اور صوبہ داروں اور والیان ملک کو جو طاقت اور اختیار پہلے تھا اُس کا عشر عشیر بھی اب نہیں حالانکہ اُن زمانوں میں بہت سی لڑائیاں ہماری گورنمنٹ کو ہندوستان کی ہر قوم ہندو و مسلمان سے پیش آئیں اور ہماری گورنمنٹ فتحیاب ہوتی گئی اور تمام ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ ایک دن تمام ہندوستان پر ہماری گورنمنٹ کی حکومت ہوگی اور یہ سب رعایا ہندوستان کی کیا ہندو اور کیا مسلمان ایک دن ہماری گورنمنٹ کے قبضۂ قدرت میں آئے گی باوجود ان باتوں کے اُس زمانے میں کسی طرح کی سرکشی اور گورنمنٹ کا مقابلہ نہیں ہوا کہ سب تاریخیں اس ذکر سے خالی ہیں اگر یہ فساد اس سبب سے ہوتا تو ضرور ہے کہ ان فسادوں کا نمونہ اُن زمانوں میں بھی پایا جاتا خصوصاً اس سبب سے کہ اُن زمانوں میں ایسے فسادات کا قابو زیادہ تھا۔ اُن محاربات کے وقت میں جو ۱۷۵۷ء میں شروع تھے جب کہ کسی طرح کی سرکشی ہندوستان میں نہیں ہوئی باوجودیکہ صدہا سال تک ہندوستان اُنھیں ملکوں کے بادشاہوں کے تحت حکومت تھا جن

سے کہ ہمارا بات در پیش تھے اور انہیں بادشاہوں کے سبب سے مسلمانوں کا وجود اور عروج ہندوستان میں ہوا تھا تو اب ہرگز خیال میں بھی نہیں آتا کہ اب کا فساد مسلمانوں نے حکومت اور اپنی سلطنت کے جاتے رہنے کے رنج سے کیا ہو۔

دلی کے معزول بادشاہ کی وقعت دلی کے لوگوں میں اور اُن شہروں میں جو دلی کے قریب تھے کچھ نہ تھی مگر بیرونجات میں لارڈ امہرسٹ صاحب کا کہنا کہ خاندان تیمور دلی کا بادشاہ نہیں۔

دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزو مند نہ تھا۔ خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے اُس کی قدر و منزلت گرا دی تھی۔ ہاں بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار اور اختیار سے واقف نہ تھے بلاشبہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اُس کو ہندوستان کا بادشاہ اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان سمجھتے تھے۔ بالاخاص دلی کے اور اُس کے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا۔ یاد ہوگا کہ جب ۱۸۲۷ء میں لارڈ امہرسٹ صاحب بہادر نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے تو اُس وقت عمائد اور والیان ہندوستان کو کچھ بھی خیال نہیں ہوا تھا گو خاص بادشاہی خاندان کو کچھ رنج ہوا ہو۔

پہلے سے کچھ سازش مسلمانوں میں جہاد کی نہ تھی۔

مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں نہایت بے بنیاد بات ہے جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔

مولوی محمد اسمٰعیل کے وعظ اور جہاد کا ذکر

بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی اُس وقت اُس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکار عملداری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی

اور جو ہر ضلع میں باغی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا اگر ہم اُس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اُس کی سازش اور صلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق نہ تھی ۔

اس ہنگامہ میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے مطابق نہیں ہوئی

غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا اُس میں خیانت کرنا ملازمین کو نمک حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا مذہب کے بموجب گناہ عظیم تھا۔ پھر کیونکر یہ ہنگامہ غدر جہاد ہو سکتا تھا ہاں البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔

دلی میں جہاد کا فتوے جو باغیوں نے چھاپا وہ در اصل جھوٹا ہے۔

دلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے مگر میں نے تحقیق سنا ہے اور اُس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا اگرچہ اس پہلے فتوے کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جبکہ وہ اصل فتوے معدوم ہے تو میں اُس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔ مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہنچی اور دوبارہ فتوے ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں چھاپنے والے اُس فتوے نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اُس کو رونق دیا تھا بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اُس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں ۔

دلی میں مولویوں کا بڑا گروہ جو معزول بادشاہ کو بدعتی سمجھتا تھا اور اس کی مقبوضہ مسجدوں میں نماز نہ پڑھتے تھے

دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ اُن

جن کی مہریں فتوے پر چھاپی ہیں اُن میں سے بعضوں نے عیسائیوں کی جان اور عزت کی پناہ دی تھی۔

لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو۔ جن لوگوں کی مہر اُس فتوے پر چھاپی گئی ہے اُن میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی اور اُن کی جان اور عزت کی حفاظت کی اُن میں سے کوئی شخص لڑائی پر نہیں چڑھا مقابلے پر نہیں آیا اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے غرض کہ میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں اور جاہلوں اور مفسدوں کا غلغلہ ڈال دینا کہ جہاد ہے جہاد ہے اور ایک نعرۂ حیدری پکارتے پھرنا قابل اعتبار کے نہیں ہاں البتہ مسلمانوں کو جس قدر ناراضی باعتبار مذہب کے تھی اور جس سبب سے تھی وہ ہم آیندہ صاف بیان کریں گے اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کو ہر ایک بات میں زیادہ تر ناراضی تھی اور یہی سبب ہے کہ مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے بعض اضلاع میں زیادہ تر مفسد ہو گئے۔ گو جن اضلاع میں کہ ہندوؤں نے فساد کیا تھا وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

پہلے سے فوج میں بغاوت کی صلاح نہ تھی

فوج میں ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی۔ تحقیق بات ہے کہ باغیان فوج نے بعد بغاوت بھی کبھی اس بات کا آپس میں بھی ذکر نہیں کیا ہاں بارک پور کے واقعہ کے بعد اور خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ پنجاب میں قواعد جدید سکھانے کو متعدد پلٹنوں کے آدمی جمع کیے گئے آپس میں یہ صلاح ٹھیری اور اُس پر یہ اتفاق ہوا کہ جدید کارتوس کبھی استعمال میں نہ لائیں گے۔ اُس وقت بھی اور کسی قسم کا ارادہ اور نیت نہ تھی بلکہ یقینی سمجھتے تھے کہ سرکار اس بات

کو موقوف کردے گی اگرچہ یہ موقوف ہوا مگر دسویں مئی ۱۸۵۷ء کے بعد موقوفی سے کچھ فایدہ اُس فساد کے رفع ہونے میں جو ہو گیا تھا نہ تھا اور وہ آگ اس قابل نہ تھی کہ ایسی تدبیروں سے بجھ سکے۔

پہلے سے فوج باغی کی بادشاہ دہلی سے سازش نہ تھی۔

فوج باغی کا پہلے سے دلی کے معزول بادشاہ سے سازش کرنا محض بے اصل ہے دلی کے بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا اُس کے منہ پر لوگ اُس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ لوگ اُس کے مرید ہوتے تھے کسی فائدے کی نظر سے نہ بطور اعتقاد۔ کچھ عجب نہیں کہ کسی پلٹن کا کوئی تلنگہ یا صوبہ دار مرید ہوا ہو مگر اس بات کو سازش بغاوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے بلاشبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی مگر جب اُس نے سرکار سے بگاڑ دی تھی تو دلی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا کہ جس کی طرف فوج رجوع کرتی۔ کچھ اس میں کچھ پہلے سے سازش کی حاجت نہ تھی بلاشبہ جو ہیئت بادشاہ دلی کی سرکار نے بنا رکھی تھی وہ ہمیشہ نامناسب اور قابل اعتراض کے تھی اور جناب لارڈ ڈالن برا صاحب بہادر نے جو تجویز کی تھی وہ بے شک لائق منظوری کے تھی بلکہ اُس سے زیادہ عمل درآمد کرنا واجب تھا بے شک دلی کا بادشاہ بھوبل میں کی ایک چنگاری تھا جس نے ہوا کے زور سے اُڑ کر تمام ہندوستان کو جلا دیا۔

شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا لجس لیٹو کونسل میں اصلی سبب فساد کا ہے

اصلی سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں اور یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی ہی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورمنٹ کے اس باب میں میرے طرفدار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں۔

یہ بات بہت ضروری تھی

سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات سے ہے حکام کو بھلائی یا برائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے بیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو شعر سرچشمہ شاید گرفتن بمیل ✦ چو پرشد نشاید گذشتن بپیل۔ اور یہ بات نہیں حاصل ہوتی جب تک

کہ مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں نہ ہو علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کی رہنے والی تھی اور مذہب اور رواج اور راہ و رسم اور طبیعت اور عادت بھی اس ملک سے مختلف رکھتی تھی، اس بات پر خیال رکھنا واجبات سے تھا۔ گورنمنٹ کا انتظام اور اُس کی خوبی اور اسلوبی اور پائداری ملکی اطوار اور عادات کی واقفیت اور پھر اُس کی رعایت پر موقوف ہے کیونکہ ملکی تاریخوں کے دیکھنے سے بلکہ درحقیقت ایک روزنامچہ ہے عادات اور خیالات اور اطوار مختلفہ نوع انسان کا معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن کی عادتیں اور خیالات اور اطوار موافق کسی عقلی قاعدے کے حاصل نہیں ہوئی ہیں بلکہ ہر ایک ملک اور قوم میں جیسے اتفاق ہو گئی ہیں پس قواعد گورنمنٹ اُن اوضاع اور اطوار پر موقوف ہیں نہ یہ کہ وہ اوضاع اور اطوار اور عادات قواعد گورنمنٹ پر۔ اور اسی بات میں گورنمنٹ کی پائداری اور قیام ہے کیونکہ جب تک وہ عادتیں اور اخلاق رعایا کے دل میں مستحکم اور بمنزلہ خاصیت انسانی کے نہ ہو گئے ہوں اُس وقت تک اُن کے برخلاف کرنا صریح خاصیت انسانی کے برخلاف کرنا اور سب کو رنجیدہ رکھنا ہے۔ کیا ہم بھول جائیں گے بنگالے کی اُس بے انتظامی کی حالت کو جو ۱۷۶۵ء میں بروقت تفویض ہونے دیوانی بنگلہ کمپنی انگریز بہادر اسی واقفیت کے سبب ہوئی تھی باوصفیکہ جان کلارک مارشمن صاحب کی تاریخ اُسے یاد دلا رہی ہے اور کیا یاد نہ رہے گی ہم کو وہ خوبی جو بنگالے میں لارڈ ہسٹنگز صاحب بہادر کی زبان دانی اور ملکی راہ و رسم کی واقفیت سے حاصل ہوئی تھی۔

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی مگر لیجس لیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں اور جمع ہوتی گئیں وہ سب اُس کی شاخیں ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری گورنمنٹ نے ملکی حالات اور اطوار دریافت کرنے میں کوشش نہیں کی بلکہ ہم اس کے بدل مقر ہیں اور بعض قوانین گورنمنٹ اور ہدایات بورڈ آف ریونیو اور آنریبل ٹامسن صاحب کے ہدایات نامہ مال کو اس کا گواہ سمجھتے ہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ رعایا کے حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت اور طینت اور لیاقت کے دریافت کرنے

میں توجہ نہیں کی۔ بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز اُن کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتہً پھٹ پڑے۔

اس سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر نہ کھلا اور گورنمنٹ کا نیک ارادہ ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا بلکہ برعکس سمجھا گیا

لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستان کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہو سکے۔ اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا ملحوظ نہیں رہیں۔ اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی۔ بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا، گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی، جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اُس میں شریک نہ تھے اور علم اُس تجویز سے واقف نہ تھے اُس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے اور وہ بعضی باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت و طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں، قطع نظر اس کے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں یا بری زیادہ تر اُن کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی۔ اور پھر اُس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص اُن کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر اُن کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی جب کہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیے تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے اور جب کہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی تو ان غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج

کہ اُن کے دل پر تھا اُن کا علاج نہ ہونا صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستان میں بیجا فساد کر دیا۔

یہ مت کہو کہ ہماری گورمنٹ نے چھاپہ خانوں میں سوائے گالی اور افترا اور جن باتوں سے فتنہ یا سرکشی وقوع میں آوے اور سب امورات چھاپنے کی اجازت دی تھی اور قانون جاری ہونے سے پہلے مشہور کیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اُس پر عذرات پیش کرنے کا اختیار تھا کیونکہ یہ امور اُن بڑی عظیم الشان بلاؤں کے علاج کو جس کا ہم ذکر کرتے ہیں محض ناکافی بلکہ محض بے فائدہ تھی۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے تربیت لیجس لیٹو کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا اور کیا قاعدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹو کونسل میں مداخلت دیجاتی تو طریقہ اُن کے انتخاب کا کیا ہوتا اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورمنٹ کے لیے بہت اچھی اور بہت ضرور تھی اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اُس کو دیکھنا چاہیے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہیے۔

سرکشی کا ہونا پانچ اصول پر مبنی ہے

یہ نقص جو ہماری گورمنٹ میں تھا اس نے تمام ہندوستان کے حالات میں سرایت کی اور جس قدر اسباب سرکشی کے جمع ہوگئے گو وہ اسی ایک امر پر متفرع ہیں مگر غور کر کے سب کو احاطہ میں لایا جائے تو پانچ اصول پر مبنی ہوتے ہیں۔

اول۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورمنٹ کا

دوم جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقہ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

سوم ناواقف رہنا گورمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور اُن

مصائب سے جو اُن پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم ترک ہونا اُن امور کا ہماری گورمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

پنجم بد انتظامی اور بے اہتمامی فوج کی

اب ہم ان پانچوں اصل کی تفصیل اور اُس کی ہر ہر شاخ کو جُدا جُدا بیان کرتے ہیں باللہ التوفیق۔

اصل اول

اول غلط فہمی رعایا | غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجویز گورمنٹ کا۔

اس مقام پر جتنی باتیں ہم بیان کرتے ہیں اُن سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت ہماری گورمنٹ میں یہ باتیں تھیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ لوگوں نے یوں غلط سمجھا اور سرکشی کا سبب ہوگیا اگر ہندوستانی آدمی بھی لیجس لیٹو کونسل میں مداخلت رکھتے تو یہ غلط فہمی واقع نہ ہوتی۔

مداخلت مذہبی سمجھنا | مداخلت مذہبی کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں اس واسطے دفعتہً اور جبراً مسلمانوں کی طرح دین بدلنے کو نہیں کہتے مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا بیان آگے آئے گا اُن کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں سب کو یقین تھا کہ ہماری گورمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا

سکندرہ کے یتیموں کا ذکر لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی
کیے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان
کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل
ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں
کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ
کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلے اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا ووں ووں ہمارے
مذہب اور رسم و رواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوئی ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی
روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ
کو ان امور میں کچھ مداخلت نہ تھی مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضی
گورنمنٹ ہوتے ہیں سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے گورنمنٹ
حکام متعہد کا مشنری طریقہ برتنا سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور اور حکام انگریزی ولایت سے بعضا
جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے
کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں اکثر حکام متعہد اور افسران فوج نے اپنے
تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی
پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا غرضکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی
شخص نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی تکرار مذہب کی کتابیں
بطور سوال جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں اُن کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں
کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوئے۔ ہندوستان میں دستور وعظ اور کتھا کا یہ ہے کہ اپنے
اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے۔ پادری

صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرت گاہ میلہ میں جاکر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا۔

مشنری سکول | مشنری سکول بہت جاری ہوئے اور اُن میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد اُن اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اُس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تھا کہ تمھارا خدا کون تمھارا نجات دینے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اُس پر اُن کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے اس بات کو عدم ناراضی پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہوجانے پر یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا ایسی سخت بات جس سے بلاشبہ اُن کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے۔

دیہاتی مکاتب | دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر گانو اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو ہر ہر گانو میں کالا پادری اُن کا نام تھا جس گانو میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ کالا پادری آیا عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں

اور کرسٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے ہمارے لڑکے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور روحانیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کر دے تاکہ آیندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے اکثر اضلاع شرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف حکماً ہوا اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔

لڑکیوں کے سکول کا اجرا

لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہو گی اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز و ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمایش کرتے تھے اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا اُن کو یقین ہوتا جاتا تھا۔

بڑے کالجوں میں طریقۂ تعلیم کا ضبط

بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے اول اول گو اُن سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی اُس زمانے میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے زندہ تھے مسلمانوں نے اُن سے فتویٰ پوچھا اُنھوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے اُس پر سیکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے مگر اُس زمانے میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ اُن میں تعلیم کا سر رشتہ بہت اچھا تھا ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی فقہ میں امتحان ہوتا تھا سندیں ملتی تھیں کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوئے تھے مگر آخر کو یہ بات نہ رہی فقہ عربی کی بہت کم ہو گئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی تعلیم کی صورت اور کتابیں کے

رواج سے بالکلیہ تغیر کرنا اردو اور انگریزی کا رواج بہت زیادہ ہوا جس کے سبب سے وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے قائم ہوگیا مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے وہی مدرسہ کے طالب علم کہ جنھوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا مدرس ہونے لگے۔ اس لیے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہوگیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار در باب استحقاق نوکری

ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا کہ اُن پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا کہ دفعتاً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سارٹیفکٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھے جاتے تھے منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے۔

جیل خانوں میں اختلاط اکل و شرب

اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اُس کی تدبیر میں ہے۔

پادری اے ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجراء

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ دفعتہً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی مذہب بھی ایک چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد

خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا پانوں تلے کی مٹی نکل گئی سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول اُن کو کرشان ہونا پڑیگا اور پھر تمام رعیت کو سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرشان ہو گئے ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں چنانچہ اُنھوں نے کر دیا اور اُس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

کچھ عجب نہ تھا کہ اسی زمانے میں کچھ بڑا بھی اور تھوڑا بہت فساد ملک میں شروع ہو جاتا چنانچہ اُس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے مگر جناب معلی القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطرار جو ہو گیا تھا وہ دھیما ہوا مگر جیسا کہ چاہیے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا لوگ سمجھے کہ فی الحال یہ بات موقوف ہو گئی پھر کبھی قابو پا کے وقت پر جاری ہو گی پادری ای ایڈمنڈ کی چٹھی اور نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال کا اشتہار آخر کتاب میں مندرج ہے وہاں دیکھو۔

مسلمانوں کو مداخلت امور مذہبی سے زیادہ رنج ہونا اور اُس کا سبب

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہندو کے بہت زیادہ ناراض تھے اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں نہ بطور احکام مذہب کے اُن کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ اُن کے برتاؤ میں ہیں اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز اُن رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں اُن کے سامنے اُن کے اُس

عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے برخلاف باتیں ہوا کریں اُن کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مذہب کے عقائد کے بموجب جو باتیں کہ اُن کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھا کرتے ہیں اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا چنانچہ یہی ہوا بلاشبہ جیسی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اُس مذہب کے جس کو وہ حق سمجھتے ہیں برخلاف اور بیجا ہے مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔

اصل دوم

دوم اجرائے ضوابط آئین نامناسب | جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقہ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کے عادات کے مناسب نہ تھے۔

ایکٹ ۲۱ ۱۸۵۰ء | لیجس لیٹو کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء صاف مذہبی قواعد پر خلل انداز تھا مگر اس ایکٹ سے ایک یہ بدگمانی لوگوں کو تھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ غیر مذہب کا کوئی آدمی ہندوؤں میں شامل نہیں ہو سکتا پس ہندو تو اس قانون کے مفاد سے محروم تھے۔ غیر مذہب کا کوئی آدمی اگر مسلمان ہو جائے تو اس کو اپنے مذہب کی رو سے جو اُس نے اختیار کیا ہے اپنے مورثوں کا متروکہ جو غیر مذہب میں تھے لینا منع ہے پس کوئی نومسلم بھی اس ایکٹ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا البتہ عیسائی مذہب جس نے قبول کیا ہے وہ فائدہ مند ہو سکتا تھا اس سبب سے لوگ خیال کرتے تھے کہ علاوہ مداخلت مذہبی کے اس ایکٹ سے صاف ترغیب ہے۔

ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء | ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء درباب بیوہ ہنود کے رسم مذہبی میں خلل ڈالتا تھا گو اس میں بڑی

بڑی بحثیں ہوئیں اور بیوستہ بھی لے گئے مگر ہندو لوگ جو مذہب سے زیادہ پابند رسم رواج کے ہیں اس ایکٹ کو نہایت ناپسند کرتے تھے بلکہ باعث اپنی ہتک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں گمان کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہنود کی بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں

عورتوں کی فعل مختاری

ضابطہ عورتوں کی فعل مختاری کا جو فوجداری سے عدالتوں میں جاری تھا کس قدر ہندوستانیوں کی عزت اور آبرو اور رسم اور رواج میں نقصان پہنچاتا تھا منکوحہ عورتیں تک فوجداری سے فعل مختار ہو گئیں ولیوں کی ولایت عورتوں پر سے اٹھ گئی اور یہ باتیں صریح مذہب میں نقصان پہنچاتی تھیں دیوانی عدالت پر جو اس کا تدارک حوالہ کیا گیا تھا بلاشبہ ناکافی اور بے فائدہ تھا اور جس بات کا فی الفور تدارک ہونا از روئے مذہب اور رسم و رواج کے چاہیے تھا وہ ایسی تاخیر اور جھمیلے میں ڈالا گیا تھا کہ زیادہ فساد اُس سے برپا ہوتا تھا دیوانی کی ڈگریات بابت دلاپانے زوجہ کے بہت ہی کم تعمیل ہوئی ہوں گی اکثر مقدمات ایسے نکلیں گے کہ عورت نے غاصب کے گھر دو تین بچے بھی جن لیے اور ہنوز مدعی اُس کی نشان دہی کی تدبیر میں سرگرداں ہے۔

بعض قوانین خلاف مذہب باوصف متحد المذہب ہونے متخاصمین

چند ایکٹ اور قانون ایسے ہیں کہ جن کی رو سے باوصف متحد المذہب ہونے متخاصمین کے برخلاف اُن کے مذہب کے مقدمات دیوانی عدالت سے فیصل ہوتے تھے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری گورنمنٹ کسی مذہب کی طرفداری کرے مختلف مذہب ہونے کی صورت میں بلاشبہ انصاف کا لحاظ چاہیے بشرطیکہ وہ انصاف دونوں مذہبوں کے یا دونوں اہل مقدمہ کے معاہدہ کے برخلاف نہ ہو الا جب فریقین متحد المذہب ہیں تو ضرور ہے کہ اُن ہی کے مذہب یا اُن ہی کے رسم و رواج کے مطابق مقدمات حقوق متعلقہ دیوانی کے فیصل ہوں۔

ضبطی اراضی لاخراج

قوانین اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون ۱۸۴۱ء ہے حکومت ہندوستان کو نہایت مضر تھا ضبطی اراضیات نے جس قدر رعایائے ہندوستان کو ناراض اور بدخواہ ہماری

لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب کا قول

گورنمنٹ کا کر دیا تھا اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا

ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور اُن کو محتاج کر دینا ہے میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو
کس قدر ناراضی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس
سبب سے اُن کو تھی بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں اور ادنیٰ ادنیٰ حیلہ پر ضبط کی گئیں
ہندوستانی صاف خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے
بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھیں وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لیں پھر تو ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ
سے ہے ضبطی اراضیات کے باب میں اگر ہماری گورنمنٹ کی طرف سے یہ عذر صحیح اور واقعی بھی سمجھا
جائے کہ اگر ضبطی اراضیات لاخراجی نہ ہوتی تو واسطے پورا کرنے اخراجات گورنمنٹ کے جس کو نہایت
کفایت شعاری سے مان لینا چاہیے ہندوستانی آدمیوں سے اور کسی محصول کے لینے کی تدبیر کرنی
پڑتی مگر رعایا کو اس سے کسی طرح تسلی اور جو مصیبت کہ اُن پر پڑی اُس کا دفعیہ نہیں ہو سکتا دیکھو اس
زمانے میں جہاں جہاں باغیوں نے اشتہارات واسطے بہکانے اور ورغلانے رعایا کے جاری کیے
ہیں سب میں بجز دو باتوں کے یعنی مداخلت مذہبی اور ضبطی معافیات کے اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے
اس سے بخوبی ثابت ہے کہ یہ دونوں باتیں اصلی منشا اور بہت بڑا سبب ناراضی اہلِ ہند کا تھا علی الخصوص
مسلمانوں کا جن کو یہ نقصان بہت زیادہ بہ نسبت ہندوؤں کے پہنچا تھا۔

نیلام زمینداری | اگلی عملداریوں میں بلاشبہ حقیت زمینداری کی خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور
تھا مگر یہ بہت کم ہوتا تھا اور جہاں جہاں تک ہوتا تھا برضامندی اور بخوشی ہوتا تھا بعلت بانی یا بعلت
قرضہ جبراً اور حکماً نیلام حقیت کا کبھی دستور نہیں ہوا ہندوستان میں زمیندار اپنی موروثی زمینداری
کو بہت عزیز سمجھتے ہیں اُس کے زوال سے اُن کو کمال رنج ہوتا ہے اگر یہ خیال کیا جائے تو ہندوستان
میں ہر ایک محال زمینداری کا ایک چھوٹی سی سلطنت دکھائی دیتی ہے قدیم سے سب کی رضامندی سے
ایک شخص سردار ہوتا ہے وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقیت دار کو بقدر اپنے حصہ زمینداری
کے بولنے اور دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا رعیت باشندہ دیہہ کے چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ
گفتگو کرتے تھے اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طول پکڑا تو کسی بڑے گانو کے مقدم اور سردار کے حکم سے

فیصلہ ہوگیا ہندوستان کے ہر ایک گانو میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی بے شک بادشاہ کو جس قدر اپنی سلطنت جانے کا رنج ہوتا تھا اتنا ہی زمیندار کو اپنی زمینداری جانے کا غم تھا ہماری گورمنٹ نے اس کا مطلق خیال نہ کیا ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گانو باقی ہوگا جس میں تھوڑا بہت نہ انتقال ہؤا ہو ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک اُلٹ پلٹ ہوگیا پھر ہماری گورمنٹ نے اُس کے تدارک کو قانون اول ۱۸۲۲ء جاری کیا اور ایک کمیشن مقرر ہؤا اُس سے اور قسم کی صدہا خرابیاں برپا ہوگئیں یہاں تک کہ یہ کام حسب دلخواہ انجام نہ ہوسکا اور آخر کار یہ محکمہ بند ہوگیا۔

اس مقام پر ہم یہ گفتگو کرنی نہیں چاہتے کہ اگر سرکار وصول مالگزاری کا یہ قاعدہ مقرر نہ کرتی تو پھر کیا کرتی اور جب کہ زمین مالگزاری سرکار میں مستغرق اور اُس کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے تو کیوں نہیں نیلام ہوتی کیونکہ ہم اس مقام پر صرف یہ بات بیان کرتے ہیں کہ سرکشی کے یہ اسباب ہوئے خواہ ان سببوں کا ہونا بہ مجبوری ہؤا خواہ ناواقفی سے اور اگر اس امر کی بحث دیکھنی ہو تو ہماری دوسری رائے طریقہ انتظام ہندوستان ہے اس کو دیکھو مگر اتنی بات یہاں لکھ دیتے ہیں کہ زمین کا مالگزاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثہ کے ہے درحقیقت دعوی سرکار کا پیداوار پر ہے نہ زمین پر۔

بعوض زر قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کیے مہاجنوں اور روپیہ والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیے اور قصداً اُن کی زمینداری چھیننے کو بہت فریب برپا کیے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔

سختی بندوبست | بندوبست مالگزاری جو ہماری گورمنٹ نے کیا نہایت قابل تعریف کے ہے مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مالگزاری لی جاتی تھی شیر شاہ نے ایک تہائی پیداوار کا حصہ گورمنٹ مقرر کیا تھا کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں تھیں اور گورمنٹ کو نقصان متصور تھا مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا اکبر اول نے اسی بندوبست

کو یعنی پیداوار کا تہائی حصہ لینا بند کیا اور اسی کو جاری کیا مگر بندوبست پختہ کر دیا جس کا ذکرلا
صاحب کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے اور آئین اکبری میں بھی اُس کا بیان ہے اکبر نے اقسام زمین
مقرر کیے اول قسم کی زمین سے جس کا نام پولج تھا اور ہر سال بوئی جاتی تھی برابر مالگزاری کا حصہ
تھا۔ دوم قسم کی زمین جس کا نام پڑوتی تھا اور ہمیشہ کاشت نہ ہوتی تھی بلکہ چندے واسطے زور
بڑھانے کے چھوڑ دیتے تھے اُس زمین سے انھیں سالوں کی بابت مالگزاری لی جاتی تھی جبر
وہ کاشت ہوتی تھی سوم قسم کی زمین کی جس کا نام چچر تھا اور تین چار برس سے بے تردد تھی
اُس کی درستی کے لیے خرچ بھی درکار ہوتا تھا اول سال زراعت میں کچھ لیا جاتا تھا اور پھر بڑھ
جاتا تھا یہاں تک کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا چہارم قسم کی زمین جس کا نام بنجر تھا اور پانچ برس سے
زیادہ بے تردد پڑی تھی اور بھی ملائم شرطیں تھیں اس خام بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طو
ر تھا کہ پیداوار ہر بیگہ کی اور ہر قسم زمین کی اوسط کے حساب سے غلہ کے وزن پر نکالی جاتی تھی
بیگہ پیچھے ۹ من غلہ کی پیداوار نکالی اور تین من غلہ اُس بیگہ کا کاشتکار سے لینا حصہ گورمنٹ
ٹھہر گیا پھر اوسط نرخ ناموں سے قیمت غلہ قرار دی گئی اور وہ نقدی اُس بیگہ کی ٹھہر گئی پھر اس
بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار بعوض نقدی گرانی نرخ سمجھ کر تین من غلہ دیدے تو اُس کو اختیار
سرکاری بندوبست میں ان میں سے بہت باتوں کا خیال نہیں رہا افتادہ زمین پر برابر محصو
لگ گیا جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں افتادہ رکھنا تھا اُس کی منہائی نہیں ہوئی ہر سال
برابر جوتے جانے سے زور کم ہوتا گیا پیداوار کم ہونے لگی جو حساب بندوبست کے وقت لگا
تھا وہ نہ رہا اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہو گیا زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عظیم
ہوئے رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہو گئے زراعت کا سامان بہت کم ہو گیا اور اس سبب سے جو زمین
کاشت کرتے تھے وہ جیسا کہ چاہیے کمائی نہ گئی اس سبب سے بھی کمی پیداوار ہوئی ادائے مالگزاری
کے لیے وہ قرضدار ہوئے سود قرضہ زیادہ ہونے لگا بہت سے زمیندار مالگزار جو بہت اچھے
سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہو گئے جن دیہات میں افتادہ زمین سوا تھی وہ اور زیادہ

خراب ہوگئی آنربل تامسن صاحب بہادر اپنے ہدایت نامہ کی دفعہ ۴۶ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۵۹ء کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھے دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہو گئی زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی مگر بندوبست کے وقت اُس کی رعایت چاہیے تھی جو نہ ہوئی غرض کہ ان اسباب سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا جس کے سبب باوجود اس امن و آسایش کے جو زمینداروں کو تھی اُن کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔

تعلقداریوں کا شکست علی الخصوص اودھ میں | تعلقہ داری بندوبست کا شکست کر دینا اگرچہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں کچھ ناانصافی ہوئی مگر عمدہ سبب فساد کا ہوا خصوصاً ملک اودھ میں یہ تعلقہ دار راجہ بنے ہوئے تھے اپنی تعلقہ داری کے دیہات میں حکومتیں کرتے تھے نفع اٹھاتے تھے وہ بادشاہت اور منفعت اُن کی دفعتاً جاتی رہی اس باب میں بھی کہ اگر سرکار یہ نہ کرتی تو اصل زمینداروں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے کیونکر نکالتی ہم اس مقام پر بحث نہیں کریں گے بلکہ اس کی بحث ہماری دوسری رائے میں ہے یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ شکست تعلقداری بھی سبب سرکشی ہے۔

اسٹامپ | اسٹامپ کا جاری ہونا بالکل ایک ولایتی پیداوار ملک کا قاعدہ ہے جہاں کی آمدنی گویا کہ نہیں لی جاتی ہندوستان میں اس کا جاری کرنا اور پھر رفتہ رفتہ اُس کی قیمت میں اضافہ ہوتا جانا جس کی انتہا اب قانون دہم ۱۸۶۲ء میں ہے بلا شبہ خلاف طبائع اہل ہند بلکہ بہ نظر حالات مفلسی اہل ہند نامناسب تھا اسٹامپ کے جاری ہونے میں پچھلے لوگ بہت بحث کر گئے ہیں اور بہت سی دلیلیں پیش ہوئی ہیں کہ اس کا اجرا مفید ہے اور بہت غالب تر دلیلیں پیش ہوئی ہیں کہ اصلی بات برخلاف اس کے ہے مگر ہم اس مقام پر اُن سب بحثوں سے قطع نظر کرتے ہیں اور اتنا لکھنا کافی سمجھتے ہیں کہ اُن بحثوں کی تمامت اُن ملکوں میں ہے جہاں کی رعایا تربیت یافتہ اور متمول اور راست باز معاملہ فہم ہے ہندوستان کی رعایا جو دن بدن مفلس ہوتی جاتی ہے وہ ہرگز اس زیر باری اٹھانے کے لائق نہیں سب عقلاء اس محصول کو ناپسند کر گئے ہیں اُن کا قول ہے کہ دستاویزات پر محصول لگانا جتنا قابل الزام اور بے وجہ

محصول ہی اس سے زیادہ برآوردہ محصول ہی جو کاغذات پر انصاف کرنے کے لیے لیا جاتا ہی علاوہ بریں بڑے اخراجات کے بہت سی صورتوں میں عدالت گستری سے باز رکھتا ہی چنانچہ مل صاحب کی کتاب پولیٹکل اکونمی اور لارڈ بروم صاحب کی پولیٹکل فلاسفی اس کے ناپسندیدہ ہونے سے پُر ہیں اور جس قدر کہ ولایت میں اُس پر [illegible] سے بہت زیادہ ہندوستان میں اس کے رواج پر الزام ہی۔

دیوانی عدالت کا انتظام پنجاب سے اچھا ہی مگر اصلاح طلب ہی

دیوانی عدالت کا انتظام جو ریذیڈنسی بنگال اور آگرہ میں ہی وہ نہایت شایستہ ہی اُس کو اس غدر میں کچھ مداخلت نہیں میں جانتا ہوں کہ اکثر حکام کی رائے اس کے برخلاف ہوگی اور پنجاب کے انتظام کو پسند کرتے ہوں گے مگر یہ گفتگو نہایت قابل بحث کے ہی قانون پنجاب کا ایک مجمل مطلب ہی اُن ہی قوانین کا جو اس ملک میں جاری ہیں اُن کے بسط اور پھیلاؤ اور عمل کے واسطے قواعد مقرر نہیں ہیں ہر حاکم اس میں خود مختار ہی سب حاکموں کی رائے سلیم ہونی ضرور نہیں ہی پھر اس میں کس قدر خرابیاں انجام کو پڑنی متصور ہیں دیوانی کا محکمہ سب محکموں سے زیادہ تر عمدہ ہی جس پر نہایت اہتمام چاہیے یہی محکمہ ہی جس پر آبادی ملک اور اجرائے تجارت اور افزونی بیع بیوپار و استحکام حقوق منحصر ہیں پنجاب میں یہ محکمہ نہایت کم قدر ہو رہا ہی حکام مطلق متوجہ نہیں بلکہ ہم کہتے ہیں متوجہ ہونے کی فرصت نہیں جس قدر مقدمات غور طلب بسبب انتقالات اور معاملات کثیر اور بسبب زیادہ مدت ہو جانے عملداری سرکار کے اس ملک میں ان ملکوں کی عدالتوں میں درپیش ہوتے ہیں وہ ابھی تک پنجاب میں نہیں اور جب ہوں گے تو اس میں شک نہیں کہ قوانین پنجاب اُن کی درستی سے فیصلہ کرنے کو کافی نہیں اس غدر میں دیوانی عدالت کا جس قدر اثر پایا جاتا ہی وہ صرف اتنا ہی اول انتقالات حقیت دوم مقروض ہونا یا مدیون ہونا لوگوں کا کہ یہ دونوں باتیں آپس کے فساد کی باعث ہوئیں نہ مقابلہ سرکار کی ان باتوں سے آپس میں دلی رنج تھا اور یہ قاعدہ ہی کہ جب عملداری کو سستی ہوتی ہی آپس کے تنازع سے فسادات برپا ہوتے ہیں پھر ان دونوں باتوں میں جو لوگوں کو آپس میں رنج تھا سب سے بڑا سبب اُس کا یہ تھا کہ انتقالات ناواجبی اور قرضہ ناجائز لوگوں کے سر پر ہو گیا تھا وہ جھوٹی ڈگریوں کے مدیون ہو گئے تھے اور

اسی سبب سے دیوانی عدالت پر الزام لگایا جاتا ہے خیال کرنا چاہیے کہ جس قدر کم توجہی اور ابتری اور سرسری تحقیقات اور خود اختیاری حکام مجوز مقدمات دیوانی کی پنجاب میں ہے وہ بہت اس سے زیادہ خرابیاں پیدا کرے گی دیوانی عدالت کی تاثیر دس برس میں ظاہر نہیں ہوتی پچاس برس بعد پنجاب کو ممالک مغربی شمالی کے انتظام اور تاثیر عدالت دیوانی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اب ہم اس بات کو منظور کرتے ہیں کہ پریسیڈنسی بنگال اور آگرہ کا قانون متعلق مقدمات دیوانی قابل اصلاح ہے انفصال مقدمات میں بہت تاخیر ہوتی ہے اشامپ کے بیش قیمت ہونے سے اپیل کے ہر مقدمہ میں بہت سے درجات قائم ہونے سے لوگوں کو زیر باری ہے حکام دیوانی کو بعض قسم کا اختیار نہ دینے سے انفصال مقدمات میں ہرج تھا اُس کو ایکٹ ۱۰ ۱۸۶۱ء نے کچھ کچھ رفع کیا اور جس قدر باقی ہے وہ قابل اصلاح ہے اس میں اگر زیادہ گفتگو کرنی منظور ہو ہماری دوسری رائے کو جو در باب انتظام ہندوستان ہے اُس کو ملاحظہ کرو۔

اصل سوم

ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور اُن مصائب سے جو اُن پر گزرتے تھے اور جن سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھٹتا جاتا تھا۔

سوم ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا سے | اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو رعایا کے حالات اور اطوار اور جو دکھ اُن کو تھے اُن کی اطلاع نہ تھی اور اطلاع ہونے کا کیا سبب تھا کیونکہ حالات اور اطوار کی اطلاع اختلاط اور ارتباط اور باہم آمد و رفت بے تکلفانہ سے ہوتی ہے اور یہ بات جب ہوتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم میں مل جل کر اور محبت اور اخلاص پیدا کر کر بطور ہم وطنوں کے توطن اختیار کرے جیسا کہ مسلمان غیر مذہب اور غیر ملک کے رہنے والوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کر کے پیدا کیا اور غیر ملکیوں سے برادرانہ ما ودرسم پیدا کی مگر درحقیقت ہماری گورنمنٹ کو یہ بات جو اصلی سبب رعایا کے حالات کی اطلاع کا ہے حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ اس طرح کی سکونت مخلطانہ ہماری گورنمنٹ کو ہونی متخیل ہے اب رہی یہ بات کہ رعایا خود اپنے مصائب کی اطلاع کرتی تو اس کا قابو رعایا کو نہ تھا کیونکہ رعایا سے ہندوستان کو تجاویز گورنمنٹ میں ذرا بھی مداخلت نہ تھی اور اگر کسی نے کچھ بے قاعدہ کوئی عرضی پرچہ بھیجا یا بحضور نواب گورنر جنرل بہادر

پیش کیا وہ بطور استغاثہ تصور کیا گیا نہ بطور استحقاق مداخلت تجاویز گورنمنٹ میں اور اسی لیے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا اب ضرور ہوا کہ کوئی اور شخص حالات رعایا کی اطلاع گورنمنٹ میں کرے وہ اطلاع منحصر تھی حکام متعہد اضلاع کی رپورٹ پر وہ خود اس سے

حکام اضلاع حالات رعایا سے مطلق واقف نہ تھے

ناواقف تھے اور کوئی راہ نہ تھی اُن کو اطلاع حاصل ہونے کو اور اُن کی عدم توجہی اس باب میں اور اُن کی نازک مزاجی ایک مشہور بات ہے اُن کے رعب سے سب ڈرتے تھے کسی کو سچی بات علی الخصوص وہ کہ مخالف طبع اور مزاج حاکموں کے ہوتی تھی کہنے کا مقدور نہ تھا ہر شخص ملازم اور درباری رئیس سب ڈر کے مارے خوشامد کی بات کہتے تھے اور ہماری گورنمنٹ نوعیہ ہے۔ ان باتوں سے گورنمنٹ شخصیہ کی صورت پیدا کی تھی پھر یہ طریقہ اطلاع حالات رعایا کا بذریعۂ حکام اضلاع ناکافی ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت معدوم تھا اس لیے حالات رعایا کے ہمیشہ ہماری گورنمنٹ سے مخفی رہے جو نیا قانون گورنمنٹ سے جاری ہوا اُس سے جو مضرت رعایا کے حال اور رفاہ اور فلاح کو پہنچی اُس کا رنج کرنے والا اور اُس کی خبر دینے والا کوئی نہ تھا اس قسم کے امور میں کوئی غمخوار رعایا کا نہ تھا بجز اُن کے لہو کے جو جل جل کر اُن کے بدن میں رہتا تھا اور بجز اُن کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو کر چپ رہتے تھے۔

مفلسی ہندستان علی الخصوص مسلمانوں کی نوکریاں بہت قلیل تھیں روزگار پیشہ جو فاطبقا مسلمان تھے بہت تنگ تھے

مفلسی اور تنگی معاش ہندوستان کی رعایا کو ہماری گورنمنٹ کی حکومت میں کیوں نہ ہوتی سب سے بڑی معاش رعایائے ہندوستان کی نوکری تھی اور یہ ایک پیشہ گنا جاتا تھا اگرچہ ہر ایک قوم کے لوگ روزگار نہ ہونے کے شاکی تھے مگر یہ شکایت سب سے زیادہ مسلمانوں کو تھی غور کرنا چاہیے کہ ہندو جو اصلی باشندے اس ملک کے ہیں زمانہ سلف میں اُن میں سے کوئی شخص روزگار پیشہ نہ تھا بلکہ سب لوگ ملکی کاروبار میں مصروف تھے۔ برہمن کو روزگار سے کچھ علاقہ نہ تھا ویش برن جو کہلاتے ہیں وہ ہمیشہ بیوپار اور مہاجنی میں مصروف تھے چھتری جو اس ملک کے کسی زمانے میں حاکم بھی تھے پرانی تاریخوں سے ثابت ہے کہ وہ بھی روزگار پیشہ نہ تھے بلکہ زمیندار تھے اور ایک ایک ٹکرہ زمین کی حکومت سے بطور بھیاچارہ علاقہ رکھتے تھے۔ سپاہ ان کی ملازم نہ تھی بلکہ بطور بھائی بندی کے وقت پر جمع ہو کر لشکر آراستہ ہوتا تھا جیسا کہ

کچھ تھوڑا سا ہندوؤں کی مملکت میں پایا جاتا ہے البتہ قوم کایت اس ملک میں قدیم سے روزگار پیشہ کہلائی دیتے ہیں مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں اگلے بادشاہوں کے ساتھ بہ وسیلہ روزگار کے ہندوستان میں آئے اور یہاں توطن اختیار کیا اس لیے سب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی روزگار سے اُن کو زیادہ تر شکایت بہ نسبت اصلی باشندوں اس ملک کے تھی عزت دار سپاہ کا روزگار جو یہاں کی جاہل رعایا کے مزاج سے زیادہ تر مناسبت رکھتا ہے ہماری گورنمنٹ میں بہت کم تھا سرکاری فوج جو غالباً مرکب تھی تلنگوں سے اُس میں اشراف لوگ نوکری کرنی معیوب سمجھتے تھے سواروں میں البتہ اشرافوں کی نوکری باقی تھی مگر وہ تعداد میں اس قدر قلیل تھی کہ اگلی سپاہ سواری سے اُس کو کچھ بھی نسبت نہ تھی علاوہ سرکاری نوکری کے اگلے عہد کے صوبہ داروں اور سرداروں اور امیروں کے نیچے کے نوکر ہوتے تھے کہ اُن کی تعداد بھی کچھ کم خیال کرنی نہیں چاہیے اب یہ بات ہماری گورنمنٹ

اسی مفلسی کے سبب لوگوں کا ایک آنہ اور ڈیڑھ آنہ یومیہ یا سیر بھر اناج پر باغیوں کی نوکری اختیار کرنا

میں نہیں ہے اس سبب سے حد سے زیادہ قلت روزگار تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی نوکری کو جمع ہو گئے اور جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے شعر

ملحد گرسنہ در خانہ خالی بر خوان + عقل باور نکند کز رمضان اندیشد +

بہت سے آدمی صرف آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی بعوض یومیہ کے سیر ڈیڑھ سیر اناج پاتے تھے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی رعایا جیسی نوکری کی خواہش مند تھی ویسی ہی مفلسی اور ناداری سے محتاج اور تنگ تھی۔

خیراتی پنشن اور انعام بند ہونے سے ہندوستان کا زیادہ محتاج ہونا

ایک اور راہ تھی اگلی عملداریوں میں آسودگی رعایا کی یعنی جاگیر روزینہ انعام اکرام جب شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو صرف بروز تخت نشینی چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گانو جاگیر میں اور لاکھوں روپیہ انعام میں دیے یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی بلکہ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں جن کی ضبطی کے سبب ہزارہا آدمی نان شبینہ کو محتاج ہو گئے تھے، زمینداروں و کاشتکاروں کی مفلسی کا حال بیان کر چکے اہل حرفہ کا روزگار بہ سبب جاری اور رائج ہونے ولائے

تجارت ولایت سے بالکل جاتا رہا تھا یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والا اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا جولاہوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا جو بدذات سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں گرم جوش تھے خدا کے فضل سے جب کہ ہندوستان بھی سلطنت گریٹ برٹن میں داخل تھا تو سرکار کو رعایا کی اس تنگی حال پر توجہ کرنی اور اُن کے ان روحانی غم اور دلی رنجشوں کے مٹانے میں سعی کرنی ضرور تھی۔

کمپنی نوٹ سے ملک کی زیرباری کمپنی نوٹ سے ایک نئی طرح کی زیر باری ملک کو ہوئی تھی جو کسی پہلی عملداری میں اُس کی نظیر نہیں ہے جتنا روپیہ قرض لیا جاتا تھا اُس کے سود کے وصول کرنے کی تدبیر بلکہ سود اور اخراجات اور انتفاع کے وصول کرنے کی تدبیر ملک سے ہوتی تھی غرض کہ ہر طرح سے ملک مفلس اور محتاج ہو گیا اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا معاش سے بھی تنگ تھے اور یہ ایک اصلی سبب ناراضی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا لوگوں کے دل جو تبدل عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے راغب اور دل سے اُس سے خوش تھے میں سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے

صرف غلطی کے سبب سے رعایا کا تبدل عملداری چاہنا ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا کیا سبب تھا صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگی جب گوالیار فتح ہوا پنجاب فتح ہوا اودھ لیا گیا لوگوں کو کمال رنج ہوا کیوں ہوا اس لیے ہوا کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں ہر قسم کی ہندوستانی اشیا کی تجارت بہ کثرت تھی۔ اُن عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی ہماری گورنمنٹ کی عملداری میں خوبیاں اور بھلائیاں بھی حد سے زیادہ تھیں میں سب پر عیب نہیں لگاتا بقول شخصے شعر عیب ہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو + نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند + امن اور آسایش اور آزادی رستوں کا صاف ہونا ڈاکوؤں اور رہزنوں کا نیست و نابود ہونا سڑکوں کا آراستہ ہونا مسافروں کی آسایش بیوپاریوں کا مال دور دور بھیجنا غریب اعلیٰ ادنیٰ کے خطوط کا دور دست ملکوں میں برابر پہنچنا خونریزی اور خانہ جنگی کا بند ہونا زبردست سے زیردست

ر اٹھنا اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی اچھی ہیں کہ کسی عملداری میں نہ ہوئی ہیں نہ ہوں گی مگر
روکر ان باتوں سے وہ مصیبت جس کا ہم ذکر کرتے ہیں نہیں جاتی ایک اور بات دیکھو کہ یہ نفع عملداری
مذکور رہا کن لوگوں کو زیادہ تھا اول عورتوں کو کہ سب طرح سے آسائش میں تھیں خانہ جنگی میں اولاد کا
نا ٹھگوں کے ہاتھ سے لٹنا عاملوں کے ہاتھ سے خاوندوں اور بچوں کا محفوظ نہ رہنا اور ہزار طرح
مصائب سے محفوظ تھیں پھر دیکھو کہ کس قدر خیر خواہ اور مداح سرکار کی عملداری کی تھیں مہاجن اور
ت پیشہ لوگ بہت آسائش سے تھے پھر ان میں سے کوئی بھی بدخواہ نہ تھا حاصل یہ کہ جن لوگوں
مداری سرکار سے نقصان نہیں پہنچا تھا اُن میں سے کوئی بدخواہ نہیں ہوا۔

اصل چہارم

م نہ کرنا اُن باتوں کا جن کا گورمنٹ پر واجب تھا

ترک ہونا اُن امور کا ہماری گورمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری
گورمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

ت اور اتحاد ہندستانیوں سے نہ کرنا

جو مراتب کہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں گو وہ ہمارے بعض حکام کے ناگوار طبع ہوں
مگر ہم کو سچ لکھنا اور دل کھول کر کہنا ضرور ہے یہ وہ بات ہم کہتے ہیں کہ جس سے
وحشی جانور دام میں آتے ہیں درندے رام ہوتے ہیں انسان کی تو کیا حقیقت ہے کیا لارڈ بیکن
کافی نہیں کہ ہم اس مقام پر دوستی اور محبت اور ربط اور اتحاد کے فائدے بیان کریں ہاں اتنی
بیان کرنی ضرور ہے کہ آپس کی محبت اور ہمسایہ کی دوستی سے گورمنٹ اور رعایا کی محبت بہت
ہر دوست کو ایک شخص سے دوستی کرنی پڑتی ہے اور گورمنٹ کو تمام رعایا سے ایسا ارتباط پیدا
پڑتا ہے کہ رعیت اور گورمنٹ سب مل کر ایک تن ہو جائیں شعر رعیت چو بیخ ست سلطان درخت
سے پسر باشد از بیخ سخت ÷ کیا یہ بات ہندوستان میں ہماری گورمنٹ سے نہیں ہو سکتی تھی کیوں
تی تھی اس لیے کہ ہم کو دن رات تجربہ ہوتا ہے کہ دو غیر ملک اور مختلف مذہب کے آدمیوں میں
ہوتا ہے اس صورت میں کہ وہ اتحاد کرنا چاہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دو ہم قوم اور ہم مذہب اور
ن آدمیوں میں کمال دشمنی اور عداوت ہوتی ہے اس سے ثابت ... ت اور اتحاد اور دوستی ہونے

پال کا خط ا باب ۳ درس ۱۲ | کو اتحاد مذہب اور ہم وطنی اور ہم قوم ہونا ضرور نہیں کیا پال مقدس کی یہ نصیحت
حکمت آمیز نہیں ہے کہ جیسے ہم تم سے محبت کرتے ہیں ویسا ہی خداوند تمہاری محبت آپس میں دوسروں
کے ساتھ بڑھنے اور زیادہ ہونے دیوے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف اپنے پڑوسیوں اور ہم قوموں سے
بلکہ سب سے یہاں تک کہ دشمنوں سے بھی محبت ہو اور وہ محبت اور مہربانی بڑھتی جائے اور کیا مسیح
متی باب ۷ درس ۱۲ | مقدس کا یہ قول دل کو تسلی دینے والا نہیں ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے
ساتھ کریں ویسا ہی تم بھی اُن سے کرو کیونکہ توریت اور نبیوں کی کتاب کا خلاصہ یہی ہے مراد مسیح مقدس
کی اس نصیحت سے محبت ہے غرض کہ کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محبت اور اتحاد بہت
عمدہ چیز ہے اور بہت اچھے اچھے نتیجے دیتی ہے اور بہت سی بُرائیوں کو روکتی ہے آج تک ہماری گورنمنٹ
نے یہ محبت ہندوستان کی رعایا کے ساتھ پیدا نہیں کی۔

یہ بھی ایک عام قاعدہ محبت کا جبلتِ انسانی بلکہ حیوانی میں بھی قدرتی پیدا کیا گیا ہے کہ اعلیٰ
کی طرف سے ادنیٰ کی طرف محبت چلتی ہے باپ کی محبت اپنے بیٹے کی طرف پہلے اُس سے شروع
ہوتی ہے کہ بیٹے کو باپ سے اسی طرح مرد کی محبت اپنی عورت کی طرف عورت کی محبت سے جو
مرد کی طرف ہے مقدم ہے اسی بنا پر یہ بات ہے کہ ادنیٰ جو اعلیٰ سے محبت شروع کرے وہ خوشامد گنی جاتی ہے محبت
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری گورنمنٹ کو اول چاہیے تھا کہ رعایا کے ساتھ محبت اور اتحاد کرنے میں تقدم کرتی
پھر محبت کا یہ قاعدہ جو ہزار ہا تجربہ سے حاصل ہوا ہے کہ خواہ مخواہ محبت دوسرے کی دل میں اثر کرتی ہے اور
اور اپنی طرف کھینچ لاتی ہے رعایا کے دل میں اثر کرتی اور رعایا اُس سے زیادہ ہماری گورنمنٹ کی محب
بلکہ فریفتہ ہو جاتی شعر عشق آں خانماں خراب ہست + کہ ترا آورد بخانۂ ما + مگر افسوس کہ ہماری گورنمنٹ
نے ایسا نہیں کیا۔

اگر ہماری گورنمنٹ دعویٰ کرے کہ یہ بات غلط ہے ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ محبت کی اور نیکی کا بدلہ
بدی پائی تو اس کا انصاف ہم خود گورنمنٹ کے سپرد کریں گے اگر یہ بات یوں ہی ہوتی تو رعایا کو بلاشبہ
ہماری گورنمنٹ کی محبت سے زیادہ محبت ہوتی بے شک محبت ایک دل کی چیز ہے جو کہنے سے اور بنانے

سے نہیں بنتی ظاہر میں بھی اگرچہ اُس کے آثار پائے جاتے ہیں اِلّا سچ یہ ہے کہ نہ وہ بیان ہو سکتی ہے اور نہ نشان دی جاسکتی ہے مگر دل اُس کو خوب جانتا ہے بلکہ اُس کے ہاتھ میں ایک ایسی سچی ترازو ہے کہ وہ کمی بیشی کو بھی پہچانتا ہے شعر دلِ راز دل ما پیست درین گنبد سپہر + از سوئے کینہ کینہ داز سوئے مہر مہر + ہماری گورمنٹ نے اپنے آپ کو آج تک ہندوستانیوں سے ایسا الگ اور ان میل رکھا ہے جیسے آگ اور سوکھی گھاس ہماری گورمنٹ اور ہندوستانی پتھر کے دو ٹکڑے ہیں سفید اور کالے کہ الگ الگ پہچانے جاتے ہیں اور پھر اُن دونوں میں ایک فاصلہ ہے کہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے حالانکہ ہماری گورمنٹ کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے جیسے ابری کا پتھر کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے سفید رنگ میں سیاہ خال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور سیاہی سفیدی عجب بہار دکھلاتی ہے۔

پطرس خط اول باب ۲ درس ۷

ہم ناانصافی کی بات نہیں کہتے ہماری گورمنٹ کو بلا شبہ عیسائیوں کے ساتھ ایک خاص محبت دین داری کی رکھنی چاہیے مگر ہم اپنی گورمنٹ سے رعایائے ہندوستان پر وہ برادرانہ محبت اور برادرانہ محبت پر وہ الفت چاہتے ہیں جس کی نصیحت پطرس مقدس نے کی ہے اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستانیوں کا خون ایک نہ تھا مذہب ایک نہ تھا رسم و رواج ایک نہ تھا دلی رشتہ داری رعایا کو نہ تھی آپس میں محبت اور اتحاد نہ تھا پھر کس بات پر ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے۔

پچھلی عملداریوں میں جب تک ہندوستانیوں سے محبت ہوئی آسایش نہ ہوئی

ہندوستان کی پچھلی سلطنتوں کا حال دیکھو اول ہندوستان پر مسلمانوں نے فتح پائی ترکوں اور پٹھانوں کی سلطنت میں ہندوستان کی رعایا سے محبت اور میل جول نہ ہوا جب تک آسایش اور آسودگی سلطنت نے صورت نہ پکڑی مغلیہ کی سلطنت میں اکبر اول کے عہد سے ملاپ بخوبی شروع ہوا اور شاہجہاں کے وقت تک بدستور رہا باوجودیکہ اُس زمانے میں بھی رعایا کو بے نظمی اصول سلطنت کے سبب تکلیفیں پہنچتی تھیں مگر وہ زخم مندمل ہو جاتا تھا اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی ۱۶۸۰ء میں یعنی عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بسبب مقابلہ اور سرکشی قوم ہنود کے مثل سیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور

اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ سخت گیری پیش آئے اور ہر ایک سے جزیہ لے پھر جو مضرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے غرضکہ ہماری گورنمنٹ نے سو برس کی عملداری میں بھی رعایا سے محبت اور الفت پیدا نہ کی۔

ہندوستانیوں کی بے توقیری

اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور اُن کی تالیف کرنی یعنی اُن کے دلوں کو ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے پائداری گورنمنٹ کا تھوڑا سا ملے اور آدمی کی عزت ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے بہ نسبت اُس کے کہ بہت ملے اور تھوڑی عزت ہو بے عزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دکھاتی ہے یہی چیز ہے کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت کرتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا شعر جراحات السنان لہا التیام ۔ ولا یلتام ما جرح اللسان تالیف کی خاصیت اس کے برخلاف ہے یہ وہ چیز ہے کہ اس سے دشمن دوست ہوتا ہے اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے بیگانہ یگانہ ہوتا ہے یہی چیز ہے کہ جس سے وحشی جنگل کے جانور چرند پرند تابعدار ہوتے ہیں پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو تو وہ کس قدر مطیع اور فرماں بردار ہوں گے ابتدائے عملداری میں یہ چیز تھی کہ جس نے سب کے دلوں کو ہماری گورنمنٹ کی طرف کھینچ لیا تھا ایک دلی اطاعت پیدا کر دی تھی بے شک ہماری گورنمنٹ ان باتوں کو بھول گئی بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے اُن کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے۔

حکام اضلاع کی سخت مزاجی اور بد زبانی

یہ سب باتیں یعنی محبت اور الفت اور عزت اور تالیف رعایا کی گورنمنٹ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں بہ وسیلہ اُن حکام متعہد کے جو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان کی کارپردازی اور رعایا سے معاملہ اور میل جول اور ملاقات رکھتے ہیں گورنمنٹ کا ارادہ کیسا ہی نیک ہو وہ کبھی ظاہر نہ ہوگا جب تک یہ لوگ اُس کے ظاہر کرنے پر کمر نہ باندھیں۔ اگلے حکام متعہد کے عادات اور روش اور اخلاق بہت برخلاف تھے حال کے حکام متعہد سے وہ پہلے

لوگ بہت عزت کرتے تھے ہندوستانیوں کی ہر طرح سے خاطر داری کرتے تھے اُن کے دلوں کو اپنے
ہاتھ میں رکھتے تھے دوستانہ اُن کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے باوجودیکہ وہ بہت بڑی
سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شان حکومت ہے وہ بھی
ہاتھ سے نہ دیتے تھے پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر ایک شخص مل کر اُن
کے اخلاق اور اُن کی محبت کا فریفتہ ہو جاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوجود
اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں ہندوستان میں
جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے بے شک اُن لوگوں نے پطرس مقدس
پطرس خط ۲ باب درس ، | کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت اور برادرانہ محبت پر الفت بڑھائی تھی
حال میں جو حکام متعدد ہیں اُن میں سے اکثروں کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں کیا اُن کے غرور اور تکبر
نے تمام ہندوستانیوں کو اُن کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے کیا اُن کی بدمزاجی اور بے پروائی نے
ہندوستانیوں کے دل میں بیجا دہشت نہیں ڈالی ہے کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے
بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات
چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہلکار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا
ہے کہ صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے
افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے میں سب حکام پر یہ الزام نہیں لگاتا
بے شک ایسے بھی حکام ہیں کہ اُن کی محبت اور اُن کے اخلاق اور اوصاف سب میں مشہور ہیں اور تمام
ہندوستانی اُن کو چاند اور سورج کی طرح پہچانتے ہیں اور اُن کو اگلے حکام کا نمونہ سمجھتے ہیں اور حقیقت
متی باب ۴ درس ۱۹ | میں وہ اُسی نصیحت پر چلتے ہیں جو مسیح مقدس نے شمعون مقدس اور اندریاس کو
فرمائی تھی جب کہ وہ دریا میں مچھلیوں کے شکار کو جال ڈالتے تھے کہ میرے پیچھے چلے آؤ میں تم کو
آدمیوں کا شکار کرنے والا بناؤں گا اُنھوں نے اپنی نیک خصلت سے رعایا کو اپنی محبت کے
جال میں کھینچ لیا ہے ان حاکموں نے اپنی حکومت کا رعب بھی رکھا ہے اور پھر بیجا غرور بھی رعایا کے ساتھ

متی باب ۵ درس ۳

نہیں کیا اور وہی مبارکی حاصل کی جو مسیح نے فرمائی تھی مبارک وے ہیں جو دل میں بے غرور ہیں اس لیے کہ آسمان کی بادشاہت اُن ہی کی ہے ان حاکموں نے اپنا علم انصاف والا

متی باب ۵ درس ۵

کو جتایا اور زمین پر حکومت کی جیسا کہ یسوع مقدس نے فرمایا تھا مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں اس لیے کہ زمین کے وارث ہوں گے ان حاکموں نے اپنی روشنی عیسیٰ مسیح کے قول کے

متی باب ۵ درس ۱۶

بموجب اسی طرح رعایا کو دکھلائی کہ تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے ویسی ہی چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کا جو آسمان پر ہے شکر کریں اس قسم کے حاکم اگرچہ کم تھے مگر جہاں تھے عزیز تھے ۔

مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ ناگوار تھیں اور اس کا سبب

اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گزرتی تھیں مگر اس کا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی باعزت چلے آتے ہیں ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے دل میں لالچ روپیہ کی بہت کم ہے کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے بہت تجربہ ہوا ہوگا کہ اور قوم میں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھا لیتے ہیں مسلمانوں کو اُس سے بھی ادنیٰ بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا ہے ہم نے مانا کہ مسلمانوں میں یہ خصلتیں بہت بُری ہی سہی مگر مجبوری ہے خدا نے جو طبیعت بنائی ہے وہ بدلی نہیں جاتی اس میں مسلمانوں کی بدبختی ہی سہی مگر کچھ قصور نہیں یہی رنج تھے جن کے باعث تبدل عملداری کو دل چاہتا تھا سرکار کے برخلاف خبریں سُن کر دل خوش ہوتا تھا مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ کو مسلمانوں کی بھلائی سے اغماض نہ تھا اُن کی لیاقت اور تعلیم اُن کا ادب سب پیش نظر تھا مگر یہ لوگ اس سے بے خبر تھے اور ہماری گورنمنٹ کا ارادہ اور دلی نیت حکام کے وسیلے سے ظاہر نہیں ہوتی تھی ۔

ہندوستانیوں کی ترقی کا نہ ہونا اور لارڈ بنٹنگ نے جو ترقی کی وہ کافی نہ تھی

اہل ہند علی الخصوص مسلمانوں کی ناراضی کا بڑا سبب یہ تھا کہ اعلیٰ عہدہ پر ترقی بہت کم تھی بہت ہی کم زمانہ گزرا ہے کہ یہ لوگ تمام ہندوستان میں معزز تھے بڑے بڑے عہدے پاتے تھے ان کا عزم اور ان کا ارادہ اب بھی ویسا ہی تھا اسی طرح اپنی قدر منزلت کی ترقی چاہتے تھے اور ظاہر میں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ابتدائے عملداری سرکار میں جو لوگ

خاندانی اور معزز تھے وے منتخب ہو کر عہدے پاتے تھے رفتہ رفتہ یہ بات نہ رہی اس میں کچھ شک نہیں کہ اُن لوگوں میں چنداں لیاقت نہ تھی اس لیے امتحان کا قاعدہ ہماری رائے میں کسی طرح قابل الزام کے نہیں اور نہ درحقیقت کسی کو اس کا رنج ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ امتحان سے عمدہ اہل کار ہاتھ آئے مگر ایسے ایسے لوگ ان معزز عہدوں پر مقرر ہو گئے جو ہندوستانیوں کی آنکھوں میں نہایت بے قدر تھے [illegible] ملنے میں خاندانی اور ذی عزت ہونے کا بہت کم لحاظ رہا جس قدر ہندوستانیوں کی ترقی لارڈ [illegible] صاحب بہادر نے کی اُس سے زیادہ ہم نہیں ہوئی کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ترقی بسبب قلت عہدجات کے نہایت ناکافی تھی بڑے بڑے اعلیٰ حاکم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جیسی ترقی ہندوستانیوں کی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی۔

بادشاہانہ دربار کا نہ ہونا | اہل ہند کو قدیم عادت تھی کہ اپنے بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے بادشاہ کی شان اور شوکت اور تجمل اور تحشم دیکھ کر خوش ہوتے تھے ایک قاعدہ جبلت انسانی میں پڑا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے یہ بات جانتا ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا مالک ہے ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں علی الخصوص اہل ہند کو قدیم سے اس کی عادت پڑی ہوئی تھی جو اب تک نایاب تھی

لارڈ اکلنڈ اور لارڈ ڈالن برا صاحب بہادر نے جو دربار کیے وہ بہت ہی مناسب تھے | نواب گورنر جنرل بہادر اگرچہ دورہ میں دربار کرتے تھے مگر ہندوستانیوں کی مراد تک پورا نہ تھا لارڈ اکلنڈ اور لارڈ ڈالن برا صاحب بہادر نے البتہ شاہانہ دربار کیے شاید ولایت میں یہ طریقہ کچھ ناپسند ہوا ہو مگر حق یہ ہے کہ ہندوستان کے حالات کے مناسب تھا بلکہ اب بھی جیسا چاہیے تھا ویسا نہ ہوا تھا خدا ہمیشہ ہماری ملکہ معظمہ وکٹوریہ کا حافظ ہے خدا ہمیشہ ہماری ناظم مملکت ہند نائب مناب ملکہ معظمہ اور گورنر جنرل بہادر ہندوستان کا حافظ ہے ہم کو امید ہے کہ اب کوئی آرزو اہل ہند کی بے پوری ہوئے باقی نہ رہے گی۔

سچ ہے کہ حقیقی بادشاہت خدا تعالیٰ کو ہے جس نے تمام عالم کو پیدا کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیقی سلطنت کا نمونہ دنیا میں بادشاہوں کو پیدا کیا ہے تاکہ اُس کے بندے اس نمونے سے اپنے حقیقی بادشاہ کو پہچان کر اُس کا شکر ادا کریں۔ اس لیے بڑے بڑے حکیموں اور عقلمندوں نے یہ بات ٹھیرائی

ہے کہ جیسا کہ اُس حقیقی بادشاہ کی خصلتیں او دوہش اور بخشش اور مہربانی کی ہیں اُسی کا نمونہ ان مجازی بادشاہوں میں بھی چاہیے یہی بات ہے کہ جس کے سبب بڑے بڑے عقلمندوں نے بادشاہ کو ظل اللہ ٹھیرایا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کی بے انتہا بخشش اپنے تمام بندوں کے ساتھ ہے اُسی طرح بادشاہوں کی بخشش اور انعام اپنی ساری رعیت کے ساتھ چاہیے اگرچہ ابتدا میں یہ بات خیال میں آتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات میں انعام واکرام دینا بے فائدہ خزانہ کا خالی کرنا ہے مگر یہ بات یوں نہیں بلکہ انعام واکرام سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ رعیت کو اپنے بادشاہ کی محبت بڑھتی ہے کلیہ قاعدہ ہے کہ الانسان عبید الاحسان اس لیے تمام رعیت اپنے بادشاہ کا انعام واکرام دیکھ کر خواہ نخواہ دلی محبت پیدا کرتی ہے اور اچھی اچھی خدمت گزاریوں اور خیر خواہیوں کا حوصلہ رکھتی ہے تاریخ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ اگلی عملداریوں میں یہ بات بہت رائج تھی ہر ہر طرح سے انعام واکرام رعایا کو اور سواروں کو ملتا تھا بڑے بڑے قیمتی خلعت اور عمدہ عمدہ تحفہ اور نقد روپیہ اور زمین جاگیر انعام میں ملتی تھی خاندانی آدمی خطاب پاتے تھے ہم چشموں میں عزت پیدا کرتے تھے اُن کے دل میں بڑے بڑے حوصلے آتے تھے اور ہندوستان کی رعایا اس بات کو بہت پسند کرتی تھی بلکہ صدہا سال سے اس کے عادی ہو رہے تھے ہماری گورنمنٹ نے یہ سلسلہ بالکل موقوف کر دیا تھا کسی شخص کو رعیت میں سے اس قسم کے ظاہری انعام واکرام کی توقع نہیں رہی تھی اور اسی باعث سے تبدل عملداری کو اُن کا دل چاہتا تھا یہاں تک کہ جب کبھی آنربل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکہ ختم ہونے اور ملکہ معظمہ کی عملداری ہونے کی خبر سنتے تھے تو خوش ہوتے تھے اگلے بادشاہوں کے عہد میں انعام واکرام دو قسم کا ہوتا تھا ایک وہ جو بادشاہ اپنی عیاشی اور اپنی ناپسندیدہ خصلتوں کے پالنے میں خرچ کرتا تھا یہ بات درحقیقت ناپسندیدہ تھی اور ہندوستانی بھی اس کو ناپسند کرتے تھے بلکہ باجیوں اور غیر مستحقوں کے انعام سے ناراض ہوتے تھے دوسری قسم کا انعام وہ تھا جو بادشاہ اپنے خیرخواہ نوکروں اور فتح نصیب سرداروں اپنی رعیت کے علما اور صلحا اور فقرا اور شعرا اور خانہ نشینوں اور بے رزقوں کو دیتا تھا اس قسم کے انعام کی سب خواہش رکھتے ہیں اور اُسی کے نہ ہونے سے ناراض ہیں گو ان باتوں سے رعایا کم ہمت اور آرام طلب

ہو جاتی ہے اور محنت کش اور قوت بازو سے روٹی کمانے والی نہیں رہتی اس لیے بادشاہ کو اس قسم کے انعام سے قطع نظر کر کے دوسری قسم کا انعام یعنی آزادی دینا بہتر ہے تاکہ ان کو خود روٹی کمانے کی گنجائش ملے یہ بات سچ ہے مگر یہ انعام اُس وقت جاری ہو سکتا ہے جب کہ رعایا آسودہ اور تربیت یافتہ ہو نہ یہ کہ وحوش سیر توں کی ناک میں سے نکیل نکال کر بے آب و دانہ جنگل میں ہانک دیں کہ خود دانہ و پانی ڈھونڈلو اُن کا انجام کیا ہوگا بجز اس کے کہ گویا مر جائیں گے یا دہی وحشیوں کی سی حرکتیں کریں گے جس سے ہماری مراد ہندوستان کی یہ سرکشی ہے۔

جس قدر اصلی سرکشی ہندوستان میں ہوئی اُس سے زیادہ دکھائی دی

غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ معاملات کی اصلیت کو آنکھ سے چھپا دیتا ہے طبیعت انتقام اور سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے سچ ہے کہ جو واردا تیں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں اسی لائق تھیں کہ ہمارے حکام کو جس قدر غصہ آئے اور جس قدر انتقام اور سیاست کریں سب بجا ہے مگر ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہیے کہ درحقیقت کس قدر سرکشی ہندوستان میں اصلی تھی اور کیوں اس قدر بڑھ گئی اور کیوں اس قدر دکھائی دی اور بدنصیب مسلمان کیوں زیادہ مفسد بعض اضلاع میں دکھائی دیے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ صدہا سال سے عملداری ہندوستان میں تزلزل تھا رعایائے ہندوستان کو یہ موروثی عادت تھی کہ جب کوئی امیر یا سردار یا بادشاہزادہ قابو یافتہ ہوا اُس کے ساتھ ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اُس کی نوکری کو اُس کی طرف سے عالی کو اُس کی طرف سے انتظام کو کسی طرح اپنا قصور نہیں سمجھتے تھے ہندوستان میں یہ ایک مشہور مثل ہے کہ نوکری پیشہ کا کیا قصور جس نے نوکر رکھا تنخواہ دی اُس کی نوکری کی، البتہ جب سردار اُٹھا یا جائے اور اُس کی جگہ دوسرا سردار قائم ہو اُس کی اطاعت نہ کرنے کو قصور سمجھتے تھے۔

ہندوستان کے امیروں اور سرداروں کی عادت علی الخصوص اُن کی جو قبل عملداری سرکار کے ہندوستان پر تسلط تھے اور جس کے سبب ہندوستان طوائف الملوک ہو رہا تھا یہی تھی کہ ملازمین سیف اور قلم سے کسی طرح مزاحمت نہ کرتے تھے وہی عادت تمام ہندوستان کے لوگوں کو پڑی تھی جب ہندوستان میں مفسدوں نے سر اٹھایا اور لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی جو روٹی سے محتاج اور نوکریوں

کے خواہشمند تھے چاکر نوکر ہوئے سب کہتے تھے کہ ہمارا کیا قصور ہے ہم تو نوکری پیشہ ہیں عام رعایا میں سے
بہت سے لوگ اُس اپنی قدیمی عادت سے کہ اب جو سردار ہے اُس کی اطاعت کریں ہم تو رعیت ہیں
جو زبردست ہے اُس کے تابع ہیں باغیوں کے تابع ہوگئے بہت سے اہل کاران سرکاری یہ سمجھے
کہ باغیوں سے ظاہرداری کر کر جان بچائیں اور جب سرکار کا تسلط ہو پھر سرکار کے تابع ہوں وہ بھی
مجرم ہوگئے حالانکہ کچھ شک کا مقام نہیں کہ وہ دل سے سرکار کے تابع تھے اکثر لوگوں اور اہل کاروں
سے دفعتاً مجبوری خواہ نادانی خواہ بمقتضائے بشریت کوئی بات ہوگئی انھوں نے خیال کیا کہ اب ہمارے
اس قصور اتفاقیہ یا مجبورانہ یا جاہلانہ سے سرکار در گزر نہیں کرنے کی اور سزا دے گی۔ اس خوف اور
ڈر سے لاچار باغیوں کے ساتھ جا شامل ہوئے بہت سے آدمیوں نے درحقیقت کچھ نہیں کیا
تھا مگر بہ خوف اور بہ سبب اور خیالات چند در چند باغیوں میں مل گئے بہت لوگوں نے اس زمانہ
میں وہ باتیں کیں جن باتوں کو وہ لوگ اپنے ذہن اور اپنی سمجھ میں جرم مخالف سرکار نہیں سمجھتے اگر
تمام ہندوستان کے حالات بغاوت پر نظر کی جائے گی تو ہم کو یقین ہے کہ وہ نظائر جو ہندوستان میں بستی ہیں
برابر بلکہ ایک سے زیادہ ایک اور ایک سے زیادہ ایک اس فساد میں نظر پڑیں گی اور اُس کا ثبات
پر تمام حالات ہندوستان کے گواہ موجود ہیں مگر جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی دیے اُس
کا سبب صرف یہی نہیں خیال کرنا چاہیے کہ دلی کی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا اور درحقیقت
مسلمان اسی قدر مفسد ہوئے تھے جیسا کہ نظر پڑے۔ نہیں حکام کا مزاج دفعتاً اُن باتوں سے جو ظاہر میں
مسلمانوں سے ہوئیں ناراض ہوگیا اُن کے مخالفوں کو بڑی گنجایش ہوگئی خود غرضانہ باتیں پیش کرنے کو
تھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا ادھر حکام کو زیادہ ناراضی ہوئی اُدھر مسلمانوں کو زیادہ تر خوف اور مایوسی
ہوئی اور اپنی تقدیر سے جتنے تھے اُس سے زیادہ مفسد دکھائی دیے اس میں کچھ شک نہیں۔ پانچویں
قسم کی بغاوت مسلمانوں میں بہت تھی اور وہ تبدل عملداری کے خیال سے بہت خوش ہوتے تھے جس
کا سبب ہر ایک مقام پر ہم بیان کرتے آئے ہیں باایں ہمہ ہماری گورنمنٹ پر مخفی نہ ہوگا کہ اس حال پر بھی
جاں بازی کی خیر خواہیاں اس ہنگامہ میں کس سے زیادہ ظہور میں آئی ہیں صفا

کے آگے جس کو حقیقی بادشاہت ہے اور دنیا کے بادشاہوں کے آگے جن کو مجازی سلطنت خداوند سے
[زبور ۱۴۳ درس ۲] عطا کی ہے سب گنہگار ہیں سچ فرمایا داؤد مقدس علیہ السلام نے کہ اے خداوند اپنے بندے
سے حساب نہ لے کیونکہ کوئی جاندار تیرے حضور بے گناہ ٹھیر نہیں سکتا اے خدا اپنے کامل کرم سے مجھ پر
رحم کر اور اپنے رحموں کی فراوانی سے میرے گناہ مٹا دے مجھے میری برائی سے خوب دھو اور مجھے میرے
گناہ سے پاک کر آمین۔ خدا ہمیشہ ہماری ملکہ معظمہ وکٹوریا کا حافظ ہے میں بیان نہیں کر سکتا خوبی اس پُر رحم اشتہار
[ملکہ معظمہ کا اشتہار نہایت قابل تعریف ہے بلکہ خدا کے الہام سے جاری ہوا ہے] کی جو ہماری ملکہ معظمہ نے جاری کیا بے شک ہماری ملکہ معظمہ کے سر پر خدا
کا ہاتھ ہے بے شک یہ پُر رحم اشتہار الہام سے جاری ہوا ہے ہندوستان کا
بہت قدیم قاعدہ چلا آیا ہے کہ جب دارالسلطنت پر کوئی بادشاہ خواہ از روئے استحقاق کے اور خواہ بغیر استحقاق
کے قائم ہوا سب سرداران ملکوں کے اُس کی طرف رجوع کرتے تھے اس ہنگامے میں بھی یہی ہوا کہ جب دلی کا بادشاہ
تخت پر بیٹھا اور ملکوں میں خبر پہنچی کہ دلی کے بادشاہ نے تخت سنبھالا سب نے بادشاہ کی طرف رجوع
کی جب کہ دلی کا بادشاہ پکڑا گیا اور وہ دارالسلطنت ہماری گورمنٹ کے قبضہ میں آیا سب کو یقین تھا کہ جلد
مفسد جنھوں نے سر اٹھایا ہے اطاعت کریں گے شاید فوج باغی کے لوگ رہ جاتے مگر یہ امر جو ظہور
میں نہ آیا اس کا سبب گمنا ہم اپنی اس رائے میں ضرور نہیں سمجھتے۔

اصل پنجم

بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج

[پنجم بدانتظامی و بے اہتمامی فوج] ہماری گورمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابل اعتراض کے تھا فوج انگلشیہ کی
ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی جب کہ نادر شاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران افغانستان دو مختلف ملک اس کے
قبضہ میں آئے اُس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں ایک ایرانی قزلباشی دوسری افغانی جب ایرانی
فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اُس کے دبانے کو موجود تھی اور جب افغانی فوج سر تابی
کرتی تو قزلباشی اُس کے تدارک کو موجود ہوتی ہماری گورمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا ہم
نے مانا کہ ہندوستانی فوج سرکار کی بڑی تابعدار اور خیر خواہ اور جاں نثار تھی مگر یہ کہاں سے عہد ہو گیا تھا

کہ کبھی اس فوج کے خلاف مرضی حکم نہ ہوگا اور کسی حکم سے یہ فوج آزردہ خاطر نہ ہوگی پھر درصورت ناراض ہو جانے اس فوج کے جیسا کہ ہوا کیا راہ رکھی تھی ہماری گورنمنٹ نے جس سے اس تمردی کا رفع دفع فی الفور ہوسکتا۔

مسلمانوں اور ہندو مخلوط کرکے پلٹنوں میں نوکر رکھا

سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں برابر رکھا تھا مگر بسبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بسبب ایک جا رہنے کے اور ایک سلک میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہو جاتا تھا

اگر مسلمانوں کی جدا پلٹن ہوتی تو شاید مسلمانوں کو کارتوس کاٹنے میں عذر نہ ہوتا

اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔

فوج ہندوستانی کا نہایت مغرور ہو جانا اور اس کے اسباب

فوج انگلشیہ کے کم ہونے سے رعایا کو بھی جو کچھ خوف تھا وہ صرف ہندوستانی ہی فوج کا تھا علاوہ اس کے ہندوستانی فوج کو بھی بے انتہا غرور تھا وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے تمام ہندوستان کی فتوحات صرف اپنی تلوار کے زور سے جانتے تھے ان کا یہ قول تھا کہ برہما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے علی الخصوص پنجاب کے فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا اب ان کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تکبر کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور مقام پر تکرار کرنے لگتی

ایسے وقت میں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور اُن کے سر غرور اور تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے خواہ مخواہ سرکار کو ماننا پڑیگا اُن کو نئے کارتوس دیے گئے جن میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا انہوں نے اُس کے کاٹنے سے انکار کیا جب بارک پور کی پلٹن اس جرم میں موقوف ہوگئی اور حکم سنایا گیا تو تمام فوج نہایت رنجیدہ ہوئی کیونکہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ بہ سبب تحفّظ مذہب کے بارک پور کی پلٹن کا کچھ قصور نہ تھا وہ محض بے قصور اور سرکار کی ناانصافی سے موقوف ہوئی ہے تمام فوج نہایت رنجیدہ تھی کہ ہم نے سرکار کے ساتھ رفاقتیں کیں اپنے سر کٹائے سرکار کو ملک در ملک فتح کر دیے اور سرکار ہمارے مذہب لینے کی درپے ہوئی اور واجبی بات پر موقوف کر دیا اُس

جنوری ۱۸۵۷ء کے بعد فوج میں صلاح اور پیغام ہونے کہ کارتوس کاٹیں گے

وقت کچھ فساد نہ ہوا کیونکہ فوج پر بجز موقوفی کے اور کچھ جبر نہ ہوا تھا مگر تمام فوج کے دل میں کچھ تو بہ سبب یقین ہونے چربی کارتوس میں اور کچھ بہ سبب رنج موقوفی پلٹن بارک پور کے اور سب سے زیادہ بہ سبب غرور اور خود بینی اور اس خیال سے کہ جو کچھ ہیں ہمیں ہیں مصمم ارادہ ہوگیا کہ ہم میں سے کوئی بھی کارتوس نہیں کاٹنے کا اس میں کچھ ہی ہو جائے بلاشبہ بعد واقعہ بارکپور آپس میں فوجوں کے خط و کتابت ہوئی پیغام آئے کہ کارتوس جدید کوئی نہ کاٹے اب تک تمام فوج کے دل میں ناراضی اور غصہ تو ہے مگر میری رائے میں ابھی تک کچھ فاسد ارادہ نہیں۔

میرٹھ میں سزائے نامناسب کا ہونا اور بہ سبب رنج اور غرور کے فوج کا سرکشی کرنا

دفعتاً تقدیر سے کم بخت مئی ۱۸۵۷ء کی آگئی میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی جس کو ہر ایک عقل مند بہت بُرا اور ناپسند جانتا ہے اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا بیان سے باہر ہے وہ اپنے تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اُس کے بیڑیوں اور ہتکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر روتے تھے وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اُس کے صلہ میں جو اُن کو انعام ملا تھا دیکھتے تھے اور علاوہ اُس کے اُن کا بے انتہا غرور جو اُن کے سر میں تھا اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت ہی بڑا سمجھتے تھے اُن کو زیادہ رنج دیتا تھا

پھر سب فوج متعینہ میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہو گا اُسی رنج اور غصہ کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کی نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملنے کی اُس فوج کو کیا چارہ رہا تھا اس حرکت کے بعد بجز اس کے کہ جہاں تک ہو سکے مفسدے پورے کرے۔

بعد فساد میرٹھ کے فوج کو گورنمنٹ کا اعتبار نہ رہا

جہاں جہاں فوج میں یہ خبر پہنچی تمام فوج زیادہ تر رنجیدہ ہوئی میرٹھ کی فوج سے جو حرکت ہوئی تھی اُس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار کو ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا سرکار وقت پاکر سب کو سزا دے گی اور اُس سبب سے تمام فوج کو اپنے افسروں کے فعل اور قول کا اعتبار اور اعتماد نہ تھا سب آپس میں کہتے تھے کہ اس وقت تو یہ ایسی باتیں ہیں جب وقت نکل جائے گا تو یہ سب آنکھیں بدل لیں گے۔ میں بہت معتبر بات کہتا ہوں کہ دلی میں جو فوج باغی جمع تھی اُس میں سے ہزاروں آدمیوں کو اس بیجا حرکت اور بے فائدہ بغاوت کا رنج تھا وہ روتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری قسمت نے یہ کام ہم سے کرایا بہت افسوس سے کہتے تھے کہ اگر ہم نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی کیونکہ سرکار کو اب ہندوستانی فوج پر اعتماد نہیں رہا تھا وہ قابو کا وقت جب پاتے ہم کو تباہ کر دیتے ابتدائے غدر میں جب ہنڈن پر فوج کشی کا ارادہ ہوا ہی ہنوز فوج روانہ نہ ہوئی تھی کہ بعضے آدمیوں کی صاف رائے تھی کہ جس وقت دلی پر فوج سے لڑائی شروع ہوئی بلاشبہ تمام ہندوستانی فوج بگڑ جائے گی چنانچہ یہی ہوا سبب اس کا یہی تھا کہ فوج سے لڑائی شروع ہونے کے بعد ممکن نہ تھا کہ باقی فوج سرکار سے مطمئن رہتی۔ وہ ضرور سمجھتی تھی کہ جب ہمارے بھائی بندوں کو ماریں گے تب ہم پر متوجہ ہوں گے اس لیے سب نے فساد پر کمر باندھ لی اور بگڑتے گئے جن کے دل میں کچھ فساد نہ تھا وہ بھی بسبب شامل ہونے فوج کے اُس جتھے سے الگ نہ ہو سکے۔ ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا سب نے سر اٹھایا عملداری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا۔

پنجاب میں سرکشی نہ ہونے کے سبب

اب ہماری اس رائے کو پنجاب کے حالات پر تولو پنجاب کے مسلمان بہت ستم رسیدہ تھے سکھوں کے ہاتھ سے سرکاری علداری سے اُن کا چنداں نقصان نہ ہوا تھا سرکار نے پنجاب میں ابتدائے عملداری میں بہت تشدد کیا تھا اور اب دن بدن رفاہ کرتی جاتی تھی برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں بالعکس تھا ابتدائے عملداری میں تمام ملک کے ہتھیار لے لیے گئے کسی کو قابو فساد کا نہ رہا تھا اگرچہ وہ تمول سکھوں کو جو پہلے تھا نہ رہا تھا مگر اُن کا کمایا ہوا روپیہ جو اُن کے پاس جمع تھا ابھی خرچ نہ ہو چکا تھا اور وہ مفلسی جو ہندوستان میں تھی وہاں ابھی نہیں آئی تھی اس کے سوا تین سبب اور بہت قوی تھے جو پنجاب نہ بگڑا اول یہ کہ فوج انگلشیہ وہاں موجود تھی دوسرے یہ کہ وہاں کے حکام کی ہوشیاری سے دفعتاً بے خبری میں ہندوستانی فوج کے ہتھیار لے لیے گئے بسبب طغیانی اور کثرت سے واقع ہونے دریاؤں اور بند ہو جانے گھاٹوں کے ہندوستانی فوج بے قابو ہو گئی فوج کا فساد برپا نہ ہو سکا تیسرے یہ کہ تمام سکھ اور پنجابی اور پٹھان جن سے احتمال فساد تھا سرکار میں نوکر ہو گئے تھے اور لوٹ کا لالچ اُس پر مزید تھا جو بات رعایائے ہندوستان اور روزگار پیشہ کو باغیوں کے ہاں بہ مشکل اور بذلت حاصل ہوتی تھی وہ اہل پنجاب کو سرکار کے ہاں بعزت و بلیاقت نصیب تھی پھر حالات پنجاب کے ہندوستان کے حالات کے بالکل مخالف تھے۔

ترجمہ

چٹھی پادری ای ایڈمنڈ جس کا ذکر سر سید نے اس رسالہ میں کیا ہے

بخدمت تعلیم یافتہ باشندگان ہند

معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کی جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہیے یا نہیں۔ ریلیں و دخانی جہاز اور تار برقی نہایت تیزی کے ساتھ دنیا کی تمام قوموں کو ملا رہی ہیں جس قدر زیادہ قومیں ملتی جاتی ہیں اسی قدر زیادہ اس نتیجہ کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ تمام لوگوں کی ایک ہی حاجتیں ہیں ایک ہی اندیشے اور ایک ہی امید و بیم ہیں۔ اور یہ بات بھی بہت یقینی ہے کہ موت سب کے لیے اس امن کو ختم کر دیتی ہے۔

تو پھر کیا ایسے وسائل نہیں ہیں جن سے زندگی کے رنج اور تفکرات کم ہو سکیں اور جن سے تمام لوگوں کو موت کے وقت آرام مل سکے۔ کیا یہ فرض کر لینا معقول ہے کہ ہر ایک قوم کو رجماً بالغیب محض قیاس کے ذریعہ سے اپنے واسطے راستہ نکالنا چاہیے؟ یا جس خدا نے سب کو بنایا ہے اس نے اپنے خاندان کے مختلف لوگوں کے لیے موجودہ اور آیندہ خوشی حاصل کرنے کے واسطے مختلف طریقے مقرر کیے ہیں؟ بے شک یہ بات نہیں ہو سکتی ہے۔

پس مذہب عیسوی ہی ایسا مذہب ہے جو خدا کے پاس سے براہ راست الہام کے ذریعے سے آنے کا دعوے کرتا ہے۔ اور یہی ایسا مذہب ہے جس سے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں جس کا حال اسی سے منکشف ہوتا ہے خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے مذہب سے اس مذہب کو ممتاز کرنے کے لیے اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل سے اپیل کرتا ہے اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جو محض دلیل کے زور سے پھیلا ہے۔ جو قومیں اس مذہب پر اعتقاد رکھتی ہیں سب سے زیادہ غور و خوض کرنے والی ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ شائستہ ہیں پس بہر کیف اس مذہب کو حق حاصل ہے کہ اس پر غور کی جائے۔

چونکہ ہم نے خود اس سے نہایت ہی اچھی برکتیں حاصل کی ہیں اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اور لوگوں کو بھی

اُن کے حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے اور اس لیے یہ سنجیدہ اور سرگرم اپیل آپ سے کیا جاتا ہے کہ بلطف خود آپ اس اہم مضمون کو امتحان کریں۔ اس مذہب کی تائید میں بے شمار دلیلیں ہیں مگر اس مضمون میں ان میں سے صرف ایک پر بحث کی جائے گی مگر وہ ایک امر کو مستحکم کرنے کے لیے بالکل کافی ہوگی۔

ایک شخص یسوع نامی ملک یہودیہ کے ایک مقام بیت اللحم میں تقریباً ۱۱۵۹[1] برس گزرے پیدا ہوا تھا وہ عالی خاندان اور دولت مند نہ تھا۔ لیکن اُس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ مجھ کو خدا نے بھیجا ہے تاکہ میں لوگوں کو صرف وہی رستہ بتاؤں جو خدا کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اس ملک میں تین سال وعظ کرتے پھرنے کے بعد سلطنت روما نے یہودی علما کی درخواست پر اس کو مار ڈالا۔ یہاں تک سب مانتے ہیں جس طرح جولیس سیزر کی موت ایک امر واقعی ہے اسی طرح یسوع کی موت بھی ایک امر واقعی ہے اور کسی شخص کو نہ ایک میں شبہ ہے نہ دوسرے میں۔ یہودی جو یسوع اور اُس کی تعلیم کے سب سے بڑے دشمن ہیں اس پر فخر کرتے ہیں اور یہ سب سے بہتر شہادت ہے جس کی ہم خواہش کر سکتے تھے۔

اُس کے پیرو کہتے ہیں کہ وہ مر کر دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ ایک بڑا واقعہ ہے جس پر تمام مذہب عیسوی منحصر ہے۔ اگر یہ سچا ہے تو انجیل بھی سچی ہے کیونکہ کوئی شخص مر کر زندہ نہیں ہو سکتا جب تک خدا کی مدد شامل حال نہ ہو۔ اور خدا اُس شخص کو ہرگز مردہ سے زندہ نہ کرے گا جس کی زندگی اور تعلیم اُس کو پسندیدہ نہ ہو۔ اگر یہ غلط ہے تو انجیل بھی غلط ہے۔

ہم نہایت ادب اور سرگرمی سے آپ کو تاکید کرتے ہیں کہ آپ اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر مبذول فرمائیں کہ آیا یسوع زندہ ہوا یا نہیں۔ ہم کو اس امر پر گواہ لانے چاہییں اور وہ حسب ذیل ہیں:-
پیٹر۔ جیمز۔ جان۔ متھیو۔ متھیاس۔ ٹومس۔ جیوڈ۔ میری میگڈلین۔ کلیوفس۔ اور پانسو اور جن کے نام اب معلوم نہیں ہیں۔ بہت سے ان میں سے خاص دوست تھے جو یسوع کی موت سے پہلے تین سال تک متواتر اُس کے ساتھ رہے تھے اس لیے وہ اُس کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتے تھے اُنھوں

---

[1] اصل انگریزی چٹھی میں بھی ۱۱۵۹ لکھا ہے ظاہرا یہ چھاپہ کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ پادری ای ایڈمنڈ کی چٹھی ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی اور اُس وقت عیسیٰ مسیحؑ کی ولادت کے حساب سے یہی سنہ ہونا چاہیے تھا ۱۲

نے اس کی وفات سے پچاس دن کے اندر اندر آ کر ظاہر کیا کہ وہ اُسی جگہ اور انہی لوگوں میں جنھوں نے اس کو مغلوب کیا تھا دوبارہ پیدا ہوا۔

اگرچہ اس بات کے ظاہر کرنے میں ان کا کچھ فائدہ نہ تھا بلکہ ہر چیز کے کھو بیٹھنے کا خطرہ تھا یہاں تک کہ جانوں کے بھی ضائع ہونے کا احتمال تھا مگر اس پر بھی اُنھوں نے کئی ہزار آدمیوں کو اس بات کا یقین کرنے کی ترغیب دی کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں سچ ہے۔ یہاں تک کہ وہی لوگ جو اُس کو نہیں مانتے تھے اور حقیر سمجھتے اور اُس سے نفرت کرتے تھے اب اس کے نام کی عزت اور پرستش کرنے لگے۔

جب تک وہ زندہ رہے نہ صرف یہودیہ میں بلکہ تمام سلطنت روما میں اس واقعہ کا ذکر کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی صداقت کو اس طرح ثابت کیا کہ اس بات کے کہنے کے عوض میں اپنے لیے موت اور سخت اذیت گوارا کی جب کہ وہ صرف یہ کہہ کر چھوٹ سکتے تھے کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ اگرچہ وہ جاہل اور ان پڑھ تھے مگر اُنھوں نے تمام سلطنت روما میں ہزاروں کو ایسی ترغیب دی کہ وہ اُن کا یقین کرنے لگے اور اپنے مذہب ترک کر کے باوجود لوگوں کی نفرت اور قتل ہونے کے اُس مذہب کو جس کی وہ تعلیم دیتے تھے قبول کر لیا۔ وہ دنیاوی آرام و عزت کا وعدہ نہیں دلاتے تھے کہ جس سے لوگوں کو اُن کا یقین کرنے کی ترغیب ہو بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ اُن کے نزدیک یہ کافی نہ تھا کہ اُن کے خیالات کی برائے نام پیروی کی جائے بلکہ وہ انکسار اور پاکیزہ زندگی چاہتے تھے جسے قدرتاً سب لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ نیا مذہب بھی کسی کو مرنے سے نہیں بچا سکتا۔ اگرچہ اُن کو خود اس بات سے کوئی فایدہ حاصل نہیں ہوا اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دی کہ اُن کو بھی کسی فایدہ کی امید نہیں رکھنی چاہیے تاہم اُنھوں نے یسوع مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا ایسا موثر طریقے سے یقین دلایا کہ یہ مسئلہ جس کا اَن پڑھ ماہی گیر غریب نجار کے بیٹے کی نسبت وعظ کیا کرتے تھے سلطنت روما کے زاویۂ خمول سے تمام سلطنت میں اُن کی موت کے بعد بھی پھیل گیا۔ اور اس نے ہر ایک مذہب کو اگرچہ زمانہائے دراز سے اُس کو مانتے چلے آتے تھے اُکھاڑ پھینکا۔

یسوع مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے ثبوت میں ہمارے پاس ان لوگوں کی شہادت موجود ہے جو اس مسئلہ کے واعظ نہیں ہوئے۔ اُن سپاہیوں نے جو قبر پر پہرے کے لیے مقرر کیے گئے تھے اس واقعہ کو

دیکھا اور (یہودی) عالموں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے جسم کے غائب ہونے کی وجہ بتانے کے لیے جس کو سب تسلیم کرتے تھے ایک بیہودہ حکایت کا گھڑلینا ضروری سمجھا صرف عوام الناس کی شہادت جس کی ہر شخص خواہش کرسکتا ہے ہمارے پاس موجود نہیں ہے کہہ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ یسوع نے عام طور پر سب لوگوں کے سامنے اور خصوصاً اُن لوگوں کے سامنے جنھوں نے اُس کو مصلوب کیا تھا اپنے تئیں ظاہر نہیں کیا۔ اس کے مختلف وجوہات بیان کیے جا سکتے ہیں جو اُس مسئلہ کی ماہیت سے جس کی وہ تلقین کرتے تھے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان وجوہات کا بیان کرنا اس وقت ناممکن ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس شہادت کا موجود نہ ہونا اس واقعہ کی سچائی پر کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ اگرچہ بہت سے آدمیوں نے جو اُس کو خوب اچھی طرح جانتے تھے اُس کو دیکھا اُس سے باتیں کیں اور اُس کے ساتھ کئی موقعوں پر کھانا کھایا تو یہ سوال کرنا کہ کیا وجہ ہے اور لوگوں نے اُس کو نہیں دیکھا درحقیقت اُن کی شہادت کو متزلزل نہیں کرسکتا جہاں کہیں وہ ظاہر ہوا تمام لوگوں نے جو اُس وقت وہاں موجود تھے اُس کو دیکھا۔ چنانچہ ایک موقع پر پانسو آدمیوں تک نے دیکھا۔ پس ظاہر ہے کہ یہ ایک خیالی نہیں بلکہ واقعی بات تھی۔ ایک شخص مسمیٰ تھامس نے کہا کہ جب تک کہ میں اُس کے ہاتھوں میں میخوں کے اور پہلو میں برچھے کے سوراخوں کو اپنے ہاتھ ڈال کر نہ دیکھ لوں گا اس وقت تک یقین نہ کروں گا کہ وہ ہمارا پرانا دوست ہی ہے۔ مگر اُس کی بھی تسلی ہوگئی۔ ہم نہایت سرگرمی کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ آپ اُن واقعات پر غور کریں اور اگر شہادت میں کچھ نقص ہو تو ہمیں بتائیں ورنہ اس بات کو تسلیم کریں کہ یسوع مسیح مُردہ سے زندہ ہوا اور انجیل پر ایمان لائیں۔

یسوع مسیح کے دوبارہ جی اُٹھنے سے سب لوگوں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ خدا نے ایک دن ایسا مقرر کیا ہے جب کہ وہ راستبازی میں دنیا کا انصاف کرے گا اُس وقت تم اُس کے سامنے کھڑے ہوگے اور خیالات بد الفاظ اور بد اعمال کی جن کے تم مجرم ہوئے ہو جواب دہی کرنی پڑے گی۔ کیا تم ایسا کرنے کے لیے تیار ہو؟ کوئی تنفس نہیں ہے جو کہ تیار ہو لیکن جو شخص یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ مانے گا اُس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے کیونکہ اس اعتقاد کے ساتھ ہی پاکی بھی عطا ہوجاتی ہے۔ پس وہ اس خوفناک دن کی جواب دہی کے لیے بھی تیار ہوجائے گا۔

چونکہ تم اپنی ابدی خوشی کی قدر کرتے ہو اس لیے ہم تم کو تاکید کرتے ہیں کہ اس بڑے مضمون کی آزمایش کرو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ روح القدس کی تعلیم کے ذریعے سے تم کو ٹھیک ٹھیک طور پر اس کلام کو کرنے کے قابل بنا دے۔ اس بات پر تخلیہ میں غور کرو اور اس کی آزمایش کرو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر بھی جن کے نام یہ چٹھی لکھی گئی ہے سوچو۔ اور اپنی توجہ صرف اس ایک امر پر بند دل رکھو کہ آیا وہ گواہ اعتبار کے قابل ہیں یا نہیں جنھوں نے یہ کہا ہے کہ ہم نے یسوع مسیح کو مردہ سے زندہ ہونے کے بعد دیکھا اگر ایسا کروگے تو تم کو تمام حصول شہادت سے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ یسوع مسیح بے شک مر کر زندہ ہوا اور اس لیے انجیل سچی ہے اور یہی ایک خدا کی طرف سے الہامی کتاب ہے۔ پس لیرنوا اور کھلم کھلا ایمان لاؤ کیونکہ یسوع نے خود کہا ہے "جو کوئی مجھ سے اور میرے لفظوں سے اس بدکاری اور گنہگاری کی زندگی میں شرمندگی کرے گا اس سے ابن آدم بھی جب وہ پاک فرشتوں کے ساتھ اپنے باپ کے جلال میں آئے گا شرمندگی کرے گا" ہماری تمنا ہے کہ اس ملک میں گرجاؤں کو ہندوستانیوں سے بھرا ہوا دیکھیں جہاں نہ صرف غیر ملک کے لوگ بلکہ تمھارے ہم وطن بھی انجیل کی خوش خبری کی باقاعدہ طور سے منادی کریں۔ وہاں عورتوں اور مردوں کو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کرنے اور اپنے خدا کی ملاقات کے لیے تیار ہونے کی تاکید کی جائے گی۔ وہاں بچوں کو اخلاق اور سچائی کی تعلیم دی جائے گی اور اس دنیا میں اپنے چال چلن کی درستی کرنے اور دوسری دنیا کے لائق بنانے کے واسطے پاکی اور نجات کے سبق پڑھائے جائیں گے اور وہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ موت اب ایسا دشمن نہیں رہا جس سے آیندہ ڈرنا چاہیے کیونکہ ہمارے نجات دہندے یسوع مسیح نے اس کا ڈنک نکال دیا ہے اور اس کو نیست و نابود کر کے انجیل کے ذریعے زندگی اور حیات ابدی کو روشن کر دیا ہے۔ خدا ہی نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ اب بھی یہی حال رہے گا۔ ہم اس وقت کے آنے کی خواہش کرتے ہیں جب کہ لوگ بخوبی اس کو سمجھ جائیں گے۔ کیوں نہ اسی نسل میں یہ بات ہو؟ کیا یہ احمقانہ، ذلیل اور خراب بت پرستی کے مقابلے میں جس سے یہ زمین آلودہ ہو رہی ہے بے حد ترقی نہیں ہوگی ہم تم کو عقل مند سمجھ کر کہتے ہیں۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس کو جانچ لو۔

نقل اشتہار گورنمنٹ بنگال جس کا ذکر سرسید کے رسالہ میں ہوا ہے

درین نزدیکی بسمع مبارک نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال چناں رسیدہ کہ بعضے اشخاص ازراہ تعصب و نادانی محض برائے حیرانی و پریشانی جمہور خلائق چند سخناں بے اصل و نالائق متعلق بہ مذہب و ملت و رسم و طریقت ہنود و مسلمانان چناں مشہور و اعلان کردہ اند کہ باستماع خطرات پُر خطر در دل مردمان جاکردہ جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر را بسیار حیرت و حسرت است کہ سکنۂ این ملک حقیقت حال را دریافت نکردہ صرف بافسانہ مفسدان چرا خود را زیر بار تشویش میکنند لاجرم بذریعۂ اشتہار عام حقیقت نفس الامری اخترامات کہ بگوش حقیقت نیوش نواب محتشم الیہ درآمدہ مشتہر کردہ میشود تا کافۂ انام بر حقیقت حال وارسند و بہ یقین معلوم نمایند کہ سرکار بہادر را نوعے در ملت و مذہب و طریق و رسم و راہ رعایا مداخلت و مزاحمت نیست و آیندہ را نیز نخواہد بود بلکہ محافظت جان و مال و عزت و حرمت ایشان پیش نہاد ست و مساعی جمیلہ درین باب بکار رفتہ آید و آمدنی ست۔

اول اینکہ بعضے پادریان کلکتہ بطریق طریقہ و وظیفہ معمولی خود افراد سوالی دربارۂ مذہب و ملت بطریق مناظرہ و مباحثہ چاپ کردہ ملفوف بہ لفافہا عموماً پیش ہندوستانیان فرستادہ و آنہا از غلط فہمی خود انگاشتند کہ آنچناں مضامین باشارۂ سرکار ابد پایدار بظہور رسیدہ حالانکہ سرکار بہادر را ازاں ہیچگونہ اطلاعے و آگاہی نیست و نیز ہرگز در ہر آئینہ شان سرکار عالی اقتدار چناں نبودہ کہ ترغیب و تحریص کسے از رعایا بسوئے ملت و دین خود فرماید چہ ظاہر ست کہ رعایائے ایں ملک ہر قسم مردم اند و ملت و مذہب و کیش و آئین جداگانہ میدارند و رقبۂ ایشاں تحت رقبۂ اقتدار سرکار والا اقتدار ست و نظر لطف و کرم بر حال آنہا ساوی و یکساں ست باوجود استدادِ ملت سلطنت سرکار ابد پایدار ہیچ وقتے مزاحمت و تعرض کیش و ملت کدامی اہل اسلام و دیگر مذہب بعمل نیامدہ و پادری صاحبان ایں قسم امور از طرف خود اجرا میکنند و ایں ہمہ گویا لوازمہ عادات معمولی شان ست

چنانکه مسلمانان و ہنودان در مساجد و معابد وعظ و نصائح میکنند و اظہار و ابراز امورات شرعی و ترغیب و اجتناب از نواہی میسازند و اگر تامل کرده شود صاف واضح شود که این معنی سخن نو و امرے جدید نیست بلکه طریق مناظره و مباحثه درمیان علمائے مختلف المذاہب ہمواره جاری ست و از ہمه امورات سرکار بہادر را ہیچ علاقه نیست۔

دوم۔ اینکه بعض اخبار اخبار کرده و در عوام نیز شہرت یافته است که بالفعل از طرف سرکار آں چناں قوانین جاری شدنی ست که از اں رسم تعزیه داری و مراسم ختنه و پرده نشینی زنان شرفا وغیره احکامات شرع و شاستر برافتد و یکسر موقوف گردد حالانکه ایں ہم غلط ست و افترائے محض سرکار بہادر را در راه و رسم و کیش و مذہب کدامی کس دست اندازی منظور نیست بلکه ایں معنی برخلاف طریقۂ رعیت پروری که سجیۂ مرضیۂ سرکار بہادر ست بوده است۔

سوم۔ اینکه صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل خانه بعضے اضلاع بلا اطلاع و واقفیت سرکار والا اقتدار حکم ستیده گرفتن ظروف اکل و شرب از قیدیان بخیال و تصور تفرقه و امتیاز در مصائب قید در احت خانه صادر کرده بود لیکن سرکار بہادر را معلوم گردید که ایں امر نقصانے است در مذہب آناں و از لاعلمی مہتمم جیل خانه آں چناں حکم صادر گردید۔ علی الفور بسبیل ڈاک برقی حکم محکم موقوفی آں صادر گشت۔

چہارم۔ ایں که بسمع معدلت مجتمع در آمد که سکنۂ ایں مملکت بنائے اسکول و اسباب علوم و تحصیل فنون و ترویج زبان انگریزی را اسباب تبدیل ملت و تخریب بنائے دین و مذہب می پندارند و ازیں جاست که بسے از مردمان در تحصیل علم و تکمیل فنون تعلل و تہاون می کنند و بعض اشخاص بفرستادن اطفال در اسکول مضائقه می دارند ظاہرا منشاے آں جز نافہمی و بے دانشی نیست و الاصل این ست که ہرگاه بحضور سرکار والا اقتدار تحقق گردید که رعایائے ایں مملکت بسبب بے علمی و بے ہنری از طریقۂ کسب معاش چناں بے خبر اند که از اوقات گزاری خود ہا بار احت و آسایش معذور اند لاجرم بحکم والائے جناب ملکۂ انگلستان که از راه تفضلات خسروانه صدور یافت برائے تعلیم و تربیت آنہا باہتمام تمام و صرف مالاکلام در ہر یک اضلاع و امصار مدارس اسکول و کالج بنا گردید و در ہر ضلع صاحبان بعہدۂ انسپکٹر

وبه نیابت شان متعدد هندوستانی برائے طریقهٔ تربیت معین گشتند و برائے درس و تدریس و تعلیم کتب علوم و فنون زبان انگریزی وغیره آں تاکید مزید شد تا باشندگان ایں ملک عموماً از جهل و بے دانشی و از رشته به تحصیل علم و دانش بخوبی تحصیل معاش نمایند و از تنگنائے تنگی و عسرت بر آمده با مسرت و عشرت صرف اوقات خود ها نمایند۔

مخفی نیست که باشندگان ملک یوروپ (یعنی ولایت انگلستان) باعث تحصیل علوم هرگونه امورات را از رسائی عقل رسائے خود به خوبیهائے تمام انجام می دهند۔ به خلاف اهالی ایں دیار که باعث بے علمی و بے دانشی بے سلیقه محض اند اگر علم و هنر و فهم و دانش در اینان شایع گردد هر یکے لوازمه آسایش و آرام را جامع خود و تشریف شاهی را کماهی نه دریافتن دیگی را بجائے خود حل کردن چه قدر افسوس و حسرت است که بشرح نمی آید جناب لفٹنٹ گورنر بهادر چنان قیاس می فرمایند که بنائے ایں همه خیالات فاسده براه غلط فهمی ست نه از روئے تعصب و بد باطنی باید دانست که غرض سرکار به تربیت و تعلیم انگریزی آں نیست که حرفے بر دین و آئین شان در آید بلکه هر کس مجاز ست که هر علم و هنر که مرغوب و مطبوع باشد و باعث فائده و دائمه به تحصیل آں پردازد مگر ایں هم دانستنی ست که بالفعل به زبان انگریزی کتب و رسائل هر فن موجود ست و همیشه تجربهائے متعدده و اختراعات نو به نو بر روئے کار می آیند که به زبان دیگر حاصل نیست و زبان انگریزی زبانِ والی ملک و صاحب سلطنت ست و در عدالت ها باعث افهام و تفهیم عوام زبان مروجهٔ ایں ملک جاری ست دریں صورت تحصیل و تکمیل زبان انگریزی و اردو و بنگله از برائے حصول معاشش و ترقیات حرمت و عزت و اقبال بلاشک ست و از واجبات است۔

مخفی مباد که از آوائے که نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بهادر احوال ایں دیار را به چشم خود دیده و از اکثر اشخاص شنیده همت والا نهمت محتشم الیه به فکر و درستی اوضاع باشندگان ایں ملک و به ایجاد طریق تعلیم و ترتیب و آرام و آسایش در حفظ عزت و حرمت هر یک عموماً مصروف ست و از غایت مهربانی و دلسوزی اصلاح حال شرفا و نجبا و زمینداراں و رعایا خصوصاً مد نظر ست۔

لہذا اشتہار دادہ می آید کہ ہمگنان سکنۂ ایں ملک بر نیک نیتی و بلند ہمتی سرکار والا اقتدار واقف و مطلع بودہ شکر خدا بجا آرند و با طمینان تمام اوقات خود ہا بسر کردہ بہ دعائے دوام دولت ابد مدت سرکار دولت مدار مصروف باشند۔

ضمیمہ نمبر ۵

ذیل کا مضمون ہم نے رسالۂ معارف مورخہ یکم دسمبر ۱۸۹۵ء میں شائع کیا تھا۔ چونکہ یہ مضمون خاص کر سرسید مرحوم کی تفسیر قرآن سے علاقہ رکھتا تھا اس لیے بعض احباب کی یہ خواہش تھی کہ بطور ضمیمہ کے سرسید کی لائف میں شامل کر دیا جائے لہذا وہ مضمون بجنسہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ حیات جاوید (یعنی سرسیّد کی لائف)

ہم نے سرسید مرحوم کی لائف میں جہاں اُن کی مذہبی خدمات کا ذکر کیا ہے، وہاں اُن کی تفسیر کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں مگر سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت، جو تفسیر کی جان ہے اور جس سے مراد قرآن اور حقائق موجودات میں مطابقت ثابت کرنا ہے، اُس پر لائف میں اس لیے بحث نہیں کی گئی کہ وہ بحث بہت طولانی تھی جس کی ایک بائیوگرافی متحمل نہیں ہو سکتی اور نیز عام ناظرین کو اُس سے چنداں دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ تفسیر مذکورہ کی اس خصوصیت پر جو کچھ ہم نے لکھا ہے یا آیندہ لکھیں اُس کو بدفعات رسالہ معارف کے نمبروں میں شائع کر دیں۔ بالفعل ہم ذیل کے عنوان پر پہلا مضمون شائع کرتے ہیں۔

نمبر (۱)

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہے، یا نہیں؟

سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیتوں کے معنی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اُس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے، جو گزشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید پر لکھی گئی ہیں، اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا

ہے جس کو علمائے سلف نے نہ طے کر لیا ہو؟ اور اگر رسول خدا صلعم نے جن کے برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہو سکتا جن آیتوں کے معنی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبانِ مبارک سے اُن کا مطلب ارشاد فرمایا۔ پھر آپ کے بعد صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور علمائے امت نے، جو یقیناً اس زمانہ کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے، قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا۔ پس زمانۂ حال میں مفسر کے لیے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انہیں تفسیروں کا ماحصل، جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں، زیادہ شرح و بسط یا زیادہ اختصار، یا زیادہ فصاحت کے ساتھ بیان کر دے، یا ایک زبان سے دوسری زبان میں اُن کا ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک آیت کے معنی بھی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کیے ہوں۔ چنانچہ اسی شبہ کی بنا پر بعض تم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا، نہ نبی کو، نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمائے امت کو۔ اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآنِ مجید میں وارد ہوئے ہیں اُن سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے، محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو اور متشابہات وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا۔ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں، مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انھوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے، یہ ہے کہ "قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص اور عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراک حقائق سے بعید ہوتی ہیں، مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے، جو نہ جسم ہے، نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اُس کی طرف اشارہ

ہو سکتا ہی، تو اُن کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہی؛ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں" شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح بیان کیا ہی کہ "شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، اُن سے خطاب کیا ہی اور اسی لیے (اُن کی سمجھ کے موافق) فرمایا "الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "آنحضرت نے ایک عورت حبشیہ سے پوچھا کہ خدا کہاں ہی؟ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ مومنہ ہی" یعنی آنحضرت نے، باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لیے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ جہت اور مکان سے پاک ہی۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہی کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کے فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمیّوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا اُن کو مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہی تاکہ اُمّی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اُس سے ہدایت حاصل کریں۔ عہدِ عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان اور یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں، چونکہ وہ اُس زمانہ میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لیے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز و استعارہ پر رکھی گئی ہی، تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اور صحیفے تشابہات سے بھرے ہوئے ہیں، جیسے خدا کا طوفانِ نوح پر اس قدر رونا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں، یا دوسرے موقع پر اُس کا ایسا ہنسنا کہ کھلیاں نظر آنے لگیں، یا سرکشوں کا اُس کو کھجا کر غصّہ دلانا اور اُس کی ناک میں دھوئیں کا سا اثر کرنا، اُس کی سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا، شہر اسور کا اُس کی آواز سے تباہ ہونا اور اس کا اسور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ۔ ایک جگہ کتاب یرمیاہ میں یروشلم کی تباہی پر خدا تعالیٰ

اپنا غصہ اس طرح ظاہر کرتا ہے "ہائے میری انتڑیو! ہائے میری انتڑیو! میرے دل کے پردہ میں درد ہے، میرے دل کی ایسی گھبراہٹ ہے کہ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ اے میری جان! تو نے نرسنگی کی آواز اور لڑائی کی للکار سنی، شکست پر شکست کی خبر ہوئی، یقیناً تمام سرزمین برباد ہوگئی، میرے خیمے اچانک اور میرے پردے ایک دم میں غارت کیے گئے۔ کب تک یہ جھنڈا دیکھا کروں اور تُرئی کی آواز سُنا کروں؟" زبور میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤدؑ کے مقرب اور محبوب ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ "میں نے تجھے جنا ہے، میں آج کے دن تیرا باپ ہوا" دوسری جگہ زبور میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اس طرح ہے "آخر خداوند خواب سے بیدار ہوا اور اُس پہلوان کی طرح جو شراب پی کر عربدہ کرے اپنے دشمنوں کی پچھاڑی ماری" غرض کہ تمام عہد عتیق کی کتابیں اسی قسم کے تشابہات سے مالا مال ہیں جن میں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ صاحب انبیا کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں "ومن سیرتھم ان لا یکلموا الناس الا علی قدر عقولھم التی خلقوا علیہا وعلومھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ"

تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضرور ہے کہ تشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ تشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویلِ تشابہات کے متعلق لکھتے ہیں "یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ، وقد اتفق اصحابنا وغیرہم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالیٰ بما لا یفید" یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لیے نہ ہو اور ہمارے علمائے مذہب اور اُن کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو، محال ہے، غرض کہ آیۂ مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں

کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدأ و معاد کے متعلق جو باتیں انسان
کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیات متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہی
اور جن پر ایمان لانے کو يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہی اُن کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا
کوئی نہیں جان سکتا اور اس لیے انسان جن الفاظ و عبارات سے اُن حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر
ناقص اور ادائے معنی مقصود سے قاصر ہوگی طیبی[1] نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہی کہ "جن متشابہات کے اتباع
سے بچنے کا حکم ہی وہ صفات باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہی جو قیاس اور استنباط سے
دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اُس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہی" لیکن اس سے یہ لازم
نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل
کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے مثلاً سورۂ تکویر میں
ہول قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہی "وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ" (یعنی جب کہ عنقریب بیانے
والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور اُن کی کوئی خبر نہ لے گا) بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس
تمثیل میں بیان کیا گیا ہی اُس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہی اور اُس کی قدرت سے باہر ہی کہ
اُس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اُس کی طاقت سے باہر
نہیں ہی کہ یہ بیان اُس کیفیت کی ایک تمثیل ہی اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ
اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی، اُس کو ہول قیامت کا تصور دلانے کے لیے کوئی اسلوب اس سے
زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب
اونٹنی بیانے کے قریب ہو اُس وقت مالک اُس کی نگرانی سے غافل ہو جائے پس اُنھوں نے اُس وقت
کہ کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جب کہ ایسی اونٹنیوں کی خبرگیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہی کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا

---

(1) قال الطیبی فی شرح المشکوٰۃ "الذی یجب رمنہ ہو صفات اللہ تعالیٰ التی لا کیفیۃ لہا و اوصاف القیمۃ
التی لا سبیل الی ادراکہا بالقیاس والاستنباط ولا سبیل الی استحضارہا فی النفوس" ۱۲

تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اُس کے لیے مواخذہ کیا جاتا تھا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کرکے بصرہ کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالکؒ سے استوی علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے اس کے سوا کچھ جواب نہیں دیا کہ "استوا کے معنی معلوم ہیں اور اُس کی کیفیت مجہول ہے اور اُس پر ایمان لانا واجب ہے اور اُس سے سوال کرنا بدعت ہے"۔

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانہ میں قرآن نازل ہوا اُس وقت اہل کتاب تحریف کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جابجا اُن پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہو سکتی اور اہل کتاب اُس کی مثال قائم کر چکے تھے اور مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصول دین میں عموماً باہم کر مشابہت رکھتے تھے اس لیے مسلمانوں کا میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا، لہٰذا اُن میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسداد تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیات متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ "فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ" اور آنحضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ "مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ" اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا "مَنْ كَذَبَ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"

اسی بنا پر سلفِ صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدہ سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اُس سے حذر کرتے

تھے۔ پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں، اُن کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے تھے اور اُن کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں، تصدیق کرتے ہیں اور اُن کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں، کیونکہ اُن کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً یَدٌ یا وجہ یا استوا کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمہ میں رکھ دیتے تھے حالانکہ عربی زبان جس میں شاعری نزول قرآن کے وقت حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی، استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالامال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہلِ کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے، تاویل متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا، متشابہاتِ قرآن کے الفاظ کے حقیقی معنوں پر مقصور رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے اُن کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کی تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اُس کی مؤید نہ ہو، عموماً مبادرت نہ کرتے تھے حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اُس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو، بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ "اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل" نعوذ باللہ بے کار ٹھیرتا ہے باوجود اس کے سلف صالح جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت کے مُنہ سے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا رستہ مسدود رہے۔

لیکن یہ مصلحت اُسی وقت تک ملحوظ رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی

تھیں جب اُن کے اصلی معنی بیان کرنے سے علما نے سکوت کیا اور اُن کو محض حقیقی معنوں پر محصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اُسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون وچرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض از راہ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اُس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کیے گئے ہیں بقدر ضرورت اُن کے اصلی معنی صاف صاف بیان کیے جائیں چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی اور آخر کو اسلام میں عموناً یہ قاعدہ مسلم ٹھیر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہییں جس سے وہ تعارض رفع ہو جائے یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اُس کو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔ یہ اصول علم کلام کی عام کتابوں میں مثل مقاصد، مواقف، تفسیر کبیر، درر غرر شریف مرتضیٰ، تہافت الفلاسفہ غزالی، فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا ہے اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ "حمیدیہ" حکمائے زمانۂ حال کے مقابلہ میں لکھی ہے، اُس میں بھی اس اصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہل اسلام قرار دیا ہے۔ بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزات حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں، یہ ہدایت کی ہے کہ "علیکم ان یقتنعوا بما تقبله عقولهم، ثم ما لم تقبله ویرفضه البرهانُ العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل والعقل" (یعنی اُن کو چاہیے کہ جس بات کو اُن کی عقل قبول کرے اُس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اُس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے)۔

اگرچہ ابوالحسن اشعری جو فرقۂ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں، متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے

---

(۱) حمیدیہ صفحہ ۳۰ - ۳

مگر اُن کی یہ ممانعت صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے پاک ہیں، کیوں کہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اَور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہاتِ کتاب و سنت کی تاویل کرنی پڑی ہے۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں، رسالہ "التفرقة بین الاسلام والزندقه" میں لکھتے ہیں کہ "اہل اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو، سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد ابن حنبلؒ ہیں باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے اُن کے کیا معنی قرار دیے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ "وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" آیا ہے اُس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کُرْسِیُّ کو پہلے ایک جسم عظیم جو آسمان و زمین پر محیط ہے سمجھا جاتا تھا بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے، بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علما کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کیے جائیں۔ چنانچہ امام رازی نے علمائے شافعیہ میں سے قفال کا یہ قول آیۂ مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ "خدا تعالےٰ نے اپنی ذات و صفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ امرا و سلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اُس نے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے جس کے گرد وہ بادشاہوں کے محلوں کی طرح طواف کرتے ہیں، اور اُس کی زیارت کا حکم دیا جس طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور حجر اسود کو اپنا دایاں ہاتھ قرار دیا اور اُس پر بوسہ دینے کا حکم کیا جس طرح وہ سلاطین کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہیں، اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیا اور شہدا کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ "اَلرَّحْمٰنُ

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ "وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" پھر فرمایا "وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ" اور فرمایا "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ" اور کہا "اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ" پھر اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا کہ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں "اذا عرفت هذا فنقول كل ما جاء من الالفاظ الموهمة للتشبيه في العرش والكرسي فقد ورد مثلها بل اقوى منها في الكعبة والطواف وتقبيل الحجر ولما توافقنا ههنا على ان المقصود تعريف عظمة الله وكبريائه مع القطع بانه منزه عن ان يكون في الكعبة فكذا الكلام في العرش والكرسي" یعنی جب تم نے یہ بات سمجھ لی تو میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ موہم تشبیہ عرش و کرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ موہم تشبیہ کعبہ اور طواف اور بوسۂ حجر اسود کے متعلق آئے ہیں، پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا ہے کہ ان الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریا کا تصور دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبہ میں ہونے سے پاک ہے، تو ایسا ہی ہم کو عرش و کرسی کی نسبت سمجھنا چاہیے۔

لیکن چونکہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لیے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں اُس زمانے میں اُن کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں اُن کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض علما(1) جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفہ کا رواج نہیں ہوا، زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم و حکمت کا

(1) شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "دین اسلام میں امریکا کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی کرویت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدہ کے خلاف ہے۔" شیخ اُس کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کریں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں۔

مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی کرویت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فَرَشْنٰهَا اور دَحٰهَا اور طَحٰهَا اطلاق کیے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اُس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجہ تک نہیں پہنچا تھا اس لیے قرآن کے بعض الفاظ جو بظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔ یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی، لوگ اُن آیتوں کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سَمَاءٌ سے جو قرآن میں جابجا وارد ہوا تھا مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چونکہ اُس وقت تک یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیط عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضائے بحت میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبیہ (یعنی کشش) ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اس لیے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی اس لیے اُن کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویل متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لیے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنھوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویل متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور اُس کو عند الضرورت واجب سمجھتے تھے جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اُسی قدر وہ اور اُن کا مذہب اور اُن کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور

معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں، صرف اُن کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ قفال جن کا قول نقلاً کُمِیَ کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے، وہ بھی معتزلہ میں شمار کیے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے الملل والنحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بنا پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں، لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں "ومن اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب والسنۃ" اس کے بعد فرماتے ہیں "ومن ذلک (ای من المتشابہات) امور کثیرۃ لا یدری أ أرید حقیقۃ الکلام او اقرب مجاز الیہا او ذلک فیما لم یجمع علیہ الامۃ ولم ترتفع فیہ الشبہۃ" (یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں، جن کی نسبت نہیں معلوم کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں، یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور یہ تردد اُن بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا) شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں نہایت مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ اُن مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو محتمل ہیں اُن سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں، یا مجازی۔

قطع نظر اس متشابہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے تفسیر کبیر اور

حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے ہی چکے ہیں، صاف پایا جاتا ہی کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوتا ہی اُس کی طرز بیان ایسی ہونی چاہیے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اُس سے ہدایت پا سکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اُس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اُس وقت بھی اُس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو، ورنہ اُس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہی اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہی کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہی، کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اُسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں "قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القرآن "لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد" فعجائب القرآن لا تنقضی الی یوم القیٰمۃ، فکل قرن لا بد لہ ان یاخذ منہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالیٰ بھا وضمھا الیہ لتکون برکۃ ھذہ الامۃ مستمرۃ الی قیام الساعۃ" یعنی آنحضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہی کہ "اُس کے عجائب یعنی دقائق و اسرار جو اُس میں مضمر ہیں، ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دوہرانے کے پُرانا نہ ہوگا" پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اسی لیے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیے کہ اُس سے فوائد کثیرہ جو اُن کے حصہ میں آئے ہیں، حاصل کریں تاکہ امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے" اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں "قال علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام آخرہ" یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ و تبیین الاحکام" یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "میری امت کی مثال مینہ کی سی ہی جس کا نہیں معلوم کہ اول بہتر ہی یا آخر" یعنی برکت اور خیر میں اور لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔"

---

(۱) از رسالۃ الحمیدیہ ۱۲

دونوں مذکورۂ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں، صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق و آثار خلقت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اُس کے اخیر قرنوں میں بہت سے نئے دقائق و اسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالی بھی اسی باب میں لکھتے ہیں کہ "وکم من معان دقیقۃ من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر یخلو عنہا کتب التفاسیر ولا یطلع علیہا افاضل المفسرین" (یعنی قرآن کے بہت سے ایسے دقائق و اسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو اُن کی خبر نہیں ہوتی۔ اُن لوگوں کے دل پر وارد ہوتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا، بہت سے مقامات اُس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق و اسرار ایسے باقی ہیں، جو اُمت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہاں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عند الضرورت اجماع امت کے خلاف ان مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے، یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ہے، اُن کے معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام سے اس قاعدہ پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" (یعنی ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز کر دیتی ہیں) ایک زمانہ تھا کہ صحابہ و تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے، چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے

کوئی مسئلہ پوچھا، چونکہ اُن کو اُس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی، اُنھوں نے کہا "میں کروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لیے حلال کردوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کردوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے" ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ "قرآن اور حدیث کے بغیر کبھی فتوے نہ دینا، اگر تم نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا" اسی طرح ابوسلمہؓ جب بصرہ میں آئے تو اُنھوں نے حسن بصریؒ سے کہا "میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتوے دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن اور حدیث کے فتوے نہ دینا" شعبی سے کسی نے پوچھا کہ جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ اُنھوں نے کہا "جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو۔ اور دوسرا تیسرے کی طرف ڈھلکا دیتا، یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی" (یعنی جب کسی کو اُس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو سب جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو دخل نہ دیتے تھے) مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ "ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت" مگر جب ضرورت داعی ہوئی علما کو ناچار اُس پر بحث کرنی پڑی۔ بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لیے سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ کیوں مسلمان قتل کیے جاتے ہیں تو اُن کو یہ جواب ملا کہ "القدر خیرہ و شرہ من اللہ" آخر علما کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

پھر چوتھی صدی تک اسلام میں تقلید شخصی کا بالکل وجود نہ تھا عوام کو جب کوئی واقعہ پیش

آتا تھا وہ جس مذہب کے عالم سے چاہتے تھے مسئلہ پوچھتے تھے اور خواص کو جب احادیث نبوی یا آثار صحابہ میں کوئی بات اطمینان کے قابل نہ ملتی تھی تو جس فقیہ کے قول کو چاہتے تھے، اختیار کرتے تھے خواہ اہل مدینہ سے ہو یا اہل کوفہ سے۔ مگر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ رفتہ رفتہ تقلید شخصی قرین مصلحت سمجھی گئی۔ حالانکہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا کہ نہ وہ خود کسی خاص شخص کا ہر ایک بات میں اتباع کرتے تھے اور نہ اوروں کا ایسا کرنا پسند کرتے تھے مگر زمانہ کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ ہر شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کو تمام احکام میں اپنا مقتدا قرار دے ورنہ اسلام میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں گے اور جس کا جو جی چاہے گا سو کرے گا۔ چنانچہ آج تک تمام ممالک اسلامیہ میں تقلید شخصی کی پابندی برابر چلی آتی ہے اور کوئی شخص علی الاعلان اس پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جب تک شک اور وسوسہ کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علما کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چونکہ ان میں کثرت سے آیات متشابہات نازل ہوئی تھیں اس لیے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔ یہودی جیسا کہ الملل والنحل شہرستانی سے ظاہر ہوتا ہے، زمانۂ دراز تک متشابہات توریت کو جن کی چند مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں، عموماً ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر آخر کار علمائے یہود میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اٹھنے شروع ہوئے جنھوں نے اس بات کو ظاہر کیا کہ تمام آیات متشابہات مُأوّل ہیں۔ چنانچہ فرقہ یوذعانیہ اور موشکانیہ اور دونوں فرقوں کی بہت سی شاخیں جملہ متشابہات توریت کی تاویل کرتی ہیں اور برخلاف عامہ یہود کے ذات باری کو اوصاف بشری سے منزہ جانتی ہیں۔

الغرض قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ اب تک ایسے موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں، یا مجازی اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو

پہنچ جائے کہ اُن کے معنی تعیین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہی تو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض، جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہی، دفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنی اختیار کیے جائیں، اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

مگر سوال یہ ہی کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہی جو محظورات کو مباح کر دیتی ہی؟ سو اس کا جواب یہ ہی کہ جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں کوئی مخالف آواز نہیں پہنچی اُن کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالے اُس کو فوراً دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جائے۔ اُن کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہی ؎

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہی ناخدا جب

مگر جو لوگ اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہی اُسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں، اُن کو وہ ضرورت روزِ روشن کی طرح نظر آتی ہی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویلِ متشابہات پر مجبور کیا تھا، وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی ہی۔ اُس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علما و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لیے حاصل کرتے تھے مگر اس زمانہ میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی ہی، ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو، یا اہلِ حرفہ ہو مجبور ہی کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اسی لیے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہو گئی ہی۔ اس کے سوا اُس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لیے جو شبہات اُن سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے اُن کے دفعیہ کے لیے اکثر حالتوں میں صرف کا انسکہ کہہ دینا کافی تھا مگر اس زمانہ میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقرا پر

رکھی گئی ہے اور اس لیے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہوسکتے ہیں وہ صرف علما کے کہنے سے دفع نہیں ہوسکتے۔

غرض گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں، بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں، بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلّمات غلط ثابت ہوجائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لیے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجہ کو پہنچ گئے ہیں اُن میں آیندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اُس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضرور ہے کہ یا تو قرآن حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اُس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر ان کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصول عربیت کے خلاف تکلفات لاطائل کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوب بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں، بالکل رفع ہوجاتے ہیں اور اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُن آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے اُن کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے، ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں، وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو، سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر اُن کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔ یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کیے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اُس زمانہ میں جب کہ

قرآن نازل ہوا، مخاطبین پر ظاہر کرنا شارع کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا، ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق جو علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقل طبیعی سے ترقی کر کے علم و حکمت کے اعلیٰ درجہ تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی ان الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انھیں پر قانع رہیں، مگر جوں جوں حقائق اشیا اُن پر منکشف ہوتے جائیں اُسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود اُن پر کھلتے جائیں، پس جو معنی قرآن کے اب یا آیندہ ایسے بیان کیے جائیں جو اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے اُن کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اُن کی نسبت صرف اس بنا پر کہ نزول قرآن کے وقت اُن کو شارع نے بیان نہیں کیا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنی نہ خدا کو سوجھے، نہ رسول کو۔ قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں مگر آنحضرت صلعم نے مسئلہ جبر و قدر پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی صحابہ ہی کے وقت میں اُس پر بحث شروع ہوگئی۔ چنانچہ عمرو ابن العاص اور ابو موسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل و نحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے اُن آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ کے متعلق کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی اُن آیتوں کے ہمارے علما اور ائمہ نے بیان کیے ہیں وہ نہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو؟

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اُس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہے اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے موافق ہے؟ اور جن اعتراضات کے رفع کرنے کی غرض سے

اُنھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اُن کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟ اور جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا اُنھوں نے قرار دیا ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آیندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

انڈکس

ت